بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

دسمبر 2015

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے

امریکہ، [illegible]، آسٹریلیا --- 7000 روپے

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
MEMBER APNS CPNE

دسمبر 2015
جلد 30 شمارہ 4
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰، بی ۶، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع دسمبر کا شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔

ایک اور سال اپنے دامن میں مایوسیاں، کامرانیاں، تشنہ آرزوئیں اور شادمانیاں لیے وقت کے سفر کا حصہ بننے جا رہا ہے۔ تاریخ کے صفحات میں کتنے سال اور کتنے زمانے محفوظ ہیں۔ جو باعث عبرت بھی ہیں اور نشان منزل بھی۔ بات صرف اس بصیرت کی ہے جو دیکھ سکے، سمجھ سکے۔ کائنات کو مسخر کرنے والا انسان ابھی بھی بہت سے معاملات میں بے بس ہے وہ وقت اور موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے۔ وقت جو انسان کے لیے مہلت عمل ہے۔ جو کبھی بے رحم ہے اور کبھی زخموں کا مرہم ہے۔ جو ہر روز ہمیں ایک نئی روشن اور اجلی صبح سے ہمکنار کرتا ہے۔ اور ہر رات ایک مہربان اندھیرا ہمارے وجود کو سکون بخشتا ہے۔ تیزی سے گزرتے وقت کا پیغام یہی ہے کہ جو مہلت عمل ہمیں دی گئی ہے اس کا ہر لمحہ بامقصد بنالیں تاکہ روز احتساب شرمندگی اور پچھتاوے سے بچ سکیں۔

دسمبر کے مہینے میں قائداعظم محمد علی جناح کا یوم پیدائش بھی ہے۔ جن کی بے لوث، پرعزم شخصیت اور مخلص قیادت میں برصغیر کے مسلمان ایک علیحدہ آزاد نظریاتی مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جس کی بنیاد کلمۂ توحید تھی۔

قارئین کو بابائے قوم کا یوم پیدائش مبارک ہو۔

سال نو نمبر سروے،

جنوری کا شمارہ "سال نو نمبر" ہوگا جس میں حسب روایت قارئین کی شمولیت کے لیے سروے شامل ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ ٹی وی پر چیختی، دھاڑتی بریکنگ نیوز کا سلسلہ معمول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ بہت کم خبریں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بریکنگ نیوز کہا جا سکتا ہے۔
اس سال ملکی یا غیر ملکی حوالے سے کون سا واقعہ یا خبر تھی جو آپ کے لیے حقیقتاً بریکنگ نیوز تھی، جس نے واقعی آپ کو چونکا دیا۔

2۔ زندگی محبت بھرے رشتوں کی ڈور سے بندھی ہے۔ کسی بھی اپنے رشتہ یا تعلق کی ڈور سے بندھی شخصیت نے آپ کی تعریف میں کوئی ایسا جملہ کہا جسے سوچ کر آج بھی دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔
تعریف کے الفاظ بھی لکھیں۔

3۔ گئے سال کے بارہ مہینوں میں شعاع کا کون سا ٹائیٹل آپ کو پسند آیا۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 18۔ دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔ ایڈریس یہ ہے۔
شعاع سال نو نمبر سروے۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔

اس شمارے میں،

- نایاب جیلانی کا مکمل ناول۔ منظر سے ہٹ کر،
- نازیہ رزاق کا مکمل ناول۔ عشق پل صراط کا سفر،
- مہوش افتخار کے ناول جام آرزو کی آخری قسط،
- ایمل رضا اور صائمہ اکرم کے ناولٹ،
- شہانہ فاطمہ، بنت سحر، فرزانہ عامر اور مریم بنت ارشاد کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- ڈاکٹر، ماڈل، فیشن ڈیزائنر نادیہ حسین کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کے اس شمارے کو ہر لحاظ سے خوبصورت بنانے کے لیے ہم نے پوری کوشش کی ہے۔ ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے یہ آپ کے خط ہمیں بتائیں گے۔ ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

اے میرے خدا!

آسمان پر کھلائے تو نے ستاروں کے باغ
شبنم کو موتیوں کا دیا ہار
روئے زمین پر جل رہے ہیں تیرے روشن چراغ
چھپائے تو نے سنگریزوں میں گوہر عام
اوجِ گردوں سے اُتاری زمین پر چاندنی
نہال گلستاں میں بڑھائے تو نے تمام
نرگس کی بے نوری کے چمن میں دیدہ ور پیدا کیا کیا خوب
رات دمکاتی تارے صبح برساتی نور
موسمِ بہاراں کر دیتا سبزہ دُور دُور
یہ رازِ گر سکھایا تو نے
چراغِ لالہ سے روشن کیے تو نے کوہ و دمن
مجھ کو نغموں پر اُکسانے لگے مرغِ چمن
مستی شراب کی سی بھری حسین نظاروں میں
تو نے

صبا محمد خالد

اب بھی روشن ہیں کسی خاک تہِ پا کے طفیل
کہکشاؤں کے خوش اندام ستارے سارے

جب بھی اُس نام کا تارا کسی لب پر چمکا
جگمگا اُٹھے در و بام ہمارے سارے

اک وہی چہرہ ہے جو لوح و قلم ٹھہرا ہے
ورق سوختہ ہیں باقی شمارے سارے

فاطمہؓ ہوں کہ علیؓ ہوں کہ حسنؓ ہوں کہ حسینؓ
ایک ہی لو سے ہیں روشن یہ ستارے سارے

ایک ساگر میں سبھی جا کے یہ مل جاتے ہیں
ایک ہی سمت میں بہتے یہ دھارے سارے

عربی ہوں عجمی ہوں کہ حبش کے باسی
نسبتِ یثرب جاناں سے ہمارے سارے

چاہے کتنا ہی بھٹک جائے پر اتنا طے ہے
شہرِ طیبہ کی طرف دل کے اشارے سارے

شجاعت علی راہی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

دجال اور علامات قیامت

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح دجال کا ذکر فرمایا۔ پس اس کے فتنے کو حقیر اور بڑا خطرناک کر کے بیان کیا (یا آواز کو بلند اور پست کیا) یہاں تک کہ ہم نے اس کی بابت گمان کیا کہ وہ یہاں کھجوروں کے جھنڈ میں ہے۔ چنانچہ جب ہم (بعد میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے تو آپؐ نے ہمارے اندر موجود اضطراب کو پہچان لیا اور دریافت فرمایا۔

"تمہارا کیا حال ہے؟"

ہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے صبح دجال کا ذکر فرمایا اور اسے حقیر اور خطرناک کر کے بیان فرمایا' یہاں تک کہ ہم نے اس کی بابت گمان کیا کہ وہ یہاں کھجوروں کے جھنڈ میں ہی موجود ہے۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دجال کے علاوہ اور چیزوں سے مجھے تمہاری بابت زیادہ شدید اندیشہ ہے' اگر دجال میری موجودگی میں نکلا تو تمہاری جگہ میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ اور اگر میری زندگی کے بعد نکلا تو ہر آدمی خود اپنے نفس کا دفاع کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پر میرا جانشین ہے (میرے بجائے اللہ نگران ہے۔) وہ دجال نوجوان اور گھنگھریالے بالوں والا ہو گا۔ اس کی ایک آنکھ (انگور کی طرح) ابھری ہوئی ہو گی۔ گویا کہ میں اسے عبدالعزیٰ بن قطن سے تشبیہ دیتا ہوں۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اسے پالے' اسے چاہیے کہ وہ اس پر سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے۔ وہ شام اور عراق کے درمیانی راستے پر ظاہر ہو گا اور دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔ اے اللہ کے بندو! (اس وقت) ثابت قدم رہنا۔"

ہم نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! اس کا زمین میں کتنا قیام ہو گا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"چالیس دن۔ ایک دن ایک سال کے برابر' ایک دن ایک مہینے کے برابر اور ایک دن جمعے کے برابر ہو گا اور اس کے باقی دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے۔"

ہم نے کہا "اے اللہ کے رسول! وہ دن جو سال کے برابر ہو گا' کیا اس میں ہمیں ایک دن کی (پانچ) نمازیں کافی ہوں گی؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نہیں ہم اس کا اندازہ کر کر کے پڑھنا۔"

ہم نے پوچھا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! زمین میں اس کی تیز رفتاری کا کیا حال ہو گا؟"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بارش کی طرح' جس کو ہوا پیچھے کی طرف سے دھکیل رہی ہو۔ (یہ کنایہ ہے تیزی کے ساتھ فساد پھیلانے سے۔) وہ لوگوں کے پاس آئے گا اور انہیں دعوت دے گا۔ چنانچہ وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اور اس کے حکم کو مانیں گے۔ پھر وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ بارش برسائے گا اور زمین کو حکم دے گا تو وہ نباتات اگائے گی۔ چنانچہ ان کے چرنے والے جانور جب شام کو ان کے پاس لوٹیں گے تو ان کے کوہان پہلے سے کہیں زیادہ لمبے ہوں گے' ان کے تھن کامل طور پر بھرے ہوں

گے اور ان کی کوکھیں زیادہ کشادہ ہوں گی۔ پھر وہ کچھ اور لوگوں کے پاس آئے گا اور انہیں اپنے ماننے کی دعوت دے گا۔ وہ اس کی بات کو رد کر دیں گے۔ پس وہ ان سے لوٹے گا تو وہ قحط سالی کا شکار ہو جائیں گے۔ ان کے مالوں (ڈنگروں) میں سے ان کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اور وہ کسی ویرانے سے گزرے گا تو اس سے کہے گا: اپنے خزانے نکال دے۔ تو اس زمین کے خزانے شہد کی سردار مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔ پھر وہ ایک بھرپور جوان کو بلائے گا اور اس پر تلوار سے وار کرے گا' جو اسے دو ٹکڑے کر دے گا' جیسے نشانے پر تیر مارا جاتا ہے۔ پھر اسے بلائے گا تو وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ چمک رہا ہو گا اور وہ ہنس رہا ہو گا۔

پس دجال اسی حالت میں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم عیسیٰ علیہ السلام کو زمین میں بھیج دے گا۔ چنانچہ وہ آسمان سے دمشق کی مشرقی جانب سفید مینار پر زرد رنگ کا جوڑا پہنے ہوئے' اپنی ہتھیلیاں دو فرشتوں کے پروں (بازوؤں) پر رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو پانی کے قطرے گریں گے اور جب اپنا سر اٹھائیں گے تب بھی موتی کی طرح چاندی کی بوندیں گریں گی۔ جس کافر کو بھی آپ کے سانس کی بھاپ پہنچے گی وہ مر جائے گا۔ اور آپ کا سانس آپ کی حد نظر تک پہنچے گا۔ چنانچہ آپ دجال کو تلاش کریں گے یہاں تک کہ اسے باب لد کے پاس پالیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام ایسے لوگوں کے پاس آئیں گے جن کو اللہ نے اس دجال کے فتنے سے محفوظ رکھا ہو گا۔ حضرت عیسیٰ ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور انہیں ان درجات کی خوش خبری دیں گے جو ان کو جنت میں ملیں گے۔

پس وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائے گا کہ

میں نے اپنے کچھ بندے ایسے نکالے ہیں جن سے لڑنے کی کسی میں طاقت نہیں۔ چنانچہ تو میرے بندوں کو کوہ طور پر لے جا کر ان کی حفاظت فرما اور اللہ تعالیٰ یاجوج اور ماجوج کو بھیجے گا اور وہ ہر بلندی سے پستی کی طرف تیزی سے دوڑیں گے۔ ان کا پہلا ٹولہ بحیرہ طبریہ سے گزرے گا اور اس کا سارا پانی پی جائے گا۔ اور اس کا آخری ٹولہ وہاں سے گزرے گا تو وہ کہے گا کہ یہاں کبھی پانی ہوتا تھا۔ (اس عرصے میں) اللہ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی گھرے ہوئے رہیں گے یہاں تک کہ ان میں ہر ایک کو بیل کی ایک سری تمہارے آج کے سو دینار سے بہتر معلوم ہو گی۔ پس اللہ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی' اللہ ان سے راضی ہو' اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا کر دے گا جس سے وہ دفعتاً" ایک جان کی طرح مر جائیں گے۔

پھر اللہ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم زمین پر اتریں گے اور وہ زمین میں ایک بالشت جگہ بھی ایسی نہیں پائیں گے جو ان کی (لاشوں کی) گندگی (سڑاند) اور سخت بدبو سے خالی ہو۔ لہٰذا اللہ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم پھر اللہ کی طرف (دعا کے لیے) متوجہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ایسے بڑے پرندے بھیجے گا جیسے بختی اونٹوں کی گردنیں ہوتی ہیں۔ وہ پرندے ان کی لاشوں کو اٹھائیں گے اور جہاں اللہ کو منظور ہو گا' وہاں پھینک دیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ ایسی بارش نازل فرمائے گا جس سے کوئی گھر اور خیمہ محفوظ نہیں رہے گا (سب کو پہنچے گی۔) چنانچہ وہ ساری زمین کو دھو دے گی' حتیٰ کہ اسے چکنی چٹان یا آئینے کی طرح صاف کر کے چھوڑے گی۔

پھر زمین سے کہا جائے گا: اپنے پھل اگا اور اپنی برکت پھیر لا۔ پس اس وقت ایک انار کو ایک جماعت کھائے گی اور اس کے چھلکے سے سایہ حاصل کرے گی۔ اور دودھ میں اتنی برکت ڈال دی جائے گی کہ ایک دودھ دینے والی اونٹنی لوگوں کی ایک جماعت کو

کافی ہو گی اور ایک دودھ دینے والی گائے لوگوں کے ایک قبیلے کو کافی ہو گی اور دودھ دینے والی ایک بکری لوگوں میں سے ایک گھرانے کو کافی ہو گی۔

پس وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا بھیجے گا جو ان مسلمانوں کو ان کی بغلوں کے نیچے سے لگے گی، پس وہ ہر مومن اور مسلمان کی روح قبض کرلے گی۔ (اس کے بعد) صرف بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے جو اس زمین پر گدھوں کی طرح اعلانیہ لوگوں کے سامنے عورتوں سے جماع کریں گے۔ لہٰذا ان ہی لوگوں پر قیامت قائم ہو گی۔" (مسلم)

فائدہ : اس میں علامات قیامت، خروج دجال، نزول عیسیٰ ابن مریم، یاجوج وماجوج کا ظہور اور ان کے مابین ہونے والے اہم واقعات کا تذکرہ ہے، دجال کی فتنہ انگیزی، یاجوج وماجوج کی حشر سامانی اور حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کے ہاتھوں اور دعاؤں سے ان کے خاتمے کا بیان ہے۔

دجال

حضرت ربعی بن حراش بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا:

"آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دجال کی بابت جو سنا ہے وہ میرے سامنے بیان فرمائیں۔"

انہوں نے کہا (کہ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا)

"بے شک دجال نکلے گا اور اس کے ساتھ پانی اور آگ ہو گی۔ لوگ جس کو پانی خیال کریں گے، وہ جلانے والی آگ ہو گی اور جس کو لوگ آگ سمجھیں گے، وہ میٹھا، ٹھنڈا پانی ہو گا۔ چنانچہ تم میں سے جو شخص اس دجال کو پالے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس میں گرے جس کو وہ آگ خیال کرے، اس لیے کہ وہ میٹھا عمدہ پانی ہو گا۔"

تو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں نے بھی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔" (بخاری و مسلم)

مدّت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری امّت میں دجال نکلے گا اور وہ چالیس تک رہے گا۔ میں نہیں جانتا، چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال۔ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا، وہ اسے تلاش کر کے ہلاک کردیں گے۔ پھر لوگ سات سال تک اسی طرح رہیں گے کہ دو شخصوں کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہو گی۔ پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ٹھنڈی ہوا بھیجے گا، پس روئے زمین پر جو شخص بھی ایسا ہو گا کہ اس کے دل میں ذرہ برابر بھلائی یا ایمان ہو گا، وہ ہوا اس کی روح قبض کرلے گی، حتیٰ کہ کوئی آدمی اگر پہاڑ کے درمیان میں بھی گھسا ہوا ہو گا تو ہوا وہاں پہنچے گی اور اس کی روح قبض کرلے گی۔ پھر بدترین لوگ ہی باقی رہ جائیں گے جن میں (شر انگیزی اور قضائے شہوت کے اعتبار سے) پرندوں کی سی پھرتی (اور ایک دوسرے کے تعاقب اور خوں ریزی میں) خوں خوار جانوروں کی سی درندگی ہو گی۔ وہ نہ کسی نیکی کو نیکی سمجھیں گے اور نہ کسی برائی کو برائی۔ چنانچہ شیطان ان کے پاس انسانی شکل بنا کر آئے گا اور کہے گا۔

"کیا تم بات نہیں مانتے؟"

وہ کہیں گے "تو ہمیں کیا حکم دیتا ہے؟"

وہ انہیں بتوں کی پوجا کرنے کا حکم دے گا۔ (جس کی وہ تعمیل کریں گے۔) اس کے باوجود ان کو رزق کی فراوانی حاصل ہو گی اور ان کی زندگی آسائش و آرام سے گزر رہی ہو گی۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ جو بھی اس کی آواز سنے گا، اپنی گردن اس کی طرف جھکالے گا اور پھر اوپر اٹھائے گا اور سب سے پہلا شخص جو اس کی

آواز سنے گا' وہ اپنے اونٹوں کے حوض کی لپائی (درستی) کر رہا ہو گا۔

پس وہ (صور کی آواز سنتے ہی) بے ہوش ہو جائے گا اور اس کے ارد گرد کے لوگ بھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا یا (فرمایا:) نازل فرمائے گا گویا کہ وہ شبنم ہے (پھوار کی شکل میں بارش ہو گی) جس سے انسانی جسم (نباتات کی طرح) اگ آئیں گے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو وہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ پھر کہا جائے گا:

"اے لوگو! اپنے رب کی طرف چلو۔"

(فرشتوں کو حکم دیا جائے گا:) "ان کو ٹھہراؤ۔" ان سے باز پرس ہو گی۔ پھر کہا جائے گا:

"ان میں سے جہنمیوں کو نکال لو۔" چنانچہ پوچھا جائے گا: "کتنوں میں سے کتنے لوگ؟" ان کو بتلایا جائے گا:

"ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ پس یہ دن وہ ہو گا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور یہی وہ دن ہے جب پنڈلی کھولی جائے گی۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ اس میں پنڈلی کھولی جانے کا جو ذکر ہے' اس سے کیا مراد ہے؟ بعض نے اس سے قیامت کی سختیاں اور ہولناکیاں مراد لی ہیں لیکن ایک صحیح حدیث میں اس کی تفسیر اس طرح بیان ہوئی ہے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا (جس طرح کہ اس کی شان کے لائق ہے) تو تمام مومن مرد اور عورتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ البتہ وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جو دکھلاوے اور شہرت کے لیے سجدے کرتے تھے۔ وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن ان کی ریڑھ کی ہڈی کے منکے' تختے کی طرح ایک ہڈی بن جائیں گے جس کی وجہ سے ان کے لیے جھکنا ناممکن ہو جائے گا۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی یہ پنڈلی کس طرح کی ہو گی؟ اسے وہ کس طرح کھولے گا؟ اس کیفیت کو ہم جان سکتے ہیں نہ بیان کر سکتے ہیں۔ اس لیے جس طرح ہم بلا کیف و بلا تشبیہ اس کی آنکھوں' کان' ہاتھ وغیرہ پر ایمان رکھتے ہیں' اسی طرح پنڈلی کا ذکر بھی قرآن و حدیث میں ہے جس پر بلا کیف ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یہی سلف اور محدثین کا مسلک ہے۔ (از تفسیر احسن البیان)

مدینہ کے علاوہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مکہ اور مدینہ کے علاوہ دجال ہر شہر کو روندے گا (اس میں داخل ہو گا۔) اور مکہ اور مدینہ کے پہاڑی راستوں میں سے ہر راستے پر فرشتے مقرر ہوں گے جو صفیں بنائے ان کی حفاظت کرتے ہوں گے۔ پس دجال (مدینے کے قریب) شور یلی زمین پر اترے گا تو مدینہ تین مرتبہ زلزلوں سے لرز اٹھے گا۔ اللہ تعالیٰ مدینے سے ہر کافر اور منافق کو باہر نکال دے گا۔" (مسلم)

یہودی

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اصفہان کے ستر ہزار یہودی دجال کے پیچھے لگیں گے (پیروی کریں گے) جن کے جسموں پر سبز رنگ کی چادریں ہوں گی۔" (مسلم)

فائدہ : اصفہان' فارس (موجودہ ایران) کا ایک شہر ہے۔ طیلسان (سبز رنگ کی چادر) عجم کے مشائخ کا عام لباس ہے۔

پہاڑوں میں پناہ

حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"لوگ دجال کے خوف سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا پناہ لیں گے۔" (مسلم)

خطرناک فتنہ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"حضرت آدم کی پیدائش سے قیامت کے برپا ہونے تک دجال (کے فتنے) سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں۔" (مسلم)

دجال کا خراج

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دجال کا خروج ہو گا تو مومنوں میں سے ایک آدمی اس کی طرف جائے گا' چنانچہ اسے دجال کے ہتھیار بند پہرے دار ملیں گے۔ وہ اس سے پوچھیں گے "تیرا کہاں کا ارادہ ہے؟"

تو وہ کہے گا: "میرا اس شخص کے پاس جانے کا ارادہ ہے جو نکلا ہے۔"

وہ اس کو کہیں گے۔ "کیا تو ہمارے رب پر ایمان نہیں لاتا؟"

تو وہ کہے گا۔ "ہمارے رب میں تو کوئی پوشیدگی نہیں" (کہ ہم کسی اور کو رب بنائیں اور مانیں۔)

پس وہ کہیں گے: "اسے قتل کر دو۔"

تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے: کیا تمہارے رب نے تمہیں اس بات سے منع نہیں کیا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل نہ کرنا؟"

پس وہ اس مومن کو دجال کے پاس لے جائیں گے۔ جب مومن دجال کو دیکھے گا تو کہے گا:

"اے لوگو! یہی وہ دجال ہے جس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ تو دجال حکم دے گا کہ اس کو پیٹ کے بل لٹایا جائے اور کہے گا "اسے پکڑو اور اس کے سر اور چہرے پر ضربیں لگاؤ۔

چنانچہ زدو کوب سے اس کی پشت اور پیٹ کو کشادہ کر دیا جائے گا۔ پھر دجال پوچھے گا:

"کیا تو مجھ پر ایمان لاتا ہے؟"

وہ کہے گا: "تو تو مسیح کذاب ہے۔ پس اس کی بابت حکم دیا جائے گا تو آرے سے اس کے سر کے درمیان سے اس کو چیر دیا جائے گا حتی کہ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے (دو) الگ الگ (ٹکڑے) کر دیا جائے گا۔ پھر دجال اس کے دونوں ٹکڑوں کے درمیان چلے گا۔ پھر اسے کہے گا کھڑا ہو جا تو وہ مومن سیدھا کھڑا ہو جائے گا۔

دجال اس کو پھر کہے گا "کیا تو مجھ پر ایمان لاتا ہے؟"

وہ کہے گا: "تیرے بارے میں میرے یقین میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔" پھر کہے گا:

"اے لوگو! میرے بعد یہ کسی کے ساتھ بھی ایسا سلوک نہیں کر سکے گا۔"

پس دجال اس کو پکڑ کر ذبح کرنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن اور ہنسلی کے درمیانی حصے کو تانبا بنا دے گا۔ پھر دجال اس کو قتل کرنے کی کوئی سبیل نہیں پائے گا تو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کو پکڑ کر پھینک دے گا۔ لوگ سمجھیں گے اس نے اسے آگ میں پھینکا ہے۔ لیکن درحقیقت (انجام کے اعتبار سے) اسے جنت میں ڈال دیا گیا ہو گا۔"

جنت اور دوزخ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا میں تمہیں دجال کی بابت ایسی بات نہ بتلاؤں جو کسی نبی نے اپنی امت کو نہیں بتلائی! (اور وہ یہ ہے کہ) وہ کانا ہے۔ اور وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کے پاس جنت اور دوزخ جیسی چیز ہو گی۔ پس جس کو وہ جنت کہے گا' وہ دوزخ ہو گی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : یعنی جو شخص اس کی شعبدہ بازیوں سے متاثر ہو کر اس کا پیروکار بن جائے گا' وہ درحقیقت جہنم میں جانے کا مستحق ہو گا۔

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔
غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی، نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا، طعنے تشنے ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ، ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ن-ق.... کنجاہ ضلع گجرات

240 مہینوں کی اس طویل رفاقت میں ہمارا اور آپ کا ساتھ ایسا ہی رہا جیسے گرمیوں میں لان کے کپڑے اور سردیوں میں جرسیاں، ہاں اس ساتھ کی آنچ آپ تک نہیں پہنچی کہ ان بیس سالوں میں صرف دو خط لکھے اور ایک دفعہ "شعاع کے ساتھ ساتھ" میں اور دونوں شائع بھی ہوئے۔
اب جو یہ سلسلہ شروع ہوا تو مزید بند نہ باندھ سکے تو چلیے پھر شروع کرتے ہیں....
س۔ شادی کب ہوئی؟
شادی 14 اپریل 2006ء میں ہوئی جب میں فقط ساڑھے انیس سال کی تھی اور شادی کا احساس صرف کپڑوں، جوتوں کی خوشی تک محدود تھا بعد میں احساس ہوا ان اشیا کی قیمت ساری زندگی چکانی پڑتی ہے۔

س۔ شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں....؟
جی! شادی سے پہلے زندگی اپنے ہونے کا مکمل احساس دلاتی تھی۔ ایک حد تک آزادی۔ والد صاحب کی وسیع لائبریری سے خود بھی مکمل استفادہ کیا اور اساتذہ اور دوستوں کو بھی خوب کروایا، جو کسر رہ گئی وہ کالج لائبریری اور نزدیکی بک شاپ سے پوری کی۔ اس کے علاوہ موویز، کرکٹ اور فیشن کی دلدادہ تھی۔ بارش سے، دھنک سے، کتابوں سے، رنگوں سے عشق تھا۔ خواتین، شعاع کے لیے مسلسل دو گھنٹے درکار ہوتے صرف۔ جو کتاب شروع کی، وہ سونے سے پہلے ختم کرنا لازمی ہوتا۔
"میرا بچپن، میرے جگنو، میری گڑیا لادو۔"
میرے والد صاحب نے ہم بہنوں میں ادبی ذوق پروان چڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہم نے بچپن میں ہی اپنی علیحدہ چھوٹی سی لائبریری بنائی تھی۔

س۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

یہاں میرے والدین ان تمام والدین کے لیے مثال ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو دنیاداری پر ترجیح دی۔ انہوں نے ہماری خاطر اپنے رشتہ داروں کو ناراض کر دیا کہ مجھے اپنی بیٹیاں عزیز ہیں باقی جو ان کے نصیب۔ میری دفعہ ہی نہیں میری سب بہنوں کی دفعہ والد صاحب نے امی سے کہا تھا کہ میں اپنی بیٹیوں پر اپنے فیصلے مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے ہم سب بہنوں نے اپنے اپنے مستقبل کے "میاؤں" کو ایک نظر دیکھا ہوا تھا۔ اپنی دفعہ بھی میں نے "ان" کو ایک نظر دیکھا تھا، لیکن فیصلے کا اختیار والدین کو ہی دیا کہ جو آپ کو بہتر لگے کرلیں۔

س۔ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ہک ہا! کیا دل کے تار چھیڑ دیے ہیں۔ بھئی میں ٹھہری "فرحت آپا" کی دیوانی اور ان کے ہیروز تو ویسے بھی کسی "سپیشل فیکٹری" میں بنتے ہیں۔ اس لیے ان کی کہانیاں پڑھ کر ہمارے دل میں بھی خیال آیا کہ "میاں" ہو تو ایسا جو کڑی دھوپ میں سایہ بن جائے اور عزت کا ساجھے دار ہو' میرا مان رکھے سب کے سامنے اور "اور۔۔۔

بس تو بس پھر کچھ ملا اور کچھ نہیں اور جو ملا وہ بہت سوں سے بہتر ہے۔ شکر ہے پیدا کرنے والے کا جو کسی کو مایوس اور ناکام نہیں لوٹاتا۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی' شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟

منگنی 24 فروری کو ہوئی اور اسی سال 14 اپریل کو شادی ہوئی تو اتنے عرصے میں تو تیاری بہت مشکل سے پوری ہوئی' باقی رہ گئی فون پر بات تو ایک دفعہ غلطی سے ریسیو کرلیا اور پھر میں نے جب آواز سنی تو بند کر دیا فوراً" ہی۔

س۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟

خیالات پر کب کسی کا بس چلتا ہے۔ منگنی سے لے کر نکاح ہونے تک آنکھوں نے بہت سے خواب بن لیے اور جب یہ خواب ٹوٹے تو یہ کرچیاں سات سال تک آنکھوں میں چبھتی رہیں۔ خود کو سمیٹنے میں بہت عرصہ لگا۔ خیال تھا کہ قدر کریں گے۔۔۔ کہتے تھے کہ "پڑھی لکھی شہری بہو" لے کر جا رہے ہیں ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اتنی نازک ہے۔ ہمارے گھر کے کام ہم خود کرلیا کریں گے" اور بعد میں سب بھول گئے یاد رہا تو بس اتنا کہ یہ "بہو" ہے اور بہوویں بس کام کے لیے ہوتی ہیں۔ یہاں ایک بات کا ذکر ضرور کرنا چاہتی ہوں۔ میری ساس نے کہا تھا۔ "ہمیں جہیز نہیں چاہیے۔" اور انہوں نے واقعی میں کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

س۔ شادی کے لیے آپ کو تعلیم کی قربانی دینا پڑی؟ یا کوئی اور۔۔۔؟

نہیں کوئی خاص نہیں تعلیم کا سلسلہ تو ویسے ہی منقطع کر چکی تھی اور اپنی ہی باری تھی سو۔۔۔

س۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟

نہیں۔ ایسی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی نہ ان کی طرف سے کوئی مطالبہ ہوا نہ کوئی ہماری طرف سے۔ اس لیے سب کچھ خیر خیریت سے ہوگیا۔

شادی کے بعد

س۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کے کیا کہا؟

شادی کے بعد "شوہر صاحب" نے سلام کیا اور کہا کہ میں نے "امی" سے بولا تھا کہ تمہیں "منہ دکھائی" دے دیں۔ لو جی ٹکی گل۔

شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟
شادی کے بعد "تبدیلیاں" تو لازمی آتی ہیں' لیکن میری زندگی میں تو "انقلابات" آئے۔ ہم نے تو کبھی اپنے کپڑے تک نہیں دھوئے تھے بلکہ ابھی بھی میکے آئیں تو امی ہی دھوتی ہیں۔ جبکہ یہاں سارا سارا دن کام کرکے تنقید کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ ہمارے گھر میں تو "والد صاحب" کے علاوہ کوئی "مرد نما" چیز نہیں تھی اور وہ بھی انتہائی بے ضرر۔ امی کے گھر میں والد صاحب جب بھی گھر پہ ہوتے امی کے اور ہمارے مکمل مددگار' جب کہ یہاں سسرال میں ماشاء اللہ چار جوان بھائی' دو بہنیں' سسر' ساس' چچا سسر اور پھر گاؤں کا ماحول ہونے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی موجود ہوتا۔ طنزیہ نگاہیں۔ طنزیہ باتیں۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف وہ بات جو لگتی' وہ گھر کے مردوں کا گھر کے ہر معاملے میں بلاوجہ بولنا اور بے تکا بولنا اور میں تو اس بات پہ حیران ہوتی کہ "مرد" عورتوں (جن میں ماں' بہن اور بھابھی یعنی میں) کو گالیاں بھی دیتے ہیں۔ اُف! اور گفتگو کا انداز اور لہجہ۔ لگائی بجھائی کی عادت۔ بہت بُرا ماحول تھا۔ میں تو بس حیران ہوتی رہتی۔ زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی کھلے جس کی زد سے میں بھی بچ نہیں پائی۔ اندازہ کیجیے کہ جس ماحول میں ماں اور بیٹیاں چھ چھ ماہ اپنی ماں سے بات نہ کریں وہاں میری جگہ کیا ہوگی۔ گالی گلوچ' ہاتھاپائی۔ کہ توبہ ہی بھلی۔

س: "شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟" یہ کھیر پکوائی جیسی رسمیں کیا صرف کہانیوں میں ہی ہوتی ہیں؟

بہوؤں کے لاڈ' نخرے کون اٹھاتا ہے؟ پانچویں دن ناشتا نہ بنانے کے شور سے جو ناشتا بنانے کی ذمہ داری سنبھالی تو ہی شور ختم ہوا۔ اپلوں اور لکڑیوں کی آگ جلنے ہی میں نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں آنکھوں میں پانی دھوئیں سے آرہا تھا یا بے بسی سے؟ پراٹھے ایسے بنے جیسے سیمنٹ کے ہوتے ہیں۔ امی کے گھر کے مزے کہاں۔ پندرہ پراٹھے ڈیڑھ' دو گھنٹے میں بنا کے اٹھی تو کمر تختہ ہو چکی تھی۔

س۔ کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟

بہت زیادہ مختلف' یہاں پر کھانے میں قدرتی طور پر "باربی کیو" کی مہک رچی بسی تھی جس کے ذائقے سے آشنا ہونے میں بہت عرصہ لگا' یہاں ہر چیز' ہر سبزی میں "آلو" جبکہ امی کے گھر آلو بہت کم استعمال ہوتے تھے۔ چکن کا استعمال زیادہ ہوتا تھا اور کھانا وقت پہ۔ جبکہ وہاں اگر کھانا وقت پہ پکا بھی دیتی تب بھی دوپہر کے تین' چار اور رات کے دس ضرور بج جاتے۔ یہاں ایک اور بات تھی کہ کھانا پکاؤ بھی اور سب کو دس' دس دفعہ کہو

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔
3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خطوط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

کہ کھانا کھالیں تب بھی مرضی سے کھانا ہوتا۔۔۔ اور کھانا پسند نہ آنے کی صورت میں۔۔۔ امی کے گھر توے کی روٹی اور جبکہ یہاں تنور کی روٹی پسند کی جاتی جو میں نے ہزار دفعہ اپنا بازو جلانے کے بعد سیکھی۔۔۔ اتنے فرق تھے کہ ان فرقوں کو جتنا بھی مٹاتی' یہ اور زیادہ ہوتے۔

س۔ میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟

میرا خیال ہے اس سوال کا جواب اگر پچھلے تمام سوالوں کے جوابات کو جمع کیا جائے تو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتنا فرق ہو سکتا ہے۔ اتنا ہوا کہ رنگوں' بارشوں' خوب صورتی' دھنک چاندنی اور شاعری سے محبت کرنے والی لڑکی مرگئی۔۔۔ بہت کوشش کی بے حس بن جاؤں' اندھی' گونگی اور بہری ہو جاؤں پر نہ ہو سکی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ایک قلعہ ہوں جسے سب فتح کرنا چاہتے ہیں' اس پہ اپنے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں اور اس میں سب نے بھرپور کردار ادا کیا۔۔۔ ٹھوکریں کھاتی' روتی اور گول ہوتی رہی جانے عورت ہی عورت کی دشمن کیوں ہے؟

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی اور کب تعریف ہوئی؟

ہوں تنقید! کن باتوں پر نہیں ہوئی۔۔۔ اٹھنے' بیٹھنے' سونے' جاگنے اور سب سے زیادہ شہری اور پڑھا لکھا ہونے پر ہوئی اور سات سال بعد جب میری ساس کو میری روٹی پسند آئی' میرے کھانے پر تنقید ختم ہوئی' میری اس بات پر تعریف شروع ہوئی کہ پڑھی لکھی اور شہری ہونے کے باوجود "ن" نے خود کو اس ماحول میں بہت جلدی ڈھال لیا' جب میری ساس کو میری وفاداری اور محبت پر یقین آنے لگا تب ان کی وفات ہو گئی تب میں دوسری بار "امید" سے تھی۔ ان کی وفات کے بعد مجھے یہ احساس شدت سے ہوا کہ بہت سے معاملات میں میرے لیے وہ ڈھال تھیں' جب میں نے ان کی سختی کو ہی اپنے لیے محبت سمجھ لیا تب وہ مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔ ان کے بعد مشکلات کا مزید پہاڑ کھڑا تھا۔ پریگننسی کے باوجود بہت کچھ برداشت کرنا پڑا۔ اور ٹھیک ایک سال بعد اچانک ہی سسر کی وفات سے گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ تب میں تیسری دفعہ "امید" سے تھی اور بڑی بہو بھی۔۔۔ ٹوٹ پھوٹ کا عمل تو جو تھا سو تھا۔۔۔ دنیاداری نبھانی بہت مشکل تھی۔ اگر "ق" (شوہر) کا ساتھ نہ ہوتا تو۔۔۔ میں مزید ایک قدم بھی نہ چل پاتی۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ "ق" کا اصل روپ بہت دیر بعد سامنے آیا' بے شک وہ بھائیوں کو کچھ نہیں کہتے تھے میری وجہ سے' لیکن ان کو چھ سال بعد ہی سہی میرا خیال آگیا اور انہوں نے صرف میری خوشی کا احساس کرتے ہوئے بھائی کی شادی کر کے مجھے علیحدہ کر دیا اور یوں میری زندگی کا نیا آغاز ہوا۔ جس میں میری بیٹیاں اور میں تھی تب ق کی محبت اور احساس نے مجھے میرے ہونے کا احساس دلایا' میں زندگی کی طرف پلٹنے لگی اور یہاں میں ق کی بہت زیادہ شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اعتبار دیا' میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا' تیسری بیٹی کی پیدائش پر بی۔ اے۔ پھر بی۔ ایڈ اور اب ایم۔ اے پارٹ ٹو کے امتحانات دینے والی ہوں۔ اللہ کا بہت شکر ہے۔ جس نے اگر دکھ دیے تو سکھ بھی میری اوقات سے زیادہ دیا۔

"لمبی ہے غم کی شام' مگر شام ہی تو ہے۔"

س۔ سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟

سسرال والے "بڑی بہو" مان لیں تو ہی بڑی بات ہے' لیکن خیر دیر سے ہی سہی مقام ستر فیصد مل ہی گیا یعنی جتنا ملنا تھا' اس سے زیادہ کی اب توقع بھی نہیں۔ اب پہلی ترجیح اپنے بچے اور اپنا گھر ہے۔ دنیا بھی تو ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ جب جہاں کسی نے آواز دی' ضرور سنی کہ بڑی بہو ہوں۔ ساس والی ذمہ داریاں

بھی نبھانی ہیں۔ یہ الگ بات ہے، کبھی کسی نے یہ مانا نہیں۔ خیر ہے اللہ تو دیکھ رہا ہے۔

س۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

جب میں نے ان کا رہن سہن دیکھا تو آہستہ آہستہ توقعات ختم کردیں۔۔۔ کیا فائدہ توقعات وابستہ کرنے کا کچھ پوری ہوئیں کچھ سے زیادہ نہیں۔۔۔ چھوڑ دیا سب کچھ ہاں اپنے میاں صاحب کی خوشی کی خاطر سب کے ساتھ چلنے کے لیے تیار رہتی ہوں۔ وہ اپنے بھائیوں کو جو مرضی، جتنا مرضی خرچا دیں، کبھی منع نہیں کیا۔ کیوں کہ جب وہ میری ہر ضرورت پوری کرتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے بلاوجہ لڑائی جھگڑا کرنے کی۔

س۔ بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے "خصوصاً" پہلا بچہ۔۔۔؟

شادی کے تین ماہ بعد ہی ماں بننے کی "نوید" نے زندگی سے تمام بدصورتیوں کے احساس کو ختم کردیا اور یہ تمام بدصورتیاں اپنی شدتوں کے ساتھ چار ماہ بعد پھر وارد ہوگئیں جب یہ "خوشی" مجھ سے چھن گئی۔ کیا میں کسی کی کچھ نہیں لگتی تھی؟ اس رات درد سے لڑتے اور تڑپتے ہوئے اپنے مرجانے کی دعا کی۔ تب درد اپنی انتہا پر تھا اور میں اکیلی آٹھ نفوس کے درمیان جو کہ سکون سے سو رہے تھے۔ لوگ تو جانور کے کراہنے کی آواز سن کر بھی اٹھ جاتے ہیں۔ کیا میں اس حیثیت میں بھی نہیں تھی۔ اف وقت گزر گیا، لیکن اپنے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ دوسری دفعہ بھی ایسا ہوا۔ اللہ نے مجھے تین سال بعد پہلی بیٹی سے نوازا اور پورا پریگننسی پریڈ اپنی امی کے گھر گزارا۔۔۔ جب وقت آیا تو میری ساس نے حکم دیا۔ اب گھر آجاؤ۔۔۔ تب گھر چلی گئی۔ اللہ کا شکر ہے، وقت گزر ہی گیا۔

س۔ آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟

سوچا تو یہ تھا کہ ہمیں رشتے نہیں ملے تو میرے بچوں کو ضرور ملیں، لیکن جب حقیقت دیکھی تو یاد آیا کہ جب ہم چھوٹے تھے تو پھوپھو کے آنے پر امی چپکے چپکے کیوں روتی تھیں۔ جب خود پہ وقت آیا تو احساس ہوا امی کی کیفیت کا۔ مجھے تو علیحدہ رہنا پسند ہے اپنے بچوں کی تربیت کی خاطر۔ اب وہ ماحول نہیں رہا کہ اتنے خاندان اکٹھے رہیں، اب تو سب کو بس اپنا مفاد عزیز ہے تو اکٹھے رہ کر منہ بنانے سے بہتر ہے کہ ہنسی خوشی علیحدہ ہوجائیں۔

س۔ آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟

وہاں سوائے میرے چھوٹے دیور کے اور میری نند کے، وہ میری ہم عمر تھی۔ سب بڑے تھے مجھ سے کافی۔۔۔ تو کیا کہتی کیا کرتی۔ ہاں کبھی جب ساس یا بڑی نند کا موڈ ٹھیک ہوتا تو ان سے کہتی کہ خدارا بیٹیوں کو گالیاں مت دیا کریں، لیکن پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔ ہاں لباس کے سلسلے میں انہوں نے ضرور مجھے کاپی کیا۔۔۔ بس اس معاملے میں ہی کامیاب ہوئی۔ باقی ان سب نے کسی معاملے میں مجھے کاپی کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی میں اس بات میں کامیابی حاصل کرسکی۔ کبھی بھی میری ساس اور بڑی نند کا موڈ ٹھیک ہوتا تو آرام سے کہتی کہ بیٹیوں کو گالیاں مت دیا کریں، لیکن۔۔۔ پھر بھی خیر چھوڑیں۔ اللہ سب کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کرے اور سب کو آسانیاں پھیلانے کی توفیق عطا کرے (آمین)۔

اب اجازت دیجیے۔ بہت شکریہ۔

بندھن

نادیہ حسین ہمراہ عاطف حسین

شاہین رشید

اللہ تعالیٰ نے عورت کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے لیکن کچھ خواتین غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں اور ان ہی میں ایک نادیہ حسین ہیں، جو بیک وقت اداکارہ ماڈل ڈاکٹر ڈیزائنو بیوٹیشن ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں بھی ہیں۔ بندھن کے لیے اس بار ہمارا انتخاب نادیہ حسین ہیں۔

"کیسی ہیں نادیہ حسین؟"

"الحمدوللہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"بیک وقت اتنے سارے کام آپ کیسے کرلیتی ہیں؟"

"سب کام شوق کی وجہ سے ہوتے ہیں اور مجھے سب کام کرنے کا شوق ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر وقت ایکٹیو رہوں اور کچھ نہ کچھ کرتی رہوں۔"

"تھکتی نہیں ہیں آپ؟"

"کیوں نہیں... انسان ہوں مگر میں کبھی یہ نہیں کہتی کہ میں تھک گئی ہوں... کیونکہ... سارے کام تو میں اپنے شوق سے کرتی ہوں۔"

"بچپن سے ہی سوچا تھا کہ میں ورسٹائل شخصیت بنوں گی؟"

"ارے نہیں... ویسے بچپن کے بہت سے خواب ہوتے ہیں اور جو شخصیت اچھی لگ رہی ہوتی ہے، اسی کی طرح بننے کو دل چاہتا ہے۔ ہاں شوبز کی فیلڈ میں آنے کا تو میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔"

"تو پھر اچانک آمد کیسے ہوگئی؟"

"اچانک تو خیر نہیں ہوئی، سلسلہ کچھ ایسا بنتا گیا کہ میں اس طرف آگئی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ

میری خالہ ٹینا ثانی کتنی شہرت رکھتی ہیں اپنی گائیکی میں، تو ان کی وساطت سے معروف شخصیات سے ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن میری امی چونکہ ٹیچر تھیں تو ان کی ساری توجہ ہماری پڑھائی پہ تھی کہ بس اچھا اچھا پڑھنا ہے، تو جب میں "اے لیول" سے فارغ ہوئی تو میں خود بھی اسکول میں پڑھانے لگی۔ اتفاق دیکھیں کہ میری ایک دوست ان ہی دنوں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں "انٹرن شپ" کر رہی تھی۔

ایک دن میرے پاس آئی کہ ایک سلک ملز کو اپنے اشتہار کے لیے ایک ماڈل کی ضرورت ہے، تم گڈ لکنگ بھی ہو اور قد بھی لمبا ہے تو تم یقیناً "انہیں پسند آؤ گی اور بس میرا قد، میری شکل سب پسند آیا اور مجھے "لان" کا اشتہار مل گیا۔ اس طرح میری آمد ہوئی۔"

"کہتے ہیں کہ جب پیسہ ہاتھ آنے لگے تو پڑھائی کی طرف دھیان کم ہو جاتا ہے لڑکیوں کا؟ ایسا ہوا نہیں۔۔۔ وجہ؟"

"وجہ یہ کہ مجھے ہمیشہ سے ہی پڑھنے اور بہت اچھا گریڈ لانے کا شوق تھا۔ میں نے اے لیول سائنس میں کیا مجھے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ چنانچہ ماڈلنگ کے ساتھ ساتھ میں نے "بی ڈی ایس" میں داخلہ لے لیا۔ میں ڈینٹسٹ بننا چاہتی تھی اور میں نے اپنی ماڈلنگ کی مصروفیات کو کم کر کے اپنا "بی ڈی ایس" مکمل کیا۔"

"شادی ایک مشکل فیصلہ ہے، آپ کا اپنا تھا یا والدین کا اور پسند کس کی تھی؟"

"شادی کا فیصلہ تو والدین کا ہی تھا۔ البتہ پسند ہم دونوں کی تھی جو والدین کی رضامندی سے ہوئی۔"

"عاطف صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

"عاطف صاحب سے پہلی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی۔ کسی نے تعارف کرایا تو پتا چلا کہ یہ اسٹاک مارکیٹ میں اسٹاک بروکر ہیں، انہوں نے تعارف کے بعد اپنا کارڈ دیا اور یوں بات آئی گئی ہو گئی۔"

"پھر۔۔۔"

ہنستے ہوئے۔ "پھر کچھ عرصے کے بعد میرا دل چاہا، اسٹاک مارکیٹ میں کچھ انویسٹمنٹ کرنے کو، پھر اچانک عاطف صاحب کا خیال آیا، میں نے ان کا کارڈ نکالا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے بہت اچھے اچھے مشورے دیے اور پھر آہستہ آہستہ ہماری ایک دوسرے کے ساتھ دوستی بڑھتی گئی اور بات پسند پہ آ گئی۔"

"پہل تو عاطف صاحب نے ہی کی ہو گی، کتنا عرصہ لگا اس سارے پروسیجر میں؟"

"آپ کو پتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کتنی بھی ایڈوانس ہو جائے، کبھی خود سے اظہار محبت نہیں کرتی، یہ کام عاطف صاحب نے خود کیا اور تقریباً" تین چار ماہ ہماری بات چیت رہی اور پھر انہوں نے پرپوز کیا اور ہماری منگنی ہو گئی اور منگنی چھ ماہ رہی اور پھر شادی ہو گئی۔"

"پڑھائی کب مکمل ہوئی اور شادی کس ایئر میں ہوئی؟"

"پڑھائی میں میری ہاؤس جاب ہی باقی تھی جو کہ میں نے شادی کے بعد مکمل کی اور ہماری شادی دسمبر 2003ء میں ہوئی۔ ماشاء اللہ سے تقریباً" گیارہ سال ہو گئے ہیں۔"

"اور بچے؟"

"ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے اور ان کے نام "شاول" "شانزے" "شاشا" اور "شیر داد" ہے۔"

"یہ آپ نے ش کا پہاڑا پڑھا ہے؟"

قہقہہ۔۔۔ "بہت خوب۔۔۔ "ش کا پہاڑا" اصل میں عاطف نے "شاول" اور "شانزے" اپنی پسند سے رکھے تھے تو جب ہمارا تیسرا بچہ ہوا تو میں نے سوچا کہ اس کا نام بھی ش سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ پھر جو دو بچے ہمارے ہوئے ان کے نام بھی ہم نے "ش" سے ہی رکھ دیے۔"

"اور اگر ایک اور کی آمد ہو گئی تو؟"

"نہیں... نہیں... اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگیاں رکھے اور انہیں صحت و تندرستی دیے رکھے اور ہمیں اتنی توفیق دے کہ ہم ان کی اچھی تعلیم و تربیت کر سکیں۔"

"آپ کو عاطف نے متاثر کیا یا عاطف آپ سے متاثر ہوئے اور آپ ان کی کس بات سے متاثر ہوئیں؟"

"عاطف تو میری خوب صورتی' میری تعلیم اور میرے ٹیلنٹ سے بہت متاثر ہوئے اور میں ان کی نرم مزاجی اور دوسروں کا بہت زیادہ خیال رکھنے کی عادت سے متاثر ہوئی اور پھر ان کی اسمارٹنس سے بھی بہت متاثر ہوئی۔"

"اور لمبے قد سے متاثر نہیں ہوئیں؟"

"لمبے قد نے تو بہت متاثر کیا' کیونکہ میں خود ماشاء اللہ کافی لمبی ہوں اور ان کا قد بھی چھ فٹ چار انچ ہے تو سوچا کہ قد کے معاملے میں بھی یہ فٹ رہیں گے۔"

"شادی کے بعد عاطف صاحب کو کیسا پایا؟"

"بہت اچھا... بہت محبت کرنے والا اور بہت خیال رکھنے والا اور ماشاء اللہ گیارہ سال ہوگئے ہیں ہماری شادی کو اور ہم ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔"

"لڑائی زندگی کا حصہ ہے' آپ کی لڑائی ہوتی ہے؟"

"جو چیز زندگی کا حصہ ہوتی ہے' وہ ضرور ہوتی ہے اور کوئی گھر ایسا نہیں کہ جہاں لڑائی نہ ہوتی ہو تو معمولی باتوں پہ جھگڑا ہمارے درمیان بھی ہوتا ہے مگر ہمارا جھگڑا روایتی میاں بیوی والا نہیں ہوتا' بلکہ بچوں کے معاملے اور ان کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ہوتا ہے جو کہ بہت معمولی اور پوزیٹو ہوتا ہے۔ اسے میں بحث کا نام دوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"شادی کے بعد میاں بیوی ایک چھوٹے سے ٹرپ پہ کہیں ضرور جاتے ہیں جسے ہم "ہنی مون" کا نام دیتے ہیں تو یہ ضروری ہوتا ہے؟"

"ضروری تو نہیں ہوتا خیر... بس اچھا لگتا ہے' کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ ہنی مون کے بعد ہی اصل شادی شدہ زندگی شروع ہوتی ہے تو ایک چھوٹا سا پریڈ مل جاتا ہے' لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا' انڈر اسٹینڈنگ ہونے کا۔ بس پھر واپس آ کر تو سب اپنی اپنی زندگی میں اپنی اپنی ذمہ داریوں میں مصروف ہوجاتے ہیں۔"

"اور پھر میاں بیوی دونوں ہی ورکنگ کلاس سے ہوں تو پھر ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں' تو خیر... سسرال والوں نے یہ تو نہیں کہا کہ اب آپ گھر بیٹھیں اور بچے پالیں؟"

"نہیں... ایسا تو کچھ نہیں کہا' کیونکہ بی ڈی ایس کر رہی تھی اور ہاؤس جاب کرنی بہت ضروری تھی تو کوئی بھلا کیسے منع کر سکتا تھا۔ ہاؤس جاب کے دوران ہی ماڈلنگ کی آفر ہوگئی تو وہ بھی کرلی اور میرے سسرال والوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں شوبز میں بھی ہوں۔ خیر پھر جب میرا بیٹا ہوا تو میں نے کچھ عرصے کے لیے شوبز کو خیرباد کہہ دیا۔ گھر میں رہنے سے اور بیٹے کی پرورش کے دوران میں بھی سسرال والوں کے مزاج سے آشنا ہوگئی اور سسرال والے بھی میرے مزاج سے واقف ہوگئے اور پھر مجھے شوبز میں اپنا ہنر دکھانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔"

"آپ کا کام ایسا ہے کہ گھر آنے میں دیر بھی ہوجاتی ہوگی' تو کبھی سسرال والے یا کبھی میاں صاحب ناراض ہوئے؟"

"سسرال والے تو کچھ نہیں کہتے' کیونکہ عاطف انہیں سمجھا دیتے ہیں' پھر میں بھی فون کرتی رہتی ہوں' بچوں کی خیریت معلوم کرتی رہتی ہوں۔ البتہ جب گھر آتی ہوں تو عاطف ضرور تھوڑا ناراض ہوتے ہیں کہ اتنی دیر مت لگایا کرو۔ وہ میری مجبوریوں کو سمجھتے ہیں' اس لیے زیادہ کچھ نہیں کہتے۔"

"سسرالی رشتوں میں ساس کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے تعلقات ہیں ماشاء اللہ اور میں سمجھتی

ہوں کہ گھر میں بزرگوں کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے' جب ہم دونوں گھر پر نہیں ہوتے تو میری ساس گھر پر ہوتی ہیں اور ان کے گھر پر ہونے سے مجھے بچوں کی بالکل بھی فکر نہیں ہوتی' بچے بھی اپنی دادی کے بہت قریب ہیں۔"

"کبھی ایسا تو نہیں کہا کہ گھر بیٹھو' بچے پالو؟"

"ارے نہیں' ایسا کچھ نہیں کہا کسی نے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر میرے میاں کا اور سسرال والوں کا تعاون نہ ہوتا تو میں اس فیلڈ میں اتنا کچھ نہ کرپاتی۔"

"آپ کے میاں صاحب آپ کے کام کی تعریف کرتے ہیں؟"

ہنستے ہوئے... "اب ان باتوں کے لیے ان کے پاس ٹائم نہیں ہے۔ میں ہی بول بول کر تعریفیں کرواتی ہوں۔"

"شاپنگ اکیلے اکیلے ہوتی ہے یا دونوں ایک ساتھ جاتے ہیں؟"

"پہلے تو ہم دونوں ایک ساتھ جایا کرتے تھے' ایک دوسرے کی پسند سے شاپنگ کرتے تھے مگر جب میری مصروفیات بڑھ گئیں اور ان کی بھی تو پھر الگ الگ شاپنگ ہونے لگی۔ مصروفیات جو بڑھ گئیں۔"

"اتنی مصروفیات میں دونوں ایک دوسرے کو وقت دے پاتے ہیں؟"

"کیوں نہیں' ہم دونوں ایک دوسرے کے لائف پارٹنر ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال بھی رکھتے ہیں اور تین چار بار دن میں ایک دوسرے سے بات بھی کرتے ہیں۔"

"اور بچوں کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"

"ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہم دونوں بچوں کو بھرپور ٹائم دیں' میں جب گھر آتی ہوں تو میرا سارا وقت بچوں کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔ اس طرح عاطف بھی جب گھر پہ ہوتے ہیں تو بچوں کے ساتھ ہی اپنا وقت گزارتے ہیں۔"

"پھر تو چھٹی کا دن بھی بچوں کے ساتھ ہی گزرتا ہوگا؟"

"جی جی... بالکل... ہم دونوں چھٹی کا دن گھر سے باہر ہی گزارتے ہیں اور ڈنر بھی کرتے ہیں اور اگر یہ مصروف ہوں تو پھر خود ہی بچوں کو لے کر نکل جاتی ہوں۔"

"آپ دونوں مزاج کے کیسے ہیں؟"

"الحمدوللہ دھیمے مزاج کے ہی ہیں۔ مجھے غصہ ذرا کم ہی آتا ہے' کافی تحمل مزاج ہوں اور عاطف کو بھی بہت کم غصہ آتا ہے۔"

"آپ دونوں کا پسندیدہ لباس کون سا ہے؟"

"انہیں جینز اور شرٹ پسند ہے اور مجھے ہر طرح کے ایزی لباس پسند ہیں اور مجھے ذرا شوخ کے رنگ کے لباس پسند ہیں اور یہ بھی مجھے شوخ کے رنگ کے لباس میں ہی پسند کرتے ہیں۔"

"ہمارے پڑھنے والوں کو جن کی ابھی کم عرصہ ہوا شادی ہوئی یا جن کی شادی ہونی ہے' کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"بالکل کہنا چاہوں گی کہ خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے کیا ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہوں گی کہ میاں بیوی کہنے کو ایک ہوتے ہیں مگر دونوں کی اپنی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی خوبیوں کی تعریف کریں اور خامیوں کو نظرانداز کریں۔ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کریں اور ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ اپنی مصروفیات ایک دوسرے کے گوش گزار کریں مگر اتنا بھی نہیں کہ دوسرے کو بوریت ہونے لگے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نادیہ حسین سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت اور سلامتی کی بہترین حالت میں رکھے۔ (آمین)

پہلا خط کراچی سے عائشہ رباب کا ہے، لکھتی ہیں

"پیارے نبی کی پیاری باتوں" سے زندان حیات کو منور کرتے ہوئے علم کی تشنگی کو سیراب کیا۔ "بندھن" میں عمرانہ مقصود سے تفصیلی گفتگو نہایت دلچسپ لگی۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" اگرچہ میں ابھی اس سلسلے میں شرکت کرنے سے قاصر ہوں، پھر بھی مجھے بہت پسند ہے۔ "دنیا سے شکووں سے کچھ نہیں ملتا اپنے رب سے مانگیں۔" یہ جملہ نہایت اثر انگیز لگا۔ "شعاع کے ساتھ" حرا قریشی کے جوابات نہایت فصاحت وبلاغت لیے ہوئے تھے۔ "رقص بسمل" رفتار کے باعث سارا چارم ختم ہوچکا ہے۔ "جام آرزو" کہانی اچھی لگی۔ "وہی راستہ، وہی منزل میری" بہت فلمی سی لگی۔ "سیاہ حاشیہ" کہانی اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ "میں اور تم" خاصی اچھی لگی۔ "دل کے بھید" کیا کہوں اس بارے میں۔ شعاع کا یہ معیار نہیں ہے۔ مائرہ کے لیے عائزہ کی سازش.... اف.... ایک بے آموز اور گمراہ کردینے والی کہانی لگی۔ "دینار" اتنی معصوم، اتنی اچھی اور حساس دل رکھنے والی لڑکی کا یہ انجام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کی ماں اتنی پاور فل تھی۔ اسے کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ "تو میرا ہیرو" آج کل کی لڑکیاں "محبتوں کا آشیانہ" تینوں افسانے بہت اچھے لگے۔ "ایک آرزو" علامہ اقبال کی شاعری اس قدر لاجواب ہوتی ہے کہ کیا کہنے۔ اس بار کی "مسکراہٹیں" بالکل بھی اچھی نہیں تھیں۔ "تاریخ کے جھروکے" اس بار بھی بہترین تھا۔

ج ۔ پیاری عائشہ! بہت شکریہ.... آپ نے اتنی تفصیل سے اتنا عمدہ تبصرہ کیا، دل خوش ہوگیا، جیتی رہیں، خوش رہیں۔ حرا قریشی ہی شمیم آرا ہیں یہ ہم نہیں جانتے وہ خود ہی بتا سکتی ہیں۔ دینار کے انجام پر ہمیں بھی دکھ ہوا تھا۔ لیکن کیا کریں دنیا ہمیشہ اچھے لوگوں کے ساتھ ہی برا کرتی ہے ماں پاور فل تو تھی لیکن وہ خود ٹوٹ گئی تھی۔

نائلہ بتول نے کنجاہ گجرات سے لکھا ہے

بلدیاتی انتخابات.... ہوں.... وہی شکاری، وہی غاصب، نیا جال، وہی وعدے اور جذباتی عوام، اللہ رحم کرے ہم پر۔

بیس سال سے شعاع کے ساتھ ہیں۔ اتنے سالوں میں کتنے موسم بدلے، کتنے ہی سنگی ساتھی بدلے شعاع کا ساتھ نہ چھوٹا۔ بہت سالوں بعد پھر سے قلم اٹھایا اور خاموشی توڑی تو اس کی وجہ ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔" کیا کمال کا سلسلہ ہے۔

اس بار اس سلسلے میں بچوں کی کامیابی کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ "سیاہ حاشیہ" کھولا تو بختاور کے عمل نے غصہ دلایا۔ ایک محبت کے لیے اتنی محبتیں چھوڑنا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ "صالحہ آپا" کا کردار پڑھ کر بے نام سی الجھن سوار ہوجاتی ہے جسے کوئی بھی نام دینے سے قاصر ہوں۔ یہ "اوریدا" کا مطلب کیا ہے صائمہ جی؟

ثمرہ جی سے تو ہم ناراض ہیں۔ ابھی رسالے میں مصروف تھی کہ میاں صاحب کی آمد ہوگئی۔ "خیر ہے نا! کل اس کا پیپر دینا ہے؟ بھئی صبر سے پڑھو، ابھی تو پورا مہینہ

ہے۔ "میں نے بھی نظریں اٹھائے بغیر "اچھا" کہہ دیا اور پھر رقص بسمل کھول لیا۔ مہوش افتخار کا "جام آرزو" بھی اچھا لگا۔ مریم عزیز! واہ... بہت مزہ آیا... موضوع تو پرانا ہی تھا لیکن انداز اور قلم چونکہ آپ کا تھا تو بہت اچھا لگا۔ "میں اور تم" بھی بہت مزے کا تھا ہلکا پھلکا۔ سمیرا حمید کا افسانہ اور ہما چوہدری نے بہت کمال لکھا تو شازیہ طارق جمال نے بھی حقوق العباد لکھ کر قلم کا حق ادا کر دیا۔

ج ۔ پیاری نائلہ! خوش رہیں' رت جگے کے بعد کیا جانے والا تبصرہ بہت اچھا لگا اور ہاں آپ سب قاری بہنیں آئندہ خاموش رہنے یا تبصرہ نہ کرنے کی دھمکی نہ دیا کریں۔ نازک سا تو دل ہے ہمارا... جو بند ہو گیا تو...؟

میاں صاحب اور آپ دونوں کے حوصلے اور صبر کی داد دیتے ہیں۔ آپ نے ان کے تبصرہ کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا اور وہ جوابی رد عمل ظاہر کیے بغیر سو گئے۔

تفصیلی تبصرہ اچھا لگا' بہت شکریہ... عوام کے بارے میں کیا کہیں... اب اچھائی اور برائی کے معیار ہی بدل گئے ہیں۔ دیانت' سچائی' شرافت' نیکی معیار نہیں ہے... بلکہ ہم سب اپنے تعصبات کے اسیر ہیں نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں تو پھر نتیجہ کیا نکلے گا' یہ تو ظاہر ہی ہے۔

فوزیہ ظفر لانڈھی کراچی سے شریک محفل ہیں

"کھلتا کسی پہ کیوں" میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ "باتوں سے خوشبو آئے" اللہ رب العزت پھولوں کو ہمیشہ مہکتا رکھے۔ (آمین) "اس ماہ کی مسکراہٹیں" مسکراتے پر کوئی پابندی نہیں۔ "فیس ویلیو" بڑھتی ہے بھئی... سید کاظم شاہ اور شمیم فاطمہ کی شاعری بھی اچھی لگی... اوہ ہاں مزہ آگیا جناب... "ایک آرزو" اقبال کی زبردست...

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو...

افسانوں میں چاروں ہی اچھے تھے۔ "سیاہ حاشیہ" بہت اعلا' ایک ایک پھول جمع کرتے کرتے "گلدستہ" بننے والا ہے۔ "میں اور تم" (عنبرین ولی) "دل کے بھید" (ہما چوہدری) بھی ٹھیک تھے۔ "جام آرزو" مہوش افتخار زبردست۔ "وہی راستہ' وہی منزل" مریم عزیز بھی اچھا تھا۔ "رقص بسمل" نبیلہ عزیز پلیز اس عزت اور ولید کو

کنٹرول میں رکھیں۔ مجھے ان کا اوچھا پن ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ "شعاع کے ساتھ" جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ اس کا عنوان بہت پیارا ہے۔ "بندھن" میں انور مقصود اور عمرانہ مقصود کو دیکھ کر بہت ہی اچھا لگا۔ "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" بہت معلوماتی سلسلہ اور بہت مفید بھی... (اس کے لیے اللہ رب العزت آپ کو جزائے خیر دے۔) "حمد باری تعالیٰ" اور "نعت رسول مقبول" بہترین ہے۔ سب سے آخر میں "پہلی شعاع" میرا پسندیدہ "خط آپ کے" مجھے وہ خط بہت اچھے لگتے ہیں جن میں بہنیں تفصیلی تبصرہ دلچسپ انداز میں بھیجتی ہیں۔ میں اپنی غزل ارسال کر رہی ہوں۔ معیاری لگے تو شائع کر دیجیے گا' نہیں تو کوئی بات نہیں۔

ج ۔ پیاری فوزیہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ نے مستقل سلسلوں پر تبصرہ کیا۔ ہمیں بہت اچھا لگا۔ اگرچہ کچھ ادھورا سا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آمنہ چوہدری مقبولہ شریف سے لکھتی ہیں

میں ایف ایس سی میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں اور ماشاء اللہ میٹرک میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ نومبر کے رسالے میں "وہی راستہ' وہی منزل" بہت بہت اچھا لگا۔ "جام آرزو تو جب مکمل ہوا تب بات کریں گے۔" "سیاہ حاشیہ" بہت اچھا ہے۔ صائمہ آپی! آپ سے درخواست ہے کہ ارصم اور اوریدا کی شادی کروا دیں' ورنہ ساری کہانی کا مزہ نہیں رہے گا۔

ج ۔ بہت مبارک ہو آمنہ! ہماری دعا ہے ایف ایس سی میں بھی آپ پوزیشن حاصل کریں' آپ کا مشورہ صائمہ تک پہنچا رہے ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے شریک محفل ہیں

تبصرہ کے لیے تیار ہوئی تو ساسو جی کا آرڈر آگیا۔ "کوثر روٹی نہیں پکائی؟"

کوثر بولی... "بھلا آپ کے آرڈر سے پہلے کیوں پکاؤں بھلے بھوک لگی رہے۔" "جی ہاں رسالہ بھی تو بھوک مٹانے کا کام کرتا ہے۔ کاش یہ بھی پڑھی ہوتیں... ویسے کبھی کبھی رسالہ پکڑ کر تصاویر دیکھ لیتی ہیں اور کبھی میں موڈ میں انہیں کوئی کہانی بھی سنا دیتی ہوں۔ اب موصوفہ سے اجازت

لے لی ہے کہ خط لکھ کر روٹی پکاتی ہوں کہ خط پوسٹ کرنے والا سہیلی کا شوہر بازار جانے والا ہے تو پھر سنیے جلدی.... ایسا نہ ہو شمع بھی آجائے، پھر تو خط چھوڑ کر ہی اٹھنا پڑے گا کہ ساتھ ہی ٹیوشن کے بچے بھی آجائیں گے۔ دس اس کے.... چار میرے....

"بندھن" انور مقصود کو میری ساس "کھبل" کہتی تھیں۔ اب ہم نے انہیں اور خود کو بھی "کھبل" بنالیا ہے۔ مطلب ڈائی اور مہندی چھوڑدی، چھڑوادی.... "تجھ سے ناتا" بہت ہی شان دار.... نصیبوں والا.... لگتا ہی نہیں کہ عام میٹرک پاس نے لکھا.... ایک لکھاری سے بھی اچھا تحریر کیا ہے۔ میری بیٹی نے بھی بہت پسند کیا ہے۔ سدا خوش رہے۔ ص.... م.... "شعاع کے ساتھ" لو جی حرا صاحبہ تشریف فرما ہیں.... حرا تمہاری انوکھے لفظوں کی طرح تمہاری روٹین بھی محنتی اور انوکھی لگی۔ بہت دعائیں، جگ جگ جیو۔ "جام آرزو" ہمارا جام آرزو تو حمد و نعت ہی تھا ہے اور رہے گا۔ "وہی راستہ، وہی منزل" کاش ایسے ہیرو سب کو ملیں در اب.... جیسے مگر اس طرح نہیں.... اس طرح جیسے مجھے ملا۔ "دینار" ایسی منفرد تمثیل لانا سمیرا حمید ہی کا کام ہے۔ تمام چاہنے والوں کو سلام اور اک شعر سب کے نام۔

میرے ذہن کی گلیاں فارغ ہیں، دست میرے مصروف بھلے
مجھے آج تلک نہیں بھولے، میرے چاہنے والے جتنے بھی ہیں
میں اکثر سب کو یاد کروں دعاؤں کے تحفے بھیجوں ہوں
میرے دل میں ڈیرہ ڈالے ہیں میرے چاہنے والے جتنے ہیں

ج ۔ پیاری کوثر! بے شمار قارئین ہمیں خط لکھتے ہیں مگر آپ کا اپنا ہی اسٹائل ہے، بہت سادہ، بے ساختہ اور دلچسپ.... یقین نہیں آتا، کوئی اتنی بے تکلفی سے سچ بھی لکھ سکتا ہے۔ جس طرح آپ اپنی باتیں لکھتی ہیں۔ کوئی تصنع کوئی بناوٹ نہیں آپ میں اور یہی بات، ہمیں بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

اس دفعہ نومبر کا شعاع پڑھ کر میں حیران رہ گئی اف اتنے زبردست افسانے اور ناولز۔ خاص طور پر مریم عزیز کا ناول "وہی راستہ، وہی منزل میری" بہت ہی بہترین، حسین دلکش سحر انگیز جس میں واقعی کوئی کمی نہیں تھی۔ صائمہ اکرم کا "سیاہ حاشیہ" بہت عمدگی سے چل رہا ہے۔ دل سے لکھتی ہیں اور واقعی دل میں رہتی ہیں۔ "جام آرزو" کرداروں کا مجموعہ لگتا ہے، بے شمار سمجھ سے باہر رشتے ہیں۔ عنبرین ولی کا "میں اور تم" واللہ جواب نہیں اتنی شوخ و چنچل تحریر۔ لگتا ہے گدگدی ہو رہی ہے۔ ہما چوہدری کا ناول "دل کے بھید کھلے کچھ اس طرح" ہما آپ نے مائرہ کو کچھ زیادہ ہی اوور نہیں کردیا۔ مگر پھر بھی بہترین کاوش کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں سب سے شان دار ہے۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ یہ مجھے زیادہ پسند نہیں۔ پتا نہیں کیوں اس میں لگتا ہے جیسے ہم اپنے گھر کی پرسنل باتیں سرعام کررہے ہیں۔ سسرال کے رونے.... رشتے داروں کے جھگڑے۔ میاں کی شکایتیں الٹی سیدھی باتیں۔ صرف اپنی تعریفیں.... دوسروں کی برائیاں گویا ہم اچھے اور سب برے۔

ج ۔ پیاری تسنیم! شعاع میں خط لکھا ہے تو سمجھو شعاع سے ہی مخاطب ہو۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ.... اور "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کے بارے میں ہم اتنی بار وضاحت کرچکے ہیں کہ اب تک تو ہماری قارئین کو اس کے شروع کرنے کی وجہ ازبر ہوجانی چاہیے۔ یہ شکایتوں کا نہیں حقیقتوں کی نقاب کشائی کا سلسلہ ہے۔ آپ لوگ جواب مانگتی ہیں تو جواب طلب بات ہوگی تو جواب دیں گے، تعریف پر تو شکریہ ہی ادا کرسکتے ہیں۔

طاہرہ آصف ملتان سے لکھتی ہیں

شعاع میں نے اپنی پھوپھی جان کے گھر سے پڑھنا شروع کیا۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" سچ میں یہ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ ص.... م.... نے اپنی زندگی کی سچائی بہت سادہ زبان میں بتائی ہے کہ مقام کوئی کسی کو نہیں دیتا۔ اپنی محنت سے لیا جاتا ہے۔ "رقص بسمل" میں نبیلہ جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سحر میں ڈوب جاتا ہے پڑھنے والا۔ "دینار" پڑھ کر دل ایک دم اداس ہوا کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ "تو میرا ہیرو" ممتاز جی کی اچھی کاوش ہے اور "وہی راستہ،

وہ منزل میری" نے جیسے وقت کو روک لیا۔ مریم جی آپ بہت اچھا لکھتی ہو۔ "میں اور تم" نے بہت ہنسایا۔ "دل کے بھید کچھ اس طرح" ہما چوہدری نے آخر تک دل میں رکھے۔ مزہ آیا پڑھنے میں۔ "ایک آرزو" علامہ اقبال کی ہماری بھی دلی آرزو ہے۔

ج ۔ پیاری طاہرہ! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں بھی بہت اچھا لگا مگر ایک بات ضرور کہنی ہے کہ تمام بہنیں یہ کیوں لکھتی ہیں کہ حوصلہ افزائی کریں گی تو آئندہ تبصرہ لکھیں گے۔ بھئی آپ کے خطوط سے ہمارا بھی تو حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ خطوط کو مشروط نہ کیا کریں۔ اب محبتوں میں بھی حساب کتاب ہوگا کیا؟ کوشش کیا کریں کہ خط ہمیں 12 تاریخ تک مل جائے۔

طاہرہ عندلیب نے اسلام آباد سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں جب بھی اس کی محبت سے ہاتھ کھینچتا ہوں
تو بھینچ دیتا ہے دل کو ذرا زیادہ کوئی

اس شعر کے مصداق آپ کے رسالوں کی محبت میرے گوشہ دل میں عرصہ دراز سے مقیم ہے۔ میری سب سے پسندیدہ کہانی شعاع میں ہے۔ "سیاہ حاشیہ" الفاظ کی بنت، کہانی پہ گرفت، خیالات کا تسلسل، بات کی روانی، کرداروں کی ترتیب نہایت عمدہ.....

"جام آرزو" نہایت ہی شان دار لفظی شطرنج کی بساط بچھائی ہے آپ نے مہوش افتخار، آپ کو بھی شاباش.....اور افسانہ "دینار" سمیرا حمید کا بہت ہی زبردست قلمی کاوش..... باقی شمارے میں کوئی افسانہ قابل ستائش نہیں ٹھہرا..... مگر میرے خط لکھنے کی وجہ بنا ناول "وہی راستہ، وہی منزل" مریم عزیز کا۔ لاجواب کہانی، عمدہ ترین خیالات..... سچائی سے قریب تر جذبات، شاعری کا انتخاب تھوڑا اور بہتر ہوتا تو دل گداز ہوتا۔ مجھے انٹرویوز کا سلسلہ بہت پسند ہے۔ اس کا اسٹائل تھوڑا متنوع کردیں تو بہترین رہے گا۔ انٹرویو کے لیے میری فرمائش بھی ہے اور وہ ہے چیف آف آرمی اسٹاف فخر پاکستان جناب جنرل راحیل شریف صاحب۔ اور ساتھ ہی انتظار حسین، حسینہ معین ان جیسے ماضی کے سرگرم رائٹرز کا انٹرویو بھی شامل ہونا چاہیے۔ اب آخر میں ایک خامی کی نشان دہی کرنا چاہوں گی جو مجھے پورے رسالے میں ہر کہانی میں "تقریباً" نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر تحریروں میں مشابہت بہت ہوتی ہے۔ ایک جیسے الفاظ اور کرداروں کی وہی دائمی مخصوص سی چپقلش جو انتہائی بے زار کن ہوتی ہے۔ کچھ کہانیوں کو چھوڑ کے باقی کہانیاں نہ تو ہمارے کلچر کی نمائندگی کرتی ہیں، نہ ہی مذہب کی۔ کوئی کہانی اگر مذہب کے پلاٹ پر لکھی گئی ہے تو حد سے زیادہ شرافت اور عقیدت ہوتی ہے اور اگر کہانی برائی لکھی گئی ہے تو اس میں شیطانوں کا ٹولہ اکٹھا ہوتا ہے اور ایک چیز کی بہت شاکی ہوں میں کہ آپ نئے اسلوب اور نئی سوچ رکھنے والوں کی کہانیاں شامل نہیں کرتے۔ وہی گھریلو فسادات اور مسائل پر مبنی کہانیاں شائع کرتے ہی اور پھر اس کو ادبی رسالہ بھی کہتے ہیں۔

ج ۔ پیاری طاہرہ! آپ کے خط کے جواب میں کیا کہیں، یقین رکھیں، آپ کی کہانیاں قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ دیر سویر البتہ ہو سکتی ہے، ادبی رسالہ کا دعوا تو ہم نے کبھی نہیں کیا، البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ ہمارے پرچوں میں زندگی کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ نئی سوچ کی جہاں تک بات ہے تو پچھلے چند سالوں میں بہت سی مصنفین نئی سوچ کے ساتھ سامنے آئی ہیں کیا آپ نے نمرہ احمد، سمیرا حمید، ایمل رضا، ہاجرہ ریحان، صدف آصف اور حنا یاسمین کی کہانیاں نہیں پڑھیں۔

سلمیٰ زبیر نے لاہور سے لکھا ہے

سرورق تو ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھا کچھ آگے بڑھے تو رخسانہ جی غائب..... "رقص بسمل" میں نبیلہ عزیز تھوڑا زیادہ لکھا کریں۔ مریم عزیز نے بھی کمال کردیا، لفظوں کے جادو سے خوب واقف ہیں آپ..... میں اور تم عنبرین ولی نے بھی مزہ دوبالا کردیا۔ "جب سے تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں کچھ خاندان کی عورتوں شادی شدہ کا حوال لکھ کر بھیج سکتی ہوں، جو شعاع کے صفحات کی زینت بن سکیں۔

ج ۔ پیاری سلمیٰ شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ یقیناً آپ کے خاندان میں بہت سی خواتین ہوں گی جو خود نہیں لکھ سکتی ہوں گی، آپ ان کے جوابات اس سلسلے (جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔) میں لکھ کر بھیج سکتی ہیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ضحیٰ خان نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

کیا ایک سطر چھوڑ کر لکھنا اور رجسٹری کروانا خطوط کے لیے بھی ضروری ہے؟

اب آجائیں تبصرے پر تو جی سرورق پر ماڈل کی مکمل تصویر دیا کریں تاکہ ڈیزائن اور اسٹائل کا بھی پتا لگ سکے۔ "ایک تھی مثال" غائب تھی ایسا نہ کیا کریں جی ایک مہینہ بہت ہوتا ہے انتظار کے لیے "رقص بسمل" کے بارے میں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبیلہ کی پریشانی دور فرما دیں۔ "جام آرزو" کی یہ قسط کافی اسٹرونگ تھی مگراب بھی سمجھ نہیں آیا کہ مہر کا نکاح "سیم" یعنی ثمروز ابراہیم سے ہوا تھا تو حنان کہاں سے بیچ میں آگیا۔ "دینار" معذرت کے ساتھ کہ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ سمیرا احمد کی تحریریں بہت اچھی، بامقصد ہوتی ہیں مگر بہت مشکل الفاظ اور فلسفہ بہت ہوتا ہے (معذرت) "آج کل کی لڑکیاں" حقیقت سے قریب ترین تھا۔

اب آجائیں طویل ترین ناول "وہی راستہ وہی منزلیں" یہ ناول حقیقت سے بہت دور تھا "دراب" جیسا عقل کا اندھا آج کل صرف ناولوں یا فلموں میں ہی مل سکتا ہے کہ صرف ایک نظر دیکھ کر ایسا دیوانہ ہو گیا عقل سمجھ سب ختم ہو گئی۔ خیر بطور ناول دیکھا جائے تو اچھا ناول تھا۔

"دل کے بھید کھلے اس طرح" انتہائی بکواس ترین تحریر۔ پورا ٹائم کنفیوژ رہی کہ مائرہ کون اور عائزہ کون اور علاؤالدین اور محی الدین بالکل پسند نہیں آئے اور آغا جان تو بالکل ہی پاگل لگے۔

ج: پیاری ضحیٰ! خطوط کے لیے ایک سطر چھوڑنا ضروری ہے لیکن رجسٹری کروانا ہرگز ضروری نہیں۔ نہ ہی خطوط کی اشاعت کے لیے ہینڈ رائٹنگ کوئی مسئلہ ہے۔ بس شمارے پر تبصرہ اور بروقت ملنا لازمی ہے۔

سمیرا حمید کی کہانی اتنی مشکل تو نہیں تھی، حیرت ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ ہٹ کر تھی۔

شعاع کے ساتھ ساتھ کے سوالات اس بار جوابات کے ساتھ دیے جا رہے ہیں۔ نوٹ کرلیں۔

آپ نے تعریف کے ساتھ تنقید بھی کی، بہت اچھا لگا۔ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچا رہے ہیں۔

آسیہ ارم نے کراچی سے لکھا ہے

آپ لوگوں تک تو صرف الفاظ ہی پہنچتے ہیں مگر اس خط میں نہ نظر آنے والی محبت، خلوص انتظار، دکھ، سکھ سب بستے ہیں صرف اس آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس میں یہ سب دیکھ سکے۔

بہت خوب صورت نظم تھی۔ میری درخواست ہے کہ ہرماہ "اقبال" کی کوئی ایک نظم ضرور شائع کریں کہ آج کے دور میں تو ہمارے بچے صرف علامہ اقبال کے نام سے واقف ہیں۔ ان کے نصاب میں اب سرے سے غائب ہو رہی ہے شاعری اور یہ بہت پراپر طریقے سے کیا جارہا ہے کہ آج کے بچے جاگ نہ جائیں۔

کہانیوں کی طرف آتے ہیں تو "رقص بسمل" پڑھا، نبیلہ جی کہانی کو آگے تو بڑھائیں۔ جام آرزو ویل ڈن مہوش کہ آپ نے ہمیں اتنی اچھی کہانی پڑھنے کو دی۔

"سیاہ حاشیہ" زبردست۔ جیسے جیسے اقساط بڑھ رہی ہیں ہمارا بھی جوش اور انتظار بڑھتا جاتا ہے۔

ہما چودھری کا ناولٹ معذرت کے ساتھ میری تو سمجھ میں نہیں آیا کہانی میں بہت جھول تھا مزہ نہیں آیا۔ عنبرین ولی کی "میں اور تم" اچھی اسٹوری تھی مکمل ناول "وہی راستہ وہی منزل میری" مریم عزیز جی آپ نے اسٹوری تو بہت اچھی لکھی، ندیم قریشی حبہ کو گھسیٹ کر اپنی گاڑی میں ڈال کر لے جا رہا تھا یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر یہ کیا کہ گاڑی میں ڈالتے ہی فلموں کی طرح ہیروئن، پولیس، کیمرہ مین سب ایک ساتھ جلوہ گر ہو گئے آپ اگر اس سین کو پراپر طریقے سے لے کر چلتیں تو ٹھیک تھا۔ سوری۔ مجھے یہاں مزہ نہیں آیا اور ایک بات اور پوچھنی تھی کہ صفحہ نمبر 176 پر حبہ اور دراب گاڑی میں بیٹھے تھے کہ اچانک حبہ نے کرسی سے ٹیک لگائی۔ یہ رائٹر کی غلطی ہوتی ہے یا ادارہ پرنٹ میں غلطی کرتا ہے۔ اسی کہانی کے حوالے سے مجھے

تمام قارئین بہنوں اور ادارہ سے یہ پوچھنا ہے کہ ہماری رائٹرز بہنیں کہانیاں یا افسانے اس معاشرے سے، مطالعے سے، مشاہدے سے یا تجربات سے ترتیب دیتی ہیں جن میں زیادہ تر حقیقت کا ہی رنگ ہوتا ہے تو کیا کسی بھی بہن کی نظر سے یہ بات (دیکھی سنی یا سنائی) گزری ہے کہ ایک میاں بیوی آٹھ، دس مہینے تن تنہا رہتے ہوں اور وہ دو

اجنبیوں کی طرح رہتے ہوں (آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی) تو پلیز مجھے بتائیں۔ کچھ دن تو پھر بھی سمجھ آتے ہیں مگر اتنے مہینے ..... اور وہ شیطان کہاں ہوتا ہے جو ہر مرد اور عورت کے درمیان ہوتا ہے کیا وہ جائز میاں بیوی کے درمیان نہیں آتا۔ سوری جو بات مجھ سے ہضم نہیں ہوتی اسے میں اندر نہیں اتار سکتی۔

سمیرا حمید صاحبہ اس دفعہ بھی "دینار" لائی ہیں بہت زبردست۔ بہت سمجھ کر پڑھنے والا افسانہ تھا۔ شاید ہر ایک کی سمجھ میں نہ آئے مگر مجھے تو بہت اچھا لگا ویل ڈن سمیرا۔ ممتاز یوسف کا "تو میرا ہیرو" بھی مزہ لیے ہوئے اچھا افسانہ تھا۔ ہلکا پھلکا پڑھ کر ذہن پر اچھا تاثر چھوڑا۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہت پسند ہے۔ جس دن قلم نے ساتھ دیا اسی دن حاضر ہوں گی اس سلسلے میں، بڑی ہمت پکڑ کرلائی ہے اس میں شریک ہونے کے لیے۔

خطوط میں اسلام آباد سے شریک 9 بہنوں نے جو خط لکھا تھا وہ اور آپ کا جواب لاجواب تھا۔ بندھن میں انور مقصود کو پڑھا بہت اچھا لگا "پیارے نبی کی پیاری باتیں" میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ لوگ مستند کتابوں کا حوالہ صفحہ نمبر کے ساتھ دیتے ہیں تو شک کی تو گنجائش ہی نہیں رہتی اس لیے اسے تسلی کے ساتھ پڑھتی ہوں۔

ج : پیاری بہن آسیہ ارم! بہت خوشی ہوئی کہ آپ کا غصہ رفع ہوگیا۔ یہ خیال غلط ہے کہ ہم تک صرف الفاظ پہنچتے ہیں۔ جب آپ کے غصے کی تپش محسوس کرلی تو ہم آپ کی محبت، خلوص اور بے تابیوں سے کیسے انجان رہ سکتے ہیں۔ یقین کرلیں ایک محبت بھرا دل ہم بھی رکھتے ہیں۔

مریم عزیز کے ناول میں پروف کی غلطی تھی نشان دہی کے لیے بہت شکریہ۔ اپنے طور پر پورا دھیان رکھتے ہیں پر کوشش کے باوجود اس طرح کی غلطیاں رہ ہی جاتی ہیں۔ شیطان والی بات پر صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت اور افسانے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ معذرت آئندہ خیال رکھیں گے۔

ممتاز یوسف اورنگی ٹاؤن کراچی سے لکھتی ہیں

"آج کل کی لڑکیاں" شازیہ جمال طارق کا بہت بہت اچھا لگا۔ بات اچھی بھی ہو اور مختصر بھی تو زیادہ اثر کرتی ہے۔ شازیہ جمال نئی لکھنے والی ہیں؟

"اس بار کا" تجھ سے ناتا" زبردست تھا۔ اتنے کٹھن حالات میں بھی بہن ص۔ م کا اتنا شگفتہ اور دلفریب انداز، زبردست، بہن ص۔ م کو تو اپنا پورا نام فخریہ لکھنا چاہیے تھا۔

ص۔ م کا ایک جملہ "خوشبو والے ربڑ جو مجھے پتا ہی نہ تھا کہ کھاتے نہیں ہیں پتا نہیں کتنے میں کھا گئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو پنسل کو مٹاتے ہیں۔" زبردست تھا۔ بھئی میں ص۔ م کو "اسٹرونگ وومین" کا خطاب دینا چاہوں گی ایک اور جملہ ان بہن کا بہت اچھا لگا "اپنے دکھ اپنے بچوں میں منتقل نہ کریں۔" میں اپنی مضبوط بہن سے ان کا اصلی نام جاننا چاہوں گی۔

"خط آپ کے" بہت زبردست تھا اب کی بار نسرین علی کا خط بہت دلچسپ تھا۔ خدیجہ اور فاطمہ نے بھی اچھا لکھا۔ تمام خطوط کو دیے گئے جوابات، یوں کہیے سونے پر سہاگہ۔

سمیرا حمید کے لیے ایک فرمائش ہے کہ وہ ایک مزاح سے بھرپور تحریر لکھیں اور جیسے "یارم" میں کارل تھا۔ شرارتی ایسا ہی شرارتی ہیرو یا ہیروئن ہو تو مزا آجائے۔

میری ایک فرمائش ہے کہ خواتین ڈائجسٹ میں "تجھ سے ناتا حصہ دوم" شروع کیا جائے اس سلسلے میں میاں بیوی کے ذاتی تعلقات اور گھریلو تعلقات کے متعلق اور بچوں کے متعلق دلچسپ سوالات ہوں۔ اگر سوالات دلچسپ ہوں گے تو ان شاء اللہ ہماری ذہین بہنوں کے جوابات حصہ دوم کو بھی حصہ اول کی طرح ایک کامیاب سلسلے میں تبدیل کردیں گے مثلاً "شادی کے بعد اکثر شوہر ٹی وی پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں، سو بیوی کو ڈراموں وغیرہ کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ بچوں کے بعد نیند کی قربانی بچوں کی بیماری وغیرہ میں شوہر خیال کرتے ہیں یا نہیں۔ عورت جتنی توجہ مرد سے چاہتی ہے اکثر عورت کو لگتا ہے کہ اس کا شوہر وہ توجہ اور پیار اسے نہیں دے پا رہا۔ سو اسی قسم کے چھوٹے موٹے سوالات اور اس سلسلے میں بہنوں کو اپنا نام چھپانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔

پیاری ممتاز! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شوہر حضرات سے تقریباً سب ہی خواتین کو ایسی ہی شکایتیں ہوں گی۔ توجہ، خیال کی کمی.... لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج مردوں کے مسائل بھی کم نہیں۔ اخراجات زیادہ، آمدنی کم نے مردوں کو گھن چکر بنا دیا ہے۔ اس لیے بہت

سی باتوں کو در گزر کر دینا چاہیے۔

ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ہمارا ایک جملہ کراچی کی بہنوں کو جگا دے گا۔ اس بار کراچی سے ہمیں کافی خطوط موصول ہوئے ہیں۔

شازیہ جمال طارق کافی عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔ پہلے شازیہ جمال نیر کے نام سے لکھتی تھیں۔ اب شازیہ جمال طارق ہو گئی ہیں۔

سدرہ گل مہک پیر محل سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

ہمیں آپ کی پیاری سی تبصرہ نگار ستارہ آمین کومل کی اکلوتی لاڈلی بہن ہونے کا شرف صرف ہم کو حاصل ہے۔ ایک راز کی بات بتاتے چلیں کومل کالم لکھتے شاعری کرتے اور زبردست تبصرے کرنے کے بعد آج کل کچھ خاص لکھ رہی ہیں۔ ہوشیار ہو جائیں' ہو سکتا ہے بجی شعاع کی رائٹرز کی صف میں جا کھڑی ہو۔ شعاع' خواتین کا اک معیار ہے اور اب کچھ عرصہ سے عجیب سی صورت حال ہے۔ اس ماہ "رقص بسمل" اوہ مائی گاڈ ڈھابے والا سین ذو معنی جملے' توبہ ہے خدارا! ایسی کھلی تحریر سین جملے مت دیا کریں۔ سیاہ حاشیہ۔ بہت پیاری ہے صائمہ آپی کی شاندار تحریر۔ نمیرا احمد آپ کی وڈی ساری فین ہوں۔ دینار بہت جاندار آپ کے الفاظ' انداز زبردست' ہماری سب سسٹرز نے بہت اچھا لکھا۔ بہت سارا پیار۔ اب آپ میری سفارش کر دیں۔ کوئی بھی رسالہ آتا ہے تو مجھے لاسٹ میں پڑھنے کو ملتا ہے ستارہ کے بعد ان کی دوست سعدیہ اور ثریا پھر رل رل کے مجھے ملتا ہے۔ خواتین' کرن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے ان کو کہیں پہلے مجھے پڑھنے دیں۔ آپ بعد میں پڑھ لینا میری جاب کی مصروفیات بھی ہوتی ہیں رات کا وقت بچتا ہے میرا۔

ج: پیاری سدرہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی ہینڈ رائٹنگ حیرت انگیز حد تک ستارہ کی لکھائی سے ملتی ہے۔ یہ خط واقعی آپ نے لکھا ہے؟ اور بھئی ستارہ! پہلا حق گھر والوں کا ہوتا ہے۔ پہلے بجی کو پڑھنے دیا کرو۔ دوستوں کی باری بعد میں۔ ستارہ! شعاع کی مصنفین کی فہرست میں شامل ہونے والی ہیں۔ اس خوش خبری کے لیے شکریہ۔ ہم ان کی تحریر کے منتظر ہیں۔

مریم حنیف نے لکھا ہے

آج کل چونکہ پڑھائی سے تھوڑا فری تھی تو آپ کا ماہنامہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ماہنامے نے تو ہمیں اپنا دیوانہ بنا لیا۔ تین دن میں ڈائجسٹ رٹ کے بیٹھ گئے۔ اتنا لطف تو کبھی فیس بک پہ چیٹنگ کا نہیں آیا۔ بس اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ آپ سب کو مزید ترقیاں دے (آمین)

مریم! آپ نے اتنی محبت سے خط لکھا' اس کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ ہمارے لیے بڑے بڑے شاعرانہ الفاظ سے زیادہ آپ کے جذبات اہم ہیں آپ نے دل سے خط لکھا اور وہ ہمارے دل تک پہنچ گیا۔ بہت شکریہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔

شائستہ کنول جٹ نے چیچہ وطنی سے لکھا ہے

پہلی شعاع کی کرن سے اپنے اندر معلومات کا ذخیرہ کیا۔ لپک کر پہنچے حمد باری تعالٰی اور نعت رسول مقبول پڑھ کر دل و روح شاد ہوا تھے پھر "رقص بسمل" پر بڑھے۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ سیاہ حاشیہ کے کیا کہنے (زبردست) افسانہ "تو میرا ہیرو" پڑھ کر اچھا لگا۔ ساتھ ہی دل کے بھید کو بھی چاٹ ڈالا دل خراماں خراماں آگے بڑھنے کو مچلا مگر ہائے ری قسمت پھر کالج جانے کا ٹائم ہونے لگا۔

پیاری شائستہ! جلدی جلدی پڑھ کر ادھورا تبصرہ کیا مگر اچھا کیا۔ ہمیں بروقت خط مل گیا لیکن آئندہ اطمینان سے پورا رسالہ پڑھ کر تبصرہ کیجیے گا تاکہ ہم آپ کی رائے جان سکیں۔

روزینہ نعیم' یاسمین نعیم نے گوجرانوالہ سے شرکت کی

پیارے نبی کی پیاری باتوں میں اس دفعہ حجامہ کے متعلق مکمل معلومات شائع کریں۔ اب بات کرتے ہیں سیاہ حاشیہ کی تو جی مزہ تو ہر دفعہ ہی پڑھنے پر آتا ہے۔ نبیلہ جی اللہ کرے کہ آپ کی ٹینشن جلد ختم ہو تاکہ "رقص بسمل" بھی ختم ہو سکے۔ اس کہانی میں صرف فارہ اور آفاق ہی پسند ہیں۔ نمیرا احمد جی آپ کی کہانی تو مردہ دلوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ "تو میرا ہیرو" اینڈ یہ مجھے لڑکی کی سوچ بہت اچھی لگی۔ جام آرزو کا تو نہ ہی پوچھیے کہانی پڑھنے کے بعد کوئی

بیس منٹ تک آپ کو سمجھانا پڑا کہ سی ہنی نہیں اور سیم ہنی ہے یا خدا! میں تو سمجھاتے سمجھاتے ہی پاگل ہو رہی تھی۔ اور شازیہ جمال کو تمام لڑکیوں کی طرف سے ایک زور دار سلامی کہ آپ نے آج کل کی لڑکیوں کا مثبت چہرہ بھی لوگوں کو دکھایا۔ مریم عزیز کی تحریر مجھے کچھ زیادہ ہی لمبی لگی ۔ اسلوب بیان بہت ہی سادہ تھا اور بے وجہ کی طوالت تھی۔ "میں اور تم" بالکل بور تھا۔ ہما چودھری کا ناول بے جان سا لگا کھنچا کھنچا سا اسلوب لگا ان کا کوئی مقصد نظر ہی نہیں آیا کہانی میں۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" پلیز اس کے صفحات بڑھادیں۔ اتنا مزہ آتا ہے پڑھنے میں۔

ج: روزینہ اور یاسمین! اس بار شعاع آپ کو پسند نہیں آیا۔ معذرت، کوشش کریں گے اس کو مزید بہتر بنا سکیں۔

ملالہ اسلم خانیوال سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

مجھے آپ لوگوں سے اپنی ایک کنفیوزن شیئر کرنی تھی ہمارے یہاں رسالوں کو پڑھنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا، ان سب کا خیال ہے کہ یہ لڑکیوں کو خراب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں آپ سب سے کہ ان میں آخر کیا برائی ہے؟ کیا یہ سب مووینز، ڈراموں چاہے وہ پاکستانی ہوں یا انڈین سے زیادہ گرلز کو خراب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں؟ نازیہ احمد اور مہوش افتخار کو اس بار پڑھا اچھا لگا۔ آپی اگر میں لکھنا چاہوں تو کیا میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

ج: پیاری ملالہ! جو لوگ یہ باتیں کہتے ہیں، ان لوگوں نے ہمارے رسالے پڑھے ہی نہیں ورنہ ہرگز ایسی باتیں نہ کرتے۔ آپ ان کو ایک بار ہمارے رسالے پڑھوادیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ وہ خود خرید کر اپنی بچیوں کو دیں گے۔

سمیرا حمید سے ہم بھی ناول لکھوانا چاہتے ہیں۔ تھوڑا انتظار کریں، وہ جلد ہی لکھیں گی۔ اپنی تحریر بھجوادیں۔ ہم تمام نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

سیدہ ام امید بخاری نے لیہ سے لکھا ہے

خط لکھنے کی بنیادی وجہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں شائع کردہ کہانی۔ واہ بھئی واہ دل خوش ہو گیا۔ ص۔م صاحبہ بہت خوب بھئی۔ انتہا کردی آپ نے جدوجہد کی۔ اتنا حوصلہ وہ بھی گاؤں کی ایک ان پڑھ دوشیزہ کا۔ خیر اللہ نے آپ کو اجر دیا۔ آپ ان کے لیے مثال ہیں۔ جو کہ ڈگری لیتے ہی جاب کرنے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ آپ نے اپنے بچوں کے لیے پڑھا بہت خوب۔

میری شادی بھی کم عمری میں ہو گئی تھی۔ اب نو سال ہو گئے شادی کو۔ میں نے شادی کے بعد پڑھا اور اب ایم ایس سی کر رہی ہوں۔ میں بھی اپنے جوابات لکھ کر بھیجوں گی۔ میں نے بہت سی جاب آفرز کو ٹھکرا دیا بچوں کی وجہ سے اور جب اپنے بچوں میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

مریم عزیز صاحبہ آپ کا ناول بہت اچھی طرح لکھا گیا ہے۔ شاباش عنبرین ولی جی آپ کا افسانہ بہت ہی خوش کن پیرائے میں لکھا تھا۔ ہیروئن کی شوخیاں، شرارتیں۔ مجھے لگا وہ میں ہی ہوں۔ ادارے سے درخواست ہے ایسے افسانے ضرور ہونے چاہئیں۔ جو آپ کو زندگی کی تلخیاں بھلادیں اور تھوڑے رومانٹک ہوں تو کیا ہی بات ہے۔

کچھ قارئین تو باقاعدہ ڈنڈا لے کر آجاتی ہیں۔ ایسا کیوں لکھا؟ ویسا کیوں بولا؟ ارے بھئی ٹی وی سے تو بہت کم رومینس ہوتا ہے شعاع میں۔

سیاہ حاشیہ، صائمہ اکرم جی بہت اچھا جا رہا ہے۔ "تو میرا ہیرو" رائٹر سے معذرت کے ساتھ مجھے ایسے افسانے بہت ہرٹ کرتے ہیں جن میں کوئی لڑکی کسی لڑکے کو متاثر کرنے کی کوشش کرے۔ بالفرض اگر رشتہ نہ ہو تو آپ ان حرکات کو کس زمرے میں رکھیں گی، بلاشبہ گناہ کے۔

ج : محترمہ سیدہ ام امید بخاری! "جب تجھ سے ناتا" میں آپ بھی ضرور شامل ہوں۔ آپ کے آنے کی ہمیں خوشی ہوگی۔ خط طویل تو تھا مگر اچھا تھا۔

رخسانہ نگار عدنان

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً ”بیٹا بہو“ سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ، عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اکتیسویں قسط

"نہیں۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔
اور پری کے لیے عدیل کا یہ لہجہ کسی شاک سے کم نہیں تھا۔
"پاپا۔۔۔ مگر کیوں؟" وہ بہت دیر بعد اپنی حیرت پر قابو پا کر بمشکل بول سکی تھی۔
"اور پاپا! مجھے وہاں صرف مثال آپی سے ملنے نہیں جانا۔ مجھے وردہ سے نوٹس بھی شیئر کرنے ہیں۔" وہ اب کے ذرا سنبھل کر لہجے میں ناگواری سی لیے ہوئے بولی تھی۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" عدیل کے لہجے میں اب بھی لچک نہیں تھی۔
"کیا مطلب؟" وہ حیران سی ہوئی۔ "مجھے نوٹس چاہئیں اور۔۔۔" وہ ذرا تیز لہجے میں احتجاجاً کہہ رہی تھی۔
"کہا ناں تم سے ہم وہاں نہیں جاؤ گی' اکیلی تو بالکل بھی نہیں جاؤ گی۔ رہی بات نوٹس کی تو میں نے تمہارے لیے ٹیوٹر ارینج کیا ہے' وہ گھر پر آکر تمہیں پڑھا دیا کریں گے۔ کل شام پانچ بجے سے سات بجے تک۔" عدیل گویا ان سب باتوں کے لیے پہلے سے تیار تھا اور سب کچھ پلان کر رکھا تھا۔
"ڈس گسٹنگ۔" وہ تنفر سے پھنکاری۔ "اب کیا میں بچوں کی طرح گھر پر ٹیوشن پڑھا کروں گی ٹیوٹر سے۔۔۔ نہیں بالکل نہیں۔" اس کی آنکھوں میں غصہ اور ناگواری تھی۔
"اگر تمہیں بچوں کی طرح اسٹڈیز میں کسی سے ہیلپ کی ضرورت پڑے گی تو اس کے لیے ٹیوٹر لگایا جائے گا اور اس میں تمہاری بہتری ہے بلکہ۔۔۔ سب کی۔" عدیل جاتے جاتے رک کر یاد کرانے والے انداز میں بولا تھا۔
لمحہ بھر کو پری اور اندر آتی عفت بھی ٹھٹکی تھیں۔
"پاپا! میں نے آج تک اس طرح سے پڑھا ہے' جس طرح مجھے اچھا لگا' مجھے ٹیوٹر سے پڑھنے کی عادت نہیں میں نہیں پڑھوں گی۔" وہ بھی دو ٹوک لہجے میں بولی تھی۔
"اوکے' تو پھر گھر میں خود ہی پڑھو گی' کسی دوست کی طرف کمبائنڈ اسٹڈیز کے لیے یا ایسے کسی بھی ڈھکوسلے کی اجازت میں نہیں دوں گا۔" عدیل نے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا۔
"پاپا!" پری تو ششدر رہی رہ گئی۔
"وردہ میری دوست ہے اور مجھے اس سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا' میں بھی آپ کو بتا رہی ہوں۔"
وہ بغاوت بھرے لہجے میں پیر پٹخ کر زور سے بولی۔
"تمہیں منع کیا ہے نا میں نے کہ تم اب وہاں نہیں جاؤ گی' یوں منہ اٹھا کر۔ اس گھر سے ہمارا اب کچھ اور طرح کا رشتہ ہے۔ عفت! اس کو اپنی زبان میں سمجھا لو' تمہاری اولاد نے قسم کھائی ہے مجھے اذیت دینے کی۔" وہ عفت کو دیکھ کر غصے سے بولا۔
عفت کے دل میں بہت سخت بات آئی تھی' مگر وہ بے اختیار ہونٹ بھینچ گئی۔
عدیل کچھ ماہ پہلے جیسا عدیل نہیں تھا' جس کی جان صرف پری اور دانی میں تھی۔ ان دونوں کی حرکتوں نے اور کچھ عفت اور سب سے بڑھ کر اس مثال کی جادوگری سے' فی الحال عدیل بہت بدل رہا تھا۔
"تمہیں جب منع کر رہے ہیں تمہارے پاپا تو کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ پری۔۔۔ کیوں بحث کر رہی ہو؟" وہ پری کے پاس آکر کچھ سخت لہجے میں بولی۔
"تو آپ بھی میری بات کو نہیں سمجھیں گی۔" پری کو ماں کی اس "تبدیلی" پر سخت رنج سا ہوا تھا۔
"سمجھ رہی ہوں تو کہہ رہی ہوں نا' تمہیں اگر اسٹڈیز میں پرابلم ہے تو گھر میں ٹیوشن لے لو جس کی تمہارے پاپا آفر کر رہے ہیں اگر ایسا نہیں چاہتیں تو خود سے پڑھ لو۔ جس چیز سے روک رہے ہیں اس سے رک جاؤ؟؟" عفت اب کے نرم لہجے میں پری کو آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نہیں مجھے کچھ نہیں سیکھنا اور کچھ نہیں پڑھنا' بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے پاپا کو مجھ پر ٹرسٹ ہی نہیں رہا۔" اس کی آواز میں نمی گھل رہی تھی۔

عدیل کے قدم دروازے کے پاس رک گئے تھے۔

"تو پھر یوں کریں مجھے کالج بھی نہیں جانے دیں۔ گھر ہی میں بٹھالیں' نہیں ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں کچھ کر گزروں گی اگر گھر سے باہر نکلوں گی تو...." وہ زور سے آنکھیں رگڑ کر مڑ کر باپ کی پشت کو دیکھ کر بولی۔

"تم بات کو خواہ مخواہ بڑھا رہی ہو پری۔" عفت کچھ جھنجلا کر سختی سے بولی۔

"میں بڑھا رہی ہوں بات کو.... پاپا نے میری توہین کی ہے۔ میں نے وردہ سے پرامس کیا تھا کہ میں آج آؤں گی اس کی طرف اور.... اس کا فون آرہا ہے۔" ماں کے آگے فون کرتے ہوئے رندھی آواز میں بولتی گئی۔

"اس کی کال کا کیا جواب دوں میں کہ میرے پاپا کو مجھ پر بھروسا نہیں اور انہوں نے مجھے صاف تمہاری طرف آنے سے منع کردیا ہے۔ ٹھیک ہے نہیں جاؤں گی میں' کہیں بھی' گھر سے ہی نہیں نکلوں گی۔" وہ روتے ہوئے بھاگ گئی۔

عفت اور عدیل گم صم سے کھڑے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ کے لیے وہ منظر ناقابل یقین تھا۔

وہ یک ٹک سامنے مشینوں میں جکڑے ایک لاش کی مانند بے حس و حرکت پڑے ہلکے پھلکے سانس لیتے نیم زندہ انسان کو دیکھتی جارہی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے اس رات کا کریہہ منظر پوری جزئیات کے ساتھ جیسے زندہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کا پورا وجود جیسے کسی زلزلے کی زد میں آگیا تھا۔

وہ زبیر تھا۔

وہی زبیر جس نے اس کے شوہر اور سسر کی ناگہانی اموات کے بعد ایک بیوہ بے سہارا عورت کو مالی طور پر' جسمانی اور روحانی طور پر جتنا نقصان پہنچا سکتا تھا' پہنچایا تھا۔

اس کی آبرو' اس کی بیوگی کی تمام ترجمع پونجی' اس کی ہمت' حوصلہ' اعتبار' بھروسا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا۔

اور اب وہ اسے زندگی کے کس موڑ پر ملا تھا اور کس حالت میں!

عاصمہ بالکل ساکت تھی۔

وہ بہت سالوں سے اس مکروہ صورت انسان نما جانور کو بھول چکی تھی۔ وہ اپنے ہی نقصانات پر کچھ ایسے فراموش حال سے گزری تھی کہ اس کے لیے بددعا کرنا بھی بھول گئی تھی۔

مگر "وہ" نہیں بھولتا "وہ" کچھ بھی فراموش نہیں کرتا' نہ کسی کی ذرہ بھر نیکی' نہ کسی کی برائی۔

اب عاصمہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ صرف اس شخص کی وجہ سے وہ حرام موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی تھی۔ اگر وہ اس وقت نہ بچ پاتی تو آج اس کے چاروں بچوں کی کیا حالت ہوتی۔ وہ زندگی کی ٹھوکروں کی زد میں خزاں رسیدہ پتوں کی مانند خدا جانے کہاں بھٹک چکے ہوتے' وقت کے قدموں تلے آکر چرمرا چکے ہوتے۔

وہ بس روئے جارہی تھی۔

"شہزاد" پتھر جیسی بھاری بوجھل اٹکتی آواز اس زندہ لاش کے وجود سے آئی تھی۔

عاصمہ کے آنسو وہیں جم گئے۔

"مگر میں کیوں رو رہی ہوں۔" وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔

اب اس کی آنکھوں میں بے تحاشا نفرت تھی۔ اس بستر مرگ پر پڑے، بہت گرے ہوئے شخص کے لیے!

وہ مڑنے لگی تھی۔

"پا...پانی۔" بھاری پتھری صدا نے پھر سے پکارا تھا۔

وہ رکنا نہیں چاہتی تھی، مگر رک گئی۔

مڑنا بھی نہیں چاہتی تھی، مگر نہ چاہتے ہوئے بھی مڑتے مڑتے ٹھٹک گئی تھی۔ اور اس کے بستر کے بالکل قریب جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ اب آنکھیں کھولے پتھرائی نظروں سے بغیر پلکیں جھپکے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی ویرانی تھی۔ وحشت تھی۔ بے بسی تھی اور خوف تھا۔ "چلے جانے کا" خوف... خدا کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف!

"پہچانا مجھے... تم نے... میں کون ہوں؟" وہ نفرت بھری غراہٹ کے ساتھ ذرا سا جھکی، اس سے پوچھ رہی تھی۔

جس کی آنکھوں میں "خوف" کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ رحم مانگتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پتا ہے میں نے تمہیں کبھی کوئی بددعا نہیں دی۔ جانتے ہو کیوں؟ میں چاہتی تھی کہ اپنے گناہوں کو اس طرح سے بھول جاؤ جیسے تم اپنی زندگی کے گزرے دنوں کو بھول جاتے ہو۔ اپنے مزوں میں، اپنی خوشیوں میں گم ہو جاؤ، مگن ہو جاؤ، بھول جاؤ سب کچھ... سب کچھ بھول جاؤ... اور پھر ایک دن ایسا آئے، تمہیں سب کچھ یاد کرا دے، وہ یاد کروانے والا جس کے ہاتھ میں رسی کا وہ سرا ہے، جس سے تمہاری گردن بندھی ہے اور وہ لمحہ بہ لمحہ اس کھنچاؤ کو بڑھاتا چلا جائے... تم موت کی تمنا کرو اور موت تم سے دور بھاگے۔ میری دعا ہے تمہارے لیے، تم بہت سے سال اور جیو..." وہ اپنے وجود کی ساری نفرت لہجے میں سمو کر بولی۔

"تم اسی بے بسی، اسی تکلیف، اسی کرب کے ساتھ ایڑیاں رگڑو۔ موت مانگو اور تمہیں موت نہ آئے۔ یہی میری دعا ہے تمہارے لیے۔" کہہ کر وہ تیزی سے جھٹکے سے مڑ کر جانے لگی تو پیچھے کھڑے واثق کو دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔ پھر اپنے چہرے کی تمام تر جذباتی کیفیت چھپاتی، تیزی سے باہر نکل گئی۔

واثق گم صم سا وہیں اپنے قدموں پر جما کھڑا رہ گیا۔

وہ ایڑیوں کے بل ذرا سا گھوما اور ماں کے بادامی رنگ کے دروازے کی اوٹ میں گم ہوتے آنچل کو تا دیر دیکھتا رہا۔

"امی یہ سب کچھ کیا کہہ رہی تھیں۔ یہ کیسی دعا تھی! کیا امی جانتی ہیں انکل کو..." وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا ایک نظر بستر پر لیٹے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے زبیر کو دیکھنے لگا۔

"انکل اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔" وہ سنبھل کر اس کے پاس آکر بولا تھا۔ زبیر بس بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ کو کچھ چاہیے۔" وہ جواب میں اسی بے چارگی سے بس دیکھتا رہ گیا۔

مگر واثق کچھ اور ہی سوچے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وردہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" مثال حیرت زدہ نظروں سے سامنے کھڑی وردہ کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر

واضح ناراضی تھی۔

"تو مجھے اور کیا کہنا چاہیے؟" وہ طنز سے الٹا پوچھ رہی تھی۔

"نہیں تم مجھ سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کررہی تھیں تو مجھے لگا شاید کہ مجھ سے ناراض ہو تو میں نے اس لیے پوچھ لیا۔" مشال کچھ شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

"اور میں نے بھی آپ کو اس کا صاف اور سیدھا جواب تو دے دیا کہ میں آپ سے کیوں ناراض ہونے لگی جب میرا آپ سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ میں تو آپ کو ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں اور آپ زبردستی ہمارے گھر میں میرے بھائی کی زندگی میں آکر گھس گئی ہیں جو مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا' سو میں نے کہہ دیا۔" وہ واضح طور پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کندھے اچکا کر بے حد رکھائی سے بولتی چلی گئی۔

اس کی یہ واضح ناپسندیدگی مشال کے لیے بہت اچانک اور پریشان کن تھی۔

"میں پوچھ سکتی ہوں اس ناپسندیدگی کی وجہ؟" وہ کافی دیر بعد خود کو بولنے کے قابل کرسکی تھی۔

"بہت سی وجوہات ہیں۔" وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔ "اور کوئی بھی وجہ نہیں ہے۔" وہ عجیب بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولی۔

"اور معاف کیجئے گا آپ کو یہ برا نہیں لگا کہ میں آپ سے اچھی طرح سے بات نہیں کررہی' بلکہ آپ کو یہ برا لگا کہ میں آپ سے اس چاپلوس انداز میں بات نہیں کررہی' جس کی آپ اس گھر میں آکر عادی ہوچکی ہیں' میرے سادہ سے بھائی اور میری بے غرض سی ماں کو تو آپ بے وقوف بنا سکتی ہیں' مگر مجھے نہیں۔" مشال سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وردہ کے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت ہوگی۔ نفرت بھی ایسی' جس کا بظاہر کوئی جواز نہیں۔

"میں کیوں بے وقوف بناؤں گی کسی کو بھی وردہ۔" وہ پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا سادگی ہے اور کیا معصومیت' لیکن میں آپ کو بتا چکی ہوں آپ مجھے اس سادگی اور مصنوعی بھولپن سے ٹریپ نہیں کرسکتیں۔" وہ اسی سنگ دل اور کٹھور لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"وردہ!" مشال حقیقتاً پریشان ہوگئی تھی۔

"آپ کسی کو زبردستی خود کو پسند کرنے پر مجبور نہیں کرسکتیں۔ آپ مجھے اچھی نہیں لگتیں' سو نہیں لگتیں سمپل۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اندر جانے لگی تو باہر سے آتا واثق اور عاصمہ اس کی آخری بات سن کر بے اختیار ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ دونوں کو نظرانداز کرکے کتاب اٹھائے اندر چلی گئی۔ مشال ساکت سے ان دونوں کی آمد سے بے خبر اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی تھی۔

واثق اور عاصمہ پریشان نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

"احسن یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ؟" بشریٰ کے چہرے پر شدید حیرت اور پریشانی تھی۔

"میں نے شاید جلد بازی کی حالانکہ میں نے زندگی.... اسپیشلی بزنس کے معاملے میں ہمیشہ بہت محتاط رویہ اختیار کیا ہے لیکن اس بار میں اس کمپنی کے جھانسے میں آگیا۔ سب کچھ پاکستان سے سمیٹ کر یہاں آگیا۔ مگر یہاں کے حالات۔" وہ پریشانی سے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر گم صم سا رہ گیا۔

"کیا زیادہ کرائسز میں ہے بزنس۔" بشریٰ نے کچھ محتاط لہجے میں پوچھا ورنہ معلوم نہیں' وہ کب کس بات پر بھڑک اٹھے۔

"کرائسز بہت چھوٹا لفظ ہے اس کے لیے۔" وہ اسی طرح مایوس لہجے میں بولا۔

"پھر اب کیا کریں گے۔" کچھ دیر بعد بشریٰ پھر سے بولی۔
"پتا نہیں۔ ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ بشریٰ کو کبھی بھی اتنا پریشان اور دل گرفتہ نہیں لگا تھا۔
"کیا ہم واپس نہیں جاسکتے۔ مطلب پاکستان۔" وہ پھر سے کچھ ڈرے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔
احسن کا رد عمل بشریٰ کی توقع کے عین مطابق تھا۔ اس نے ناراض نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
"تمہارے خیال میں یہ سب بہت آسان ہے۔ یوں بزنس، گھر اکھاڑ کر ادھر آنا اور یہاں کام نہ بنے تو سب سمیٹ کر واپس چل پڑنا۔" وہ طنز بھرے لہجے میں بولا تھا۔
بشریٰ خاموش سی رہ گئی۔
وہ اس سے کس انداز میں تسلی چاہ رہا تھا۔ بشریٰ سمجھنے سے قاصر تھی۔
"سیفی کو میں نے سمجھایا تھا یہاں رہ کے اپنی ایجوکیشن یہیں مکمل کرلے، میرے ساتھ بزنس دیکھ لے مگر اس نے بھی شاید مجھے تنگ کرنے کی ٹھان لی ہے، چلا گیا اور اب وہاں جاکر بھی کچھ نہیں کررہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں کیا کروں۔"
سمجھ میں تو بشریٰ کے بھی نہیں آیا تھا کہ اس کی اس پریشانی کو کس طور حل کرے۔ سو خاموش بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼
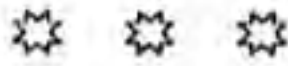
"عدیل! آخر اس میں کیا حرج ہے اگر دانی باہر جاکر پڑھنا چاہتا ہے۔" عفت نے موقع دیکھ کر بات شروع کی۔
"اے لیول تو وہ جیسے تیسے کر ہی لے گا۔ اس کے بعد بھی تو اسے یہی کچھ کرنا تھا۔ مطلب کہیں۔۔۔ ابروڈ تو جانا ہی تھا۔" وہ عدیل کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولی۔
"وہ ابھی میچور نہیں ہے عفت! تم کیوں نہیں سمجھتیں۔" وہ زچ ہو کر بولا تھا۔
"اسے یہاں سے کہیں اور بھجوانے کی ضرورت ہے، آپ کو بھی یہ بات سمجھنی چاہیے عدیل۔" عفت ڈھکے چھپے انداز میں جیسے بہت کچھ کہہ گئی۔
عدیل نے چونک کر اسے دیکھا۔
اس کی بات میں کچھ تھا جو شاید عدیل کی نظروں سے چھپا تھا۔ "اسکول کالج بدلنے سے فرق نہیں پڑے گا یہاں۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کچھ ایسے دوست جنہیں وہ چاہتا ہے چھوڑنا اور اور جانا چاہتا ہے مگر۔۔۔ وہ ہتھیلیاں ملتے ہوئے آگے کا مدعا جیسے حذف کرگئی۔ "پھر فوزیہ ہے وہاں، وہ اسے بلوا سکتی ہے، پاس رکھ سکتی ہے، وہ اپنی اسٹڈیز بھی مکمل کرے گا اور ساتھ میں چھوٹی موٹی جاب بھی اسٹارٹ کردے گا۔ اس کے اپنے اوپر ذمہ داری پڑے گی تو یقیناً" ٹھیک ہو جائے گا۔" عدیل اسے بس بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا۔
عفت بہت کچھ دانی کے ساتھ پلان کرچکی تھی۔ عدیل کو صرف یہ ڈر تھا جو یہاں ماں باپ کے ساتھ رہ کر کچھ نہیں بن سکا۔ وہ کہیں اور جاکر کیا کرے گا۔
"آپ فوزیہ سے بات کریں یا پھر میں کروں۔ ویزہ وغیرہ سب ہم نے ہی کرنا ہے۔ وہ kinShip (خونی رشتہ) کی بنیاد پر اسے بلوا تو سکتی ہے۔" عفت عدیل کو خاموش دیکھ کر پھر سے ملتجی لہجے میں بولی۔
"تم کیا سمجھتی ہو۔ فوزیہ آسانی سے مان لے گی۔ یہ سب۔" وہ بہت دیر بعد بولا تھا۔
"کیوں نہیں مانے گی۔ ہمارا دانی اس پر بوجھ تھوڑی بنے گا۔ اگر وہ وہاں رکھے گی تو ٹھیک ورنہ یہ جاکر کچھ ٹائم کے بعد اپنا جو بھی بندوبست ہو گا دیکھ لے گا۔ آپ بات تو کریں۔"
"یا میں کروں۔" وہ عدیل کی خاموشی کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکی اور فوراً" سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ تم خود کرلو بات' وہ جو کہے گی پھر ہم دیکھ لیں گے' مجھے نہیں لگتا وہ اتنی آسانی سے مانے گی۔"
عفت اس کی اگلی بات سنے بغیر باہر جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں گھٹن سی ہو رہی تھی۔
اور وہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر کھڑکی نہیں کھول پا رہی تھی۔ بس پتھر کی طرح ایک ہی جگہ ساکت و جامد تھی۔
وردہ کا رویہ اسے بہت کچھ یاد دلا گیا تھا۔
فوزیہ پھپو کے بشریٰ کے ساتھ ہونے والے جھگڑے' جن کی وجہ سے آئے دن عدیل اور بشریٰ کے درمیان بڑھتی ہوئی رنجشیں اور دادی امی!
جس کا نتیجہ ہمیشہ کی جدائی نکلا تھا۔
اسے بیٹھے بیٹھے بہت کچھ دل دہلا دینے والا سوجھنے لگا تھا۔ وردہ کے لہجے کی نفرت' اسے بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔
پھر واثق اور عاصمہ نے جس طرح اسے ہاتھ کا چھپھولا بنا رکھا تھا' وہ تو اسے چند ہی دنوں میں پتا چل گیا تھا۔ اگر کچھ ایسا ویسا ہوا تو واثق۔ وہ بھی تو ایک بھائی ہے' پاپا جیسا بھائی۔ فوزیہ پھپو کے لیے پاپا نے اپنی اتنی چاہنے والی بیوی کی پرواہ نہیں کی۔ میں تو پھر زبردستی اس گھر پر مسلط کی گئی ہوں۔
مجھے واثق سے بات کرنی چاہیے۔ وہ عجیب سی گھبراہٹ کا شکار ہو کر کھڑکی سے دور گئی تھی۔
"یوں اندھیرے میں اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔" واثق اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔
مثال لحہ بھر کو کچھ بول ہی نہیں سکی۔
"آپ کب آئے گھر۔ آنٹی بھی آگئی ہوں گی؟" مثال رخ پھیر کر یونہی صوفے پر پڑے کشنز ٹھیک کرتے ہوئے غیر متوازن لہجے میں پوچھنے لگی۔
"تمہیں کیا ہوا ہے مثال؟" وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر گہرے لہجے میں بولا۔
وہ ساکت سی رہ گئی۔
واثق کو میرے دل کی حالت کا کیسے پتا چل جاتا ہے۔
"کچھ بھی نہیں ٹھیک ہوں میں۔ بس یونہی بیٹھی تھی' آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ نظریں چرائے' رک رک کر بولتی رہی۔
"ابھی تک تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آیا اور یہ یاد رکھنا اگر تم نے جھوٹ بولنا سیکھ بھی لیا تو مجھ سے نہیں بول سکو گی۔" وہ اسے سختی سے کندھوں سے پکڑے کہہ رہا تھا۔
"وردہ کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے تمہارا۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بولا تو مثال کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بے اختیار اس کے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

☼ ☼ ☼
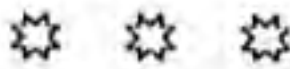
"کیا؟" اچھا کب؟" عدیل پہلے کچھ حیران ہو رہا تھا پھر ذرا جوش سے پوچھ رہا تھا۔ عفت ہاتھ میں چائے کی ٹرے لیے وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔
"ہوں۔! چلو ٹھیک ہے جو بھی کنفرم ہو مجھے بتا دینا۔ مجھے انتظار رہے گا۔ خدا حافظ۔" کہہ کر فون بند کرتے ہوئے وہ جیسے کسی گہری سوچ میں تھا۔
"کس کا فون تھا؟" اس سے زیادہ عفت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"پری کہاں ہے۔" عدیل نے بالکل ہی الگ سی بات پوچھی تھی۔ عام حالات میں یوں پری کے بارے میں پوچھنا عفت کو اچھا لگتا تھا مگر اس وقت۔ وہ غصے کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"اپنے روم میں ہے!" وہ بے زاری سے بولی۔

"کالج گئی تھی یہ آج!" عدیل کو پھر کچھ خیال آیا۔ عفت نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"دو دن سے نہیں جا رہی کالج۔" وہ آہستگی سے چند لمحوں بعد بولی۔

"اور تم نے اسے کہا بھی نہیں، گھر بٹھا لیا۔ اتنے مہنگے کالج میں ایڈمیشن کروایا اس کا، یوں چھٹیاں کرنے کے لیے۔" عدیل کو غصہ آگیا۔

"وہ ناراض ہے آپ سے اس دن کی بات پر۔" عفت، کچھ جتا کر بولی تھی۔ عدیل کوفت سے چائے پینے لگا۔

"آپ نے بتایا نہیں فون کس کا تھا؟" اسے پھر بے چینی نے گھیرا۔

"فوزیہ کا۔" عدیل کے جواب پر عفت کا دل جیسے حلق میں آگیا۔

"کیا کہہ رہی تھی وہ۔ میں نے جب فون کر کے کہا تھا تو بہت خوش ہوئی تھی۔ کچھ بتایا ویزے کے بارے میں، دانی کے۔" وہ جوش سے کہتی چلی گئی۔

"فوزیہ خود آرہی ہے پاکستان۔ کچھ دنوں میں۔" عدیل نے جیسے دھماکا کیا تھا عفت کے کانوں کے پاس۔

"فوزیہ کب۔ کیوں؟" وہ کچھ بوکھلا کر بولی۔ عدیل جواب میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"کوئی وجہ تو بتائی ہو گی پاکستان آنے کی۔" وہ پھر بے قراری سے بولی۔

"کچھ خاص نہیں اور مجھے زیادہ پوچھنا اچھا بھی نہیں لگا ظاہر ہے۔ وہ میری بہن ہے اور بہت سالوں سے یہاں آئی بھی نہیں، ہو سکتا ہے اب اس کا دل چاہ رہا ہو۔ ہم سب سے ملنے کے لیے۔" عدیل رک رک کر کچھ بے تاثر لہجے میں کہہ گیا۔

"اور جو مثال کی شادی میں آپ نے انوائیٹ کیا تھا اس وقت تو اس نے صاف منع کر دیا تھا۔ اب چند ہی دنوں بعد دل اداس ہو گیا۔ اس کا۔ عجیب سی بات ہے۔" عفت آخر میں منہ میں بڑبڑائی تھی۔

"بھئی میں یہ بھی اسے نہیں جتا سکتا تھا اور آنے سے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔" عدیل نے جلدی سے چائے کا کپ خالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھوں ذرا پری کا کیا مسئلہ ہے یوں کالج سے آف کرنے کا۔" کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"یہ فوزیہ کو ایکا ایکی یہاں آنے کی کیا سوجھی۔ اب کس مقصد کے لیے یہاں آنا چاہ رہی ہے۔ اگر دانی کو وہاں بلانے سے روکنے کے لیے تو وہ وہاں بیٹھے بھی منع کر سکتی تھی یوں یہاں آکر وہ کیا خاص بات کرنا چاہتی ہے۔ حد ہے بھئی! یہاں کسی کو کچھ ذرا سا کام کہہ دو، وہ سر پر ہی چڑھنے کے لیے آجاتا ہے۔" وہ ناگواری میں بڑبڑاتے ہوئے چائے کے خالی برتن اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆
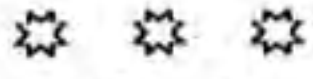
"تمہارا وہم ہے مثال! ورده کیوں تمہیں ناپسند کرنے لگی۔ بہت اسٹریٹ فارورڈ ہے ورده یونہی بول دیا ہو گا ورنہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ورده مجھ سے اٹیچڈ ہے اور وہ تم سے محبت بھی کرتی ہے۔"

مثال چہرہ جھکائے بے یقین سی خاموش بیٹھی رہی تھی۔ اس نے زیادہ بحث نہیں کی تھی، نہ واثق کے دعوے کی تردید کی تھی۔ اسے لگا تھا اگر وہ زیادہ ورده کے رویے کی شکایت کرے گی تو شاید واثق کو لگے گا کہ وہ روایتی بھابھی بن کر نند کے خلاف زہر اگل رہی ہے۔

واثق نے اسے تو تسلی دے کر خاموش کروا دیا تھا مگر اس کے اپنے دل میں جیسے بے چینی سی آگئی تھی۔ وردہ کا رویہ واثق سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ مگر وہ اسے یوں ہی ذرا سی خفگی سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا جو آئس کریم یا کسی بھی عام سے گفٹ کے ذریعے وہ دور کیا جا سکتا ہے۔

اور وہ دور کرنا بھی چاہتا تھا لیکن آج کل اسے وقت نہیں مل پا رہا تھا۔ پہلے شہزادی کی وجہ سے اسے آفس میں ٹائم دینا پڑ رہا تھا۔ اب مثال کی کشش اسے آفس میں کام ختم کرتے ہی گھر بھاگنے پر مجبور کر دیتی۔ شاید وہ خود بھی وردہ کو کچھ نظر انداز کر رہا ہے اور اسی بات پر وہ دل میں ناراض سی تھی۔

مثال کو یہاں کوئی اجنبیت کوئی اکیلا پن محسوس نہیں ہونا چاہیے‘ اس کے لیے عاصمہ اور وردہ سے اس کے اچھے تعلقات ضروری ہیں۔ اور مجھے اس کے لیے مثال کا ساتھ دینا ہوگا۔ لیکن عاصمہ کا اسپتال سے آنے کے بعد مبہم سا رویہ بھی اسے الجھا رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

اگلے روز عفت کچھ حیران کچھ خوش تھی۔

پری کالج کے لیے تیار ہو کر ناشتا کرنے آچکی تھی۔ دانی بھی آج کل باقاعدگی سے کلاسز لے رہا تھا۔

"تو مثال کے منحوس سائے بالآخر اس گھر سے ٹلنے لگے۔" اس نے طمانیت بھرا گہرا سانس لیا۔

عدیل کا رویہ بھی اب اس کے ساتھ کافی بہتر ہوتا جا رہا تھا ______ شادی کے دوران جو بدمزگی ہوئی تھی اس کا تاثر زائل کرنے کے لیے‘ عدیل اس کے ساتھ بہت نرم محبت بھرا سلوک کر رہا تھا۔

"پاپا تیار نہیں ہوئے آفس کے لیے۔" پری بالکل نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔ عفت کو خوشی محسوس ہوئی۔

"ابھی کچھ دیر ہوئی اٹھے ہیں۔ کہہ رہے تھے آج کچھ لیٹ جانا ہے انہیں آفس۔" عفت نے پری کا پسندیدہ اورنج جوس اس کے آگے رکھا۔

"فوزیہ پھپو سے بات ہو گئی آپ کی مما؟" دانی اپنی ہی الجھن میں تھا زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکا۔

"ہاں ہو گئی ہے۔" عفت ٹالنے والے انداز میں بولی۔

"وہ کیا کہہ رہی تھیں‘ کب تک ویزے کا کریں گی۔" وہ بے چینی سے پوچھ رہا تھا۔

"بیٹا جی یہ ٹیکنیکل باتیں ہیں۔ تمہاری پھپو نے تمہارے پاپا سے کی ہیں۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔" عفت نے جیسے جان چھڑائی۔

"اور شاید فوزیہ خود بھی چکر لگائے یہاں کا۔" وہ آخر میں ذرا رک کر بولی۔

"وہ کیوں آ رہی ہیں؟ کیا کریں گی یہاں آکر؟ میں جو جا رہا ہوں وہاں۔" وہ کوفت بھرے لہجے میں بولا۔

"ہاں جیسے وہ صرف تم سے تو ملنے کے لیے آ رہی ہیں‘ کیا خوش فہمی ہے بھئی۔" پری اسے چڑانے کو جوس کا خالی گلاس رکھتے ہوئے بولی۔

"میں تم سے بات نہیں کر رہا۔" وہ تنفر سے پری کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"میں کون سا تم سے بات کرنے کے لیے مری جا رہی ہوں۔ جلو مت۔" وہ جواباً ہنکارا بھرتی‘ بیگ کندھے پر ڈال کر جانے کے لیے تیار تھی۔

"مما! میں جا رہی ہوں کالج وین آنے والی ہے میری۔" وہ کسی خیال کے آنے پر یوں ہی ذرا سا مسکرا کر جھک کر ماں کا ماتھا چوم کر بولی۔ تو عفت کا دل جیسے نہال ہو گیا۔

بہت عرصے بعد وہ پہلے جیسی پری لگی تھی۔
"جیتی رہو ہمیشہ خوش رہو خدا کامیابی دے بہت جاؤ اللہ کی امان میں۔" عفت اسے دعائیں دینے لگی۔ وہ چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" واثق کے لیے یہ بات کسی شاک سے کم نہیں تھی وہ بے یقینی سے ماں کو دیکھتا رہا۔
عاصمہ ان تین راتوں میں جیسے کسی قبر میں اتر گئی تھی۔
بیس سال پہلے کی وہ خوف ناک رات جیسے اس کے اندر سانس لینے لگی تھی جی اٹھی تھی۔
وہ چاہنے کے باوجود اس سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ تین دن سے اس نے اکیڈمی سے بھی چھٹی لے رکھی تھی۔ گھر میں بھی وہ صرف اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔
واثق ان تین دنوں میں اس سے کئی طرح سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھنے کی کوشش کر چکا تھا۔
مگر وہ ہر بار ایک یاس بھری گہری نظر ڈال کر بالکل خاموش ہو جاتی واثق نے اسے اپنی قسم دی تو اس نے اپنی آبرو کی بے داغ عمارت مسمار ہونے کے سوا سب کچھ بتا دیا۔
اور واثق کو بھی اپنی زندگی کے سب سے مشکل اذیت بھرے دن یاد آ گئے۔ کس طرح اس نے اپنے ہنستے بستے گھر کو ایک بار نہیں کئی بار بنیادوں سے ہلتے اور ان کے اوپر گرتے دیکھا تھا۔ اس کی ماں اس کی بہنیں اور وہ خود کئی بار موت کی بانہوں میں جاتے جاتے بچے تھے۔ اور آخری دھچکا اس کے باپ کے اس نام نہاد فراڈیے دوست نے دیا تھا جسے کل تک وہ اپنے دوست کا باپ جان کر دل و جان سے افسردہ تھا۔
واثق سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
"کتنے سال ہو گئے ہیں ماما یہ شخص اپنے اعمال کی دوزخ میں جل رہا ہے۔ یتیموں کا مال کھانے والے کا انجام نہ اس دنیا میں اچھا ہے نہ اس دنیا میں۔ پھر بھی لوگ سبق کیوں نہیں حاصل کرتے۔" وہ رنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
اور عاصمہ کے تو جیسے لب ہی گنگ ہو گئے تھے۔
اس کے اندر سارے الفاظ مر گئے تھے۔ سارے جملے بے مطلب و بے معنی ہو گئے تھے۔
تین دن سے وہ درد کے ایسے گہرے دریا میں غوطہ زن تھی جس میں بمشکل وہ ہاتھ پاؤں مارتے خود کو بچانے کی سعی کر رہی تھی۔
"ڈاکٹرز جواب دے چکے ہیں۔ اور موت اسے ساتھ لے جانے کے لیے تیار نہیں۔ زمین کے اوپر زمین کے نیچے وہ دونوں طرح سے ایک بوجھ بن کر رہ گیا جسے کوئی بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔" واثق کچھ دیر بعد پھر بوجھل لہجے میں بولا۔
"صرف یہی نہیں ماما! آپ کو معلوم ہے اسے قدرت کی طرف سے سزا تو بہت شروع میں ہی مل گئی تھی۔ یہ تو بس آخری ضرب ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا تو عاصمہ نا سمجھی سے دیکھنے لگی۔
"شہزاد زبیر انکل کا اپنا بیٹا نہیں ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا تو عاصمہ چونک کر رہ گئی۔
"بہت سال پہلے زبیر انکل کی بیوی اور دونوں بچے ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے یہ کچھ سال بہت اذیت اور تکلیف میں رہے پھر انہوں نے شہزاد کو جو ان کے دور کے رشتے دار کا لاوارث بچہ تھا اسے ایڈاپٹ کیا اور اس کی اپنے بیٹے کی طرح پرورش کی مگر اپنے بچوں اور بیوی کی جدائی نے اس شخص کو ہمیشہ رنجیدہ رکھا۔

کسی کو دھوکا دینے والے‘ دکھ پہنچانے والے خود بھی کبھی خوشیاں نہیں پاتے مما! اور خدا بڑا حساب لینے والا ہے۔ اس کا بدلہ بڑا ہی دردناک ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنے غضب سے محفوظ رکھے ہمیشہ یہ۔

اور مما! آپ بھی اس سب کو بھول جائیں اب۔ ہم سب سے سب کچھ چھیننے والے کے پاس وہ سب کچھ چند دن بھی نہیں رہا‘ بہت سال اس نے بھی مفلسی جھیلی پھر کہیں جاکر کچھ سیٹ ہوا ہے اب تو سب کچھ شہزاد کی محنت اور خلوص سے اور وہ اپنے ساتھ کی گئی نیکی کا بدلہ چکا رہا ہے۔“

”ہوں‘ ملی ہوں میں اس لڑکے سے۔ سعادت مند والدین کی اولاد ہے جو خدا نے اس پر کیے گئے احسان کو بھی اس دنیا میں چکانے کا انتظام فرمادیا۔“ عاصمہ گہرا سانس لے کر بولی۔

”اچھا اب بھول جائیں اس سارے قصے کو۔ اتنے دنوں سے خود کو یوں بند کررکھا ہے‘ پلیز آپ کی اس حالت کی وجہ سے گھر میں کتنی ڈسٹربنس ہے کچھ خیال ہے آپ کو۔“ وہ کچھ جتانے والے انداز میں بولا۔

”کیا ہوا؟“ عاصمہ کچھ فکرمندی سے بولی۔ واثق لمحہ بھر کر خاموش رہ گیا۔ کہ وردہ کی ساری بات عاصمہ کو بتائے یا نہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہا تھا‘ سوچنے لگا۔

”واثق! کچھ ہوا ہے بیٹے۔“ وہ نرمی سے پوچھنے لگی۔

”وردہ شاید مثال کو Accept (قبول) نہیں کرپارہی ہے شاید۔“ وہ رک کر بات پوری نہ کرتے ہوئے بھی جیسے سب کچھ کہہ گیا۔

”مثال سے کچھ کہا اس نے۔“ عاصمہ سوچ کر بولی۔

”آپ جانتی تو ہیں۔ وہ پہلے سے ہی کچھ ناخوش تھی۔ کچھ اور قسم کی توقعات تھیں اس کی پھر جس طرح اچانک یہ سب کچھ ہوا تو اسے ایک اجنبی لڑکی کو گھر میں بہت اہم جگہ پر دیکھنا کچھ اتنا پلیزنٹ نہیں لگ رہا۔“ وہ رک کر حتی الامکان نرم الفاظ میں کہہ رہا تھا۔ مبادا عاصمہ کچھ اور مطلب لے لیں کہ وہ چند ہی دنوں میں بیوی کی ہمدردی میں بہن کی مخالفت پر اتر آیا ہے۔

”تم پریشان نہیں ہو۔ میں دیکھ لوں گی سب۔“ عاصمہ اس کی توقع کے عین مطابق سمجھ داری کا اظہار کرتے ہوئے سرہلا کر بولی تو واثق کو گہرا اطمینان ہوا۔

”اچھی بات ہے۔ یہ گھر کے معاملات ہیں مما! اور میں چاہتا ہو جیسے پہلے گھر کے سارے معاملات آپ خود ہی بہت سمجھداری اور طریقے سے چلاتی رہی ہیں اسی طرح اب بھی چلائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے ان میں انوالو ہونا پڑے۔“ اور ڈھکے چھپے لفظوں میں جیسے سب کچھ کہہ گیا تھا۔

”میرے بیٹے! تم کیوں فکرمند ہورہے ہو۔ میں دیکھ لوں گی نا سب کچھ۔ اور وردہ بہت ناسمجھ اور بدزبان سی ہے۔ اسے کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ تم آفس کے لیے لیٹ ہورہے ہو ان ساری باتوں کو اپنے دماغ سے نکال کر اپنا دھیان صرف اپنے کام کی طرف لگاؤ۔“ عاصمہ ہمیشہ کی طرح اس کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے شفقت سے بولی۔ تو واثق سرہلا کر رہ گیا۔ ”اور واثق ایک بات اور بھی بیٹا۔“ وہ جانے لگا تھا جب عاصمہ نے سنجیدگی سے اسے روکا۔

”کوشش کرو‘ چند ماہ تک جیسے بھی ہوسکے بزنس سے اپنے شیئرز الگ کرکے اپنے طور پر بزنس کرو تو تمہارے لیے یہ زیادہ ٹھیک رہے گا تم سمجھ رہے ہو ناں۔“ وہ اثبات میں سرہلا کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

✲ ✲ ✲

”ہاں تو وہ ہے ہی اسی فطرت کی مالک بتم دیکھنا وہ کیسے تمہیں اور تمہاری ماما کو گھر کے معاملات سے الگ کرکے

سب کچھ اپنی مٹھی میں کرتی ہے۔ اس کی ماں بھی تو اسی طرح کی تھی 'میری دادو اور پھپھو اگر تم ان سے ملتیں تو تمہیں اس مثال آپی کی نیچر کا ٹھیک ٹھاک اندازہ ہو جاتا۔" پری مزے سے اپنا موبائل پر کوئی گیم کھیلتے ہوئے وردہ سے کہہ رہی تھی۔

وردہ کے چہرے پر کچھ اور بھی پریشانی جھلکنے لگی۔

"شکل سے تو اتنی معصوم لگتی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد یاسیت سے بولی۔ "وہ ماں بیٹی شکل کی معصومیت کا تو فائدہ اٹھاتی رہی ہیں۔ میرے پاپا کو دیکھا ہے نا' کیسے پہلے اس کی ماں کے پیچھے دیوانے ہو گئے۔ اتنے سال میری ماما بے چاری ساری زندگی ان کی بے دام کی لونڈی بنی رہیں 'مگر پاپا نے کبھی آج تک ماما سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کی۔ محبت کرنا' دل میں جگہ دینا تو بہت دور کی بات۔"

وہ کہتے کہتے بے اختیار آنکھوں میں نمی لے آئی۔

"اور یہ مثال آپی' سمجھو ایک تو تا ہے۔ جس میں میرے پاپا کی جان ہے۔ اس کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ شادی والا واقعہ بہت پرانا تو نہیں' حالانکہ فہد بھائی ڈائیوورس دے رہے تھے پہلی بیوی کو تو' لیکن پاپا نے سالوں پرانا دوستی تعلق سب کو ٹھکرا دیا بیٹی کی خاطر۔ ایسا گہرا جادو ہوتا ہے ان ماں بیٹی کا کہ امی ساری زندگی پھڑ پھڑا نہیں سکیں۔"

بس یار تم اپنے بھائی کو خود کو اور اپنی ماما کو ان سے بچا سکتی ہو تو بچا لینا جو کہ ناممکن ہے۔"

"پلیز مجھے ڈراؤ تو نہیں۔" وردہ روہانسی ہو کر بولی۔

"لکھ کر رکھ لو میری بات۔ چند دنوں میں ہی تمہارے بھائی تمہاری ماما سے تمہاری شکایت کرتے نظر آئیں گے۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ رکنے والا نہیں 'پھر انہیں تمہاری ماما سے بھی مسائل ہونے لگیں گے اور آخر میں اکٹھے رہنے سے۔"

پری' وردہ کی آنکھوں کے سامنے گویا تصویر کھینچتی جا رہی تھی۔ وردہ کے چہرے اور آنکھوں میں خوف سمانے لگا تھا۔

"مگر کیوں؟ ماما تو انہیں اتنی محبت دے رہی ہیں۔ ایسا اسپیشل پروٹوکول' پھر ماما سے انہیں کیا شکایت ہو سکتی ہے؟" وردہ الجھ کر بولی۔ وہ حقیقتاً" پریشان ہو گئی تھی۔

"ان ہی سے تو اسے مسئلہ ہو گا۔ وہ تمہارے بھائی کے گرد نہ تمہیں رہنے دیں گی نا تمہاری ماما کو۔ بس اب یہ کچھ ہی مہینوں کی بات ہے۔ پھر تمہیں یقین آئے گا' میں کتنا سچ بول رہی تھی اور کتنا جھوٹ۔" کہتے ہوئے یونہی وردہ کا سیل فون اٹھا کر چیک کرنے لگی۔ وردہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼
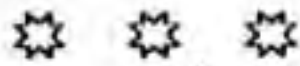
عدیل کی راستے میں اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ مثال کو پتا چلا تو وہ فوراً" واثق کے ساتھ عیادت کے لیے آگئی۔ آتے ہی اسے محسوس ہو گیا تھا کہ عفت کو اس کا یوں آنا اچھا نہیں لگا۔ مگر وہ اس کی سرد نگاہوں کی عادی تھی۔ سو نظرانداز کر گئی۔

"میں پاپا کے پاس رات رکوں گی۔ عفت ماما شادی کے بعد میں ان کے پاس نہیں آئی۔ میں واثق سے کہہ کر آئی ہوں رات رکنے کے لیے۔" کچن میں عفت کو ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے اطلاعی انداز میں کہا تھا۔

"تم یہاں رک کر کیا کرو گی؟" عفت نے بے اختیار کہا تھا۔

مثال اس اچانک صاف جواب کے لیے تیار نہیں تھی 'عفت کو یکھتی چلی گئی۔

"پہلے ہی تمہاری وجہ سے ہمارے گھر میں اتنے مسائل رہے ہیں۔ اب جا کر کچھ معاملات سلجھنے لگے ہیں۔ تو پھر آسیب بن کر چمٹنے کے لیے آگئی ہو۔ اپنے باپ سے۔"

"عفت ماما" وہ ششدر سی بس یہی کہہ سکی۔

"بس شادی کردی ہم نے تمہاری۔ میرے گھر میں میری اور اولادیں بھی ہیں جنہیں تمہاری وجہ سے تمہارا باپ ہمیشہ اگنور کرتا رہا ہے تمہیں خود تو اس بات کا کبھی احساس تک نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔"

وہ تو جیسے اندر سے بھری پڑی تھی۔ پھٹ کر بولتی چلی گئی۔

"ہاں تم نے بھی سوچا ہوگا میرے بعد کہیں یہ عفت اور اس کے بچے عدیل پر قبضہ نہ جمالیں ہم جا کر ان کے سر پر سوار جاؤ، لیکن اب میں تمہیں صاف بتا رہی ہوں کوئی لحاظ نہیں کروں گی۔

خیریت پوچھنے آئی ہو خیریت پوچھو اور چلتی بنو بہتر ہے جا کر اپنا گھر بناؤ۔ کہیں ماں کی طرح تم بھی۔ تین حرف ماتھے پر سجائے چلی آؤ۔" وہ آخری زہر میں بجھا تیر اس کے سینے میں اتار کر چائے کی ٹرے اٹھائے باہر نکل گئی۔

اور مثال کو لگا جیسے وہ کھڑے کھڑے ہی مرگئی ہو۔

ایسی ذلت اس نے کبھی نہیں سہی تھی یا سہی بھی تھی تو بھول گئی تھی۔ ان چند دنوں میں واثق کی محبت پا کر وہ پچھلی ساری اذیتیں، ساری ذلتیں جیسے بھول ہی چلی تھی۔ مگر آج عفت نے کیسے تاک تاک کر نشانے لگائے تھے کہ کچے زخموں کے ادھڑنے والی تکلیف نے اسے دوہرا کردیا تھا۔

لحہ بھر میں گھر کے در و دیوار سب کچھ اجنبی اور پرایا ہو گیا تھا۔

وہ تو سمجھی تھی شاید اس کے چلے جانے کے بعد کسی نہ کسی نے اس کی کمی کو محسوس کیا ہوگا اور کچھ نہیں تو دنیا داری نبھانے کو عفت ضرور اسے خود سے رات رکنے کو کہے گی کہ شادی کے بعد سے وہ یہاں آکر چند گھنٹے بھی نہیں رکی تھی۔

لیکن عفت نے تو سارا معاملہ ہی جیسے صاف کردیا تھا اس کا اس گھر پر، عدیل پر کسی بھی چیز پر کوئی حق نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بکواس کر رہی ہو یہ تم۔" واثق کو لگا جیسے کسی نے چٹا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔

پری کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے قریب تھی۔

"اگر آپ مثال آپی کو نہیں چھوڑیں گے خود سے تو میں اسے آپ کی اصل حقیقت بتا دوں گی۔ آپ کیا ہیں۔"

وہ کسی ماہر بلیک میلر کی طرح واثق کی آنکھوں میں دیکھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں بولی تھی۔

"کیا۔ کیا ہے اصلیت میری اور کیا بتا دو گی مثال کو میں بھی تو سنوں ذرا میں کیا ہوں۔ کیا ہے میری حقیقت؟"

واثق شدید غصے میں بل کھا کر رہ گیا۔ یہ چھوٹی سی کمینی لڑکی مسلسل اس کے اعصاب کے لیے امتحان بنتی جا رہی تھی۔

"آپ سن نہیں سکیں گے۔ سن لیں گے تو آپ کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ لیکن ایک بات طے ہے اگر آپ نے مثال کو نہیں چھوڑا تو وہ آپ کو چھوڑ دے گی۔ آخر میں آپ کو شادی تو مجھ ہی سے کرنی پڑے گی۔ میری ہی طرف آنا ہوگا۔" وہ جس بازاری انداز میں اس سے یہ سب کہہ رہی تھی واثق کی برداشت ختم ہوگئی۔

اس نے بڑے زور کا تھپڑ پری کے منہ پر جڑا تھا۔

پری اس اچانک تھپڑ کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ گنگ سی گال پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی۔

اسی وقت مثال اندر آئی تھی اور واثق کی اس حرکت نے اسے بھی بھونچکا کر دیا تھا۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ آئینہ کی شادی۔ یہ کیا ہو گیا ہے احسن آپ کو۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" بشریٰ ششدر سی احسن کو دیکھتی چلی گئی۔

احسن کی دگرگوں ہوتی حالت اسے بہت کچھ تو بتا رہی تھی لیکن اس کے دماغ میں یہ نئی چیز چل رہی ہے' اس کی اسے ایک فیصد بھی توقع نہیں تھی۔

"اس میں پچھ ہونے کی کیا بات ہے۔ ایک دو سالوں میں بھی تو اس کی شادی کرنا ہی ہے تو ابھی کیوں نہیں۔" وہ گہرے اطمینان سے اپنے آگے پڑی فائلوں کے ڈھیر میں گم مصروف لہجے میں بولا۔

"احسن! وہ ابھی چھوٹی ہے۔ بہت۔ شادی! نہیں پلیز۔ یہ ابھی نہیں۔" وہ حواس باختہ سی ہو گئی تھی۔

"کیا چاہتی ہو تم۔ میرے بعد اکیلی آئینہ کی ذمہ داری اٹھاپاؤ گی۔" وہ ایک دم سے سرد لہجے میں بولا تو بشریٰ کا دل جیسے رک سا گیا۔

"احسن!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"جو ہو رہا ہے بشریٰ! اسے ہو جانے دو' بہت اچھا رشتہ ہے میرے جاننے والے ہیں۔" وہ بولتے ہوئے رکا۔

"میرے دور کے رشتہ دار بھی ہیں اور سمجھو دوست بھی' ایک ہی بیٹا ہے' ایک بیٹی کی شادی کر چکے ہیں بہت سالوں سے یہاں سیٹل ہیں۔" وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔

"فار گاڈ سیک احسن' ابھی نہیں۔ وہ پڑھ رہی ہے۔" وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

احسن اسے دیکھتا رہا۔

"کوئی مسئلہ ہے۔ مطلب کوئی ایسی بڑی بات احسن! جس نے آپ کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ مطلب' آپ خود بھی جانتے ہیں ابھی آئینہ چھوٹی ہے۔ شادی جیسی بڑی ذمہ داری اٹھانے کے لائق نہیں ہے وہ۔"

"اور مجھے لگتا ہے بشریٰ میرے پاس وقت کم ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"احسن۔" بشریٰ کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکی۔

اس نے آگے پڑی ایک فائل بشریٰ کے ہاتھ میں دی۔ "اس کو پڑھ لو اچھی طرح سے۔ اس میں میری تمام میڈیکل رپورٹس ہیں' میرے دل کے تینوں والوز... ڈاکٹرز کے خیال میں اگر میں بائے پاس نہیں کرواتا تو بھی بس چھ آٹھ ماہ سے زیادہ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ اب تم خود سوچ لو کیا کرنا ہے۔" بشریٰ شاکڈ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"مثال!" واثق ششدر سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ جس کے چہرے پر عجیب سی سرد مہری تھی۔

"ہاں واثق! میں جاننا چاہتی ہوں۔ سب کچھ' جو آپ کے اور پری کے درمیان۔ پہلے سے تھا یا ابھی ڈیویلپ ہوا ہے۔"

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مثال کبھی اس سے ایسی بات بھی پوچھ سکتی ہے۔

اس کے اندر جیسے بہت کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔

اپنی محبت کا غرور' ایک چاہت کا مان' اندھے بھروسے کا یقین' اعتماد' ان سب کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں اور اس کے دل کو جیسے زخمی کر گئیں۔

"مثال! تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔ اس طرح کا مرد' ایسا مرد جو ایک ہی وقت میں دو لڑکیوں کے ساتھ۔ آخ تھو۔"

اس نے غصے سے رخ پھیر کر تھوک دیا۔
مثال لمحہ بھر کو گنگ رہ گئی۔
پری کی ذرا سی بات وہ سن چکی تھی، وہ کس طرح واثق کو بلیک میل کر رہی تھی کہ وہ مثال کو وہ سب کچھ بتا دے گی جو کبھی ان کے درمیان رہ چکا ہے۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔
"پتا نہیں مجھے کیا ہے آپ کے اور پری کے بیچ میں۔" وہ وحشت زدہ سی اس کا کالر کھینچ رہی تھی۔
"تمہیں کیا لگتا ہے کیا ہو گا ہم دونوں کے درمیان میں؟" وہ جیسے ایک اذیت کو سہتے ہوئے زخمی لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
مثال کو اس کی بات سے اور بھی دھچکا لگا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ واثق یہ سب باتیں جو وہ یونہی شاید سوچ بیٹھی ہے۔ واثق اتنی جلدی سے مان بھی لے گا۔
اس کے اندر تڑخ سے کچھ ٹوٹا تھا۔
وہ وہیں کھڑے نڈھال سی بیٹھ گئی۔
پتھرائی ہوئی نظروں سے واثق کو دیکھتی جا رہی تھی۔ "کب سے ہے۔ آپ دونوں کے درمیان۔ اور مجھے۔ مجھے کیوں پتا نہیں چلا۔ اگر یہ سب ہی تھا۔ واثق تو پھر مجھے۔ مجھے کیوں اتنا بڑا دھوکا دیا آپ نے۔"
وہ ٹوٹ ٹوٹ کر لفظوں کو بمشکل جوڑتے ہوئے جملہ بول رہی تھی اور واثق کو تو خود لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود کی پوری عمارت کسی ملبے کے نیچے دب گئی ہو اور اس سے سانس لینا بھی محال ہو رہا ہے۔
وہ وہیں اس کے قدموں کے قریب دو زانو بیٹھ گیا۔
"تمہیں یقین ہے۔ اس بات کا مثال کہ میں پری سے۔ تمہارے دل نے مان لی یہ بات۔ بتاؤ مجھے؟"
"ہاں مان لی میرے دل نے۔ اب سچ کیا ہے بتائیں مجھے۔ ورنہ میں پری سے معلوم کر لوں گی۔"
واثق ششدر سا دیکھتا گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شہبانہ فاطمہ

"کیا ہے؟"

یہ میں آپ سے نہیں کہہ رہا' وہ جو سامنے والے گھر کے لان میں کھڑی ہے نا... وہ لڑکی مجھ سے کہہ رہی ہے اور آپ کی طرح میں بھی حیرت کا شکار ہوں بلکہ حیرانی سے اسے گھور گھور کر دیکھ رہا ہوں۔

"گھونچو! میں تم سے ہی پوچھ رہی ہوں یہ ہدوانے (تربوز) جیسی آنکھیں نکالے کیا ٹک ٹک دیدم کی مثال بنے ہوئے ہو؟"

(ارے غضب خدا کا... میری ان ہی آنکھوں پر تو کالج کی کئی لڑکیاں فدا ہیں جنہیں اس نے...)۔"

"مونگ پھلی کھاؤ گی؟" میں نے بحر حیرت و صدمات سے نکل کر اپنے ازلی اعتماد سے پوچھا۔ اب حیرت کا جھٹکا اسے لگا تھا اور میں خود کو شاباشی دے رہا تھا۔ بھئی میں بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ "علی شیر ہمدانی"

"یوں لنگور کی طرح گرل پر لٹک کر مونگ پھلی کھانے سے تو بہتر ہے کوئی انسانی شغل فرماؤ اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ کہیں میرے ہاتھوں خرچ نہ ہو جانا۔"

(بلے بھئی بلے۔ ادھر وہ بھی لگتا ہے اپنے نام کی ایک ہی شاہکار روئے زمین پر اتری ہے۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا... یاد نہیں آرہا)

"یہ تمہارا نام شبنم کس نے رکھا ہے؟ درست کر کے شعلہ رکھ لو۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر سب سے پہلے تمہیں ہی خاکستر کروں گی۔" میرا کام ہو چکا تھا سو اب میں واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور پھر سے اپنی کتابوں پر جھک گیا۔

آپ بھی سوچتے ہوں گے کیسا نظرباز انسان ہے۔ ارے نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہم پچھلے ڈیڑھ سال سے اس کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ میرے بڑے بھائی جو آرمی میں کرنل ہیں اور آج کل اسی شہر میں تعینات ہیں۔ یہ گھر بھی آرمی کی طرف سے ملا ہے اور سامنے والے گھر میں رہنے والی علیزے سے میری یونہی نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔ ارے نا۔ نا... نظرباز نہیں ہوں میں جناب۔ علیزے کو شبنم اور شعلہ جان بوجھ کر کہتا ہوں چڑانے کے لیے۔ اس کے چہرے کی معصومیت' نرم سا تاثر مجھے شبنم جیسا لگتا ہے مگر اس کا غصہ... بھڑکتا ہوا شعلہ اور اسے شعلہ جوالا بنا کر جو مجھے لطف آتا ہے... وہ تو بیان سے باہر ہے' جانے کیوں اس کا تپتا چہرہ میرے دل کو تسکین دیتا ہے۔

بیٹ مین کو چائے کا کہہ کر میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سامنے والے گھر میں جھانکا۔ علیزے بہت مگن انداز میں پڑھ رہی تھی۔ اس کے ایف ایس سی کے پیپرز ہو رہے تھے۔ میری رگِ شرارت پھڑک اٹھی اور میں کمرے میں جانے کے بجائے ٹیرس پہ آگیا۔ کچھ دیر خاموشی سے اسے پڑھتے ہوئے دیکھنے لگا' ملگجا حلیہ' چہرے کے اطراف بکھری لٹیں۔ بہت اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ اپنی کیفیت پر گھبرا کر تھوڑا سا کھنکارا مگر ادھر کوئی اثر نہ ہوا۔

"پڑوسن رٹے مار مار کر کیا برا حال کر لیا ہے' کہو تو نمبر لگوا دوں؟ میری اپروچ ہے کافی۔"

دل میں مجھے ہنسی بھی آرہی تھی کیوں کہ میں خود

نہایت ایمانداری سے دن رات محنت کرتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ وہ بھی کافی لائق اسٹوڈنٹ ہے۔ میری بات پر ایک نظر اس نے میری طرف دیکھا اور دوسرے لمحے بغیر کوئی جواب دیے سنجیدگی سے دوبارہ کتاب میں گم ہوگئی۔ میری تسکین نہ ہو سکی تھی۔

"شعلہ جوالا! لگتا ہے امتحانات کے خوف نے تمہارے حواس سلب کرلیے ہیں۔ لگتا ہے قوت سماعت و گویائی بھی متاثر ہوگئی ہے۔ چہ چہ چہ.... بہت افسوس ہوا۔ نالائق اسٹوڈنٹس کا یہی حال ہوا کرتا ہے امتحانات میں۔ اگر کچھ پڑھا لکھا ہوتا سارا سال تو یہ حالت نہ ہوتی نا۔"

اس سے پہلے کہ جن خطرناک تیوروں سے مجھے وہ دیکھ رہی تھی کوئی جوابی کارروائی کرتی، مگر برا ہو۔ ہمارے بیٹ مین کا وہ اچانک میرے پیچھے نمودار ہوا اور سامنے والے گھر میں ذرا آگے ہو کر گرل سے جھانکنے لگا (الہ دین کے جن کا ماما نہ ہو تو)۔

"اچھا تے باؤ جی ایسہ پڑھائیاں کروے ہو تسی۔ میں ہونے صاحب جی تو دسناواں۔" (اچھا تو یہ پڑھائی کرتے ہیں آپ۔ میں ابھی صاحب جی کو بتاتا ہوں) شرفو کو ڈانٹ کر چپ کروا کر واپس بھیجا تو نظر ساتھ

والے ٹیرس پر کھڑے خرم پر پڑی' جو بڑی فرصت سے علیزے کو دیکھ رہا تھا۔ جانے اس قدر بُرا کیوں لگا کہ برداشت نہ ہوسکا۔

"اٹھو یہاں سے اور جاکر اپنے کمرے میں پڑھو۔" میرا لہجہ اس قدر سنجیدہ اور حکمیہ تھا کہ ایک لمحہ کو میں بھی حیران رہ گیا۔ علیزے بہت حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی اور دوسرے لمحے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"صبر یار صبر۔ علی شیر! اتنا غصہ کیوں آرہا ہے تمہیں؟ کیا لگتی ہے وہ تمہاری؟ کیوں برداشت نہیں ہوئیں تم سے خرم کی نظریں؟" میں خود کو سمجھانے اور سوال کرنے لگا اور جو جواب میرے دل نے دیا۔ میں واقعی خاکستر ہوگیا' میرے حواس گم ہوگئے۔ کیا واقعی وہ اس قدر شدت سے میرے دل میں سما چکی ہے؟ دوسرے دن اسی جواب کو پرکھنے کے لیے سامنے والے ٹیرس پر چکر کاٹتے ہوئے پڑھنے والی علیزے کو بے حد سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

"اگر یہ مجھے نہ ملی تو..." جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ مجھے سانس لینے میں دقت ہورہی ہے۔ میری نظروں کا ارتکاز محسوس کرکے اس نے میری طرف دیکھا اور چند لمحوں کے بعد اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔ شاید وہ میری اس قدر سنجیدہ کیفیت کو محسوس کرکے حیران ہورہی تھی۔

"او ہیلو! لنگور۔ لگتا ہے تمہاری قوت گویائی سلب ہوگئی۔ کچھ ذہنی عارضہ لاحق ہونے کی علامات بھی نظر آرہی ہیں۔ کہیں فیل تو نہیں ہوگئے... نمبر لگوا لینے تھے نا... تمہاری تو بہت اپروچ ہے۔" میرے جملے سود سمیت لوٹائے۔ اسی سنجیدہ کیفیت میں۔ میں نے نفی میں سرہلایا۔

"تو پھر کاکے کی چاکلیٹ کسی نے چھین لی ہے جو ایسی رونی صورت بنا رکھی ہے۔ جاؤ جلدی سے ماما گودی بیٹھ جاؤ۔ مت رونے... نہ... نہ روتے نہیں۔ بی بریو۔" پچکار کر کہا۔

میں آہستہ سے مسکرایا اور اسے دیکھتے ہوئے زیرِ لب شعر پڑھا۔

مجھے کیا خبر کہ رات بھر تجھے دیکھ لینے کو اک نظر
رہا ساتھ چاند کے منتظر تیری کھڑکیوں سے ادھر کوئی

علیزے کندھے اچکا کر اندر چلی گئی۔

بھابھی سے۔ بہن جیسی بے تکلفی تھی سو ان کو راز دار بنا کر بات امی اور بھیا تک پہنچائی۔

"ہوں... تو یہ چکر ہے۔ میاں چھٹکے! آپ بھی جوان ہوگئے۔ سہرا باندھنے کا شوق ہورہا ہے؟" بھیا کے سامنے پیشی ہوئی میں سر جھکا کر مسکرا دیا۔

"نہیں بھیا صرف منگنی کافی ہے ابھی۔" میں نے جرات کی۔

"کتنے دن کا بخار ہے؟" بھیا نے مکھی اڑائی۔

"میں سنجیدہ ہوں بھیا۔" بڑی ہمت کرکے بھیا کی آنکھوں میں دیکھا' کچھ دیر سوچ کر بھیا بولے۔

"ٹھیک ہے' مگر ثبوت کیا ہے؟"

"میں نے خود کی ہے محبت۔" پہلے تو بھیا خاک بھی نہ سمجھے' اچانک ٹی وی کمرشل ذہن میں لہرایا اور پھر ان کی ہنسی چھوٹ گئی۔ یہی میں بھی چاہتا تھا' مگر وہ بھی پکے فوجی نکلے۔

"امتحان دینا پڑے گا۔"

"کیسا امتحان؟ میں تیار ہوں۔"

"کاکول اکیڈمی جوائن کرنا ہوگی۔ چھ ماہ سے پہلے گھر کا چکر کسی بھی بہانے نہیں لگاؤ گے۔ لیفٹیننٹ بننے تک اگر محبت پر قائم رہے تو باقی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔"

"بھیا۔ آپ نے اگر فورس جوائن کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بدلے مجھ سے کیوں لے رہے ہیں؟" میں منمنایا۔

"پہلے قدم پر ہی ڈگمگا گئے؟ بس اتنا ہی دم تھا؟"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے' مگر مجھے بھی یقین دہانی کروایے کہ علیزے کا رشتہ اس دوران میں آپ کہیں اور نہیں ہونے دیں گے۔ انکل مصطفیٰ اور آنٹی صفیہ سے اس سلسلے میں بات کرلیں گے۔"

"اس کی ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑدو۔ البتہ ہر چکر پر تم انکل مصطفیٰ اور آنٹی صفیہ سے ملاقات کروگے اور ان پر تمہارا امپریشن بہت بی بے (اچھے) بچے کا ہونا

چاہیے۔"

"بیٹا بچہ؟ میں ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں بھیا! آپ کیا اسے میری گورنس بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" میں نے ذرا خفگی دکھائی۔

"ٹھیک ہے جوان! مگر شرائط منظور ہیں نا؟"

"بالکل منظور ہیں۔"

"کوئی شک۔" بھیا شرارت سے مسکرائے۔

"نو سر۔" میں نے بھی سیلوٹ کیا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

☼ ☼ ☼

اکیڈمی جانے میں چند دن باقی تھے اور میں علیزے کو زیادہ سے زیادہ دیکھ لینا چاہتا تھا پھر تو چھ ماہ بعد ہی یہ چہرہ دیکھنے کو ملتا۔ ایسے میں یہ راز میرے دوست کم کزن کاشف پر آشکار ہو گیا اور باقی کی کسر بھابھی نے پوری کردی۔ اب وہ میرا ناطقہ بند کیے ہوئے تھا۔ علیزے کے سامنے آنے پر جملہ بازی' ذو معنی گفتگو اس پر میرا امپریشن مزید خراب کرنے لگی۔ تو کاشف کو سنجیدگی سے سمجھانا پڑا۔ وہ باز تو نہ آیا البتہ شرارتوں میں کمی ہو گئی۔

"ایکسکیوزمی" علیزے اپنے گیٹ پر کھڑی تھی' ساتھ میں کوئی سہیلی بھی تھی۔

"ایکسکیوزڈ" مجھ سے پہلے کاشف بولا اور ان کے گیٹ پر جا پہنچا۔

"پلیز ایک کام تو کردیں۔ گھر میں اس وقت ایسا کوئی نہیں جسے بازار بھیجا جاسکے۔ میری فرینڈز بھی آئی ہوئی ہیں۔ بازار سے نان تو لادیں۔" خوان پوش اور پیسے ہماری طرف بڑھائے (اچھا تو امن کی فاختہ اپنے مطلب کے لیے بنا جارہا ہے) میں نے بڑھ کر خوان پوش پکڑا تو مسکرا کر بولی۔

"یہ پیسے بھی۔" میں نے یہ سوچ کر پکڑ لیے کہ نہ پکڑے تو خوان پوش بھی واپس لے لیتی۔

"روغنی یا سادہ؟" میں نے پوچھا۔

"سادہ" جواب آیا۔

"بڑے یا چھوٹے؟" کاشف نے بے تکی بات کی۔

"میرا مطلب ہے تل والے یا بغیر تل کے؟" ان دونوں کے ساتھ ساتھ میں بھی کاشف کا منہ دیکھنے لگا۔

"جو مل جائیں وہی لادیں پلیز۔" علیزے نے دانت پیسے جبکہ اس کی سہیلی قہقہے لگانے لگی۔ علیزے کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی اس نے گیٹ بند کردیا۔

واپسی پر میرے بیل بجانے پر علیزے کے ساتھ اس کی وہی سہیلی تھی۔

"تھینک یو سوچ۔ آج تو چیتے کی رفتار کو بھی مات کردیا۔ مجھے تو خطرہ تھا جان بوجھ کر دیر کردو گے..... مسٹر لنگور"

"میرا نام علی شیر ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ مستقبل مجھے ڈرا رہا تھا۔

"ہاں وہی شیر ہو یا لنگور تعلق تو دونوں کا جنگل سے ہی ہے۔"

"اور جنگلی بلی کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" میں فوراً" واپس پلٹا' اپنے گیٹ سے اندر داخل ہونے سے پہلے مڑ کر دیکھا وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور چھپاک سے گیٹ کے اندر ہس کی سہیلی کے قہقہے نان اسٹاپ تھے۔

☼ ☼ ☼

کاشف نے سگریٹ فوراً" میرے ہاتھ میں پکڑایا (یہ کبھی کبھار کی چوری تھی) کمرے سے سگریٹ کی بو نہ آئے اس لیے یہ شغل ٹیرس پہ پورا کیا جارہا تھا۔ مکمل اطمینان کرکے سگریٹ سلگائی تھیں' مگر اچانک سامنے والے ٹیرس پر علیزے نمودار ہوئی۔ شاید پڑھتے پڑھتے نیند بھگانے کے لیے ٹیرس پہ آئی تھی۔

آج اس کی رات دیر تک پڑھنے کی عادت بہت بُری لگی۔ ہم دونوں نے سگریٹ والے ہاتھ پشت پر چھپانے کی کوشش کی۔

"ہم کچھ چھپا تھوڑی رہے ہیں۔" کاشف بوکھلا کر

بولا اور ساتھ منہ میں بھرا دھواں باہر۔ میں نے بے بسی سے علیزے اور پھر کاشف کو دیکھا۔ اب صبح امی یا بھابھی تک رپورٹ پہنچ جائے گی۔

"نام شیر اور کام گیدڑوں والے۔" اس نے طنز سے کہا۔

"تم ایسا کرو جنگل کے تمام جانوروں کے نام ایک ہی بار مجھے دے ڈالو۔ ایک سگریٹ ہی تو پی ہے ہم تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ اس میں سے دھواں کیسے نکلتا ہے۔" میں نے بھنا کر سگریٹ سامنے سڑک پر پھینکی اور غصے میں ایک بے حد بے تکی بات کردی۔

"بالکل۔ بالکل آپ تو سگریٹ سے دھواں نکلنے کا تجربہ کررہے تھے۔ صبح ریل کا انجن ایجاد کرنا ہے نا آپ کو اس لیے یہ تجربہ نہایت ضروری تھا۔" چبا چبا کر کہا پھر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"پتا ہے نا آنٹی ہارٹ پیشنٹ ہیں، آج کل وہ ویسے بھی بہت حساس ہورہی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر زود رنج ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ یوں دیکھ لیں یا ان کو کسی سے پتا چلے تو؟ کل شام میں ان کی طبیعت کتنی خراب ہوگئی تھی، بھول گئے ہو؟" کہہ کر وہ کمرے میں واپس چلی گئی اور ہم دونوں شرمندہ ہوگئے۔

اکیڈمی آئے ایک سال کا عرصہ ہوگیا تھا۔ دل کو بہت سمجھانے کے باوجود گھر کی اور اس جنگلی بلی جیسی پڑوسن کی یاد ہر رات بہت ستاتی اور دیر تک جگاتی تھی، اب وہی لڑائیاں مسکرانے کی وجہ بن جاتیں۔ جانے اس نے بھی مجھے کبھی یاد کیا ہوگا یا شکر ادا کیا ہوگا میرے وہاں نہ ہونے پر۔ دوسری بات میں وزن محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

تم نے سن لیا ہوگا
شہر کی ہواؤں سے
وہ جو اک دیوانہ سا
آتے جاتے راہی کو
راستوں میں ملتا تھا
اب کہیں نہیں ملتا

علیزے ٹیرس پر آکر ابھی کھڑی ہوئی تھی کہ سامنے والے ٹیرس پر کھڑے علی شیر نے یہ اشعار پڑھے۔

"چہ چہ... پڑوسی تم تو صرف نیم پاگل تھے یہ فوج والوں نے کیا حال کردیا تمہارا؟" بے حد افسوس کے اظہار کے ساتھ کنپٹی کے پاس دائرہ بنا کر پاگل ہونے کا اشارہ کیا۔

پچھلے پہر کا چاند
جب کھلے دریچے سے جھانکتا ہے
تو بے ساختہ میرا من، میری آنکھیں
تجھے پکارنے لگتی ہیں
اور ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے ہیں
کیوں کہ میں نے سنا ہے
پچھلے پہر مانگی ہوئی دعائیں قبول ہوتی ہیں

دھیمی سی مسکراہٹ علی شیر کے لبوں پر تھی۔

"دشمنوں کی طبیعت واقعی ناساز ہے۔ کسی سائیکاٹرسٹ کو بتایا یا میں لے چلوں؟"

"ذرا سنبھل کے گولہ باری کیجیے پڑوسن۔ فوجی بندہ ہوں۔ کہیں یہ دشمن، دشمن جاں نہ بن جائے۔"

"دشمن جاں کی تو... میں ابھی آکر آنٹی کو تمہارے اگلے پچھلے کچے چٹھے بتاتی ہوں۔"

"زہے نصیب... شوق سے آئیے۔ میں اس وقت گھر میں اکیلا بور ہورہا ہوں، آپ کی میزبانی سے شرف یاب ہوکر نہایت خوشی ہوگی۔" خوش اخلاقی کے ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔ امی گھر میں موجود تھیں ایسے میں علیزے کو روکنا بہت ضروری تھا ورنہ امی...

اس شام میں انکل آنٹی سے ملنے پہنچ گیا۔ انکل اور آنٹی کے سامنے شرافت مجھ پر ختم تھی۔ میں دانستہ چائے کے وقت آیا تھا۔ آنٹی نے علیزے کو میرے لیے چائے بنانے کو کہا۔ وہ برے برے منہ بناتے ہوئے چائے بنانے لگی، میں دل ہی دل میں قہقہے لگانے لگا۔ آنٹی فون سننے کے لیے چلی گئیں۔ (میری قسمت)

"چینی کتنی؟" علیزے نے دانت پیسے۔

"تم بس انگلی ڈبو دو۔ چائے خود بخود میٹھی ہو جائے گی۔" میں نے طنز کے ریکارڈ توڑے۔ پہلے تو وہ چونکی (کیوں کہ لہجے نے دل سے یاری نبھائی تھی) پھر کچھ سوچ کر مسکرائی اور انگلی کی پور چائے میں ڈبو کر کپ میری طرف بڑھایا۔

"میٹھی تو کیا ہو گی۔ کہیں میرے غصے کے زہر سے یہیں جام شہادت نوش کرنے کا موجب نہ بن جائے۔" آنٹی واپس آچکی تھیں، میں خاموشی سے چائے پینے لگا۔

"تھینک یو۔ چائے "بہت میٹھی" تھی۔" میں ذو معنی کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ حیران ہو کر دیکھتی آنٹی کو خدا حافظ کہا اور اس کے تپتے چہرے کا لطف دیر تک میرے ساتھ رہا۔

☼ ☼ ☼
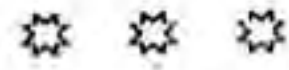
پاسنگ آوٹ کے بعد میں گھر آیا تو جو خبر مجھے ملی میرے حواس گم کر دینے کو کافی تھی میں ٹکر ٹکر بھابھی کی شکل دیکھنے لگا۔ بھابھی کی ہمدرانہ نظر اور بھیا کا جملہ۔

"علیزے کا نکاح ہو رہا ہے اگلے ہفتے۔" بھیا کچھ دیر بعد ہی میرے کمرے میں پیچھے آئے، میں نے بے حد شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یار میں نے تو پوری کوشش کی، مگر علیزے کا کہنا تھا کہ ہم دونوں کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ ہمارے مزاج، عادات اور خیالات ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔"

تم زندگی کو غم کا فسانہ بنا گئے

میں گیت کے بولوں کے ساتھ فسانہ دل کا ماتم منا رہا تھا کہ کاشف کمرے میں داخل ہوا اور گیت بدل کر وارث شاہ کا "جھوٹی نہ نہ کردی سی اج اوہاں کر بیٹھی اے" لگا دیا۔ میں کاشف کے ایسے مذاق پر تلملا اٹھا۔ ابھی کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ بھابھی کاشف کو بلانے آگئیں۔

"پرسوں تمہارا نکاح ہے علی شیر۔ کاشف اور اپنی بھابھی کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لو۔" میں کچھ دیر تو شاک کی کیفیت میں بھیا کو دیکھتا رہا پھر ضدی لہجے میں احتجاجاً" کہا۔

"نہیں کرنا کوئی نکاح مجھے۔"

"ہم رشتہ طے کر چکے ہیں۔ انکار کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔" بھیا نے دبنگ لہجے میں ڈپٹا اور میں واک آوٹ کر گیا۔

یونہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے
وہیں تھم کے رہ گئی۔

کاشف نے پھر وہی حرکت کی اور گیت بدل دیا۔

"جھوٹی نہ نہ کردی سی۔" کمرے میں آواز گونجنے لگی، میں نے غصے سے تپ کر سوئچ آف کر دیا اور دندناتا ہوا کاشف کے سر پر جا پہنچا۔

"تم دوست ہو کر مذاق اڑا رہے ہو میرا؟ تمہارے دل کو لگی ہوتی تو پتا چلتا کہ دل لگی کیسے کرتے ہیں؟" لہجہ نم ہو گیا۔ مجھے پتا تھا بھیا پکے فوجی تھے اپنی منوا کر چھوڑیں گے۔ "آرڈر از آرڈر" اور "یس سر" کی تفسیر۔ "نہ" کا کاش تو ان کی زندگی سے فوجی بنتے ہی نکل گیا تھا۔

"میں ہی تو تمہارا دوست ہوں، مگر تم سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" کاشف بے حد اطمینان سے کہہ کر بھابھی کے ساتھ جانے کے لیے پورچ کی طرف بڑھا۔

"کول ڈاؤن علی شیر! صبر یار۔ یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ لڑکی کون ہے؟ اگر اس سے رابطہ کر کے علیزے سے محبت کے بارے میں بتا دو تو کم از کم یہ خطرہ فی الحال ٹل جائے گا۔ لڑکیاں ایسے معاملات میں بہت نازک مزاج اور حساس ہوتی ہیں۔" دماغ نے ایک راہ سجھائی۔

"بھابھی لڑکی کون ہے؟" بھابھی نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر تھوڑا گھبرا گئیں، کچن کے دروازے پر بھیا کھڑے تھے، جواب بھیا نے دیا۔

"میرے کولیگ کی بہن ہے حوریہ، تصویر دیکھنا چاہو تو مل جائے گی اور اگر بات کرنا چاہو تو فون پر بات

بھی ہوجائے گی۔ علیزے نے انکار کیا ہے تو اسے بھی تو پتا چلے ناکہ میرے بھائی کو رشتوں کی کمی نہیں۔ اسی دن تمہارا ابھی نکاح ہے۔"

"آپ کو ترس نہیں آتا علی کی حالت پر؟" بھابھی نے مداخلت کی۔

"خاموش رہو۔ فوجی جوان اتنے نازک نہیں ہوا کرتے۔ بہت بہادر اور ہمت والے ہوتے ہیں۔" بھابھی کو ڈپٹ کر بھیا نے رخ میری طرف کیا۔

"اور جوان! تم یہ شکل اور حلیہ درست کرو۔ یہ لڑکیوں کی طرح آنسو بہانا چھوڑو اب۔"

"کبھی تو فوج کی وردی سے نکل کر عام انسانوں کے جذبات کو بھی محسوس کیا کریں۔ آئرن مین۔" میری مردانہ انا پر "لڑکیوں کی طرح" چوٹ پڑی تھی۔

"فوجی عام انسان نہیں ہوتے۔ سخت تربیت ان کے اعصاب اور جذبات کو فولادی بنا دیتی ہے اور اس کا عملی مظاہرہ انہیں ہر مقام پر کرنا ہوتا ہے۔ عوام اور سرحدوں کی حفاظت جیسی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر ہوتی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

اگلی صبح سب کے لیے حیران کن تھی، میں خوشگوار موڈ، نک سک سے تیار گنگناتا ہوا ناشتے کی ٹیبل پر سب کی حیران نظروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بھیا نے بھی حیران ہو کر دیکھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بھیا! فوجی بندے لڑکیوں کی طرح آنسو بہائیں۔ یہ ان کے وقار کے خلاف ہے۔" بھیا ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کر پا رہے تھے، مگر ظاہری طور پر وہ پُر اعتماد تھے۔

"اور ہاں بھیا۔ رات کو میری حوریہ سے بات ہوئی تھی جس کی آواز اس قدر خوب صورت ہے وہ خود کتنی حسین ہوگی۔ مٹی پاؤ علیزے کی محبت پر، اتنا نخرہ ہے تو ٹھیک ہے مجھے بھی پروا نہیں۔" میں کن اکھیوں سے بھیا کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے تاثرات مجھے محظوظ کر رہے تھے۔ اب مزہ آیا نا کھیل کا۔ (آپ کے تجسس کو ہوا نہیں دوں گا) اصل میں بھیا کے کہنے پر رات حوریہ نے مجھے فون کیا۔ نمبر اور آواز اجنبی تھے، میں نے بادل نخواستہ گفتگو کا آغاز کیا، مگر تھوڑی ہی دیر میں نہ صرف میں چونک گیا بلکہ میری کایا ہی پلٹ گئی۔ (گفتگو ملاحظہ کیجیے)

"ہیلو! میں حوریہ بات کر رہی ہوں۔"

"جی فرمائیے۔"

"مجھے کچھ فرمانا نہیں آپ کے بھیا نے کہا تھا کہ آپ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"محترمہ کام کیا ہے؟ دہرا دیجیے میں سن نہیں سکا۔"

"گھونچو! فضول سوال کیوں کر رہے ہو۔" جواب بے ساختہ آیا تھا۔ مجھے 880 وولٹ کا جھٹکا لگا۔ یہ انداز...؟

"آپ نے کیا فرمایا؟" میں نے چونک کر تصدیق چاہی۔

"عقل کیا اکیڈمی میں ہی بھول آئے ہو لنگور!"

"بس بس بس... اتنا کافی ہے۔" اب شک کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ پوری دنیا میں ایسے جوابات مجھے علیزے سے ہی مل سکتے تھے۔ اس کی آواز لاکھ پردوں میں لپٹ کر میرے سامنے آتی کم از کم "میں" اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ کاشف سے بھی اگلوا چکا تھا۔ اب میں شاپنگ میں خوب دلچسپی لینے لگا۔ دوسرے دن بھیا نے حوریہ کی تصویر دکھائی تو ایک لمحہ کو میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہوا، مگر وہ ٹیلی فونک گفتگو اور کاشف کی آنکھ کا اشارہ مجھے میری جون میں واپس لوٹانے کو کافی تھا۔ اب بھیا کی الجھن میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔

"ماشاء اللہ! بھیا یہ تو واقعی حور شمائل ہے۔ سوری بھیا میں نے بلاوجہ آپ سے ضد کی۔" اور تصویر لے کر میں نے جیب میں ڈال لی۔

"ارے... ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ ابھی تمہارا نکاح نہیں ہوا۔" بھیا گڑبڑائے۔

"کل ہو جائے گا بھیا۔ پھر میرا ہی حق ہے نا اس پر۔" "اک حسن کی دیوی" گنگناتا میں اپنے کمرے میں آگیا۔

"تم۔ یہاں۔ کوئی دیکھ لے تو۔" علیزے کے ہاتھوں کے طوطے 'کبوتر' کوے' فاختائیں' بلبلیں حتی کہ چڑیا اور کوے تک اڑ گئے' میں مسکراتا ہوا کھڑکی سے اندر چلا گیا۔

"کمرے کا انٹیریئر تو لاجواب ہے۔" میں آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تم جاؤ یہاں سے۔ کوئی آگیا تو۔ تو۔ پلیز جاؤ۔" وہ زندگی میں پہلی بار روہانسی شکل کے ساتھ بڑی اچھی لگی۔

"تو میں کہہ دوں گا' تم نے بلایا ہے۔" بہت اطمینان سے کہا۔

"میں نے۔؟ میں نے کب بلایا ہے تمہیں؟" وہ بھڑکی۔

"رات خواب میں نہیں بلایا تھا۔" میرے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔" گلدان ہاتھ میں لیے دھمکیوں پر اتر آئی۔

"شوق سے۔ کیا جواب دو گی سب کو یہاں میری موجودگی کا اور سر پھاڑنے کی کیا وجہ بتاؤ گی۔" جی بھر کر بلیک میل کیا۔ پھر مجھے اس کی شکل دیکھ کر ترس آگیا۔

"او کے۔ پریشان مت ہو' میں نے سوچا ازلی دشمن ہیں ایک آخری ملاقات کرلی جائے۔ اپنی ہونے والی دلہن کی تصویر بھی دکھانا تھی۔ جب سے تصویر دیکھی ہے دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اگر تصویر اس قدر حسین ہے تو خود کیا غضب ڈھاتی ہوگی۔" کن اکھیوں سے تاثرات کا جائزہ بھی لیا۔ تصویر دیکھ کر اس کا رنگ لحہ بھر کو زرد ہوا۔

"کیوں پڑوسن! بولتی بند ہو گئی نا۔ میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔ او کے۔ بائے۔ گڈ نائٹ۔ سویٹ ڈریمز۔" کہتا میں کھڑکی سے باہر آگیا۔

☆ ☆ ☆

شادی ہال میں اسٹیج پر بیٹھی دلہن نے جہاں میرے حواسوں پر بم پھوڑا' وہیں میرے قدموں نے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے بے بسی سے بھیا کی طرف دیکھا وہ بھی میری طرف ہی آرہے تھے۔

"رک کیوں گئے جوان؟ تم تو بہت بے چین تھے حوریہ سے نکاح کے لیے۔ اب کیا ہوا؟" میں نے بے چارگی سے بھیا کو اور پھر بائیں جانب کھڑے کاشف کو دیکھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

"تھالی کے بینگن' غدار' عیار' دھوکے باز۔" میں نے دانت پیسے۔ اسٹیج پر دوبارہ نظر ڈالی تو میرے الوژن نے مجھے دکھایا کہ حوریہ کھڑی ہو رہی ہے اور سر پر لیا دوپٹہ کاندھے پر ٹکا کر ہنس رہی ہے جبکہ وہاں علیزے کو بٹھایا جارہا ہے۔

"اب تو خواب دیکھنا چھوڑ دو میاں علی شیر۔ بہت برے پھنس گئے ہو۔" خود کو بھیا کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے کو تیار کرنے لگا۔ دل نے شرم دلائی' مگر ایسی انا "وارے" میں نہیں تھی۔

"ہیں۔ یہ کیا؟" میرا الوژن کچھ زیادہ ہی پاور فل تھا شاید۔ پوری آنکھیں کھول کر بلکہ پھاڑ کر علیزے کو دیکھنے لگا۔

★ ★ ★

حجلۂ عروسی میں سر جھکا کر بیٹھی علیزے کو دیکھ کر میری زبان میں کھجلی ہوئی' مگر شرافت سے گھونگھٹ اٹھا کر کھنکارا وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کا یہ روپ میرے دل کو خمار آلود کرنے لگا۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" میں نے اس کی تعریف کی۔

"مگر تمہیں تو جنت کی حور پسند آگئی تھی نا۔ پھر دستبردار کیوں ہوئے؟"

"غلط فہمی ہے جناب کی مجھے تو ازل سے "جنگل کی حور" پسند تھی۔ جنگلی بلی۔"

چاند ہم دونوں کی شفاف ہنسی پر مسکرا کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"عشق اور ساگ بڑے جتنوں سے ہموار ہوتے ہیں صاحب... آنچ کا بڑا حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے بڑے گھونٹنے چلانے پڑتے ہیں... سخت محنت لگتی ہے پھر کہیں جا کر چوکھے رنگ آتے ہیں صاحب۔"

آخر تک پہنچتے پہنچتے سکینہ اداس ہو گئی۔

"خدا کے لیے سکینہ چپ کر جا... بند کر اپنی یہ بکواس... ختم کر اپنا یہ فلسفہ... تنگ آ گیا ہوں میں تیری ان باتوں سے... سنا تھا گاؤں کی لڑکیاں تو بہت سیدھی سادی ہوتی ہیں... تو تو وڈی سمجھ دار نکلی۔"

اسے پھٹکارنے کے بعد وہ طنز کر رہا تھا۔ سکینہ پر کسی چیز

اسی غصے سے بولا پھر خود ہی نرم پڑا۔

"پتا ہے... پتا ہے تجھے... کتنا اچھا لگتا ہے مجھے تیرے منہ سے اپنا نام سننا۔"

"اماں کہتی ہے۔ مالکوں کو ان کے ناموں سے نہیں پکارنا چاہیے... اپنا خون دغا کرنے لگتا ہے... خواہشیں بڑھنے لگتی ہیں اور انسان..."

"تجھے صرف اماں کی باتیں ہی یاد رہتی ہیں... کبھی مجھے یاد کرنے کی بھی کوشش کی تو نے؟"

"آپ کو یاد نہ کرنے کے چکر میں ہی تو ہلکان ہو جاتی ہوں صاحب... ابا کہا کرتا تھا۔ ایسے راستے ٹھنڈے

ایمل رضا

وڈا کھیل

کا اثر نہ ہوا۔ نہ اس کے غصے کا' نہ اس کے طنز کا۔

"مجھے معاف کر دیں صاحب... نجانے کیا بات ہے... میری کوئی بھی بات آپ کو اچھی نہیں لگتی... شاید میری باتیں بھی میرے پکے رنگ کی طرح دل کو بھانے والی نہیں ہوتیں۔"

"تو مجھے یہ صاحب کہنا بند کر دے... یہ ہی احسان ہو گا تیرا مجھ پر۔" غصے سے عاصم نے دھپ سے سکینہ کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"پتا نہیں کیوں صاحب... زبان ساتھ نہیں دیتی میرا... آپ کا نام لینے میں۔"

"گھر کے دوسرے ملازم بھی تو مجھے عاصم صاحب کہتے ہیں... ایک تجھے ہی کہتے موت پڑتی ہے۔" وہ

بھی گرم بجن کی منزل اپنی نہ ہو۔"

عاصم بیڈ سے ایک جھٹکے سے اٹھا تھا اور اس نے سکینہ کو کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"منزل تیری ہے پگلی... تو سمجھتی کیوں نہیں۔" عاصم نے کہا اور سکینہ نے دیکھا اس کا دلکش روپ آج اور بھی چمک رہا تھا۔ ابلق گھوڑے کی طرح۔ سکینہ نے نظریں جھکا لیں۔

"مٹی کو سونے کی کٹھالی میں جلا رہے ہو صاحب۔"

"تجھے میری بات کا بھروسا نہیں۔"

"آپ کا بھروسا ہے صاحب... اپنی قسمت سے ڈر لگتا ہے جو زمانے نے بنا رکھی ہے... لوگوں کی تو دودھ

رنگت والی دھیوں کے بر نہیں مل رہے... مجھ کالی صورت کے ایسے نصیب کھل جائیں۔ یہ بات زمانہ برداشت نہیں کرے گا۔"

"میں تیرے ساتھ ہوں... پھر تجھے زمانے کا ڈر کیوں لگتا ہے؟"

"آپ کو بھی لگے گا... آپ کی یہ بغاوت کسی کو ہضم نہیں ہوگی... ملکانی بیگم کو بھی نہیں..."

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔"

"گندم کی فصل کو تکلا خراب کر دے تو صرف فصل خراب ہوتی ہے۔ زمین نہیں صاحب۔"

"مطلب؟" وہ بھنویں سکیڑ کر پوچھنے لگا۔

"ملکانی بیگم... اچھی بری فصل تو کسی کو بھی دان کر سکتی ہیں... مگر زمین کسی دوجے کے نام لگادیں... ایسا حوصلہ تو کوئی بھی نہیں رکھتا صاحب۔"

"میں اپنی محبت تجھے نہیں سمجھا پا رہا تو اماں کو کیا سمجھاؤں گا۔" وہ اداس ہو گیا۔ سکینہ کچھ نہیں بولی... کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"سکینہ بیٹا! لے آ کپڑے۔" نیچے برآمدے میں سے سکینہ کی ماں زہرہ کی آواز آئی تھی۔

"میں تجھے اس حویلی کی رانی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں... اور تو نوکرانی بن کر رہنا چاہتی ہے۔"

"ہم گاؤں کے باسی ہیں صاحب... پشت در پشت کے مزارع... ہم تو ماں کی گود میں ہی اپنے دل پتھر کے کر لیتے ہیں... ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا... لیکن جس راستے پر آپ چل نکلے ہیں... وہ آپ کے پاؤں پر ضرور چھالے نکال دے گا۔"

"سکینہ بٹی! آجا... کپڑے اکٹھے کرنے میں اتنی دیر۔"

"سچی محبت ہو تو خدا بھی مدد کرتا ہے سکینہ... تجھے یقین نہیں۔ تو ڈرتی ہے یا میرا ساتھ دینے سے گھبرا رہی ہے۔"

"مجھے یقین ہے صاحب... ڈرتی ہوں لیکن صرف آپ کے لیے کہیں آپ..."

"میری فکر تو نہ کر۔" عاصم چیخا تھا۔

"تو ہوتی کون ہے میری فکر کرنے والی... کیا لگتی ہے تو میری..."

"سکینہ بٹی..." نیچے برآمدے میں سے پھر آواز آئی تھی۔

"جا چلی جا نیچے... ماں بلا رہی ہے تجھے تیری... تجھے اپنی قسمت خراب ہی رکھنی ہے تو رکھ پھر جا چلی جا' دفع ہو جا۔"

عاصم چیختا رہا اور سکینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کپڑے دے دو صاحب۔" آنکھوں کو بنا خشک کیے وہ بولی' عاصم کو مزید طیش آ گیا اپنی اتنی ساری باتوں کی بے قدری پر۔

"یہ لے... یہ لے' کھونٹی سے کپڑے اتار اتار کر وہ اس کے ہاتھ اور فرش پر ڈھیر کرنے لگا۔ پھر الماری کھول کر اس نے صاف ستھرے اور استری شدہ کپڑے بھی ایک ایک کر کے باہر پھینکنے شروع کر دیے۔

"یہ... یہ بھی پکڑ... جا لے جا سب... نوکرانی ہے نا تو اس گھر کی... تو دھوان سب کو دوبارہ... دوبارہ سے استری کر... یہ ہے تیرے صاحب کا حکم۔"

ٹکٹکی باندھ کر کافی دیر غصے سے اس کے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ اسی طرح غصے سے باہر چلا گیا۔ سکینہ تھوڑی دیر تو کپڑوں کو دیکھتی رہی پھر سب کپڑے اکٹھے کر کے ان ہی میں آنسو چھپا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ صبح ہوا کی رتھ پر سوار ہوتی ہے۔ اس کا چاروں طرف پھیلنا لازم ہوتا ہے۔ یہ چھپائے نہیں چھپتی... اور یہ بھی کہ اونچ نیچ میں پروان چڑھنے والی محبتیں گھن لگے زینے کی مانند ہوتی ہیں جو زینہ خود گرنے والا ہو۔ وہ کسی اور کو کیا پار کروائے گا۔

☼ ☼ ☼

"ہاہاہا..."

سات سمندروں ۔۔۔ چھپے غاروں اور بلند و بالا پہاڑوں کو سر کر کے آنے والی آوازوں کی بازگشت جیسے تھے وہ قہقہے۔۔۔

"نہ میرا بیٹا کوئی کملا دیوانہ ہے، جو چھپ چھپ کر کروں گی شادی۔" بات فون پر ہو رہی تھی۔ لیکن ریسیور کان سے لگائے ملکانی رعب داب کی ایسی ایسی ادائیں دے رہی تھی کہ کیا ملکاؤں نے اپنے ادوار میں دی ہوں گی۔

"میں تو آدھے شہر کو بلاؤں گی۔۔۔"

بھنویں اتنی اٹھ گئیں کہ حویلی کے مینار تک اس اونچائی پر حیران رہ گئے۔ ملکانی دل کھول کر قہقہے لگانے لگی۔

"دیکھی بھی سونے کی تیاری نہ کروالوں تو میرا نام بدل دینا۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ کسی گرے پڑے خاندان کی ہوں کیا میں۔۔۔ سات نسلوں کی زمیندارن ہوں۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ پرانی تجوریاں تک سنبھلی پڑی ہیں۔۔۔ پرداروں سے بھی پہلے کی۔"

قہقہوں کے ساتھ بات چیت پورے محل نما کمرے میں گونج کر بہت دیر بعد سناٹے میں بدلتی تھی۔ زہرہ اس وقت تانبے اور پیتل کے پرانے سجاوٹی برتنوں پر سے گرد صاف کر رہی تھی۔

ایک آہ سی بھر کر رہ گئی وہ۔۔۔ زہرہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ناشکری شکوے کو پیدا کرتی ہے۔ شکوے باغیانہ خیالات کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ انسان خدا سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ ناشکری نہیں تھی۔۔۔

بس بعض اوقات انسان کے دہرے تہرے معیاروں پر دل کڑھ کر رہ جاتا تھا۔

ایک یہ حویلی تھی۔ جہاں سونے چاندی سے کم بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ ایک اس کا کوارٹر تھا۔ جہاں ایک بیٹی کے بیاہ کی فکر ہی دن رات اسے دیمک کی طرح کھائے چلی جا رہی تھی۔ بات جہیز کی ہوتی تو زہرہ بھیک تک مانگتے نہ شرماتی۔ لیکن سکینہ تو اتنے پکے رنگ کی تھی کہ اس سے اب کوئی اندھا ہی بیاہ کر سکتا تھا۔

"سب تیرے بنائے بندے ہیں مالک۔۔۔ میں کون ہوں صلاح دینے والی۔۔۔ پر تو نے ان کو رنگ و کھرے وکھرے دیے۔۔۔ کوئی اچھی سوچ تو ایک جیسی دے دیتا۔"

اور ہر وقت کانپتی زہرہ 'خدا کو صلاح دیتی اب کی بار کچھ زیادہ ہی کانپ گئی۔ پیتل کا ایک برتن دوسرے سے ٹکرا کر نیچے گلاس کے فرش پر جا گرا۔

ملکانی نے باتوں کے دوران ٹیڑھی نظروں سے زہرہ کو دیکھا۔ لاکھا جمے ہونٹوں کے اندر سے دندا سا رگڑا' جبڑا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

زہرہ نے جلدی سے برتن اٹھا کر واپس اس کی جگہ پر رکھا۔ ملکانی زہرہ کے معاملے میں بڑی نرم دل تھی۔

"اے سنو۔۔۔" گھر میں اتنے ملازم 'نوکر وغیرہ تھے کہ اسے کسی کا نام ہی نہیں یاد ہوا تھا ابھی تک۔۔۔ یا وہ ان کم ذاتوں کے نام یاد کرنے کو اہمیت ہی نہ دیتی تھی۔

"جی۔۔۔" زہرہ 'باادب' باملاحظہ ہو گئی۔ جیسے موجودہ وقت کے فرعون کی تشریف آوری ہو رہی ہو۔

"بعد میں کر لینا صفائی۔" منہ کو کم ہلایا گیا۔ بھنوؤں کو دروازے کی طرف اشارہ کر کے زیادہ کھینچا گیا۔

"مسطلب ابھی جاؤ۔" اور زہرہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ تب ہی عاصم اندر داخل ہوا۔ بھنوؤں کے وہ زاویے جو الجبرا کے کسی باب میں نہیں ملتے تھے' چڑھتے چڑھتے بھیانک سے ہو گئے۔ آنکھوں کی روشنی بھی کچھ مزید بڑھ گئی اور زبان میں شیرینی من و من بوریوں سمیت بھر گئی۔ ملکانی مزید چمک چمک کر بولنے لگی۔

"ایک ہی تو بیٹا ہے میرا۔" آواز فون میں۔۔۔ اور نگاہیں عاصم کی طرف۔۔۔ عاصم ان سنی کرنے کی اداکاری کرتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا اور میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

"سارے ارمان پورے کروں گی۔۔۔" کمر پر جھولتا۔۔۔ شیشے جڑا پراندہ ملکانی نے ہاتھ میں پکڑ لیا اور

خود کو فرضی پنکھا جھلنے لگی۔

"دوسری منزل تو نئے سرے سے تیار کرواؤں گی۔۔۔ برج سینا۔۔۔ سنگ سرخ' بادل شادل۔۔۔ ان کے رواج تو بھئی اب ختم ہو گئے۔۔۔ دو دو مرلے کے گھروں میں لگ گئے ہیں اب تو یہ۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ کمپنی سے ہی تیار کرواؤں گی۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ چکوزی باتھ۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ سوانا باتھ۔۔۔ جس میں بیٹھ جاؤ اور۔۔۔" اور اگلے فقرے کو دبا لیا گیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم دیکھنا تو سہی۔۔۔ کیا امریکہ والے کرواتے ہوں گے۔" لفظ "امریکہ" پر خاصا زور دے کر کہا گیا۔ عاصم بھی کہاں میگزین پڑھ رہا تھا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔

"جہیز منہ سے تو نہیں مانگوں گی۔۔۔ اب ایسی بھی نہیں ہوں میں۔۔۔ پر انہیں خود بھی خیال ہونا چاہیے۔۔۔ میری بھی برادری ہے بھئی۔۔۔ میں نے بھی تو دودھ پلائی اور رستہ رکوائی میں دینے کے لیے دو دو سونے کے سیٹ تیار کروا لیے ہیں ابھی سے۔۔۔ سالیاں نہ ہوئیں تو دیورانی' جیٹھانی' سہیلی یا ماں کو ہی دے دوں گی۔۔۔ ہاں۔۔۔ پورے دس دس تولے کے ہیں وہ دونوں سیٹ۔۔۔ بالکل نئے ڈیزائن۔۔۔ بس تم رشتہ ڈھونڈو۔۔۔" الٹے میگزین کی تحریر اور تصویریں عاصم کی آنکھوں کے آگے گڈمڈ ہونے لگیں۔

"اونچی لمبی ہو۔۔۔ نیلی آنکھوں والی مل گئی تو قسم سے تجھے سونے کا ایک کنگن اضافی دوں گی۔۔۔ ہوئی گوری چٹی چاہیے۔۔۔ دودھ ملائی کی بنی ہوئی۔"

"کسی انگریزنی کی طرح کی کہہ دو نا۔"

عاصم نے میگزین ٹیبل پر پٹختے ہوئے کہا تھا۔ ملکانی کی باتوں' قہقہوں اور چہک کو بریک سی لگ گئی تھی۔ پراندے کی۔۔۔ جھنجھناہٹ بھی رکی۔۔۔ اور سرخ لاکھا جیسے ہونٹ ناگواری سے مڑ تڑ گئے۔

"ہاں۔۔۔ بعد میں بات کرتی ہوں میں۔۔۔" ریسیور رکھ کر کریڈل پر پتا نہیں رکھا بھی گیا کہ نہیں۔۔۔ سونے کی پازیب کی چھم چھم پر تھم تھم کر آتی ملکانی' عاصم کے سر پر کھڑی ہو گئی۔ کالی سیاہ بھنویں۔۔۔ چاند کے برادے کی سی آنکھیں۔۔۔ اور سرخ اور سفید چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی۔۔۔ یہ چہرہ ملکانی کو اپنی ساری جاگیر' سارے سونے' موتیوں سے زیادہ پیارا تھا اور۔۔۔ یہ چہرہ پچھلے کئی مہینوں سے اسے کس قدر زیادہ ستا رہا تھا۔۔۔ ملکانی نے دل کو مضبوط کیا اور اپنے سارے اندرونی جذبات کو حویلی کی مالکن کے رعب کا لحاف اڑھا دیا۔

"بات سن میری۔۔۔" پراندے کو کمر کی طرف واپس پھینکا گیا اور انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی گئی۔

"تو رو لے۔۔۔ پیٹ لے یا جو مرضی کر لے۔۔۔ شادی تو تیری وہیں ہو گی جہاں میں چاہوں گی۔" ملکانی نے سخت لہجے میں کہا۔۔۔ اگر وہ ملکانی تھی تو بیٹا بھی اس کی ہی اولاد تھا قلعے کی مضبوط دیوار کی طرح تن کر اس کے آگے کھڑا ہو گیا۔

"تم سات نسلوں کی زمیندارن ہو نا۔۔۔ اور میں۔۔۔ میں چودہ نسلوں کا راجپوت ہوں۔" وہ اپنے سارے پتے ایک ایک کر کے شو کروانے لگا۔

"چلو مان لیا کہ میری شادی ہو جائے گی تمہاری مرضی سے۔۔۔ زبردستی ہی سہی تم اپنی کر گزرو گی لیکن پھر' پھر آگے کیا۔۔۔ کیا آگے بھی سب کچھ خود کرو گی؟" چاند کے برادے والی آنکھوں کو مزید روشن کر کے عاصم نے پوچھا تھا۔ اور پھر ایک جاندار قہقہہ لگایا تھا۔

کمرے کے در و دیوار صرف ملکانی کے قہقہوں کے عادی تھے۔ اس انجان آنے والے وقت کے بادشاہ کے قہقہوں کا بوجھ وہ سہار نہ سکے اور لرز لرز گئے۔ ملکانی کچھ زیادہ لرز گئی۔ اس کی سرمہ لگی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"دودھ ملائی سے بنی لڑکی بنجر ہو کر مر جائے گی یا ہمت والی ہوئی تو طلاق لے لے گی۔۔۔ تب روکنا اسے پرانی تجوریاں دکھا دکھا کر۔۔۔ چاندی کے چمچے میں سونے کا پانی پلا کر۔۔۔"

عاصم طنزیہ قہقہے لگاتا ہوا باہر چلا گیا۔ کمرے میں موجود پیتل' تانبے کے برتن آپس میں ٹکرا کر نیچے

فرش پر گر گئے۔
ملکانی اسی انداز میں کھڑی رہی۔ عاصم کے سامنے وہ ناریل کا اوپری سخت خول تھی اور اس کے جانے کے بعد اندر کی نازک گری۔
ایک ہی اولاد تھی اس کی اور وہ بھی کیسی ضد پر اڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
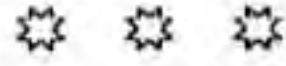
"جب امریکہ میں مجھے مریم سے محبت ہوئی تو مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میں اس کے بغیر مر جاؤں گا۔۔۔ جیسے اگر یہ مجھے نہ ملی تو میری زندگی، میرے زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہی نہیں رہ جائے گا۔ جب اماں کو منانے گھر آیا تو اماں نے الٹا میرا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ چھین لیا۔ تب اس رات۔۔۔ میں نے اللہ سے بہت شکوے کیے۔ میری زندگی جیسے ختم ہو گئی۔۔۔ مجھے ساری دنیا سے نفرت ہونے لگی۔۔۔ میرا دل کیا اس ساری حویلی۔۔۔ ساری دولت کو آگ لگا دوں۔۔۔ پر اب سوچتا ہوں کتنا نادان تھا میں۔۔۔ اللہ کی مہربانی کو نہ سمجھ سکا۔ یہ سب تو اسباب تھے۔۔۔ اللہ سلاسل بنا رہا تھا مجھے تجھ سے ملانے کے لیے۔۔۔ اچھا ہوا اماں نے پاسپورٹ چھین لیا ورنہ میں تجھ سے کیسے ملتا، کیسے تیری محبت میں گرفتار ہوتا۔ کیسے بڑے عشق کے رنگ مجھ پر چڑھتے۔"
گہری رات میں عاصم کے فقرے رات کی رانی کی طرح خوشبو دیتے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ سکینہ اس خوشبو کے حصار میں آنے لگی تھی اب۔۔۔ روز اپنے علاقے سے ایک قدم پیچھے ہٹنا۔۔۔ روز رتی رتی بے اصولی کرنا۔۔۔ جواب بڑے ٹیلے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔
وہ لڑکی تھی۔ سمجھ دار تھی۔ نہ نہ کرتے بھی نادانی کرنے کا نہیں سوچ سکتی تھی۔۔۔ لیکن عاصم ہر روز باتوں کے ذریعے اس کے گرد ایک آہنی سلاخ گاڑ دیتا۔ اور اب تو صرف چند ہی اور سلاخوں کی بات رہ گئی تھی۔ وہ بری طرح گرفتار ہونے لگی تھی۔
خود اس کی نظریں بھی اب عاصم کو کھوجتی رہتی۔۔۔ وہ نظر نہ آتا تو اس کا دل بے قرار ہو جاتا۔۔۔ اسے اس کی باتوں پر تو پہلے دن سے ہی اعتبار تھا۔ اب اپنی قسمت سے لڑنے کا حوصلہ بھی آ ہی گیا اس میں۔۔۔ بہانے بہانے سے وہ اوپری منزل آتی۔ چوبارے چڑھتی۔۔۔ حویلی اتنی بڑی اور نوکر چاکر اتنے زیادہ تھے کہ کسی کو کسی کے یہاں، وہاں۔۔۔ ہونے کا ہوش ہوتا تھا نہ ہی فرصت۔
سکینہ پر تو کوئی یوں بھی نظر نہ رکھتا تھا کہ۔۔۔ کالے سیاہ رنگ کی تو ہے۔ کوئی گل کھلا بھی لے گی تو وہ کلی سے زیادہ نہ ہوگا۔
"تو بھی کچھ بول سکینہ۔۔۔" عاصم نے اسے جھنجھوڑا۔

پیپل کے درخت کی شاخوں کے پار چاند ٹکڑے ٹکڑے ہوا دکھتا تھا۔
"رنگ۔۔۔" وہ بولی اپنی ہی منطق سے۔
"عشق کے رنگ۔۔۔ رنگوں کی کتنی پہچان ہے آپ کو عاصم صاحب؟"
"بہت۔۔۔"
"مریم تو وہیں پلی بڑھی تھی۔۔۔ انگریزنی ہی دکھتی ہو گی۔۔۔ اور انگریزنیاں تو کتنی خوب صورت ہوتی ہیں نا۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ بہت۔۔۔"
"پھر آپ کو یہ زنگی بڑ (کالی بلبل) کیسے پسند آگئی؟"
عاصم نے غصہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ بڑے پیار سے اسے موڑ کر اس کا دھیان چاند اور تاریک پیپل پر سے ہٹایا تھا۔
"دیگی۔۔۔ یہ بتا سورج زیادہ روشنی دیتا ہے کہ چاند؟"
"سورج۔" وہ معصومیت سے بولی۔
"پھر بھی لوگ چاند کو کیوں پسند کرتے ہیں۔۔۔"

جواب پا کر بھی وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔
"مجھے چاند سے ملا کر چاند کی بے عزتی تو نہ کریں۔"

"اور جو تو۔۔۔ خود کو اتنا نیچے گرا کر۔۔۔ میری محبت کی

بے عزتی کرتی ہے وہ۔" عاصم نے کہا تو وہ آگے سے کچھ نہیں بولی۔۔۔ بس خاموشی سے اس چہرے کو دیکھنے لگی جو اب کھلی بند آنکھوں میں بھی ہر وقت اس کے وہم و گمان میں رہنے لگا تھا۔

"میں محبت کی بات کرتا ہوں اور تو روتی ہے۔"

"اپنی قسمت پر روتی ہوں۔۔۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو میرا رنگ و روپ بھی آپ کی نسلوں جیسا ہوتا۔۔۔ میں بھی زمیندارن ہوتی۔۔۔ پھر میری اور آپ کی شادی کتنے آرام سے ہو جاتی۔۔۔ بنا کسی رکاوٹ کے۔۔۔ ملکانی بیگم کا خوف بھی نہ ہوتا۔"

"ابھی بھی ہو جائے گی۔۔۔ آرام سے۔"

"مجھے خوش فہمیوں میں نہیں جینا عاصم صاحب... کھانی کے تیل میں تلچھٹ صرف ایک رات کے لیے ہی کھلتی ہے پھر۔" وہ سر کٹے چاند کو دیکھنے لگی۔

"پھر جوں ہی صبح ہوتی ہے۔ تلچھٹ اپنے مقدر کی ماری پاتال میں جا بیٹھتی ہے۔ صبح تیل اور تلچھٹ دونوں الگ الگ ہو جاتے ہیں۔" عاصم جھنجلا گیا۔ پتا نہیں سکینہ ایسی باتیں کہاں سے سیکھتی تھی۔

"کیا آپ ملکانی بیگم کے غصے کو نہیں جانتے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"اور کیا تو مجھے نہیں جانتی۔"

"آپ انہیں منالیں گے؟"

"میں انہیں سمجھالوں گا۔"

"اگر وہ نہ مانی تو؟"

"جنگ لڑنے سے پہلے ہی شکست قبول نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ لیکن اگر تیرا ساتھ میرے ساتھ نہ ہوا تو پھر نہ میں سمجھا سکوں گا۔ نہ منا سکوں گا۔۔۔ میدان میں جانے سے پہلے ہی ہار جاؤں گا۔"

"میں آپ کا ساتھ کیسے دوں عاصم صاحب۔۔۔ اماں کہتی ہے۔۔۔"

"بس کر سکینہ۔۔۔ ایسی نصیحتوں سے بہتر ہے کہ تو نہ ہی بولا کر۔۔۔ چپ ہی رہا کر۔"

وہ غصے ہوا تو اس کی کب سے بھیگی آنکھیں جھک گئیں۔ جسے دیکھ کر عاصم کو وقتی طور پر مزید طیش آیا۔

عجیب لڑکی تھی عجیب حرکتیں کرتی تھی۔

"میرا ہاتھ پکڑ کر جائے گی ماں کے سامنے؟"

"ملکانی بیگم مجھے جان سے مار دے گی۔"

"پھر تیرے ساتھ میں بھی مر جاؤں گا۔" عاصم نے کہا تو سکینہ نے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عاصم نے وہ ہاتھ تھام لیا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

"پھر کہتی ہے کہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتی۔" اس کی ہنسی نہ تھمی تو اپنی چوری کے پکڑے جانے پر بے اختیار ہو کر سکینہ بھی ہنسنے لگی۔

"آپ بات کریں گے ملکانی بیگم سے۔"

"اور اگر اماں نے تجھ سے پوچھا تو۔"

"تو میں۔۔۔ تو میں۔"

"یہ تو میں۔۔۔ تو میں کرتی رہی پھر تو شاید وہ تجھے واقعی ہی مار دیں گی۔"

"پھر کیا کہوں؟"

"کہنا۔۔۔ ہاں میں بھی محبت کرتی ہوں عاصم سے۔۔۔ صاحب نہ کہنا۔" عاصم نے کہا تو سکینہ ایسے ڈرنے لگی جیسے ابھی وہ ملکانی سے بات کر رہی ہو۔

"بتا کہے گی ایسا ہی۔۔۔؟" عاصم نے اسے جوش دلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کہہ دوں گی۔۔۔" پہاڑ چڑھنے کے سے ارادے کو سکینہ نے اپنے اندر بھر لیا اور سیڑھیاں اتر کر اپنے کوارٹر میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن خارش زدہ بوٹی کی طرح تھے اندھیرے کے علاوہ وہ ہر ہر چیز سے ڈرتی رہی۔ دیواریں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، برتن سب چیزیں تو اس کی پیدائش کے وقت سے ہی تھیں۔ اس کی ہر خوشی، ہر غم کی ہم راز۔۔۔ لیکن عاصم کی کوئی بات وہ اپنے ضمیر تک سے بھی نہ کر سکی۔ اور در حقیقت وہ اس معاملے میں ذرا ذرا مطلبی سی ہو گئی، خود غرض سی۔۔۔ ٹھیک ہے میرا بھی کچھ حق ہے زندگی پر کالی ہوں تو کیا ہوا، عاصم منالے گا ملکانی

بیگم کو۔ میں بھی ساتھ دوں گی اس کا۔ زہرہ آتے جاتے اسے کہتی رہی۔

"اے سکینہ اٹھ جا۔۔۔ چلی جا حویلی۔۔۔ ابھی سے ملکانی کی نظروں میں آئے گی تو وہ تجھے ٹھکانے لگانے کا کچھ سوچے گی نا۔۔۔" لیکن وہ سردرد کا بہانہ کر کے چارپائی کے ساتھ لیٹی رہی۔

بعض اوقات چھوٹی بیماریوں کے پیچھے کیسی بڑی بڑی اور بھیانک بیماریاں چھپی ہوتی ہیں' یہ بات نہ زہرہ سمجھ سکی' نہ سکینہ جان پائی۔

ہر آن اس کا دل دھڑکتا رہا۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ آنے والے مناظر دیکھنے لگی۔ متوقع اور غیر متوقع۔

اب عاصم صاحب اٹھے ہوں گے۔ اب ناشتہ کیا ہو گا۔ ناشتے کی ٹیبل پر ماں سے بات کی ہو گی۔ اب لڑائی ہو رہی ہو گی۔ اب بیٹا' ماں کو سمجھا رہا ہو گا۔

لو بھلا ملکانی بیگم تو عاصم کے اٹھنے سے پہلے ہی ناشتا کر لیتی ہے۔

ہاں دوپہر کے کھانے پر بات ہوئی ہو گی۔۔۔ ملکانی بیگم نہیں سمجھے گی۔ وہ غصے ہو جائے گی اور اب سکینہ کو قتل کرنے اس کے کوارٹر آ رہی ہو گی۔

سکینہ کا دل مٹھی میں آجاتا۔ سرسراہٹ چیخیں بن جاتیں۔۔۔ اور آہٹ دھماکے زروں ذروں سے ڈرتی وہ خود میں ہی سمٹنے لگی۔

زہرہ کو تیسرے دن ہوش آیا تو دوائی لائی سکینہ کے لیے۔۔۔ سکینہ تو واقعی میں مرجھا رہی تھی۔ دوائی میں حکمت تھی یا نہیں۔۔۔ بہرحال سکینہ کی سوچوں کا دھارا ضرور بدل گیا تھا۔

کیا پتا ملکانی مان گئی ہو۔ بیٹے کی پسند کے آگے اپنی ضد چھوڑ دی ہو۔ اس امریکہ والی نے کہاں آنا تھا ملکانی کے رعب داب میں۔۔۔ میں تو بہو بن کر بھی ساری زندگی ملکانی کی غلام ہی بنی رہوں گی۔

کڑیاں ملاتی ملاتی سکینہ بہت دور جا نکلی۔ اتنی دور کہ خود ملکانی کی عمر کو پہنچ گئی۔
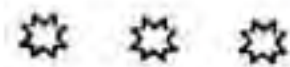
عاصم نے چوتھے دن شام کو ماں سے بات کی تھی۔ جسے سن کر پہلے ملکانی چپ ہو گئی تھی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ حویلی کے سب سے خوب صورت نوابی کمرے میں اس کا قہقہہ گونجا تھا اور پھر قہقہوں کی جیسے لائن لگ گئی تھی۔ ملکانی سوچنے لگی۔

"بہتری کی طرف آ گیا ہے بیٹا۔۔۔ مذاق کرنے لگا ہے۔" بچپن سے ہی عاصم کی عادت تھی۔ ہر شادی شدہ یا کنواری لڑکی کو دیکھ کر کہتا۔

"اماں! میری شادی اس سے کرا دو۔" اس عادت کی وجہ سے۔ پھوپھیوں' امیوں کو بھی نہ چھوڑا۔ ایک دن کھیت میں کھڑے ہولے کو دیکھ کر بھی یہ ہی کہنے لگا۔ ملکانی تب بھی دیر تک ہنستی رہی تھی اور آج بھی۔۔۔ جوان ہو گیا تھا پر بچپن کی عادت نہیں گئی تھی۔ آج تو عاصم نے ہولے سے بھی زیادہ برا مذاق کیا تھا۔

"سکینہ۔۔۔ زہرہ کی لونڈیا۔"

یاد کرتے ہوئے ملکانی گھٹنوں پر ہاتھ مار مار کر اکیلی ہی ہنستی رہی۔

"چلو' کچھ تو زندگی کی طرف لوٹا۔۔۔ ورنہ اس انگریزنی کے غم میں تو باؤلا ہی ہوا پھرتا تھا۔ ملکانی کا دیکھ دیکھ کر دل دہلتا تھا۔ اگرچہ چہرے سے وہ ظاہر نہیں کرتی تھی۔

اور وہ جو اس کی ایک ایک ادا پر زمین وان کر دینے والی تھی۔ اس کے اتنے سے مذاق پر نہال ہو گئی۔۔۔ حویلی کے سارے ملازموں کی جھولیوں کو بادام' پستے' گھی' شکر سے بھر دیا گیا۔ میووں کی بوریاں کھل گئیں۔ اناج کے گوداموں پر سے پہرے دار ہٹا دیے گئے کہ جس کو جتنا چاہیے لے جائے۔ دودھ' مکھن کا کوئی حساب کتاب نہ رکھا گیا۔

اپنے بیٹے کے مذاق کو کتنا مہنگا تول رہی تھی ملکانی۔۔ پھر مذاق کرنے والے کی کیا اہمیت تھی۔۔۔ وہ جانتا تھا اسی لیے تو اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

اسی میوے شکر سے لدوں لد ہوتی زہرہ بھی اپنے کوارٹر آئی تھی۔ اس نے کسی سے بس اتنا ہی سنا تھا کہ

عاصم صاحب نے گھر کی کسی ملازمہ سے شادی کرنے کا مذاق کیا ہے ماں سے اور ملکانی بیگم اسی خوشی میں پاگل ہو گئی ہیں۔

زہرہ سنانے والی کے سامنے ہنسنے لگی۔ لیکن اندر ہی اندر کہیں جھکڑ چلنے لگے۔ کوارٹر میں پٹی سے لگی سکینہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

"سکینہ..." زہرہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر ہلایا۔

"سکینہ..." منہ موڑنے پر آنسوؤں سے بھیگا سکینہ کا چہرہ زہرہ کو نظر آیا دودھ تھی لڑھک کر نیچے جا گرے۔

"ہائے میرے اللہ۔" لفظ چیخ کی صورت زہرہ کے منہ سے نکلے۔

"اوہ پگلی... اوری بدذات..."

سکینہ اور زور زور سے رونے لگی۔ وہاں عاصم اسے پاگل کہتا تھا یہاں ماں... تو کیا وہ واقعی پگلی تھی۔

"ہائے سکینہ...! یہ تو نے کیا کیا؟" زہرہ سینے پر دو ہتڑ مارنے لگی۔ سکینہ کے رونے اور زہرہ کے بین کرنے کی آوازیں... دونوں آپس میں مدغم ہو گئیں۔

"اٹھ... اٹھ بتا مجھے کب شروع ہوا یہ۔" خود کو دوہتھڑ مارتی زہرہ پنکچر لگے ٹائر کی طرح بے دم سی ہو گئی۔ پھر بے آواز رونے لگی۔ اس نے آج تک سکینہ کو گالی نہ دی تھی لیکن اب غم، غصے کے مارے اس کا حلق بھی جیسے ساتھ چھوڑ گیا تھا سکینہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پتا ہی نہیں چلا ماں کب شروع ہوا یہ۔ وقت تاریخ یاد نہیں۔"

"میں نے تجھ پر کبھی روک ٹوک نہ کی کہ تجھ پر اعتبار بہت تھا اور تو نے یہ گل کھلایا۔" شدت غم سے زہرہ کا کلیجہ پھٹنے پر آگیا تھا۔ آج روتے روتے وہ تھکنے والی نہیں تھی۔

"کب زنجیریں توڑیں... بتا بول... پھوٹ کچھ منہ سے..."

"میں نے اسے سمجھایا تھا ماں...! پر وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا... میں نے اسے سمجھایا تھا کہ..."

"تو زہر کھا لیتی سکینہ... پر یہ... ہائے میرے اللہ۔"

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اماں... سچی محبت۔"

"اوہ پگلی... تجھے کیا لگتا ہے کہ ملکانی تیرا رشتہ لینے آئے گی یہاں... اس جھگی میں تیری اس شکل کے ساتھ... وہ تو تجھے زندہ دفنا دے گی اور مجھے بھی کسی کنویں میں پھنکوا دے گی۔"

"اسے مجھ سے عشق ہے اماں... میں نے اسے کہا بھی تھا کہ عشق اور ساگ..."

"اپنی بو بھی دیکھ شیشے میں..."

"اسے کالے رنگ سے فرق نہیں پڑتا اماں... کہتا ہے لیلیٰ بھی تو کالی تھی..." سکینہ کی باتوں نے زہرہ کے رونے کو جیسے پھر سے ہوا دی۔ وہ اور بھی تیزی سے رونے لگی۔

"بول... کتی کس حد تک گئی ہے تو اس کے ساتھ کہاں تک کالک ملی ہے تو نے میرے منہ پر؟"

"نہیں اماں۔" سکینہ کانپ گئی "مجھے اپنی حدوں کا پتا ہے۔"

"تجھے پتا ہوتا تو یہ کرتوت کرتی تو... ہائے میں مر کیوں نہ گئی یہ دن دیکھنے سے پہلے۔"

"وہ کہتا ہے... کہ وہ میرے لیے مر جائے گا۔"

"غریبوں پر تو کیچڑ کی ایک چھینٹ بھی پڑ جائے تو وہ نیچ ہو جاتے ہیں۔ زمانہ انہیں فاحشہ بنا دیتا ہے... ہم کوئی جاگیردار ہیں... جو ہمارے عیب ہماری اراضیاں ڈھانپ لیں... بول کس کس کو پتا ہے یہ سب۔"

"کسی کو بھی نہیں پتا اماں... کسی کو بھی نہیں پتا۔"

زہرہ روتے روتے پھر بے دم سی ہو گئی۔ حلق خشک ہو گیا اور آنکھیں بنجر ہو گئیں۔

"اٹھ کتی... چل باندھ سامان، راتوں رات نکلیں گاؤں سے..." زہرہ جھٹکے سے اٹھی۔

"نہیں اماں... میں ایسے نہیں جا سکتی... اب جو ہو سو ہو۔"

"کیوں مرنا ہے رزیلن تو نے... ایسی باتوں کو افشاں لگی ہووے... اندھیرے میں بھی نظر آجاوے۔"

"میں عاصم کے بغیر نہیں جا سکتی۔" سکینہ نے کہہ کر نظریں نیچی کرلیں۔ زہرہ برتن، کپڑے سمیٹتے ایک ٹک رک کر اسے دیکھنے لگی۔ کوکھ جنی نہ ہوتی تو شاید آج زہرہ اسے جان سے ہی مار دیتی۔ ملکانی نے بھی تو یہ ہی کام کرنا تھا تو کیوں نہ وہ خود گھر پر ہی کرلے۔

"کم عقلیے... تو نے کیوں یقین کرلیا اس کی باتوں پر۔ تو نہیں جانتی کہ جھرنے موری کی اینٹوں سے نہیں ٹکراتے..."

"جو مرضی کہہ لو... اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

سکینہ بانس کی جڑیں کھائے بیٹھی تھی... دنوں میں پروان چڑھی... اپنے ہی گھر میں کمزوری دکھا دیتی تو ملکانی بیگم کا سامنا کیسے کرتی۔

اس کے انجام کو سوچتے سوچتے زہرہ کا وجود پیلا ہی پڑتا گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے بات کرلی ہے ماں سے۔" عاصم نے اگلے دن اس سے کہا۔

"پھر کیا کہا انہوں نے...؟"

"اب تیری باری..."

"ملکانی بیگم نے تجھ سے کیا کہا...؟"

"کہا نا... اب تیری باری۔"

"میں، میں کیا کہوں؟"

"بس ڈر گئی...؟"

"نہیں۔ پوچھ رہی ہوں کہ میں کیا کہوں... کیسے بات کروں۔"

"تجھے کچھ نہیں کہنا..." عاصم نے کہا۔

"پھر...؟"

"یہ لے..." جیب سے دو جھمکے نکال کر اس نے سکینہ کے آگے کیے۔

"یہ کیا ہے؟"

"دو گلی... جھمکے۔"

"مجھے کیوں دے رہا ہے۔"

"ہمارے خاندانی جھمکے ہیں۔"

"تو پھر میں کیوں لوں۔"

"ان پر ویسے بھی میرا حق ہے... میری بیوی کا یعنی تیرا۔"

"ملکانی بیگم نے دیے ہیں۔"

"نہیں... فی الحال چوری کیے ہیں۔"

"چوری... کیوں؟" چوری کے نام پر ہی سکینہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"تیرے لیے... کہا نا ان پر ویسے بھی تیرا حق ہے آج لے یا کل لے۔" وہ غصے ہونے لگا۔ سکینہ جھمکے پکڑ نہیں رہی تھی اور سوال پر سوال پوچھے جا رہی تھی۔

"میں... میں ان کا کیا کروں گی؟"

"بس پہن کر اماں کے سامنے چلی جانا..."

"میں ملکانی بیگم کے سامنے..."

"وہ سب سمجھ جائیں گی..." سکینہ ملکانی کے سب سمجھ جانے سے ہی کانپ گئی۔

"پوچھیں تو بتا دینا عاصم نے دیے ہیں۔" وہ ہونق ہوگئی۔

"بول اب بتا دے گی... پہن کر چلی جائے گی اماں کے سامنے...؟" وہ اس سے پوچھنے لگا تو وہ سفید چہرے پر اگی اس کی کالی سیاہ داڑھی کو دیکھنے لگی۔ بھنویں، ماتھا، گال، ہونٹ، آنکھیں، گردن۔

ہائے خدارا... اس چہرے کو وہ مرنے کے بعد بھی بھول جانے کا حوصلہ بھلا کہاں رکھتی تھی۔

"اب تیری محبت کا امتحان ہے۔" کہتے ہوئے عاصم کی چاند کے برادے کی سی آنکھوں کے آگے چاند بھی ماند سا پڑ گیا۔

پتا نہیں یہ اس کا حسن تھا یا اس کی باتیں... سکینہ کسی انجانے عزم سے بھر گئی اور وہ جو نہ کبھی پڑھی نہ لکھی... پانچ جماعتیں مشکل سے پاس... یہ امتحان پاس کرنے کے لیے اس نے جیسے ضد باندھ لی۔

"اب تیری محبت کا امتحان ہے۔۔۔" وہ پھر کہنے لگا۔۔
سکینہ نے عاصم کے ہاتھ سے جھمکے لے لیے۔
"ہاں ٹھیک اب جو ہو سو ہو۔" اس نے ایسے کہا جیسے کل رات زہرہ سے کہا تھا۔ عاصم خلاؤں میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

☆ ☆ ☆

وہ جاتی سردیوں کی دھوپ سے اجلا ایک دن تھا۔ نیچے بڑے برآمدے میں ملازم لڑکیوں کا ہجوم سا اکٹھا تھا۔ ایک کونے میں چند لڑکیاں گندم کی صفائی کر رہی تھیں۔ دوسرے کونے میں سوکھی مرچوں کو الٹا پلٹا جا رہا تھا۔

ملکانی خود اونچی نواڑی کرسی پر بیٹھی زہرہ سے تیل سے اپنے سر کی مالش کروا رہی تھی۔ اس کے پاؤں نیم گرم پانی کے تسلے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور وہیں تسلے کے قریب گھر کی دوسری ملازمہ بھی بیٹھی تھی۔ باقی دو دائیں بائیں ملکانی کے کندھوں کو دبا رہی تھیں۔
ملکانی نے سخت سردی میں عاصم کی پیدائش والا واقعہ ابھی ابھی ختم کیا تھا۔ اس کا سر اوپر اٹھتا تھا بار بار۔۔ اس لیے براہ راست اس کی مخاطب زہرہ ہی تھی۔
"لڑنے کا شوق تو میری ساس کو تھا۔۔۔ اور پھر اس نے اپنے ارمان نکالے بھی بہت۔۔۔" دنداسے لگا جبڑا دکھا کر اور سرمہ لگی گول گول آنکھیں گھما کر ملکانی زہرہ کو دیکھتے ہوئے سب سے بولی۔
"لیکن نہ بھئی۔۔۔ مجھ سے تو نہ ہوں گے یہ جھنجھٹ۔۔۔ مجھ سے تو نہ لڑا جائے گا اپنی بہو سے، جسے اتنے ارمانوں سے بیاہ کر لاؤں گی۔ اس سے کیسے لڑوں گی بھلا ہیں زہرہ تو ہی بتا۔"
تیل لگاتی زہرہ جیسے کسی خوف کے باعث مزید ترو تر ہو گئی۔۔۔ نہیں ملکانی کی بات سے نہیں۔۔۔ بلکہ وہاں سکینہ کی آمد سے۔
دبے قدموں سے چلتی ہوئی سکینہ وہاں آئی تھی۔۔۔ جیسے دار پر چڑھنے آ رہی ہو۔
"اے زہرہ کی لونڈیا۔۔۔" ملکانی سیدھی ہوئی تو سکینہ کو دیکھ کر بولی۔
"تو کہاں گم صم رہتی ہے۔۔۔ کس دنیا میں ہوتی ہے تو۔ آجا بیٹھ جا۔۔۔ سب بیٹھی ہیں۔" اور سکینہ بے آواز چاپ سے چلتی ہوئی تسلے میں ڈوبے ملکانی کے قدموں کے قریب بیٹھ گئی۔
"اے ذرا زور سے دباؤ۔۔۔ کھاتی نہیں ہو کیا؟" ملکانی نے جھاڑا تو دائیں بائیں کندھے دبانے والیوں کے ہاتھوں میں مزید تیزی آ گئی اور زہرہ کے ہاتھ مزید سست ہو گئے۔
"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میں نے تو ابھی سے کریم داد سے کہہ دیا ہے کہ یہ حلووں پر چاندی کے ورق مجھے تو نہیں پسند بھئی۔۔۔ ایسے ہی انسان تھڑ تھلا سا لگتا ہے۔ ورق ہوں تو صرف سونے کے۔۔۔" ملکانی کہہ کر خود ہی بھرپور طریقے سے ہنسنے لگی۔
"اے زہرہ کی لونڈیا۔" ہنستے ہنستے ملکانی نے سکینہ کو پکارا۔
سکینہ چونکی۔۔۔ پانی کی جھاگ دار سطح سے نظریں ہٹا کر ملکانی کی طرف متوجہ ہوئی۔
"یہ جھمکے کہاں سے بنوائے تو نے۔۔۔ ہو بہو ہمارے خاندانی۔۔۔" اور حیرت سے کہتی ملکانی خود بخود ہی رک گئی۔ دائیں بائیں کے کندھے دبانے والیوں کے ہاتھ بھی اپنے آپ ہی رک گئے۔ پیروں پر جھانواں مارتی لڑکی بھی جھانواں مارنا بھول گئی۔
کونے میں ہوتی گندم کی صفائی رک گئی۔ چھاج چھٹکنے والی کے دانے کہیں ہوا میں ہی تحلیل ہو گئے۔ مرچوں کے الٹ پھیر نے ساری فضا کو کاٹ دار بنا دیا۔ سب کی ناکیں سرخ ہو گئیں۔ ملکانی کی کچھ زیادہ ہی۔۔۔ اور ناک سے بھی کہیں زیادہ سرخ ہوئیں آنکھیں۔
زہرہ ساکت و جامد امید و ناامید کے جھولے میں جھولنے لگی۔۔۔ پھر منجمد ہوئے سمے کی زنجیر ٹوٹی ایک دھماکے سے۔
پہلے ملکانی نے تسلے میں سے پاؤں باہر نکال کر سکینہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا پھر ایک زور دار ٹھوکر تسلے کو ماری۔۔۔ پانی کم اچھلا اور عزت جیسے زیادہ

اچھل گئی۔ لمحوں میں برآمدہ بھر گیا۔
ملکانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' آگے بڑھ کر سکینہ کو بالوں سے پکڑ کر اس کے دائیں بائیں کے گالوں پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔
"تیری اتنی جرات..... کمینی..... حرافہ..... چھنال۔"

ملکانی چیختی رہی اور مارتی رہی۔ ہر وہ گالی جو عورت نکال سکتی ہے ملکانی نے دے دی اور ہر وہ طریقہ جس سے ایک عورت دوسری عورت کو مار سکتی ہے ملکانی نے آزمالیا۔ زہرہ چپ چاپ سب تماشا دیکھتی رہی۔ کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ملکانی کے منہ پر ہاتھ رکھ سکے..... اور ایسی بغاوت بھی کوئی نہ کر سکا کہ تاڑ تاڑ تھپڑ برساتی ملکانی کے ہاتھ روک سکے۔ سکینہ کچھ نہ بولتی تھی۔ ملکانی نے اس سے بھلا کوئی وضاحت ہی کب مانگی تھی۔
"بے غیرت..... بے حیا' بدکار....." ملکانی مارتے مارتے جیسے بے بس ہو گئی۔
یہ تماشا تب تھما جب زہرہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہوئی۔ جھرمٹ میں سے آدھی زہرہ کی طرف متوجہ ہوئیں تب ملکانی نے کھینچ کھینچ کر جھمکے سکینہ کے کانوں سے لہو سمیت اتارے..... اور اس پر تھوک کر پاؤں پٹختی..... اسے پھٹکارتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

تاریک رات کے اختتام پر تارکول میں لپٹا ہوا سفیدہ نظر آنے لگا تھا۔ اس تھوڑے بہت نظر آنے میں بھی بہت کچھ فریب مشابہت کی ہی نظر ہو گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے جب سے کائنات بنی ہے یہ ہی عالم چلا آرہا ہے۔
نہ رات نہ سحر بس ایک جامد پہر..... جیسے سورج بادشاہ ازلوں کا دنیا والوں سے ناراض ہوا بیٹھا ہے اور اب اپنی ضیاء ریزی میں بخل سے کام لے رہا ہے۔
جن جن کے کھیتوں کو باری کے پانی ملنے کا دن تھا۔ وہ صبح ہی صبح اپنی زمینوں پر آ گئے تھے۔ ان کی

عورتیں نلائی کا کام کر رہی تھیں۔ باقی چاروں سو۔۔۔ خاموشی اور سناٹا تھا۔

جگالی کرتے بیلوں کی گردنوں میں جھولتی گھنٹیوں کی بازگشت عروج پر تھی جب وہ دونوں۔۔۔ زہرہ اور سکینہ۔۔۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئیں۔ اس طرح خاموشی سے کہ ان کے اپنے قدموں کو بھی اتنا لمبا سفر طے کر کے آنے اور سب کچھ پیچھے چھوڑ آنے کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

سوکھی کنالیوں کو زہرہ نے مانجھ مانجھ کر دھویا تھا۔ جب سے گھر بند تھا کنالیاں بھی سوکھی پڑی تھیں۔ خوب اچھی طرح دھو لینے اور اپنی تسلی کر لینے کے بعد زہرہ نے ایک کنالی میں پانی اور دوسری کو چادر کے پلو سے خشک کر کے اس میں باجرہ ڈالا تھا اور اوپر چھت پر رکھنے چلی گئی تھی۔

وہ شاید پیاسوں کا گاؤں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چڑیاں اکٹھی ہو گئیں اور دونوں کنالیاں گدلے پروں سے ڈھک گئیں۔

زہرہ کڑی دوپہر میں کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

"نجانے کس کے بدلے۔۔۔ کس کے صدقے۔"

نیچے آ کر اس نے جھاڑو پکڑی تھی اور صحن میں لگانا شروع کر دی تھی۔ بہتیرا پانی چھڑکا تھا صحن میں۔۔۔ پھر بھی دھول تھی کہ اڑتی ہی جاتی تھی۔

"لا چاچی۔۔۔ میں کر دوں صفائی۔۔۔" پڑوس کی لڑکی زارا نے دہلیز پار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں رہنے دے زارا دھی۔۔۔ خود ہی لگا لیتی ہوں میں۔۔۔ کسی ایک دیہاڑی کا کام تھوڑی ہے۔۔۔ اب تو روز ہی کرنا پڑے گا۔" اور روز کرنے والے کام کو وہ ایک لمحے کے لیے بھول سی گئی۔

"سکینہ کی طبیعت بہتر ہوئی چاچی۔۔۔؟" زارا نے پوچھا تو سوکھی دھول زہرہ کے پورے وجود پر چڑھ گئی۔

منہ سے کچھ نہ کہا پھر بھی زارا سب سمجھ گئی۔

"سنا تھا شہر میں جا کر لڑکیاں بہت تیز ہو جاتی ہیں چاچی۔۔۔ پر یہ سکینہ تو پرانی سدھ بدھ سے بھی گئی۔"

"ہاں۔ پتا نہیں کون سی نیند ہے۔ جو وہ یوں ہر وقت لیٹے رہ کر کھلی آنکھوں سے پوری کرتی ہے۔"

"کچھ تو بتا چاچی۔۔۔! کچھ تو بول۔۔۔ کیا ہوا شہر میں جو وہ یوں چھوئی موئی کی طرح خود میں ہی سمٹتی جاتی ہے۔" زہرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"وہ شہر ہے نا بیٹی۔۔۔ بڑی تیز رفتار زندگی ہے وہاں۔۔۔ کچھ ہو جانے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوا کیا ہے۔"

"سکینہ تو جیسے چپ رہنے کی قسم کھائے بیٹھی ہے۔۔۔ یہاں تیرا منہ بھی دیسی تالے کی طرح جامد ہے۔۔۔ تالا کھل بھی جائے پر کنڈی نہیں کھلتی۔"

"کچھ پتا ہو' کچھ سمجھ میں آئے تو بتاؤں۔"

"تو چھپاتی ہے چاچی۔۔۔ ہم سب سے' خود سے بھی۔"

"چھپاتی تو وہ ہے مجھ سے۔۔۔ کہیں خود ہی نہ چھپ جائے۔"

"کیا ہوا کوئی تاپ کوئی بیماری کوئی زہریلا جانور کاٹ گیا۔"

گندے صحن میں زہرہ دیوار کے ساتھ ڈھو لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے وہ منظر گھوم گیا جب ملکانی اسے تاڑ تاڑ تھپڑ مار رہی تھی۔ پتا نہیں یہ خیال ہی کیسا تھا۔ زہرہ کا سر اس دن کی طرح ہی چکرانے لگا۔

"سب کچھ۔۔۔"

"کیا سب کچھ چاچی۔۔۔" زارا نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"پہلے تاپ چڑھا۔۔۔ میں نے کہا اتر جائے گا۔۔۔ پر وہ بیماری بن گیا اور آخر میں زہریلی ہو گئی سکینہ۔۔۔"

"رہنے دے چاچی۔۔۔! تجھے بھی سکینہ کی زبان لگ گئی ہے۔"

"اور اس کی زبان۔۔۔ اس کی زبان کہاں گئی۔۔۔؟" زہرہ اپنے آپ سے بولی۔

"دکھ سے ہے ایسی گنگ۔۔۔ خاموش۔۔۔ کب سے نہیں بولا سکینہ نے کچھ۔"

"جب سے گاؤں واپس آئے ہیں... اس سے ایک رات پہلے سے۔"

"پتا نہ چلا کہ کیا ہوا اس رات میں۔"

"رات بھی تو ناگن ہووے... ڈس لیوے... ہونی کے لمحے کو کون ٹال سکے۔"

"تو کیا بیٹھے بٹھائے ہی ہو گیا سب کچھ..." زارا نے ہاتھ لہرایا بھنویں ملائیں۔

"بیٹھی تو میں رہ گئی... ہمت دکھا دیتی تو آج یہاں اس طرح نہ بیٹھی ہوتی۔"

"صرف باتوں سے تو فکر نہ ظاہر کر چاچی...! اس طرح لاتعلق تو نہ ہو جیسے سکینہ تیری سگی اولاد نہیں۔"

"تو کیا کروں..." زہرہ نے زارا سے پوچھا اور آسمان کو دیکھا۔

"اعتقاد تو اللہ کی ذات پر ہے... عقیدہ بھی دعا ہے... لیکن ان بابوں کے پاس جڑی بوٹیوں کا بڑا علم ہوتا ہے۔ جو عام آدمی کے پاس نہیں ہوتا... یہاں سے دو گاؤں چھوڑ تیسرے گاؤں میں ایک بابا آیا ہے... میری بھابھی وہیں سے ہے نا... وہاں لے جا سکینہ کو..."

"وہ کر دے گا سکینہ کا علاج... پھر سے بول سکے گی سکینہ... ٹوٹ جائے گا اس کا سکتہ؟"

"جانے میں حرج ہی کیا ہے چاچی۔"

زارا نے جھاڑو پکڑ لی اور بیٹھی ہوئی گرد کو پھر سے اڑانے لگی۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل چکا تھا اور ایک موسم کے بدلنے میں نجانے کتنی رتیں بدل گئی تھیں۔ مونجی کی لہلہاتی فصلوں کی کٹائی میں صرف چند دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ درخت برہنہ ہو چکے تھے۔ شاخوں کا جو جال سبزے سے بھرا تھا وہ بھی گرد کے باعث بڑا بے جوڑ دکھتا تھا۔

زہرہ لائن در لائن آگے دھریک کے درختوں کی چھاؤں تلے چلتی ہوئی پاؤں گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ دھوپ میں ابھی تیزی باقی تھی اور وہ اتنی تیز چل نہ سکتی تھی کہ جلدی گھر پہنچ سکے۔ سکینہ سے تیز تیز چلا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے مریل وجود میں اب بھلا جان ہی کتنی رہ گئی تھی کہ اب وہ اچھی طرح کھڑی ہی ہو سکے۔ زہرہ سکینہ کے ایک ہاتھ کو اپنے کندھے پر رکھے اسے سہارا دیے کر چل رہی تھی۔ سفر زیادہ لمبا تو نہیں تھا لیکن صبر آزما ضرور تھا۔ دونوں کی جوتیاں اور پاؤں مٹی کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔

چھ ماہ گزر چکے تھے زہرہ کو سکینہ کا علاج کرواتے کرواتے... اور آج بابا جی نے اسے دوائی نہیں دی تھی... شیشم کی سیاہ نسواری لکڑی کے موٹے دانوں والی تسبیح اور اسی میں رنگے ان کے ہاتھ تسبیح پر پھرتے پھرتے رک گئے تھے۔ ایسا کم کم ہی ہوا تھا... جلالی آنکھوں میں اداسی جھلکی تھی... اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ اسے کوئی بیماری ہے... یہ تو روگی ہے۔"

"روگی؟" زہرہ نے کہا۔

"تو کیا روگ بیماری نہ ہووے..." وہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔

"ہاں... روگی 'بیراگن' ملنگنی جوگن یا جو بھی کہہ لے تو سمجھ لے تو۔"

"ناں میرے کہنے سے کوئی خاصیت بدل جائے گی۔" زہرہ نے سوچا اور پوچھ لیا۔ "سایہ...؟"

"ہاں سایہ کہہ لے... سمجھ لے۔"

"کس کا سایہ... محبوب کا سایہ؟"

جامن کی چھال کی سی رنگت والے بابا جی بڑی پھیکی مسکراہٹ مسکرائے۔

"ہاں محبوب کا سایہ... تو تو وڈیری تھی... نہیں جانتی تھی کہ محبت سانپ ہے تو عشق کوڑیالہ..."

"کوڑیالہ...؟" زہرہ کانپی جیسے نام لیتے ساتھ ہی کسی نے پٹاری میں سے کوڑیالہ باہر نکال دیا ہو۔

"سانپ کا ڈسا تو پھر پانی مانگ لے... کوڑیالے کا ڈسا تو وہ بھی نہ مانگ سکے۔"

"پانی ہی مانگ لے... کچھ تو بولے۔" زہرہ نے

حسرت سے کہا۔
"تجھے اتنی بھی سمجھ نہ تھی کہ گھوڑی اور لڑکی منہ زور ہو جائے تو کیا کرتے ہیں۔"
"سمجھ تھی... پر یہ زنجیریں چھڑا چھڑا کر باہر جاتی تھی۔" بابا جی خاموش رہے۔
"پھر اب ازالہ کیسے کروں... کس کے پاس جاؤں۔"

"روگ کا علاج انسان کے پاس ہوتا تو موت کا بھی ہوتا... کسی کے پاس نہیں ہے اس کا علاج... کسی کے پاس نہیں ہے..."
"کسی کے پاس نہیں؟" زہرہ نے مریل سکینہ کو گلے سے لگا لیا۔
"کسی حکیم، ڈاکٹر، بابے کے پاس نہیں... سوائے ایک کے..."
"کون ہے وہ ایک... میں جاؤں گی اس کے پاس۔"
بابا جی نے شہادت کی انگلی اوپر اٹھا دی۔
"وہ جو ایک ہے اور ایک ہی رہے گا... گھر چلی جا، وہ کرے گا علاج جب اس نے کرنا ہو گا۔"
اور وہاں سے ناامید ہو کر زہرہ نے سکینہ کو اٹھایا اور گھر کو ہولی۔
چلتے چلتے اور سہارا دیتے دیتے زہرہ جیسے تھک سی گئی تھی۔ گھر تھوڑے ہی فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ہر ہفتے بعد کا یہ سفر پچھلے چھ مہینے سے اسے ہلکان کر رہا تھا۔ لیکن آج تو وہ جیسے ختم ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ سکینہ کی بیماری، کچھ اس بیماری کا لاعلاج ہونا۔ اکتوبر کا سورج نیم گرم ہونے کے باوجود بھی زہرہ کو سوا نیزے پر لگا۔
سکینہ نے دور دور تک اگی ہوئی سنہری فصل کو دیکھتے ہوئے اپنا سارا بوجھ اماں پر منتقل کیا۔ زمین اس کے پیروں کے نیچے سے کھسکنے لگی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا یہ زمین پچھلے کئی مہینوں سے اس کے پیروں کے نیچے سے کھسک رہی تھی۔ لیکن نہ پوری طرح کھسکتی تھی نہ پوری طرح ٹھہرتی تھی۔ زمین کی اس ناانصافی نے اسے دائمی کپکپی لگا دی تھی۔
زارا اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی تھی۔
"چاچی... سکینہ جیسی آنکھیں تو ریقان والوں کی ہوتی ہیں۔" زہرہ کہتی تھی۔
"ایسی آنکھیں انتظار والوں کی ہوتی ہیں۔"
اور وہ خود... وہ خود تو نہ کچھ سوچتی تھی نہ کچھ کہتی تھی۔ ایسی آنکھیں تو اس کی ہوتی ہیں جو چاند کے براداے کو گہن لگتا دیکھ لے۔
اس نے بھی گہن لگتے دیکھ لیا تھا۔ جس رات وہ ملکانی کا کوارٹر چھوڑنے لگے تھے اسی رات... لیکن کیسی عجیب بات تھی۔ گہن والا خود تو خوش تھا اور جو دیکھ رہا تھا، وہ اندھا ہو گیا تھا۔
جس دن ملکانی نے تھپڑ مار مار کر سکینہ کا سنولایا چہرہ لال سرخ کر دیا تھا۔ زہرہ نے اسی دن ہوش میں آنے کے بعد کوارٹر آکر سارا سامان سمیٹ لیا تھا۔ غریبوں کے پاس خواہشوں کی طرح سامان بھی بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ لمحوں میں سارا کوارٹر بنجر ہو گیا۔
"اٹھ بے غیرت! اب تو اٹھ جا، اپنا کپڑا لتا رکھ لے۔ اب کیا تجھے علیحدہ سے سندیسہ آئے گا کہ یہ کوارٹر خالی کر دو... اب کس چیز کی آس ہے؟" زہرہ غصے سے چیختی رہی لیکن سکینہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔
"میں ایسے نہیں جاؤں گی اماں... عاصم۔"
"اوہ بے غیرت... ابھی بھی نہیں سمجھی تو اپنی اوقات..." زہرہ نے کہا اور بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔
"ساری زندگی تجھے گالی نہ نکالی میں نے... تجھ پر ہاتھ نہ اٹھایا کبھی... اس چیز کی لاج ہی رکھ لیتی تو سکینہ... کیوں اس عمر میں میرے اصولوں کا احتساب کرنے بیٹھ گئی تو۔"
کچھ صبح بے ہوش ہونے کی کمزوری، کچھ سارا سامان سمیٹنے کی تھکن... کچھ اپنی غریبی، اپنی حیثیت پر پڑنے والے طمانچے... زہرہ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز تیز رونے لگی۔
"تو کیوں روتی ہے اماں... مار تو مجھے۔"
"دور ہو جا میری نظروں سے..." زہرہ نے اسے لات ماری... پھر خود کو پیٹنے لگی۔

"اگر میں تیرے ساتھ ایسے ہی چلی گئی اماں تو عاصم پاگل ہو جائے گا۔۔۔ مجنوں بن جائے گا میری تلاش میں۔"

"تجھ میں کون سے ایسے گن ہیں کُتی۔۔۔ جو تیرے لیے کوئی کوہ کن بنے۔" زہرہ خود کو مزید پیٹنے لگی۔

"جتنی عزت رہ گئی ہے اس کو سمیٹ لے سکینہ۔۔۔ اٹھ سامان پکڑ۔"

"بس ایک بار اماں۔۔۔ بس ایک بار۔۔۔ آخری بار۔۔۔ مجھے اس سے مل لینے دے۔۔۔ میں اسے سمجھا دوں گی کہ وہ ملکانی کی بات مان لے۔ پر۔۔۔" سکینہ خاموش ہو گئی۔

"پر اس سے ملے بغیر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

سکینہ کی آنکھوں میں بغاوت تنی دیکھ کر زہرہ نے خود کو پیٹنا بند کر دیا اور گہرے دکھ سے سکینہ کو دیکھنے لگی۔

"وہ پاگل ہو جائے گا یا تو ہو گئی ہے۔"

"مجھے پاگل ہی رہنے دے اماں۔۔۔! پر مجھے ایک بار اس سے مل لینے دے۔"

اس رات کی آمد بہت بھاری تھی۔ سکینہ پر، زہرہ پر اور ملکانی پر بھی۔ ملکانی کے ہاتھ ابھی تک درد کر رہے تھے۔ مارتے مارتے اس کا خود کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا تھا، سر پھٹنے لگا تھا اور اس کے سر کو عادت بھی زہرہ کے ہاتھوں کی ہی رہی تھی۔

"ایک تو ان رزیلوں میں مضبوطی بہت ہوتی ہے۔۔۔ کم بخت کالی کلوٹی کیا چوہیا سی دکھتی تھی پر اتنی مضبوط ہڈیاں ہیں کہ میری اپنی ہڈیاں درد کرنے لگی ہیں۔"

ملکانی کے کچھ درد جوڑ جوڑ میں تھے۔ کچھ دل میں، نہیں۔۔۔ سکینہ کو مارنے کا تو اسے ذرا برابر دکھ نہیں تھا۔ ان رزیلوں کی بھلا اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔ وہ ہی نرم رہی ساری زندگی ان کے ساتھ۔۔۔ خوف خدا نے ہی گھیرے رکھا اسے تو ہر وقت۔۔۔ جو ان جوٹھوں کی دوست بنی رہی۔ کبھی مالکن بنی ہی نہیں۔۔۔ اناج، گھی، دودھ کے منہ کھلے رکھے ان خبیثوں پر۔۔۔ ہر ایک کی مشکل میں خود پریشان ہو گئی۔ ہر خوشی میں انہیں بھی شریک رکھا۔۔۔ اور آج۔۔۔ زہرہ کی لونڈیا۔۔۔ اتنی ہمت دکھا گئی تھی اس کی ناک تلے۔۔۔ پتا نہیں کب سے چل رہا تھا یہ سب۔

پہلے وہ انگریزنی تھی اور اب یہ سکینہ۔۔۔

ملکانی کروٹوں پر کروٹیں لینے لگی۔۔۔ نیند آج گرم کمرے میں ٹھنڈی ہوا کی طرح کہیں باہر ہی رہ گئی تھی۔۔۔ اسے تو صرف عاصم کی فکر تھی۔ عاصم کے کچھ فقرے اس کی سماعت کی بازگشت میں ڈوب ابھر رہے تھے۔

"چلو مان لیتا ہوں کہ میری شادی ہو جائے گی۔۔۔ زبردستی ہی سہی۔۔۔ تم اپنی کر گزرو گی۔۔۔ لیکن پھر۔۔۔ پھر آگے کیا۔۔۔ کیا آگے بھی سب کچھ خود کرو گی؟"

"لڑکی بنجر ہو کر مر جائے گی یا ہمت والی ہوئی تو طلاق لے لے گی۔" ملکانی نے اپنا دل تھام لیا۔

انگریزنی، سکینہ۔۔۔ سکینہ، انگریزنی۔

ملکانی ایک جھٹکے سے اٹھی۔

ادھر کوارٹر میں سکینہ بھی چارپائی سے اتری۔

ملکانی نے الماری کھول کر کچھ کاغذات الٹ پلٹ کیے اور ایک پیکٹ نکالا۔

سکینہ نے کالی چادر میں خود کو چھپایا اور جاگتی ماں کو سوتا سمجھ کر دروازے کی دہلیز پار کر گئی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ عاصم کے کمرے تک پہنچتی۔۔۔ گھور اندھیری رات میں اس نے ملکانی کو بھی وہاں ہی جاتے دیکھ لیا۔ دروازے کے پٹ کی جھری کے ساتھ لگ کر سکینہ کھڑی ہو گئی۔

اندر پہنچ کر ملکانی نے بند پیکٹ عاصم کی طرف اچھالا تھا۔

"یہ۔۔۔ لے۔" پیکٹ لیٹے ہوئے عاصم کے ہاتھ کے قریب آ کر گرا تھا لیکن نہ تو اس نے پیکٹ کھولا تھا اور نہ ہی زبان۔

"تیرا پاسپورٹ۔۔۔ شناختی کارڈ اور نقدی۔۔۔" ملکانی خاموش ہو گئی۔

"جا لے آ جا کر اس انگریزنی کو یہاں۔۔۔ یا اسے ادھر بلا لے۔۔۔ مجھے یہ شادی منظور ہے سچے دل سے۔" اس

سے پہلے کہ ہکا بکا عاصم کچھ بولتا۔ سکائی کمرے سے باہر نکل گئی۔

سکینہ دیوار کے ساتھ دیوار ہو گئی۔۔۔ اور سوچنے لگی۔۔۔ جب تک میں اندر پہنچوں گی عاصم تو اس پاسپورٹ کو پھاڑ ہی چکا ہوگا۔ لیکن اس کے اندر پہنچنے سے پہلے ہی عاصم کا قہقہہ باہر کو لپکا۔

"ہائے اللہ! کہیں عاصم دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔"

پگلی۔۔۔ دیوانی تو وہ ہو گئی تھی۔

اور جھری میں سے ہی اس نے دیکھا۔ عاصم نے پاسپورٹ کو ہوا میں اچھالا تھا۔ پھر اسے ہونٹوں سے لگا کر چوما تھا۔ اور پھر ایک عجیب سا نعرہ لگایا تھا۔

سکینہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ لیکن اندر جانے کی اس کی ساری ہمتیں بھی نجانے کیوں مفقود ہو گئیں۔

اپنا موبائل پکڑ کر عاصم نے جلدی جلدی ایک کال کی تھی۔

"ہاں۔ سب ٹھیک ہو گیا ڈارلنگ۔۔۔ سب کچھ۔" وہ قہقہے لگاتے لگاتے ہنسا۔

"اماں تجربہ کار ہیں پر چالاک نہیں کم از کم میرے جتنی۔"

سکینہ نے دروازے کے پٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔۔۔ دوسری منزل پر ہونے کے باوجود بھی وہ جیسے پاتال کی اور سرکنے لگی۔ پتا نہیں اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے قدموں میں چلا گیا تھا یا دھڑکنیں اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھیں۔

"ترکیب کام کر ہی گئی۔۔۔ حالانکہ مجھے اس کے کام کر جانے کا اتنا بھی یقین نہیں تھا۔" عاصم کی آوازیں اور قہقہے آنا بند ہی نہیں ہو رہے تھے۔ اور کیسی ہنسی تھی وہ جس نے اس کی ساری حیاتی کی آنے والی ہنسی مسکراہٹ بھی چھین لی تھی۔

فضا میں مونجی کی خوشبو کو محسوس کرتے کرتے وہ اوب گئی تھی۔ زہرہ نے دور سے ہی گھر کی چھت پر پڑی دونوں کنالیوں پر چڑیوں کا جھرمٹ دیکھ لیا تھا۔

"نجانے کس کے بدلے۔۔۔ کس کے صدقے۔۔۔" وہ اپنی چادر کے پلو سمیت دل کو بھی تھام کر رہ گئی۔

"چاچی! کیا کہتا ہے بابا۔۔۔ سکینہ تو اور دبلی ہو گئی ہے۔ اتنی دیر تو ہو گئی علاج کرواتے کرواتے۔۔۔ آخر کب تک بولے گی یہ۔۔۔" زارا گھر کے باہر شٹاپو کھیل رہی تھی۔ زہرہ کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"نہ بولے تو فکر نہ کر چاچی۔۔۔ بس دعا کر کہ اب یہ زندہ رہے۔" فریدہ نے کہا۔

"میرے ماموں کے گاؤں میں بھی ایک حکیم ہے۔" فاطمہ نے بتانا چاہا۔

"نہ دھی رانی۔۔۔ اب نہیں۔۔۔ جان گئی ہوں کہ اس کا علاج ایک ہی جانا کر سکتا ہے وڈا ڈاکٹر۔۔۔ وہ علاج کر دے یا انصاف کر دے۔"

"علاج ہی کروا لے چاچی۔" فاطمہ مشورہ دے کر ہنسی۔

"جتنا وڈا کھیل اس کے ساتھ کھیلا گیا ہے۔ علاج بھی تو اتنا ہی وڈا ڈاکٹر کرے گا ناں۔"

"کتنا وڈا کھیل چاچی۔۔۔ شٹاپو سے بھی زیادہ وڈا۔۔؟" لڑکیاں چہکیں۔

"سوچ سے زیادہ وڈا۔۔۔" اور ہنستے ہنستے ان تینوں کی ٹی جیسے گم سی ہو گئی۔

"چل سکینہ! گھر چل۔۔۔ وضو کر کے مصلیٰ بچھا کر اس وڈے ڈاکٹر کے آگے عرضی ڈالوں۔۔۔ علاج کر دے یا انصاف کر دے۔۔۔ بس جلدی کر دے۔۔۔ چل بیٹی۔۔۔ گھر چل۔"

زہرہ نے چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کیں اور سکینہ کو سہارا دے کر گھر کی طرف چل پڑی۔

بھری دوپہر میں سورج جیسے ڈوب سا گیا۔

نایاب جیلانی

”کبھی کبھی چھوٹا سا ذہن بڑے بڑے کارنامے سر انجام دے دیتا ہے۔“ اس نے کہیں پڑھا تھا اور پھر خود ہی ”سچ“ کر دکھایا۔ اسے خود بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا معمولی سا دماغ لڑانے کے بعد صورت حال اس قدر قابو میں آجائے گی۔ بکھری چیزیں سمٹ جائیں گی! رویے 'لوگ' حالات' سچویشن اس کے کنٹرول میں آجائے گی۔ سب کچھ ایک معمول کی طرح ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ لوگ ڈگریوں کی تعداد سے ذہانت کی اونچائی اور گہرائی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہانت کی آزمائش سے پہلے ہی انہیں ”کم عقل، کند ذہن“ اور احمق قرار دے دیتے ہیں۔

دراصل ایسی سوچ رکھنے والے لوگ خود بلا کے کند ذہن اور احمق ہوتے ہیں۔

اور زوہیب بڑی دلیری کے ساتھ خود کو ایسے القابات سے نواز سکتا تھا۔

دراصل اس کے ساتھ ہوا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

گزشتہ واقعات پہ نظر دوڑاتے اسے اب اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اور ساتھ ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ دو خواتین میں ”ریس“ لگی تھی۔ دونوں مہذب انداز

مکمل ناول

میں ایک دوسرے پہ ذہنی طور پر سبقت لے جانا چاہتی تھیں۔ (زوہیب کو اسے سج سج سیڑھیاں اترتے دیکھ کر پوری کی پوری کہانی سمجھ میں آگئی تھی اور اب وہ ہنس رہا تھا) ان میں کند ذہن خاتون نے ذہین و فطین خاتون کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اپنا چھوٹا سا دماغ لڑا کر.... کچھ ساعتوں اور گھڑیوں کے لیے منظر سے ہٹ کر۔

اس وقت صوفے پہ لیٹ کر اپنی ہیجان آمیز خوشی کو قابو کرتا' سیڑھیاں اترتی "نصف بہتر" کو دیکھ کر اسے اپنے بھی "الّو" بنائے جانے پہ غصہ آنے کے بجائے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

پچھلے کئی گھنٹوں سے انتہائی گرمی' تپش لُو اور دھوپ میں سڑکوں پہ مارا مارا پھرنے' خاک چھاننے' رشتے داروں کے گھروں میں پاگلوں کی طرح اس کی تلاش میں جانے کی تمام تر ریاضت کا غصہ' اشتعال اور صدمہ اسے سیڑھیوں سے' اپنے ہی گھر کے اوپر والے پورشن سے برآمد ہوتے دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

اور وہ بڑے کھلے انداز میں' ہر قسم کے نسوانی خطرناک وجود سے پاک ہوئے گھر میں' گھومتی کھلکھلاتی ہوئی ذوہیب سے اترا اترا کر پوچھ رہی تھی۔

"اب بتائیں سرتاج جی! بھلا کند ذہن کون؟" اور زوہیب پہ ایک مرتبہ پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

فضا میں مچھروں کی سحر انگیز آواز گونج رہی تھی۔ کبھی آواز آتی' کبھی گم ہو جاتی تھی۔

مٹی کی دیواروں میں کھدے طاقچے خالی تھے۔ اندھیرے میں یوں لگتا جیسے طاقچوں میں دیے رکھنا یاد نہ رہا ہو۔ لیکن طاقچے خالی نہیں تھے۔ ان میں ایک ایک دیا موجود تھا۔

وہ دیوار ٹٹولتی نچلی پڑچھتی سے ماچس اٹھا کر طاقچہ تک آئی تھی۔ دیوں میں تیل بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس نے واپس جا کر اسی پڑچھتی سے تیل کی بوتل اٹھائی اور دیوں میں تیل کی دھاریں بھرنے لگی۔ پھر ماچس کی تیلی نکال کر رگڑی تو اک ننھا سا شعلہ اندھیرے میں نمودار ہو گیا۔ اس نے دونوں دیوں کو روشن کیا اور کچے کمرے میں پھیلی روشنی میں ٹائم دیکھنے کے لیے چھوٹا سا ٹائم پیس اٹھا لیا۔

فجر ہونے میں ایک گھنٹہ بیالیس منٹ تھے۔

اس کے پیروں میں پھر سے پہیے بندھ گئے.... کچے کوٹھے سے نکل کر وہ احاطے میں آ چکی تھی۔ پورا احاطہ رات کی ساحرہ کے چنگل میں بے بس' خاموش تھا۔ دور ویرانوں سے جانوروں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی تھی۔ اس کے علاوہ پورے عالم پہ سکوت طاری تھا۔

احاطے کے ایک طرف بندھے جانوروں کی بدبو نتھنوں میں گھستی تو اسے ابکائی آنے لگتی تھی۔ اسے اپنے ہی گھر کے دیہی' غلیظ اور خستہ حال ماحول سے گھن آئی۔

ایک بڑا عرصہ بڑے شہروں کی ہوا کھانے کے بعد دیہات میں ایک لمحہ بھی نکلنا محال تھا۔ اسے اب پتا چلا تھا کہ اس کا پڑھا لکھا کرنل چاچا یہاں کیوں نہیں آتا تھا۔ بھلا یہاں تھا ہی کیا؟ گند' غلاظت' جانوروں کے گوبر کی بساند۔ ٹوٹی سڑکیں' ابلتے نالے' بھوک' افلاس' جہالت' اس کا بھرا ہوا دل اور بھی بھرنے لگا۔ وہ شہر میں جاب کرتی تھی۔ لیکن جمعہ کو لازمی واپسی کا سفر کرنا پڑتا۔ اگر جمعہ کو تعطیل نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی گھر نہ لوٹتی۔

اور اب اس کے ٹرانسفر آرڈر آ چکے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے اسے چھٹی ملی اور وہ مجبوراً" واپس اسی ماحول میں آ گئی۔ جس ماحول سے اسے سخت ترین نفرت تھی۔ اور آج فجر کے بعد چلنے والی پہلی ویگن سے اس کے حبس بھرے دنوں کا اختتام ہونے والا تھا۔ پوری رات خوشی کے مارے نیند نہیں آئی تھی۔

خوشی اس بات کی نہیں تھی کہ وہ اس قفس سے

نکلنے والی ہے۔

خوشی اس بات کی تھی۔ وہ محبوب کے شہر میں اُترنے والی ہے۔

☼ ☼ ☼

ایک گلابی دن طلوع ہوا اور بکھرتا ہوا اداس شام میں ڈھل گیا۔

سورج اپنی لالی سمیت آسمان کی وسعت میں کھو رہا تھا۔ پورب کی طرف سے مٹیالی گرد کے آثار نظر آتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا' آندھی کا غبار ہر سو چھانے کی تیاری کررہا ہے۔

شام بھی سرمئی ہورہی تھی۔ آسمان پہ سیاہی مائل بادلوں کا بسیرا تھا۔ اس نے موسم کے تیور دیکھے تو دھڑ دھڑ کھڑکیاں' دروازے بند کرنے لگی۔ اندر سے رخسانہ کی آواز بھی آرہی تھی۔

"آندھی آنے والی ہے۔ کھڑکیاں دروازے بند کرو۔ فبنا کو میرے پاس لاؤ۔ بادل گرجے تو ڈر جائے گی۔" ان کا اپنا ہی الارم بج رہا تھا۔ ہمیشہ وہ اپنا شور مچا کر اسے بوکھلائے رکھتی تھیں۔ یوں ہر سیدھا ہوتا کام بھی الٹ جاتا تھا۔

"دیکھ تو رہی ہیں۔ کھڑکیاں بند کررہی ہوں پھر بھی" وہ جھنجلائی سی اپنے بیڈ روم کی طرف بھاگی تھی۔ اندر سے فبنا کے رونے کی آواز آرہی تھی۔

اس نے فبنا کو جلدی سے اٹھایا اور کھڑکیاں بند کرتی باہر آئی۔

"دیکھا نا.... ڈر گئی بچی.... کہا بھی تھا مجھے دے جاؤ۔" فبنا کو روتے دیکھ کر انہوں نے اپنی گردن کھڑکی سے باہر نکال لی تھی۔ وہ جھنجلا کر فبنا کو انہیں پکڑانے آئی تھی۔

"سو کے اٹھی ہے۔" وہ اس کی بھوک محسوس کر کے فیڈر لینے چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو فبنا دادی کی گود میں دوبارہ سو چکی تھی اور وہ فون سننے میں مصروف تھیں۔ چہرے پہ خاصے خوشگوار تاثرات تھے۔ وہ ان کی باتوں سے اندازہ لگانے لگی۔ "کیا کوئی آرہا تھا؟"

"کیوں نہیں' اس کا اپنا گھر ہے۔ پہلے بھی تو آتی تھی۔ کسی ہاسٹل میں کیوں رہے گی۔ ہمارے گھر رہے۔ اوپر گیسٹ روم میں.... پہلے بھی کہا تھا مگر وہ مانی نہیں۔" اس کی ساس کا موڈ بڑا تر و تازہ ہو گیا تھا۔ اور ایسا عموماً کم کم ہی ہوتا تھا۔ ان کے چہرے پہ مسکراہٹ لانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ یا ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر۔

اس نے سر جھٹک کر کان پھر سے ان کی باتوں میں لگائے تھے۔ ایسے کھد بد سی ہورہی تھی۔ شاید اس کی نند نے کال کی تھی؟

کچھ دیر بعد فون بند ہوا اور اس کی ساس نے پہلی مرتبہ خاصا مسکرا کر بتایا۔

"آمنہ کے جیٹھ کی بیٹی آرہی ہے.... ارے کیا میٹھی سی طبیعت ہے اس کی۔ ایسی چونچال کہ پورا سال ہنسی نہ رکے۔" وہ اپنی دھن میں بول رہی تھیں جبکہ شافیہ کے ہاتھ سے فیڈر گر پڑا تھا۔ وہ ایک دم سن ہو گئی۔

فضا میں مجیروں کے بجنے کا سحر پھیل رہا تھا۔

پیتل کی کٹوریوں کو طبلے کے ساتھ تال دینے کے واسطے بجایا جارہا تھا۔

فضا میں گھٹن تھی اور گھٹن سانس دبا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ فضا میں آکسیجن نہیں تھی۔ لیکن آکسیجن تو تھی پر سانس نہیں تھی۔ اور کیا سانس واقعی نہیں تھی؟

اس نے جلتی آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر اندر بھرتی ریت کو زائل کرنا چاہا تھا۔ یہ ریت' کچی نیند کی کڑواہٹ کے اثر سے تھی۔

بار بار آنکھ لگتی اور کھلتی۔ وہ آنکھیں رگڑ رگڑ کر جاگنے کی کوشش میں ہلکان ہورہی تھی۔ آج پورا دن کس قدر مصروفیت اور تھکاوٹ سے گزرا تھا۔

گرمی کی چھٹیوں کا کل پہلا دن تھا اور آج اوپر والے پورشن کی صفائی میں پورا دن نکل گیا تھا۔ اوپر والے پورشن کی صفائی بھی کسی شوق کے پیش نظر نہیں ہو

رہی تھی۔ "وجہ صفائی" کچھ اور تھی۔ صبح صبح زوہیب کی سب سے بڑی بھانجی کا فون آیا تھا۔

"نانو! ہم چھٹیاں گزارنے آرہے ہیں۔ اس دفعہ پورے بیس دن رہیں گے۔" ہما کی کال کے فوراً" بعد شافیہ کی ساس رخسانہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر آواز لگائی تھی۔

"شافی! جلدی سے اندر آکر میری بات سنو۔"

رخسانہ کے لہجے میں واضح خوشی اور جوش محسوس ہورہا تھا۔ شافیہ ان کے بغیر بتائے ہی سمجھ گئی تھی کہ ان کی بیٹی آمنہ کے بچوں کا نزول ہونے والا ہے۔

ایک تھکا دینے والے احساس کے ساتھ وہ کچن سے نکل کر ساس کے حضور حاضر ہوئی تھی۔ گو کہ آمنہ کا آنا کبھی اسے ناگوار نہیں گزرا تھا اگر ناگوار لگتا بھی تو شافیہ کی اتنی جرات نہیں تھی جو وہ اپنی ناگواری کا کھلا اظہار کرسکتی۔

نہ ہی اس کی ساس' نند اور شوہر نے اسے اتنی جرات عطا کی تھی کہ وہ اپنی "رائے" کا اظہار کرسکتی۔ آمنہ ہی چھٹیوں میں بچوں کو دوبئی' شارجہ' ملائشیا لے کر جاتی تھی۔ ہر ٹور کے بعد وہ سب ایک ہفتے کے لیے یہاں ضرور آتے تھے۔ لیکن اس دفعہ شاید آمنہ نے اپنا پروگرام بدل لیا تھا۔ وہ لوگ بیرون ملک جانے کی بجائے یہاں آرہے تھے۔ اس لیے رخسانہ کی خوشی کا کوئی حساب نہیں تھا۔ انہوں نے اسے واضح اور دو ٹوک انداز میں بتادیا تھا۔

"اوپر والے پورشن پہ نگاہ کرم ڈال دو۔ ہر چیز مٹی مٹی ہورہی ہے۔ ہفتوں تم اوپر کا رخ نہیں کرتیں تم۔ اب تو سوا مہینہ ہوئے بھی تین مہینے گزر گئے۔ بچی چوتھے مہینے میں لگ گئی ہے۔" انہوں نے لگے ہاتھوں اس کے "آرام" کے دنوں کو بھی جتلا دیا تھا گو کہ ان دنوں میں بھی اسے آرام نصیب نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی رخسانہ کو باتیں سنانے کا موقع مل گیا۔

"کل اتوار ہے' آج صفائی کرلو۔ کل زوہیب کے ساتھ جاکر کھانے پینے کا سامان لے آنا۔ بچوں کی پسند کا تمہیں پتا ہے۔ جو کچھ وہ کھاتے ہیں۔ سب کچھ لے آنا۔ پہلی مرتبہ تو رہنے کے لیے آئیں گے۔" ان کی سرخوشی کا عالم ہی کوئی اور تھا۔ شافیہ کے اندر خواہ مخواہ ہی محرومیاں اترنے لگیں۔

اس کے لیے اس انداز میں تیاری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پہلے اماں اور پھر ابا بھی چلے گئے۔ گو کہ بھائی تین موجود تھے۔ بھابھیاں بھی تھیں۔ لیکن یوں لگتا تھا اماں' ابا کے بعد انہوں نے اکلوتی نند کو بھی دفن کر دیا تھا۔ بھائی ماشاءاللہ خوش حال تھے۔ اور اپنے گھروں میں مگن اور مشغول بھی۔ سو انہیں اپنی اکلوتی چھوٹی بہن کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔

بڑے بھائی تو خود ابو نانا' دادا بن چکے تھے۔ باقی دونوں کی اولاد بھی جوان تھی۔ بڑے بھائی کے چاروں بچے شادی شدہ تھے۔ دراصل شافیہ' اماں' ابا کے بڑھاپے کی اولاد شمار ہوتی تھی۔

ایک بیٹی کی خواہش نے اماں کی گود میں بالآخر شافیہ کو ڈال ہی دیا۔ جب اس کے بھائی جان' دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ شافیہ کی پیدائش بھی ایک المیہ تھی۔ کم از کم اس کے خاندان کا المیہ ہی تھی۔

شافیہ کا دنیا میں آنا ایک عجوبہ بن گیا۔ اماں بے چاری ایسے منہ چھپائے پھرتی تھیں جیسے شافیہ کو پیدا کر کے انہوں نے کوئی گناہ کردیا ہو۔

اماں اپنی بہوؤں کے طنز' باتوں' طعنوں اور مذاق اڑانے کے خوف سے اپنی ننھی سی بیٹی کو اٹھاتی تک نہیں تھیں۔ پیار کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔

لیکن ابا کا رویہ اس کے ساتھ بڑا والہانہ تھا۔ اکثر شافیہ کو اٹھا کر گلی میں باہر لے جاتے۔ تو کوئی بھی ان کا دوست مذاقاً" کہہ دیتا تھا۔

"کیا پوتی اٹھا کر لائے ہیں؟" تب ابا بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے۔

"پوتی کیوں؟ میری اکلوتی بیٹی ہے شافیہ۔۔۔" ان کا لہجہ فخر و انبساط سے بھر جاتا تھا۔ اماں کی "شرمندگی" بھرے انداز کی نسبت ابا کا رویہ بڑا پر اعتماد ہوا کرتا تھا۔

اماں کا پہلا ہارٹ اٹیک ہی جان لیوا ثابت ہوا اور وہ دنیا چھوڑ گئیں۔ اماں کے بعد ابا بھی گم صم رہنے لگے تھے۔ اماں کے بعد ہی ابا کو اندازہ ہوا تھا شافیہ کی اپنے ہی گھر میں زندگی کس قدر مشکل میں ہے۔

بچپن تو جیسے تیسے بھابھوں اور بھتیجے' بھتیجیوں کی مار دھاڑ سہتے گزر گیا تھا۔ جیسے ہی وہ شعور کی دنیا میں آئی اس کے لیے سب کے رویے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

بھابھیاں اس کی موہنی صورت سے خار کھاتی تھیں اور بھتیجیاں اس کی سفید دودھیا چمکتی رنگت سے جلتیں۔ ابھی دسویں جماعت کا نتیجہ آیا تھا' جب رشتوں کی لمبی لائن ہی لگ گئی۔ ابا تو بوکھلا گئے تھے اور بھائیوں نے صاف جواب دے دیا۔

"ابا! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" وہ جز بز ہو رہے تھے لیکن ابا کے سر پہ دھن سی سوار ہو گئی تھی۔

"میرے ہوتے ہوئے شافی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میں مر گیا تو اس کا کیا حال کرو گے؟" ابا کی ضد پہ بھائیوں کو چپ ہونا پڑا ان ہی دنوں اس کی بڑی بھتیجی ثانیہ کا بھی رشتہ آگیا تھا۔ بھابھی ثانیہ کی شادی کے لیے پرجوش کیا ہوئیں' ابا نے بھی آنے والے آخری رشتے پہ ہاں کر دی۔

زوہیب کا رشتہ تب آیا تھا جب ابا سارے اچھے اچھے رشتوں کو بھائیوں کی ملی بھگت کی وجہ سے کھو چکے تھے۔ بھائیوں کا خیال تھا۔ شافیہ ابھی چھوٹی ہے۔ پہلے ثانیہ اور رانیہ کی شادی ہو۔ دونوں بی اے کر چکی تھیں۔ تب تک شافیہ بھی گریجویٹ ہو جائے گی لیکن ابا اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر چکے تھے۔ وہ ثانیہ کے ساتھ ہی شافیہ کو رخصت کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ ثانیہ کے بعد رانیہ اور پھر سامعہ کی باری آگئی۔ ابھی بھی بھابھی' بھائی متردد تھے۔ بھائی جان اور بھابھی کو دوہرا خرچہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی حتی المقدور کوشش تھی کہ شافیہ کی شادی رک جائے لیکن جیسے ہی ابا نے زوہیب کے رشتے پہ ہاں کی اس کے گھر والوں نے ابا سے تاریخ لے کر ہی جان چھوڑی تھی۔ زوہیب کا رشتہ آخری رشتہ ثابت ہوا۔ بھابھیوں کی چالاکیوں سے پہلے سارے رشتے نامراد پلٹ گئے تھے۔ زوہیب کی طرف سے جلدی جلدی مچانے کا عقدہ بھی بعد میں کھلا۔

کہا جاتا ہے' جو شروع میں مصیبت برداشت کرتے ہیں۔ آگے ان کے لیے آسانی ہوتی ہے۔ لیکن شافیہ کی دفعہ یہ مقولہ غلط ثابت ہو گیا تھا۔

اس کے لیے آگے بھی زندگی پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ اگلی مشکلات پچھلی تکلیفوں سے بھی زیادہ بڑی لگتی تھیں۔ زوہیب کی اتنی جلدی شادی کے پیچھے بڑی ٹھوس وجوہات تھیں۔

وہ دوران تعلیم ہی جاب کر رہا تھا۔ جب وہ یونی ورسٹی سے فارغ ہوا تب شادی ہو گئی۔ شادی بھی بہت اچانک ہوئی تھی۔ اس کی امی کا ایکسیڈنٹ میں گھٹنا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے کے لیے بیڈ پہ تھیں۔ سو' زوہیب کی بہن آمنہ نے ماں کے لیے قرینہ قرینہ 'آیا' تلاش کرنا شروع کر دی تھی۔ اس مقصد میں اسے کئی مرتبہ ناکامی کا سامنا ہوا۔ ہر دفعہ امی کی لمبی لمبی ٹیلی فون کالز پہ شکایتوں کے دفتر کھلے ملتے تھے۔

آمنہ جانتی تھی اس کی ماں بہت نخریلی ہے۔ انہیں نہ کوئی میڈ پسند آتی تھی اور نہ میڈ کا کوئی کام۔ ہر نوکرانی میں وہ سو سو کیڑے نکال کر اسے فارغ کر دیتی تھیں۔

"یہ گندی ہے۔ بار بار بال کھجاتی ہے۔"

کبھی کہتی تھیں۔ "اس کے ناخن میلے ہیں۔ پیلے پھٹک۔" آمنہ اندر تک دھنسوا کر اس کے ناخن کٹواتی اسے صفائی پہ لمبے لمبے لیکچر دیتی۔ پھر بھی امی اسے نکلوا کر دم لیتی تھیں۔

کبھی کوئی کالی بھتنی' بدشکل' ہوتی کبھی کوئی بدبو سے بھری ہوتی' کسی کے سر میں جوئیں ہوتیں اور کوئی ایسی آوارہ آتی کہ انہیں لگتا کہ زوہیب پہ ڈورے ڈال رہی ہے۔

اس سارے تماشے کا ایک حل آمنہ نے سوچا اور اس پہ مہر لگ گئی۔
زوہیب کے لاکھ چلانے، جھگڑنے، دھمکانے کے باوجود آمنہ نے اس کے لیے لڑکی تلاش کرنے کی مہم شروع کردی تھی۔ اس دفعہ آمنہ کوئی رسک نہیں لے سکتی تھی۔ یہ معاملہ نوکرانی کا نہیں تھا کہ پسند نہ آئی تو اسے فارغ کردیا جاتا۔ وہ بہت چھان پھٹک کر لڑکی ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کے میاں کرنل تھے اور اسے اپنے ہی حلقہ احباب اعلیٰ سے اعلیٰ لڑکی مل سکتی تھی۔
لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے صرف زوہیب کے لیے "بیوی" نہیں چاہیے تھی بلکہ اپنی ماں کے لیے فل ٹائم خدمتگار کی ضرورت تھی۔
ایسے لڑکی جو نہایت متحمل مزاج، حلیم، کم گو، شریف، معصوم اور کسی حد تک دبّو ہو۔ جو اس کی ماں کے نخروں، غصے اور تیز مزاجی کو سہہ سکے۔ بہت کوالیفائیڈ، بہت اعلیٰ مزاج، یا جاب کرتی کسی بھی لڑکی کو اس نے اپنی فہرست سے نکال رکھا تھا۔
اسے واجبی سی، پڑھی لکھی لڑکی کی ضرورت تھی۔

ورنہ اس کے جیٹھ کی بیٹی کیا کم تھی۔ انتہائی لائق فائق، ہزاروں کماتی۔ پُرکشش، اسٹائلش۔ جیٹھانی نے کتنی ہی مرتبہ آمنہ سے کہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے لیے فلک کو نظر میں رکھے۔ لیکن آمنہ جانتی تھی کہ فلک کے ساتھ اس کی امی کا گزارہ ممکن ہی نہیں۔
فلک زوہیب کے لیے بہترین بیوی ثابت ہوسکتی تھی لیکن امی کے لیے کیسی بہو ہوتی؟
گوکہ آمنہ کا اپنا بھی جھکاؤ آخری وقت تک فلک کی طرف تھا۔ پھر اسے لگتا بھی تھا کہ زوہیب اسے پسند بھی کرتا ہے۔ زوہیب کا ہر چھٹیوں میں بھاگ بھاگ کر آمنہ کے گھر جانا اور فلک کا بھی دوسرے ہی دن وہاں پہنچ جانا۔ آمنہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ رہی تھی۔
پھر جس شدت سے زوہیب شادی سے انکار کررہا تھا آمنہ کو اور بھی یقین ہوگیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

"زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے۔ اسے بھی اپنی پسند سے بندہ نہ گزارے۔" وہ انتہائی دل برداشتہ تھا۔ ان دونوں کی آخری جھڑپ زوہیب کی شادی والی رات ہوئی تھی۔
"کرلی تم نے اپنی من مانی۔ خوش ہوجاؤ آپی!" وہ بہت غصے میں تھا۔ بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ آمنہ اس کے غصے کو کسی خاطر میں نہیں لارہی تھی۔ اسے امید تھی۔ شافیہ کو دیکھ کر اس کا غصہ خود بخود اتر جائے گا۔ اور شافیہ کو دیکھ کر تو اس کی نخریلی امی بھی لحہ بھر کے لیے چپ رہ گئی تھیں۔ پھر اس کا سرتاپا جائزہ لے کر بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔
"خوب صورت ہے۔ ہاتھ پاؤں بہت نفیس ہیں۔ تم نے زوہیب کی دلہن بڑی "سفید" ڈھونڈی ہے۔ مجھے کالا رنگ پسند نہیں نا۔ اس لیے۔" ساس صاحبہ کا تعریفی انداز بھی بڑا ہی عجیب تھا اور ان کے بیٹے کا اندازماں سے بھی عجیب تر۔
یہ اس کی شادی کی پہلی رات تھی اور شوہر سے اس کا پہلا پہلا تعارف تھا اور شوہر ایسا نروٹھا جیسے شافیہ نے اس کے بڑے بڑے نقصان کردیے تھے۔

اس نے بیڈروم میں آتے ہی چلا کر کہا۔
"اتنا کارٹون بننے کی ضرورت کیا تھی؟ مقابلۂ حسن میں حصہ لینا تھا؟ یہاں سے کوئی آسکر نہیں ملے گا تمہیں۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔ تب شافیہ اتنی ہکا بکا ہوئی کہ گھونگھٹ اٹھا کر شعلہ فشاں سرتاج کو آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی۔ اسے اپنا "دلہناپا" بھی بھول گیا تھا۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہو! میرے سر پہ سینگ اگے ہیں کیا؟" اس کے آنکھیں پھاڑنے پہ اسے اور بھی غصہ آیا۔ تب شافیہ کا بے ساختہ نفی میں سر ہل گیا تھا۔ وہ دھپ دھپ کرتا اس کے قریب آیا۔ اس کے جگمگاتے خیرہ کن حسن کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے چلا کر جتایا۔
"مجھے خوب صورتی ذرا بھی متاثر نہیں کرتی۔"

اس بات کا مفہوم شافیہ کے حسن کی نفی کرنا تھا۔ یعنی اس کا ایک ہی پلس پوائنٹ تھا جسے لمحوں میں "رول" دیا گیا۔ شافیہ کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

"پھر کیا چیز متاثر کرتی ہے؟" اس نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا۔ گو کہ وہ اتنی بہادر نہیں تھی پھر بھی اپنی دلیری کا ثبوت دے چکی تھی۔

زوہیب کو بھی اس سوال کی امید نہیں تھی۔ آمنہ نے جس انداز میں شافیہ کی خوبیاں بیان کی تھیں ان کا لب لباب کچھ یوں تھا۔

"بہت نرم، حلیم لڑکی ہے۔ مٹی کی مادھو سی، جس سانچے میں ڈھالو گے، ڈھل جائے گی۔ کبھی "اف" نہیں کرے گی۔" اور اس وقت وہی "مٹی کی مادھو" بڑے پُراعتماد انداز میں زوہیب سے سوال کر رہی تھی۔ اب کے زوہیب کو دھچکا لگا تھا۔

"یہ تو خاصی ہوشیار لگتی ہے، لگتا ہے آمنہ آپی کے ساتھ ہاتھ ہو گیا۔" یہ تبصرہ اس نے دل میں کیا تھا تاہم اس کا لہجہ پہلا سا تیز نہیں رہا تھا۔

"مجھے ذہانت متاثر کرتی ہے۔" زوہیب نے ناک چڑھا کر اس انداز میں کہا جیسے اس کی تحقیر کر رہا ہو۔ ایک "میٹروکولیٹ" کو حقارت سے دیکھ رہا ہو۔ کیونکہ وہ خود ایک سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ اس خوبی کی بنا پر اسے اپنی بیوی کی تحقیر کا پورا پورا حق تھا۔ اسی لیے وہ تن کے کھڑا تھا۔ اگر اس کے سامنے فلک ہوتی یا اس کی ہم پلہ کوئی لڑکی۔ تو زوہیب کا رویہ کیا ایسا ہوتا؟

"تو آپ کے پاس کون سا آلہ ہے؟ یا پیمانہ ہے؟ جس نے آپ کو بتا دیا کہ میں "ذہین نہیں ہوں۔" شافیہ کی نرم پُراعتماد آواز نے زوہیب کو دوسری مرتبہ جھٹکا دیا تھا۔ وہ جو اپنے ہی کرّوفر میں کھڑا تھا لمحہ بھر کے لیے چپ سا ہو گیا۔

"اچھا۔" کچھ دیر بعد اس نے طنزیہ انداز اپنایا۔ "کیا کوالیفکیشن ہے تمہاری؟" اس کے لب و لہجے میں واضح استہزا نظر آ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ شافیہ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"ذہانت کیا ڈگریوں کی محتاج ہوتی ہے؟" شافیہ کے سوال نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ اسے خوامخواہ غصہ آنے لگا۔

"اور زندگی میں پہلا دولہا دیکھا ہے، جو اپنی شادی والی رات بیوی کی تعریف کرنے کے بجائے اس کی تعلیمی قابلیت پہ بحث کر رہا ہے۔" شافیہ کے اگلے الفاظ نے زوہیب کے سارے طبق روشن کر دیے تھے۔ آمنہ آپی کی ساری جھوٹی باتیں اس کا دماغ ہلا رہی تھیں۔

"بہت کم گو ہے۔ منہ میں جیسے زبان ہی نہیں۔ بہت معصوم ہے، بے ضرر سی۔"

اس کا دل چاہ رہا تھا الٹے قدموں اوپر والے پورشن تک جائے اور حالت نیند سے آمنہ کو اٹھا کر ادھر لے آئے۔ آخر "بے زبان گائے" کے درشن بھی تو کروانے تھے۔

"تمہیں دولہوں کا بڑا تجربہ ہے۔" کوئی اور بات نہ مل سکی تو وہ بلا سبب ہی چڑھ دوڑا۔ "اور یہ مت سوچنا میں تمہارے حسن کی تعریف کروں گا۔"

"آپ سے توقع بھی نہیں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی پھر بھی اس کی بڑبڑاہٹ زوہیب نے سن لی۔

"تم بہت چالاک ہو۔"

"کیا یہ تعریف ہے! آپ یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں۔ میں بہت ذہین ہوں۔" شافیہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

"ہونہہ، میٹرک پاس، گھر میں بیٹھی، بھابھیوں کے چنگل میں پھنسی لڑکیاں کچھ اور نہیں، چالاکیاں خوب سیکھ لیتی ہیں میں تمہیں ذہین نہیں، چالاک کہہ رہا ہوں۔" اسے بھی شافیہ کو تپا کر مزہ آ رہا تھا۔ جتنا وہ کلس، کلس کر اندر آیا تھا۔ اسی قدر اسے جلا کر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

"آپ نے کافی ریسرچ کر رکھی ہے۔" اس نے ملائم لہجے میں اسی کا جملہ اسی پہ لوٹایا تھا۔ زوہیب کی بھنویں تن گئیں۔

"زیادہ اوور ایکٹ مت کرو۔" زوہیب کا انداز تنبیہی تھا۔ وہ دھپ دھپ کرتا ڈریسنگ روم میں چلا گیا تھا۔ کافی دیر کی کھٹ پٹ کے بعد واپسی ہوئی تھی۔ اسے سابقہ حالت میں دیکھ کر وہ چڑ گیا۔

"ہونا، کم عقل اور بدھو! بلکہ جاہل کہنا مناسب رہے گا۔ ابھی تک براجمان ہو۔ جانے کس آس میں ... کوئی ... کوالیفائیڈ لڑکی ہوتی تو سمجھ جاتی ... کہ اسے گھاس پڑنے والی نہیں۔" شافیہ نے اس کا طنز بڑے حوصلے سے پی لیا تھا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"اس کمرے میں ایک ہی ڈریسنگ روم ہے۔ جو آپ کے زیر استعمال تھا۔ آپ کی شاہی سواری باہر تشریف لاتی تو مجھے اندر جا کر چینج کرنے کا موقع ملتا۔" شافیہ کا متحمل انداز زوہیب کو آگ ہی لگا گیا تھا۔ اس نے اسے اچھا خاصا خفیف کر دیا تھا۔

"اور گھاس کی بھی آپ نے خوب کہی، عالی جاہ! میں گھاس نہیں کھاتی۔" وہ اپنا لہنگا سنبھال کر جھپاک سے اندر چلی گئی تھی۔

ایک لمبا سا طویل شاور لے کر اعصاب کو پرسکون کیا تھا۔ زوہیب صاحب تو اس کی توقع سے بھی زیادہ پیچیدہ نکلے تھے۔ والدہ کیا الجبرا کا کم پیچیدہ سوال تھیں

بیٹا ان سے بھی چار ہاتھ آگے نکلا تھا۔

شافیہ کو اپنا کٹھن مستقبل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان ماں بیٹے کے ساتھ نباہنا آسان نہیں تھا اور شافیہ کا تو یہ حال تھا کہ آگے کنواں اور پیچھے کھائی۔ نہ آگے بڑھ سکتی تھی نہ پیچھے۔ آگے سے زیادہ پیچھے خوفناک کھائیاں تھیں۔ تین مکار بھابھیوں کی صورت میں۔

اگر زوہیب اسے نہ اپناتا تو وہ کہاں جاتی؟ اس کا فیوچر کیا ہوتا؟ ایک بات تو طے تھی، اسے واپس نہیں جانا تھا۔ اسی گھر میں رہنا تھا۔ زوہیب جیسے اکھڑ، جھگڑالو شوہر کے ساتھ گزارا کرنا تھا۔ اتنا تو وہ جان ہی چکی تھی کہ زوہیب اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ اس کی من چاہی نہیں تھی۔ وہ اس کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتی تھی۔

جس کی فی الحال ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ شافیہ کے پاس ڈگریوں کے انبار نہیں تھے۔ وہ زوہیب جتنی پڑھی لکھی نہیں تھی۔ لیکن وہ کوئی جاہل، اجڈ، بدسلیقہ تو نہیں تھی۔ اسے بولنے، پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ وہ سمجھ دار تھی اور اس کے ابا کہا کرتے تھے۔

"شافیہ کی اماں اپنی ساری فراست، وراثت میں اسے دان کر گئی ہیں۔ تینوں بیٹے اس فہم اور شعور سے بے بہرہ ہیں۔"

وہ تو ابا تھے جنہیں اپنی بیٹی چلتی پھرتی قابلیت کا مجسمہ دکھائی دیتی تھی اور ابا جیسی خوردبین زوہیب کے پاس نہیں تھی۔ اور زوہیب نے فی الوقت اسے ناپسند کرنے کی ایک ہی وجہ بتائی تھی۔ جو شافیہ کے معاملہ فہم دماغ کو قطعاً "ناکافی" لگی تھی۔ اس کے پاس اتنا شعور تو تھا کہ وہ سمجھ سکتی کہ کوئی بھی شوہر شادی کی پہلی رات بیوی کے حسن و ادا کو سراہنے، بجائے ڈگریوں کا رونا نہیں روتا۔ نہ قابلیت کی بحث کرتا ہے۔ نہ کوالیفکیشن پہ ماتم کرتا ہے۔

وجہ کچھ اور تھی یا وجہ "کوئی اور" تھی؟ کیا!!!

باہر خوب صورت رات کا فسوں پھیل رہا تھا۔ اور

اندر اس کے ذہن کو آکٹوپس کی طرح مختلف سوچوں نے جکڑ رکھا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد باہر سے آواز آئی تھی۔

"کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ سوچنے کے لیے واش روم اچھی جگہ ہے مگر اتنی بھی نہیں۔ باقی معاملات پہ غور باہر آکر بھی کیا جا سکتا ہے۔" ایسا شاندار طنزیہ انداز بھلا کس کا ہو سکتا تھا؟ اس نے گہری سانس کھینچ کر بال تولیے کی قید سے آزاد کیے۔ پھر چٹخنی گرا کر باہر آگئی۔

زوہیب طنز کے تیر کمان سے نکال کر واپس بستر پہ فروکش ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے پھر سے توپوں کو تیار کر لیا تھا۔ آخر جی بھر کے بھڑاس بھی نکالنا تھی۔

شافیہ نے تلے قدم اٹھاتی سنگھار میز کے سامنے آ رکی۔ تراشیدہ بالوں میں برش پھیر کر اس نے لوشن اٹھا لیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر خود کو مصروف رکھ رہی تھی اور اگلا لائحہ عمل سوچ رہی تھی۔ جتنی زوہیب اس کی انسلٹ کر سکتا تھا' کر چکا تھا وہ خود کو مزید بے عزت کروانا نہیں چاہتی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اسے آگے کیا کرنا چاہیے؟ کیا بستر اٹھا کر باہر چلے جانا چاہیے؟ یا اسی کمرے کے کسی کونے میں پڑ کے سو جانا چاہیے؟

بھلا وہ کس طریقے سے زوہیب کو صاف نظر انداز کر کے بدلہ لے سکتی تھی؟ گو کہ بدلہ لینا اس کی سرشت میں نہیں تھا پھر بھی... ایسے مغرور لوگوں کو ضرور جتانا چاہیے کہ جنہیں حقیر سمجھ رہے ہیں وہ کوئی ایسے گئے گزرے بھی نہیں۔

"مسئلہ فلسطین حل کر چکی ہو تو تشریف لے آؤ... تم سے ذاتی معاملات پہ بھی بات چیت کرنی ہے۔ عالمی مسائل پہ کسی اور دن غور و فکر فرما لینا۔" اس کی پشت کو گرم نگاہوں سے گھورتا زوہیب چوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شافیہ نے گہرا سانس کھینچ کر پلٹ کے دیکھا۔ وہ تکیہ دوہرا کیے اس پہ کہنی ٹکائے' اب خاصی پرشوق نگاہوں سے بغور دیکھ رہا تھا۔ یوں کہ شافیہ کے قدم لحہ بھر کے لیے ڈگمگا گئے تھے۔

"کیا ہے؟" اب کے اس کی آواز مدہم تھی۔

"یہاں آؤ۔" اس نے اپنی طرف والی سائیڈ پہ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ شافیہ کو کچھ اچنبھا ہوا تھا۔ تاہم وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آگئی۔ گو کہ ایک حد فاصل برقرار تھی۔ پھر بھی زوہیب نے جتایا۔

"میں نے اتنا بھی قریب آنے کو نہیں کہا۔" شرمندہ کرنے میں تو اس نے پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ شافیہ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی خفت سے سرخ ہوا۔

"مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ؟" وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی تھی۔ وہ اسے جھنجلایا ہوا ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اندر تک لطف اندوز ہوا تھا۔

"میرے ساتھ ایک نہیں، بہت سے مسئلے ہیں۔ تم کون کون سے سننا چاہتی ہو؟" زوہیب نے مسکرا کر کہا تھا۔ اس کی مسکراہٹیں ہونٹوں کے کناروں سے نکل رہی تھیں۔ شافیہ نے بڑے ضبط سے جتلایا۔

"ہر ایک۔"

"کیا میرے مسئلوں کے حل بھی نکالو گی...؟" وہ بیڈ پہ پھیلتے ہوئے مسکرایا۔

"کوشش کروں گی۔" اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

"ایک مسئلہ تو تم ہو... پہلے اسے حل کرو۔" زوہیب کی پہلے والی جھلاہٹ ختم ہو چکی تھی۔ آمنہ پہ آیا غصہ بھی تمام ہو چکا تھا۔

"میں...!" شافیہ کا دماغ ہی گھوم گیا تھا۔ بندے کو اتنا بھی صاف گو نہیں ہونا چاہیے۔

"کیا آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں؟" اس نے تپتے دماغ کو بمشکل قابو میں رکھ کر حلاوت سے پوچھا تھا۔ وہ قطعاً "غیر جذباتی لڑکی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک جذباتی ہو کر واویلا کر کے واک آؤٹ کر چکی ہوتی۔ لیکن اسے خود کو پرسکون رکھنا تھا۔ کوئی خراب سچویشن پیدا کرنے میں اس کی اپنی ہی رسوائی اور جگ ہنسائی تھی۔

اس کا حلیم لہجے میں پوچھا گیا سوال زوہیب کے دل

پہ لگا تھا۔ اس نے برجستہ کہا۔

"میں نے یہ کب کہا۔؟"

"تو پھر؟" شافیہ کی آنکھوں میں سوال تھا۔ گو کہ وہ اس کے بدلے بدلے انداز سمجھ چکی تھی۔ اس کے مزاج کی حلیمی بھی اندر کے "بدلاؤ" کی طرف واضح اشارہ تھی۔ یعنی جناب اب اپنی اصلی حالت میں آ رہے تھے۔ صلح جوئی کا موڈ ہو رہا تھا۔

"پھر یہ کہ تم واقعی ڈفر ہو۔ انتہائی بدھو' آؤ تمہاری کچھ تعریف کردوں۔۔۔ ایکچوئلی! دل توڑنے کا گناہ میں کبھی نہیں کرتا۔" اس نے مسکرا کر شافیہ کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ میکانکی انداز میں اس دھوپ چھاؤں کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

بقیہ زندگی اس دھوپ چھاؤں جیسے مزاجا" گرگٹ کے ساتھ گزارنا ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔

وہ اپنی ماں کی طرح انتہائی نخریلا' ضدی' کچھ کچھ ہٹ دھرم اور ناک تک عاجز کر دینے والا بندہ تھا۔ یہ دونوں ماں بیٹا' شافیہ کے لیے ایک امتحان تھے۔

امی صاحبہ تیز مزاج کی تیکھی سی خاتون تھیں۔ انتہائی صفائی پسند۔۔۔ دن میں تین تین مرتبہ تو اس کی واش روم تک پریڈ کرواتی تھیں۔

"جاؤ نہا کر آؤ۔ گرمی میں لوگ آٹھ آٹھ مرتبہ نہاتے ہیں۔۔۔ تم ایک ہی لباس فاخرہ میں پورے دن گھومتی ہو۔"

پسینہ ان کی برداشت سے باہر ہوتا تھا۔ یوں دن میں۔۔۔ تین مرتبہ نہا کر ہر دفعہ نیا استری شدہ جوڑا پہن کے' ہلکے پھلکے میک اپ' جیولری' خوشبو میں خود کو بھگو کے ساس صاحبہ کے کمرے میں حاضری دینا ہوتی تھی۔

اس طرح ہمہ وقت تیار رہنے کی عادت تو اس کی پختہ ہو چکی تھی۔ وہ مشین بھی لگا رہی ہوتی تو انتہائی نک سک سے تیار ہو کر۔۔۔ کیونکہ اس دوران اگر ساس صاحبہ کا بلاوا آجاتا تو اپنی تیاری میں وقت ضائع ہوتا۔ دیر ہونے کی صورت میں بھی امی "گت" بنا دیتی تھیں۔

"سنگھار ختم نہیں ہوتا تمہارا۔۔۔ دو منٹ لگتے ہیں تیاری میں۔ تم بہت سست ہو۔ گھنٹہ گھنٹہ آرام سے ضائع کرتی ہو۔ سب کام چوری کی علامتیں ہیں۔" ایک سیکنڈ کی دیر کرنے پہ وہ پچھلی ہر محنت پہ بہت سلیقے سے برش پھیر دیتی تھیں اور ذرا جھجکتی۔۔۔ نہیں تھیں۔ کچن میں جانے سے پہلے بھی یہی صورت حال ہوتی۔ پہلے وہ خود کو سنوارتی پھر کچن میں جاتی۔

گو کہ تین افراد کی وجہ سے کام اتنا نہیں ہوتا تھا۔ زوہیب تو دن بھر گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں ہوتی تھیں اور اب تھی فینا۔ فینا کے بعد شافیہ کی خود کو "مین ٹین" رکھنے والی عادت برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ وہ ہر چیز میں الجھ گئی تھی۔ صفائی کی دو' دو دن ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ لیکن مجال تھی جو ایک دن بھی بغیر صفائی کیے گزر جاتا۔ ہر روز جھاڑو' پوچا' ڈسٹنگ۔ ایک ایک چیز چمکانی پڑتی تھی۔ فرش بھی پوچے لگا لگا کر شیشہ بنائے جاتے تھے۔ پھر بھی امی کی تشفی نہ ہوتی۔ وہیل چیئر پہ بیٹھ کر پورے گھر کا چکر لگاتی تھیں۔ کونوں کھدروں سے نادیدہ گرد انگلی پھیر پھیر کے نکال لیتی تھیں۔ پھر وہ ایک انگلی زوہیب کے آنے تک گرد میں لتھڑی رہتی۔

"دیکھا تم نے۔۔۔ بہت ہڈ حرام ہے تمہاری بیوی۔ ذرا میری آنکھ لگے اور یہ کوڑا کونوں میں گھسا کر خود آرام کرنے چلی جاتی ہے۔ بہت نکمی ہے سارا فرنیچر دھول مٹی ہے۔ کوئی چیز صاف نہیں۔" وہ ایک ایک ڈیکوریشن پیس اور ایک ایک چیز کی طرف اشارہ کر کے جتاتی تھیں۔ تب ٹی وی دیکھتا زوہیب چونک جاتا۔

"کیا واقعی؟" اس کی آنکھوں میں استعجاب ہوتا تھا۔

"سارا فرنیچر تباہ کر دیا ہے اس نے۔ بہت کام چور لڑکی ہے۔ آمنہ سے کہا بھی تھا یہ لڑکی "مسنی" لگتی ہے۔ بعد میں رنگ دکھائے گی۔ دیکھا' وہی ہوا۔" وہ بیٹے کی توجہ پا کر اور بھی فارم میں آجاتی تھیں۔ تب کچن میں کام کرتی شافیہ اندر تک کلس

جاتی۔

"تو کیا بدل دیں۔۔۔؟" زوہیب کی پرجوش آواز سنائی دیتی۔ شافیہ کے کام کرتے ہاتھ سست پڑ جاتے تھے۔

"شافیہ کو۔۔۔؟" امی کو چھکار کے کیا ہی کہنے ہوتے۔

نوکرانی ہوتی تو اب تک دس مرتبہ بدل چکی ہوتیں۔ مسئلہ یہ تھا۔ شافیہ زوہیب کی بیوی تھی۔

"نہیں" آپ کے جہیز والے پرانے فرنیچر کو۔۔۔ اکھچو ٹکی امی! یہ اپنا حسن اور چمک دمک کھو چکا ہے۔ جتنا بھی پوچھا جائے چمکتا نہیں۔ اس کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ بہتر ہے اسے بدل دیں یا پالش کروالیں۔"

زوہیب کے مشورے پہ امی کا پارہ آسمان پہ چڑھ جاتا تھا۔

"شاباش بیٹے! تم سے یہی امید تھی۔ بجائے بیوی کو ڈانٹنے اور کھنچائی کرنے کے۔ ماں کا سامان بیچنے کی بات کر رہے ہو۔ آج کل کی اولاد بڑی بے فیض ہے۔ بجائے ماں کی پریشانی سمجھنے کے، سامان ٹھکانے لگانے کا سوچتے ہو۔ کسی دن پرانی، بھدی بڈھی ماں کو نہ بدل آنا۔" زوہیب کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ گھبرا اٹھا۔

"اف امی۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میری بات کا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا مطلب تھا۔" وہ چمک کر بولیں۔ "یہ نکمی دل لگا کر کام نہیں کرتی۔ نجانے کس کے خیالوں میں رہتی ہے۔" اب کے ان کی آواز کچھ ہلکی تھی۔

"کیا واقعی!" زوہیب کے اندر کا "شوہر" کروٹیں لے کر بیدار ہوا تھا۔ اس کے تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ امی کو جلدی سے وضاحت کرنا پڑی۔

"ارے میکے والوں کے خیالوں میں رہتی ہے۔ کوئی پوچھتا جو نہیں۔ ڈیڑھ سال سے ادھر ہے۔ ایک رات کے لیے بھی نہیں گئی۔ صرف دو مرتبہ گھڑی بھر کے لیے گئی تھی۔" امی کی تیوری چڑھتی گئی۔ زوہیب بھی تھوڑا ٹھنڈا پڑا۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟ اسے یہاں سے فارغ کر دیں؟ آپ بھی ایک صورت دیکھ دیکھ کر بور ہو چکی ہیں۔ اور اب "تبدیلی" کی خواہش مند ہیں۔" کچھ دیر بعد شافیہ کو کچن سے باہر آتے دیکھ کر زوہیب نے کہا تھا۔

شافیہ ان دونوں کو تازہ مینگو شیک دے کر اندر چلی گئی۔۔۔ کچن کی کھڑکی کھلی تھی سو آوازیں با آسانی اندر جا رہی تھیں۔ اور یہ تو ان دونوں ماں، بیٹے کا معمول تھا۔ شافیہ پہ گھنٹوں بحث کرتے نہیں تھکتے تھے۔

"نہیں۔" امی نے شیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ان کا انداز خاصا پرسوچ قسم کا تھا۔

"تو پھر؟" وہ بھی بڑا سنجیدہ نظر آیا۔ گو کہ آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

"میں کہتی ہوں زیبی! اس کو یہیں رہنے دو۔ تم ایک اور لے آؤ۔ اس سے اکیلے پورے گھر کا نظام نہیں چلتا۔ یہ بس کچن تک محدود رہے۔ کم بخت کے ہاتھ میں ذائقہ کمال کا ہے۔ باقی صفائی ستھرائی کے لیے ایک الگ سے ہونی چاہیے۔۔۔" امی کے مشورے پہ زوہیب کو اچھو لگتے لگتے رہ گیا تھا۔

"کیا ایک اور شادی کر لوں؟ فلک سے؟" اس کی بے تابی کے کیا ہی کہنے تھے۔ شافیہ نے مارے اشتعال کے ہانڈی میں زور سے ڈوئی ماری۔ ادھر امی نے چوکنا ہو کر بیٹے کو گھورا تھا۔ فلک کے نام پہ وہ الرٹ ہو گئی تھیں۔

"ہیں۔۔۔ لڑکے؟ تمہارا دماغ ٹھیک۔۔۔ ہے نا؟" امی نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔" وہ مسکرا کر بولا۔ نگاہیں کچن کی کھڑکی پہ ٹکی تھیں۔ اندر سے جھنجلائی ہوئی شافیہ صاف دکھائی دیتی تھی۔

"پر مجھے نہیں لگتا۔۔۔ علاج کراؤ اس کا۔ میں کام والی کی بات کر رہی ہوں۔ بندوبست کرو کہیں سے۔"

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسے گھورا تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا تھا۔

"بات تو ایسے کر رہی تھیں جیسے مجھے دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہیں۔۔۔ میں کام والی سے تو ہرگز نہیں کروں گا۔ اگر کوئی "نظر" میں ہے تو ٹھیک۔۔۔ اور ویسے بھی فینیا کی پیدائش کے دوران ڈیڑھ سو میڈ میں نے بھرتی کی تھیں، جنہیں بغیر جرم کے آپ نے نکال دیا۔ اب میڈ کا خیال بھی دل سے نکال دیں۔ کوئی نہیں ملنے والی۔ البتہ دوسرے آپشن پہ آپ غور کر سکتی ہیں۔ میری دوسری شادی کے ذریعے میڈ کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" وہ کچن کی طرف منہ کر کے چلایا تھا تب امی اس کے کندھے پہ دھپ لگا کر بولیں۔

"خبردار، جو ایسا سوچا بھی۔۔۔" ان کے انداز میں نمایاں وارننگ تھی۔ لاکھ شافیہ سے عداوت کے باوجود بھی۔۔۔

"اگر سوچ لوں تو۔۔۔؟" زوہیب نے انہیں تپایا۔ اور شاید شافیہ کو بھی۔۔۔ اندر سے کچھ ٹوٹنے کی آواز بھی آئی تھی۔

"بہت پٹو گے مجھ سے۔" امی نے خفگی سے کہا تھا۔

"بڑا پیار ہے اس سے؟" وہ رازداری سے بولا۔ جیسے ان کا اندر پڑھنا چاہتا ہو۔

"اونہیں۔۔۔" انہوں نے سر جھٹکا۔۔۔ "یہ کھانا بہت اچھا بناتی ہے۔ بتانا مت اسے۔" ان کا انداز انتہائی رازدارانہ تھا۔ زوہیب نے لمبا سا قہقہہ لگایا اور شافیہ نے غصے میں ایک کانچ کا گلاس توڑا۔ گو کہ جان بوجھ کر نہیں توڑا تھا پھر بھی "نہیں" یہی لگا۔ امی کی کلبلاہٹ کچن تک آئی تھی۔

"بڑی نکمی ہے یہ۔۔۔ ہاتھوں میں سوراخ ہیں۔۔۔ اٹھارواں گلاس توڑا اس نے۔ کوئی کام سلیقے سے نہیں کرتی۔ ناک تک تنگ آچکی ہوں ــــــ آمنہ نے ہمیں پھنسوایا اور اسے گھر لے آئی۔ ارے او۔۔۔ وہ فلک بھی تو تھی نا۔۔۔ دو سال یہاں رہ کر گئی۔" امی کا واویلا جاری تھا، جب زوہیب کو بیچ میں ٹکڑا لگانا پڑا۔

"یہاں نہیں، ہاسٹل میں۔" یہ وضاحت ضروری تھی۔ ورنہ کچن سے ایک اور گلاس ٹوٹنے کی آواز آجاتی۔

"ہاں وہی، اتوار کے اتوار آتی تو پورا گھر چمکا کے جاتی۔ ایسا قرینہ کہ دل خوش ہو جاتا۔ کیسے کیسے اطالین کھانے بناتی۔ مزیدار کیک، براؤنیز، بسکٹ اور پیسٹریاں بیک کرتی۔۔۔ آمنہ کی آنکھوں پہ تو پٹی بندھی تھی۔ گھر کا ہیرا چھوڑ کر پیتل اٹھا لائی۔" امی کو فلک کیا یاد آئی۔ ان کی آہ و فغاں بھی فلک تک پہنچ گئی۔ فلک کی یاد میں وہ گوڈے گوڈے ڈوب چکی تھیں۔ معاً کچن سے شافیہ نے گردن نکالی۔

"تب سے شوگر لگی ہے آپ کو۔ اب سمجھ میں آیا معاملہ، جہاں بھر کا میٹھا کھلا کر آپ کو اوپر پہنچانے کا ارادہ ہو گا۔" اس کا لہجہ ہنوز حلیم تھا مگر الفاظ امی تو ہل کے رہ گئیں۔

"زوہی۔۔۔ دیکھا تم نے۔" ان پہ زلزلہ طاری ہو گیا۔ "ارے یہ کیا کہہ رہی ہے بھلا فلک کیوں ایسا چاہتی؟ اور اس کی زبان دیکھو۔ اتنی لمبی اور آمنہ کہتی تھی، بڑی کم گو ہے۔ بے زبان گائے۔۔۔ ارے بے زبان ایسے ہوتے ہیں؟"

امی کا مارے صدمے کے برا حال ہو گیا تھا اور شافیہ کا دماغ گھوم گیا۔ اس گھر میں جب جب فلک کا ذکر ہوتا تھا شافیہ کا میٹر اسی طرح گھوم جاتا۔ آخر کب تک وہ فلک نامے کو برداشت کرتی؟ جو بد قسمتی سے زوہیب کی کلاس فیلو اور دوست رہ چکی تھی۔ جو دو سال یہاں قیام فرما کے بھی گئی تھی اور اپنی انمٹ یادیں امی اور زوہیب پاس چھوڑ گئی۔ اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا۔

"امی! ریلیکس، اس کو خواہ مخواہ فلک سے دشمنی ہے۔ حالانکہ وہ اتنی سوفٹ تھی۔ آپ کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ اسی لیے تو میں چاہتا تھا، آپ فلک کو اپنی بہو بنا لیں۔۔۔ مگر آپ بھی آمنہ آپی کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئیں۔ اب نتیجہ ہم دونوں معصوم ماں بیٹا بھگت رہے ہیں۔" اس نے معصوم سی شکل بنا کر کچن کی کھڑکی میں دیکھا۔ یقیناً شافیہ ادھر آنکھیں لگائے کھڑی تھی۔

"میٹھا کھلانے کا الزام فلک پہ رکھ رہی ہے۔ اور دیکھو' مجھے مینگو شیک میں اتنا میٹھا پلا دیا۔ کہا بھی تھا۔ چینی مت ڈالنا۔۔۔" اب وہ اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے شافیہ پہ غصہ الٹ رہی تھیں۔ شافیہ کو کھڑکی سے گردن نکالنی ہی پڑی۔

"آپ کا شیک' ودھ آوٹ شوگر تھا امی!" اس نے کلس کر جواب دیا تھا لیکن وہ امی ہی کیا جو تسلیم کر لیتیں۔

رات تک اسی صدمے کے زیر اثر رہیں کہ شافیہ نے ان کو چینی والا شیک پلا دیا ہے۔ وہ ایسی ہی وہمی تھیں۔

فضا میں مجیرے بجنے کا ابھی بھی شور سنائی دے رہا تھا۔

پیتل کی کٹوریوں کو طبلے کے ساتھ 'تال دینے کے واسطے بجایا جا رہا تھا۔ ردھم میں ایک آواز سنائی دیتی تھی۔

طاقچوں میں دیپ تھے۔ پر دھواں اڑاتے ہوئے۔ دیپوں میں لو نہیں تھی۔ لو نہیں تھی تو روشنی بھی نہیں تھی۔ ہر سو اندھیرا تھا اور گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھڑیال نے رات کے گیارہ بجائے تب کہیں باہر ہلکے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچنے میں ایسی محو تھی کہ وقت بیتنے کا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔

اور اب کھٹکے کی آواز پہ وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔ تب تک دروازہ کھول کر زوہیب اندر آگیا تھا۔ شافیہ کو لامحالہ اٹھنا پڑا۔ زوہیب کے ہاتھ سے لیپ ٹاپ بیگ' موبائل اور چابیاں پکڑ کر ٹیبل پہ رکھیں۔ اس کے کپڑے بھی گیلے تھے اور بال بھی۔ شاید بارش باہر ٹوٹ کے برسی تھی۔

"موبائل چارجنگ پہ لگا دو۔" وہ جوتے اتارنے لگا تو شافیہ نے پہلے موبائل چارجنگ پہ لگایا پھر اسے کپڑے نکال کر دیے تھے۔

جب وہ چینج کر کے آیا تب تک شافیہ کھانا گرم کر کے میز پہ لگا چکی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کے کھڑکیاں کھول دیں۔ پردے ہٹا دیے۔ باہر موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ آندھی طوفان کے بعد اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اک تازگی بھرا احساس کمرے میں گھس رہا تھا۔

"اتنے حبس میں بیٹھی تھیں۔ اتنا نہیں ہو سکا کہ کھڑکیاں کھول لیتیں' طوفان تو کب کا رک چکا ہے۔ بہت بونگی ہو تم۔" اب وہ اس کی نااہلی پہ تبصرہ فرما رہا تھا۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا وہ کچھ کہے بغیر رہ سکتا۔

"آج بہت دیر ہو گئی۔۔۔" وہ جواب نہ پا کر پھر سے خود ہی بولا تھا۔ شافیہ قریب ہی بیٹھی آنکھیں دبا رہی تھی۔ آج اس کی آنکھوں میں بہت جلن ہو رہی تھی۔ اپنی ہی کالونی میں آئی اسپیشلسٹ موجود تھا مگر زوہیب کو توفیق نہیں ہو رہی تھی اسے چیک کروا لاتا۔ اکیلی وہ کبھی گئی نہیں تھی۔

"بارش میں پھنس گئے تھے۔ اوپر سے ٹریفک جام۔" کھانا کھاتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خود ہی بولے جا رہا ہے۔ اسی لیے لحہ بھر کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر اس نے شافیہ کا کندھا ہلایا۔ وہ معمول سے ہٹ کر خاموش تھی۔

"کیا ہوا ہے۔۔۔؟" وہ فکر مندی سے بولا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں چونک کر سر ہلایا۔ وہ مطمئن ہوا یا نہیں' تاہم سوال نہیں کیا تھا۔

کافی دیر بعد اس نے فینا کا پوچھا۔ اسے فینا کا خالی کاٹ نظر آیا تھا۔ بیڈ پہ بھی نہیں تھی۔

"فینو کہاں ہے؟"

"امی کے پاس۔"

"انہیں تنگ کرے گی رات کو۔ میں لے آتا ہوں۔" وہ ٹشو سے ہاتھ پونچھتا' اٹھنے لگا تھا تب شافیہ نے اسے بے ساختہ روکا۔

"امی نے خود اسے اپنے پاس سلایا ہے۔" شافیہ

نے ٹرے میں برتن رکھتے ہوئے بتایا۔ اس کے دروازے کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

"کیوں؟" زوہیب کو اچنبھا ہوا۔

"ان کے خیال میں رات کو بادل گرجتے تو فینا ڈر جاتی۔" شافیہ کو وضاحت کرنا پڑی تھی۔ وہ امی کی منطق پہ چڑ گیا۔ بچی رات کو انہیں تنگ کرتی۔ ان کی نیند پوری نہ ہوتی اور صبح تک ایک نیا محاذ کھل جاتا تھا۔

"تو ہم دونوں کہاں ہوتے؟" اس نے چڑ کر پوچھا۔

"ان کے خیال میں ہم اتنے نیند میں دھت ہوں گے کہ ہمیں فینا کے ڈر کر رونے کی آواز نہیں آئے گی۔" شافیہ نے امی کی بات دہرائی تھی۔ زوہیب بری طرح چڑ گیا تھا۔

"یعنی ان کے خیال میں ہم نے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوگی۔"

"شاید۔" شافیہ ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی تھی۔ اس کی واپسی تک وہ ایک راؤنڈ امی کے بیڈ روم کا لگا آیا تھا۔

"وہ دونوں مزے سے سو رہی ہیں۔" اب کے زوہیب کچھ مطمئن ہوا تھا۔

"شکر، آپ کی تسلی ہو گئی۔" شافیہ نے جماہی روک کر لوشن اٹھایا اور چہرے اور ہاتھوں پہ ملنے لگی۔ پھر اس نے اپنے تراشیدہ بالوں میں برش کیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنی جگہ پہ آ گئی۔

تب ہی زوہیب نے اس کی طرف کروٹ بدل لی تھی۔ اس کے نتھنوں سے بھینی بھینی خوشبو ٹکرانے لگی۔ زوہیب کا ہاتھ اس کے بالوں میں سرسرایا تو شافیہ نے پلکیں اٹھا کر ترچھی نظر سے اسے دیکھا۔ وہ شافیہ کی طرف ہی متوجہ تھا۔

"لوگ اپنے حسن کو نکھارنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔" وہ خاصی خوش دلی سے مخاطب تھا۔ اس کے سرخ سے گال کچھ اور سرخ ہوئے تھے۔

"کیونکہ ایک ہی تو پلس پوائنٹ ہے، حسن دو آتشہ۔" زوہیب کی آواز گمبھیر ہو گئی تھی۔ ایک ہلکا سا خمار بھرا احساس اس کے اردگرد بکھرنے لگا۔ شاید کوئی خواہش سی جاگی تھی۔

"اور اگر یہ پلس پوائنٹ نہ ہوتا۔؟" اس کا لہجہ کچھ روکھا سا ہو گیا۔ زوہیب نے خوشبو بھرا احساس اپنے اندر اتارا۔ اس کے ہونٹوں پہ اک دل فریب تبسم بکھر گیا تھا۔

"تو پھر میں ایک اور شادی کھڑکا لیتا۔"

"اب کیا قباحت ہے؟ وہ آپ اب بھی کر سکتے ہیں۔" وہ اس کی پیش قدمی پہ رونکھی ہو کر کسمسائی تھی۔ آج اس کا موڈ سخت آف تھا۔ بجائے اس کی خاموشی اور بیزاری کی وجہ پوچھتا۔ اسے ہری ہری سوجھ رہی تھی۔

"تم اجازت دے رہی ہو۔۔۔؟" زوہیب نے چونک کر پوچھا۔ دوسری شادی کے نام پہ اس کی آنکھوں میں دیے جل اٹھتے تھے۔ شافیہ اندر تک سلگ گئی تھی۔

"اجازت ہی سمجھ لیں۔" اس کا موڈ بگڑ گیا۔ اور اس نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

"آج مزاج اتنا برہم کیوں ہے؟" بالآخر اسے پوچھنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔ زوہیب نے زبردستی اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"آنکھوں میں درد ہے زوہیب! سونے دیں۔" وہ جھنجلائی۔

"او۔۔۔ یار! کل چلیں گے ڈاکٹر آدم بیزار کے پاس تم بھی نا۔۔۔ بہت ست ہو۔ یہ اپنی کالونی میں تو کلینک ہے۔۔۔ کون سا کوہ قاف جانا تھا تمہیں۔ فینا کو ساتھ لے جاتیں۔" زوہیب نے خاصی ناگواری سے اسے سنائی تھیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا شافیہ اکیلی سامنے پارک تک بھی نہیں جاتی تھی۔

"فینا بہت بڑا مرد ہے نا؟" وہ خفگی سے بولی۔

"اچھا بابا۔۔۔ چلیں گے صبح۔ کل میرا ویسے بھی آف ہے۔ اب میرا موڈ خراب نہ کرو۔" اس کی بیزاری زوہیب نے محسوس کر لی تھی۔

"کل کی تاریخ میں آپ نے کیا کیا کام سرانجام دینے ہیں؟" شافیہ کا انداز بھرپور طنزیہ تھا۔ زوہیب نے

بغیر سمجھے کہا۔

"تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے پھر لمبا سا ریسٹ ماروں گا۔ اس پورے ہفتے ذلیل باس نے بڑا ستایا ہے۔"

"ریسٹ کا ٹائم ملے گا...؟" اس کے انداز میں کچھ تھا جو وہ چونک گیا۔

"کیوں نہیں ملے گا..."

"آپی کے بچے آرہے ہیں۔" شافیہ کو بتانا ہی پڑا تھا۔ وہ بے ساختہ خوش ہو گیا۔

"کیا واقعی؟ ہما اور زبیر۔"

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا تھا۔

"کب آئیں گے؟"

"صبح تک... نہیں' شاید شام تک۔" وہ بہت الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ زوہیب نے سر ہلا دیا۔

"شام کی فلائٹ سے آئیں گے۔ میں انہیں پک کر لوں گا۔" وہ اپنی ٹائمنگ کا حساب لگانے لگا تھا۔

"اور صبح بھی کسی کو پک کرنا ہے۔" شافیہ کے اگلے الفاظ اسے کچھ حیران کر گئے تھے۔ وہ تھوڑی گردن اچکا کر بولا۔

"کسے؟"

"فلک کو۔" اس نے یوں فلک کا نام لیا جیسے دانتوں تلے چبا ڈالے گی اور زوہیب اتنا حیران ہوا کہ کچھ بولنا ہی بھول گیا تھا۔ کافی دیر تک دونوں کے درمیان معنی خیز خاموشی چھائی رہی تھی۔ پھر وہ اس کا کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔

"فلک یہاں آرہی ہے؟" اس کو اپنا ہی لہجہ اجنبی لگا تھا۔

"آپ تو ایسے ری ایکٹ کر رہے ہیں جیسے جانتے ہی نہیں۔" شافیہ کا انداز بڑا کٹیلا تھا۔ وہ فلک کے آنے کا سن کر اتنا حیران تھا کہ اس کے لہجے کے روکھے پن اور بیزاریت کو سمجھ نہیں پایا تھا۔

"میرا کون سا اس کے ساتھ کانٹیکٹ ہے جو جان جاتا۔" وہ جز بز سا ہو کر رہ گیا تھا۔ شافیہ نے اسے ایسی نگاہ سے دیکھا تھا جیسے یقین نہ آیا ہو۔

"کیا شادی کے بعد پہلے تمام رابطے ختم ہو گئے؟" اس کا انداز کاٹ دار ہوتا گیا تھا۔ اب کے زوہیب کے ماتھے پہ بھی بل پڑ گئے تھے۔ وہ کہنی پہ دباؤ ڈال کر تھوڑا اونچا ہوا۔ اب اس کا چہرہ واضح تھا۔ لیکن وہ گردن موڑ گئی تھی۔

"اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" اس نے شافیہ کے بازو پہ دباؤ ڈال کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"مطلب مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔ یعنی ساری چڑچڑاہٹ کی کڑیاں فلک کی آمد سے ملتی تھیں۔

"تو کس سے پوچھوں؟" زوہیب کا موڈ آف ہو گیا۔

"کل صبح اسٹاپ سے لے کر آنا ہے اسے۔" اس نے چبا چبا کر یاد دہانی کروائی تھی۔

"کیا وہ یہاں ٹھہرے گی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زوہیب کو پوچھنا پڑا تھا۔ شافیہ کا رواں رواں سلگ اٹھا۔

"وہ تو شاید نہ ٹھہرتی... آپ کی امی نے بہت مجبور کیا ہے۔"

"ہاں' آپی نے اگر کہا ہے پھر تو امی کچھ نہیں کہیں گی..." زوہیب نے سر ہلایا۔

"آپ کی امی ویسے بھی کچھ نہیں کہیں گی۔ بڑی فیورٹ پرسنالٹی ہے ان کی۔" اس کا لہجہ کٹیلا تھا۔

"سو تو ہے۔" زوہیب کا دھیان کہیں اور تھا۔ شاید فلک کی طرف۔ وہ جل کر آنکھیں بند کر کے سوتی بن گئی تھی۔ دماغ ابھی تک فلک میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ یہاں آرہی تھی۔ جاب کے بہانے یا تجدید تعلقات کرنے؟

کچھ دیر بعد زوہیب نے پھر سے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"شافی! سو گئی ہو کیا؟" اس کی آواز پہ اور ہلانے پہ بھی شافیہ نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ وہ غصے میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

یہ بڑا ہی حبس بھرا دن تھا۔

صبح نو کی ساری خوشگواریت چلچلاتی دھوپ نے نوچ لی تھی۔ فضا میں گھٹن' لو اور تپش کی انتہا تھی۔ پسینے سے برا حال تھا۔ اوپر سے کھچا کھچ انسانوں سے بھری ویگن ۔۔۔ اندر کی فضا میں کھٹے پسینے کی باس رچی تھی۔

وہ ناک دبا کر بیٹھی تھی پھر بھی ابکائیاں آ رہی تھیں۔ کہاں اس کی نفیس طبیعت اور کہاں ویگن کا گھٹا گھٹا ماحول ۔۔۔ اس کا خوب صورت اسٹائلش سوٹ سلوٹ سلوٹ ہو رہا تھا۔

صبح تو موسم بڑا حسین تھا۔ فجر کے بعد جب وہ اپنی تیاری کر رہی تھی' تب اماں اور چھوٹے بہن بھائی کا دل برا ہو رہا تھا گو کہ دونوں اس کے سوتیلے بہن بھائی تھے' مگر اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

"باجی! کب آؤ گی؟" وہ دونوں کئی دفعہ پوچھ چکے تھے۔ ہر بار باجی پھاڑ کھانے کو دوڑتی تھی۔

"اس جہنم سے ابھی تو جا رہی ہوں۔ واپسی کا سوال مت کرو۔ دو ماہ سے پہلے نہیں آؤں گی۔"

وہ اپنا اسٹائلش بیگ بھر کے صحن میں آئی اور رسٹ واچ سے وقت دیکھا۔ ویگن آنے میں ابھی پندرہ منٹ تھے۔ یہ واحد ویگن تھی جو اس کے گاؤں سے ہو کر شہر جاتی تھی۔ اس پہ بے زاریت سوار ہو گئی۔

"پتر! اپنا گھر جہنم نہیں ہوتا۔" اماں جو فٹافٹ اس کے لیے دیسی گھی کے پراٹھے تل رہی تھیں' ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔ گو کہ اماں اس کی سوتیلی تھیں مگر ان کے تعلقات کبھی بھی روایتی نہیں رہے تھے۔ جس میں بڑا ہاتھ اماں کا تھا اور یہ اماں ہی تھیں جنہوں نے فلک کے تنک مزاج کے ساتھ نباہ کیا تھا اور اگر فلک سمجھتی تو یہ اماں کا بڑا احسان تھا اس پہ ۔۔۔ جو انہوں نے اسے اتنے بڑے شہر کی بڑی انجینئرنگ یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ ورنہ ابا تو دسویں کے بعد آگے پڑھائی کے حق میں نہیں تھے۔

اماں نے ہی ابا کو مجبور کیا تھا کہ فلک نے دسویں میں ٹاپ کیا ہے اسے آگے بھی پڑھانا چاہیے۔

دوران تعلیم جتنا بھی اس کا ذاتی خرچا ہوتا تھا وہ اماں ہی چپکے چپکے بھجواتی تھیں۔ جس میں سے کچھ پیسہ وہ اپنی شاپنگ پہ خرچ کرتی اور کچھ پارلروں میں جھونک آتی۔

وہ شروع سے ہی اپنے دیہاتی ماحول میں مس فٹ تھی۔ اور کچھ اسے لگتا تھا وہ اپنے رشتے داروں سے بہت پیچھے ہیں۔ اس بات کا احساس اسے تب تب ہوتا تھا جب جب اس کے کرنل چاچا کا گاؤں میں چکر لگتا۔ ان کی آمد پر یہ احساس بہت بڑھ جاتا تھا۔ ان کی پڑھی لکھی اسٹائلش بیوی۔ خوب صورت بچے۔

تب اس کا دل کرتا تھا وہ بھی اس ماحول سے نکل کر ایک اچھا معیار زندگی اپنائے۔ اور اس کے لیے تعلیم بہت ضروری تھی۔ اس نے ایک طویل عرصہ محنت اور ان تھک محنت میں گزارا تھا۔ رات دن کا فرق بھلا کر اپنے تعلیمی معیار کو بلند کیا تھا۔ اسی لیے اسے ایک بڑے شہر کی بڑی یونی ورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔

تب اماں نے اس سے پوچھے بغیر چاچی کو فون کر دیا۔ چاچی کا میکہ اسی شہر میں تھا۔ اماں کی خواہش تھی وہ چاچی کے میکے میں قیام کرتی ۔۔۔ تاکہ انہیں اس کی رہائش اور کھانے پینے کی فکر نہ ہوتی' لیکن یہاں بھی اس کی ہٹ دھرمی نے اماں کی ایک نہ چلنے دی تھی۔ حالانکہ چاچی نے بخوشی اسے اپنی امی کے گھر رہنے کی آفر کی تھی مگر فلک کو کسی کا احسان گوارا نہیں تھا۔ اس نے ہاسٹل میں قیام کو ترجیح دی۔ اور یہ پہلا فیصلہ تھا جو بہت غلط ثابت ہوا تھا۔

ابتدا میں ہی فلک کو پتا چل گیا تھا کہ چاچی کا بھائی اس کے ساتھ پڑھتا ہے۔ زوہیب اس کا کلاس فیلو تھا۔ وہ ذہین تھا مگر فلک کی ٹکر کا ہر گز نہیں تھا۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے والا تھا۔ فلک کی طرح ٹاپر ہر گز نہیں تھا۔

آغاز میں ہی فلک کا طوطی پوری یونی ورسٹی میں بولنے لگا تھا۔ وہ دنوں میں ہی مقبول ہو گئی تھی۔ اور اسی

طرح دنوں میں ہی زوہیب کے ساتھ اس کی دوستی
پروان چڑھ گئی تھی۔ وہ عموماً"اکٹھے ہی نظر آتے تھے۔
کلاس میں بھی اور کلاس سے باہر بھی۔۔۔ پھر اکثر وہ
ویک اینڈ پہ زوہیب کے گھر بھی جانے لگی۔

وہ ذہین تھی اور اس نے بڑی ذہانت کے ساتھ
زوہیب کی امی کے دل میں گھر کرلیا تھا۔

زوہیب کا چھوٹا سا صاف ستھرا خوب صورت گھر
اس کے خوابوں میں بستا تھا۔ اس کی نفیس سی انتہائی
صفائی پسند امی جو پورا وقت گھر چمکانے میں لگی رہتی
تھیں۔

وہ ان کے گھر جاتی تو غیر محسوس انداز میں۔ کئی کام
کردیتی تھی۔ اسے بہت اچھی سلائی آتی تھی۔ وہ اس
کی امی اور آپی کے کپڑے سلائی کرتی۔ ہما کے لیے اعلیٰ
سے اعلیٰ ڈیزائننگ کرتی۔ اچھی سے اچھی کوکنگ کرتی
تھی۔ زوہیب کی امی اسے بہت چاہنے لگی تھیں۔ اس
کی آپی بھی فلک کو بہت پسند کرتی تھیں۔

ہر چھٹیاں وہ اپنے چاچا کے گھر گزارتی تھی تب
زوہیب بھی آجاتا تھا۔ فلک کو اندازہ تھا۔ زوہیب
اسے پسند کرتا ہے۔

زوہیب کے ساتھ گزرا ایک ایک پل اسے یاد تھا۔

زوہیب کی برتھ ڈے والی شام بڑی سہانی شام
تھی۔ اس روز فلک نے خود کو بھرپور سجایا تھا۔ بہت ہی
کم عرصے میں اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ زوہیب کی امی کو
اپ ٹوڈیٹ رہنے والے لوگ بڑے پسند ہیں۔ خود
زوہیب کی دودھیا شرٹس پہ ایک شکن نہیں ہوتی
تھی۔ وہ خود بھی بہت سج سنور کے رہتا تھا۔ بڑے
اہتمام سے تیار ہوکر یونی ورسٹی آتا تھا۔ ایک دن فلک
کے پوچھنے پہ اس نے بتایا۔

"یار! میری آنسہ امی جان کو "ان دھلے" میلے کچیلے
لوگ پسند نہیں۔ وہ کچن میں بھی "تیار" ہو کر جاتی ہیں۔"

اور زوہیب کی یہ بات سو فیصد درست تھی۔ جب
وہ زوہیب کے گھر پہنچی تب آنٹی کچن میں تھیں۔
انہوں نے خوب صورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں کا
ڈھیلا سا جوڑا۔ ہلکا سا میک اپ' وہ بڑی فریش لگ رہی
تھیں۔ اسے دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئیں۔

"ماشاء اللہ' بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

انہوں نے ناقدانہ انداز میں اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ
اسٹائلش سوٹ میں بالوں کی اونچی پونی کے ساتھ بہت
پُرکشش لگ رہی تھی۔۔۔ اوپر سے اندازِ گفتگو کمال کا
تھا۔ اس کی ذہانت سے بھرپور باتیں مقابل کا دل موہ
لیتی تھیں۔ اس نے آنٹی کی بنائی کڑاہی کو ڈش آؤٹ
کیا' ٹیبل لگائی' اپنے ہاتھ سے بیک کیا کیک رکھا اور
آنٹی کے کہنے پر زوہیب کو بلانے اس کے کمرے میں آگئی
تھی۔ ایسی بے تکلفی ان دونوں کے درمیان پل کی
طرح موجود تھی۔ برتھ ڈے بوائے ابھی تک نیند میں
دھت تھا۔ اس کے جگانے پہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"اف' ناگہانی آفت! یہ تم ہو۔" اس نے بمشکل
اپنی مندی مندی آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر اس پہ نظر
پڑی تو مسکرا دیا اور آنکھوں میں ستائش بھی اتر آئی
تھی۔ چہرے پہ روشنی سی پھیل گئی تھی۔

"برتھ ڈے میری ہے اور تیاری لوگوں کی دیکھو۔"
زوہیب کی آنکھوں میں اتری ستائش دیکھ کر فلک
اترانے لگی تھی۔

"اتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا۔ تم نے جگا دیا۔" وہ منہ
بناتا ہوا اٹھ گیا۔

"کیسا خواب؟۔۔۔" فلک کی مسکراتی آنکھیں اور
مسکرائیں۔۔۔ زوہیب کی آنکھوں نے اس کی تعریف
مکمل کردی تھی۔

"اپنی شادی کا۔ ابھی دلہن کا گھونگھٹ اٹھ ہی رہا
تھا جب تم نے خوفناک انٹری ماری۔" وہ واش روم
سے منہ دھو کر آیا اور جلدی جلدی بال بنانے لگا تھا۔
پھر اس نے خود پر پرفیوم چھڑکا۔

"کیسی دلہن تھی تمہاری۔" فلک کی دلچسپی بڑھ
گئی تھی۔

"بہت ہی سفید۔۔۔" اس نے آنکھیں میچ کر سوچتے
ہوئے بتایا۔

"کیا؟" فلک کی بے ساختہ چیخ بلند ہوئی تھی۔

زوہیب مصنوعی سہم کر دور ہٹا۔

"بہت سفید؟ یعنی کہ ۔۔۔؟" فلک کی گھوریوں پہ زوہیب نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا تھا۔

"یعنی کہ وہ تم نہیں تھیں۔" اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ اب کے فلک کا قہقہہ بلند ہوا۔

"تم دل پہ مت لو' خواب بس خواب ہوتے ہیں۔" فلک نے اسے تسلی دی تھی۔

"لیکن مجھے اتنی سفید دُلہن نہیں چاہیے۔" وہ بچوں کی طرح بسور کر بولا تھا۔ فلک نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔ وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔ اس لیے کہ فلک کی رنگت سفید نہیں تھی۔

"پھر کیسی چاہیے ۔۔۔؟" اس نے بڑے اعتماد سے پوچھا تھا۔ جیسے وہ زوہیب کا جواب پہلے سے جانتی ہو۔

"تمہارے جیسی نمکین' سلونی' کالی کالی سی۔" آخری الفاظ اسے چڑانے کے لیے کہے گئے تھے۔ فلک نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پہ دھپ ماری تھی۔ اس کے من میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔

"بہت کمینے ہو تم۔" اس نے دانت پیسے ۔۔۔ یہ مصنوعی غصہ تھا جسے زوہیب بھی سمجھتا تھا۔

"لڑکی! میرا ادب کرنا سیکھو۔" زوہیب نے رعب سے کہا تھا۔ وہ آئینے میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"وجہ!" وہ تنک کر مسکرائی تھی گو کہ وجہ وہ جانتی تھی لیکن زوہیب کے منہ سے اگلوانا چاہتی تھی۔

"کیونکہ فیوچر میں آسانی رہے گی۔" زوہیب بھی بات کو گول مول کر گیا تھا۔

"کیسی آسانی؟" فلک بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔

"وہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" وہ مزے سے ٹال گیا تھا۔ شاید وہ قبل از وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر اس شام انہوں نے خوب ہی انجوائے کیا۔ زوہیب کے گھر میں کتنا سکون تھا۔ ٹھنڈا پُرسکون ٹھنڈا سا گھر۔ ایک اس کا اپنا گھر تھا ۔۔۔ اتنا بڑا احاطہ' ایک کونے میں بندھے ڈھور ڈنگر ۔۔۔ کچے پکے تین کمرے۔ کھلے کواڑ اور پورے صحن میں چکراتی دھوپ۔۔۔ گرمیوں میں گھر ایسے لگتا جیسے تندور ہے۔

اس کا بس چلتا تو وہ ہمیشہ کے لیے ۔۔۔۔ اسی گھر میں ٹھہر جاتی ۔۔۔ کبھی واپس جاتی ہی نا۔ زوہیب کی امی کے ساتھ اس کی کیمسٹری مل گئی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کی امی کا مزاج سمجھ گئی تھی۔ جہاں تک زوہیب کا تعلق تھا تو گو کہ اس نے کبھی منہ سے اقرار نہیں کیا تھا لیکن فلک جانتی تھی کہ زوہیب اسے پسند کرتا ہے۔ اور عنقریب اسے پرپوز کر دے گا۔ فلک کو پورا یقین تھا۔

فائنل میں ٹاپ کرنے کے بعد فلک کی مقبولیت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ زوہیب اس کے متاثرین میں شامل تھا۔ وہ اس کی شخصیت سے زیادہ اس کی قابلیت کا مداح لگتا تھا۔ اس کی ذہانت کا دل دادہ تھا۔ وہ فلک کو اپنا ایک اعزاز سمجھتا تھا۔ اس کے برابر چلنا زوہیب کے لیے قابل فخر بات تھی۔

فلک کی زوہیب سے بے تکلفی کسی کو بھی ان کے تعلق کی نوعیت سمجھا سکتی تھی۔ اور بہت سے لوگ ہوائیاں بھی اڑانے لگے تھے۔ فائنل میں ٹاپ کرنے کی خوشی میں فلک نے "فورک اینڈ نائف" میں زوہیب کو ڈنر آفر کیا تھا۔

اس دن فلک کو امید تھی' زوہیب اسے کچھ نہ کچھ ضرور کہے گا۔ کم از کم فیوچر کے متعلق۔ اس سے اگلے دن فلک کی واپسی تھی۔ وہ چاہتی تھی زوہیب اسے کوئی امید کا سرا تھمادے۔ تاکہ اس کا اگلا سفر آسان ہو۔

"فورک اینڈ نائف" کے پرسکون ماحول میں بڑا سے لطف اٹھاتے ہوئے فلک بہت بے چین تھی۔ اور زوہیب بھی اتنا ہی الجھا الجھا پریشان لگ رہا تھا۔ فلک چاہتی تھی وہ خود اپنی الجھن کو ڈسکس کرے' لیکن زوہیب کے ایسے کوئی ارادے نہیں لگتے تھے۔ اس کی الجھن کیا فلک سے تعلق رکھتی تھی؟ اس کا اضطراب زوہیب کی خاموشی سے بڑھ رہا تھا۔ تنگ آکر فلک نے ایک موضوع گفتگو چنا اور خود ہی بولنے لگی۔ اس سے اچھا زوہیب کو متوجہ کرنے کے لیے ٹاپک نہیں تھا۔

"زوہیب! میرے ایک دو پروپوزل آئے ہیں۔ اماں اور ابا شاید چاچا کو بلوا کر فائنل کر دیں۔ میں ابھی جاب کرنا چاہتی تھی مگر..."

فلک انتہائی غم زدہ سی انگلیاں مسلتے ہوئے کہہ رہی تھی... اس نے کمال ذہانت سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ اسے ہر طریقے سے گفتگو کو موڑنا آتا تھا۔ زوہیب کو چونکانا آتا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا آتا تھا۔ زوہیب کے چہرے پہ واضح پریشانی دکھائی دینے لگی تھی۔ فلک کے دل میں اک گونہ سکون اترا تھا۔ کم از کم زوہیب کو اس کی پروا تو تھی۔ پسندیدگی اور چاہت کے سفر میں وہ اکیلی تو نہیں تھی۔ زوہیب اس کے ہمراہ تھا۔ وہ تنہا نہیں تھی۔

"اتنی جلدی؟" زوہیب نے متفکر انداز میں کہا۔ اس کی ساری بے نیازی ہوا ہو چکی تھی۔ وہ سخت بے چین ہوا تھا۔

"جلدی کہاں! ابا کے نزدیک تو بہت دیر ہو چکی ہے۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بتا رہی تھی۔ زوہیب کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ جانے وہ اتنا متفکر اور مضطرب کیوں تھا؟ اور پتا نہیں اس نے اپنے گھر میں فلک کے حوالے سے بات کی تھی یا نہیں؟

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟" زوہیب عجیب انداز میں بولا۔ فلک کے لیے یہ بات اچنبھے کا باعث تھی۔ کیا وہ اس کا خیال نہیں جانتا تھا؟

"میرا خیال...؟" وہ چونکی' زوہیب آخر کیا جاننا چاہتا تھا کیا اس کے منہ سے اقرار سننا چاہتا تھا!"

"تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو؟" زوہیب نے قدرے بے قراری سے کہا تھا۔

"تمہارے بارے میں کیا سوچنا ہے....؟" فلک نے گہرے لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"میں تو تمہیں سوچتی ہوں۔" اگلے الفاظ اس نے دل میں کہے تھے۔ وہ بھی زوہیب کے سامنے خود کو ہلکا نہیں کرنے والی تھی۔

"میرا مطلب ہے...؟" وہ شاید کنفیوژن کا شکار ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیسے بات کرے۔ کس انداز میں دل کی بات کہے۔ فلک کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیسے کرے۔ گو کہ وہ بہت منہ پھٹ تھا مگر سامنے بھی تو فلک تھی۔

"تم بس مطلب میں ہی الجھتے رہنا... صاف بات نہیں کر سکتے تم۔" اس نے چڑ کر جتلایا تھا۔

"فلک! تم مجھے پسند کرتی ہو؟" زوہیب نے بالآخر کہا بھی تو کیا۔ فلک کا دل چاہا اپنا سر پھاڑ لے۔ وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ بجائے یہ کہنے کہ وہ فلک کو پسند کرتا ہے۔ اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔ الٹی بات ہی کہہ رہا تھا۔

"تمہیں ناپسند کرنے والی کیا بات ہے۔" فلک نے دانت پیس لیے تھے۔ وہ جانتی تھی زوہیب ڈفر ہرگز نہیں ہے۔

"یعنی میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟" اب کے وہ ذرا اعتماد سے مسکرایا تھا۔

"اور میں تمہیں کیسی لگتی ہوں۔" اس نے انتہائی جھلاہٹ کو چھپا کر بمشکل پوچھا۔

"بہت اچھی..." اس نے بہت جذب سے سچ بتایا تھا۔ فلک اعتماد سے مسکرا دی تھی۔ جیسے اسے زوہیب سے یہی توقع تھی۔ یعنی اتنی سی بات کے لیے زوہیب نے دماغ پلپلا کر کے رکھ دیا تھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی زوہیب ایسے ہی زچ کر کے رکھ دیتا ہے۔

"تو پھر..." فلک نے معنی خیزی سے کہا۔ وہ کہنی ٹیبل پہ ٹکا کر مٹھی پہ ٹھوڑی رکھے' دھیمے سے مسکرائی تھی۔

"پھر یہ کہ میں اپنی امی اور آپی کو تمہاری گھر بھیجتا ہوں۔" اتنے لمبے چکرا دینے والے مباحثے کے بعد اس نے یہی تو کہنا تھا۔ اس نے بالآخر فلک کو مژدہ جاں فزا سنا ہی دیا تھا۔ فلک پہلی مرتبہ اندر تک کھل کر مسکرائی تھی۔

اس کے برسوں سے دیکھے خوابوں کی تکمیل کا وقت قریب آرہا تھا۔

ایک خوب صورت زندگی اس کی منتظر تھی۔ وہ دیہات کے ہر پس منظر کو اپنی زندگی کے کونوں سے بھی

نوچ کھسوٹ کرا تار چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

زوہیب نے اسی رات اپنی امی کو حال دل سنا کر فلک کے لیے رضامند کر لیا تھا۔

اس کی امی کو فلک پسند تھی۔ نکھری اجلی، اپنے آپ کو ہر وقت سنوارنے والی۔ حاضر دماغ، ہنس مکھ، مزاجا" کھلی کھلی۔ امی نے آمنہ آپی سے بات بھی کر لی تھی۔ بظاہر تو کوئی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن آمنہ کچھ متذبذب تھی۔ تاہم اس نے ہامی ضرور بھر لی۔ زوہیب کی خوشی بہر حال ان کے لیے مقدم تھی۔

زوہیب نے اسی رات فلک کو کال کر کے خوشخبری سنادی۔

"امی اور آپی نے تمہارے گھر آنے کا پروگرام بنالیا ہے۔" زوہیب کی خوشی لفظوں میں بیان ہونے سے قاصر لگ رہی تھی۔ فلک اس کی اولین تمنا تھی۔۔۔ ایک پر اعتماد، اعلیٰ تعلیم یافتہ، انتہائی ذہین ہم سفر۔

پوری یونی ورسٹی کے کریم اسٹوڈنٹس فلک کے نام کا دم بھرتے تھے۔ اس نے بڑے بڑے سورماؤں پہ زوہیب کو فوقیت دے کر اس کے دل میں اپنا اونچا مقام بنالیا تھا۔ ورنہ فلک کو رشتوں کی کیا کمی تھی ــــــ

اور کیا رشتوں کی زوہیب کو کمی تھی؟

یہ اس نے سوچا ہی نہیں۔ اسے لگتا تھا اگر فلک اسے نہ ملی تو شاید اسے کوئی فلک جیسی لڑکی ملے ہی نا۔ فلک بھی بار بار اسے جتائے بغیر نہیں رہتی تھی۔

"میرے لیے بہت پروپوزلز آرہے تھے۔ لیکن میں نے کسی انجان بندے کو اپنے لیے منتخب نہیں کرنا تھا۔"

تب زوہیب فلک کا بہت ہی شکر گزار نظر آتا کہ اس نے اتنے لوگوں پہ اسے ترجیح دی ہے۔

پھر جس دن امی نے جانے کا پروگرام بنایا اسی دن امی کا ایکسیڈنٹ میں گھٹنا فریکچر ہو گیا۔ پہلے ہسپتالوں کے چکر، پھر امی کا آپریشن۔۔۔ اور بعد میں تھراپی کے لمبے لمبے سیشن کیا شروع ہوئے، زوہیب گھن چکر بن گیا تھا۔ امی ہسپتال سے گھر آئیں تو لمبے بیڈ ریسٹ پہ تھیں۔

آمنہ اور زوہیب بوکھلا گئے تھے۔ فلک کے گھر جانے کا پروگرام کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ امی کے لیے کسی کل وقتی ملازمہ کا ہونا ضروری تھا۔ آمنہ اسی بھاگ دوڑ میں لگی تھی۔۔۔ لیکن اس کی امی کے ساتھ کسی ملازمہ کا ٹک کر رہنا محال تھا۔ امی نے دو مہینے کے اندر اندر کئی ملازمائیں فارغ کر دی تھیں۔۔۔ اور خود ابھی وہ دوسروں کی محتاج تھیں۔ تب آمنہ نے سوچ سمجھ کر، ہر ایک نکتے پہ غور کرنے کے بعد زوہیب کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

امی سے ذکر کیا تو وہ فلک کے لیے بے تاب ہو گئیں کیونکہ وہ جانتی تھیں زوہیب فلک کو پسند کرتا ہے۔

تب آمنہ نے رسانیت سے انہیں سمجھایا۔ وہ بڑی سمجھ دار تھی۔ بہت دور اندیش تھی۔

"امی! فلک زوہیب کے لیے اچھی بیوی ضرور ثابت ہوگی لیکن وہ آپ کو سنبھال نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں۔ مجھے اس گھر کو سنوارنے کے لیے ایک گرہستن لڑکی کی تلاش ہے۔"

"مگر زوہیب تو فلک کو۔" امی نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ جتنی بھی تیز مزاج تھیں۔ آمنہ کے سامنے مدہم پڑ جاتی تھیں۔

"پسند کرتا ہے نا۔۔۔ پسند تو کسی کو بھی کیا جا سکتا ہے۔ پسند بدلی بھی جا سکتی ہے۔" آمنہ نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔ امی لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گئیں۔ لیکن اندر سے وہ بجھ رہی تھیں۔ زوہیب کی خوشی اور چاہت ان کے لیے بہت اہم تھی۔

"زوہیب کی خوشی تو پوری نہیں ہو گی۔" ان کے دل میں فلک کے لیے قلق ہو رہا تھا۔ تب آمنہ کو پوری گہرائی سے سمجھانا پڑا۔

"امی! فلک نے اتنی محنت کر کے پروفیشنل ڈگری لی ہے۔ اس کے انکل بھی ہر گز نہیں چاہیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کو زنگ لگائے۔ ابھی بھی وہ جاب کر رہی ہے۔ شادی کے بعد بھی وہ جاب کرے گی۔ جاب اور گھر کو

مین ٹین رکھنا اس کے لیے بہت مشکل ہو گا۔ پھر وہ یہاں مس فٹ رہے گی۔ آپ کے اور اس کے درمیان کلیش ہوں گے۔ اگر ہلکی سی دراڑ بھی آئی تو میرا اس کی فیملی سے حساس رشتہ بنتا ہے۔ لازما" ہمارے گھر کا بھی ماحول خراب ۔ ہو گا۔" آمنہ کی دور اندیشی نے امی کو قائل تو کر لیا تھا لیکن فلک ان کے دل سے نکلی نہیں تھی اور شاید ان کے بیٹے کے دل سے بھی۔

پھر آمنہ اپنی تمام کوششیں بروئے کار لا کر بالآخر شافیہ کو بیاہ لائی تھی۔ شافیہ کی موہنی صورت بھی امی کے دل سے ملال نہ نکال سکی۔

وہ اور زوہیب فلک کی یاد میں آہیں بھرتے تو شافیہ کا دل جل جل کر خاک ہو جاتا تھا۔

کچھ عرصہ تک وہ امی کے بتائے ڈھب پہ چلتی رہی۔ خود کو دن میں تین تین مرتبہ سنوار کر۔ فینا کے بعد اس کی روٹین کیا بدلی تھی امی کا دل اس سے اور بھی کھٹا ہو گیا۔ تب انہیں فلک اپنی "ڈریسنگ" کے ساتھ اور بھی یاد آتی تھی اور اب وہی فلک ایک مرتبہ پھر ان کی زندگیوں میں واپس آ رہی تھی اور شافیہ کو اپنی ناؤ کے پتوار ڈولتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

کھچا کھچ بھری ویگن میں سورج کے اونچا ہوتے ہی حبس بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر چھوٹے اسٹاپ پہ ویگن رکتی تو ہجوم بیکراں اندر گھسنے کے لیے بے تاب نظر آتا۔

گرمی سے روتے چلاتے بچے 'عورتوں کی چیخ و پکار اور جھاڑ کنڈیکٹروں کی دہائیاں۔۔۔ اور گندی مندی اشیا بیچنے والوں کا بینڈ۔ سر میں ایک لامتناہی شور ٹیسوں کی صورت میں اٹھ رہا تھا۔

اس کا بس چلتا تو بھری ویگن سے چھلانگ لگا کر نیچے اتر جاتی۔ لیکن کچھ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔

جیسے زوہیب اسے نہیں ملا۔ ہاں 'اس کی شادی کا کارڈ ضرور ملا تھا۔ اس کے کرنل چاچا دے کر گئے تھے۔ اپنے سالے کی شادی کا انوی ٹیشن۔

تب فلک کی کیا کیفیت ہوئی تھی؟ اس پہ کیسا صدمہ گزرا تھا؟ وہ کس حد تک خوف کو محسوس کرتی تھی؟ اس نے کتنا ماتم کیا تھا؟ کتنے بین ڈالے تھے؟ کیسی کیسی آہ و فغاں کی تھی؟" بظاہر کچھ بھی نہیں۔

وہ ویک اینڈ پہ گھر آئی تو پرچھتی پہ سنہرا کارڈ رکھا تھا۔ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں اٹھایا اور دھک سے رہ گئی۔ یہ زوہیب کی شادی کا کارڈ تھا۔ اماں نے اسے کارڈ اٹھاتے دیکھا اور خود ہی بتانے لگیں۔

"آمنہ کے بھائی کی شادی کا کارڈ ہے۔ ادھر شہر میں ہی رشتہ کر لیا۔ میں نے کہا بھی تھا۔ اپنے بھائی کے لیے ہماری فلک کو نظر میں رکھے۔ بس پتر! قسمت کی بات ہے۔ جس کی جہاں لکھی۔"

اماں تندور پہ روٹیاں لگانے چلی گئی تھیں۔ فلک نے کارڈ 'نہ پھاڑا نہ پھینکا۔ بس وہیں پر چھتی پہ سجا دیا تھا۔ وہ نہ روئی تھی 'نہ چلائی تھی 'نہ جاہلوں کی طرح واویلا کیا تھا۔ بس خاموشی سے ہر چیز کو برداشت کر لیا۔

اس نے خود کو جاب میں مصروف کر لیا تھا اور اندر ہی اندر اپنے ٹرانسفر کے لیے کوششیں کرنے لگی۔ اسے ایک مرتبہ پھر اسی بے درد کے شہر میں جانا تھا۔ اس سے آمنے سامنے بات کرنا تھی؟ اپنے مسترد کیے جانے کا استفسار کرنا تھا؟ اپنی توہین کا بدلہ لینا تھا؟ بغیر کچھ کہے 'اس کے ہٹ جانے پہ باز پرس کرنا تھی؟

کیا انتقام لینا تھا؟

شاید ہرگز نہیں۔

وہ تو صرف اسے سزا دینا چاہتی تھی۔ اور کیا یہ غلط تھا!

معا" چلچلاتی دھوپ پہ اچانک حنائی رنگ آنے لگا تھا۔ دھوپ میں پہلے تو گیروا رنگ گھلا تھا۔ پھر مہندی سی رنگت بھری تھی اور بعد میں زردی مائل سرخی سی ہر سو چھانے لگی۔ پھر مغرب کی طرف سے سرمئی غبار اڈ رہا تھا۔ شاید آندھی کے آثار تھے۔ یا برکھا برسنے والی تھی۔

بادلوں کے چھاتے ہی گرمی کا زور ذرا کم پڑا تھا۔ ہوا میں گھٹن بھی ہلکی ہوئی تھی۔ اس نے سیٹ کی پشت

سے ٹیک لگائی تو یادوں کا سلسلہ وہیں سے چل پڑا جب زوہیب کی اگلی سالگرہ کی شام فلک نے اس کے کچن میں گھس کر پورا مینیو تیار کیا تھا۔

چاکلیٹ کیک بھی خود بیک کیا اور ڈیٹ ڈیلائٹ کے ساتھ پا زی بریانی بنائی۔ جب وہ سب کچھ تیار کر چکی تب آنٹی نے اس کی جی بھر کے تعریف کی۔

"کب وہ مبارک دن آئے گا جب میں تمہیں ہمیشہ اس گھر میں چلتا پھرتا دیکھوں گی۔"

فلک ان کی بات کے مفہوم پہ شرمائی نہیں تھی بلکہ اعتماد سے مسکرا دی تھی۔ تاہم اندر سے وہ بہت خوش ہوئی۔ اس گھر میں آنا اس کا خواب تھا۔ چاچی کی فیملی اس کی آئیڈیل فیملی تھی۔ چھوٹا سا مختصر گھرانہ.... صرف زوہیب اور اس کی امی.... اور مائیں بے چاری کب تک ہوتی ہیں؟

آمنہ بھی اپنے گھر بار والی تھی.... یہاں پہ وہ اور صرف زوہیب۔ تب زندگی کے کتنے نرالے رنگ نکھرتے؟ وہ ان لمحات کی خوشبو سے مہک جاتی تھی۔

تب ہی زوہیب کا اکلوتا دوست ڈاکٹر آدم بیزار بھی آ گیا تھا۔ نام تو اس کا آدم ہی تھا۔ لیکن بیزار کا لاحقہ زوہیب نے لگا رکھا تھا۔ وہ اس کا کالونی فیلو بھی تھا۔

آدم کے والدین حیات نہیں تھے۔ کوئی بہن بھائی اور رشتے دار بھی نہیں تھا۔ بس زوہیب کی فیملی سے اس کے تعلقات تھے۔ ویسے بھی ڈاکٹر آدم بیزار لوگوں کے ہجوم سے زیادہ تر بیزار ہی رہتا تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا، یا پھر زوہیب کی کمپنی میں رہتا۔

کالونی کی ابتدا میں کارنر والی کوٹھی آدم بیزار کی تھی۔ کلینک بھی کوٹھی میں بنا رکھا تھا۔

اس وقت زوہیب اپنے کمرے میں تھا۔ اسی لیے فلک کو کمپنی دینے آنا پڑا۔ آنٹی نماز ادا کرنے چلی گئی تھیں۔ گفتگو کے دوران اسے اندازہ ہوا تھا ڈاکٹر آدم اتنا بھی بیزار نہیں۔ وہ خاصا نفیس آدمی تھا۔ اچھی گفتگو کرتا تھا تاہم کم بولتا۔

"آگے آپ کے کیا ارادے ہیں؟" آدم نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔

"اپنی فیلڈ میں ہی جاب کروں گی۔"

اور اس کے علاوہ....؟" اس نے مزید پوچھا۔

"اس کے علاوہ کیا؟" پہلی مرتبہ فلک کچھ کنفیوزڈ ہوئی تھی۔

"آئی مین شادی وغیرہ؟" آدم کی بے تکلفی اور خوش اخلاقی کے کیا ہی کہنے تھے۔ اس وقت وہ کہیں سے بھی آدم بیزار نہیں لگ رہا تھا۔

"ابھی سوچا نہیں۔" فلک خاصی جزبز ہو رہی تھی۔ اس زوہیب کا بھی سنگھار" اپنی اماں کی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ جانے کہاں رہ گیا ہے۔ سنبھالے اپنے آدم بیزار دوست کو۔ جو کہیں سے بھی بیزار نہیں لگتا۔ وہ دل ہی دل میں کلستی بظاہر مسکرا رہی تھی۔

"تو کب سوچیں گی؟" آدم نے بھی مسکرا کر استفسار کیا۔

"ابھی کچھ پتا نہیں۔"

"اوکے، جب بھی شادی کے بارے میں سوچنے کا ارادہ کیا' تو مجھ سے ضرور رابطہ کیجیے گا۔" آدم نے بڑے اخلاق سے اپنا کارڈ فلک کو پکڑایا تو لامحالہ اسے کارڈ پکڑنا پڑا۔ تب ہی بن ٹھن کے زوہیب بھی آ گیا۔

"ابے! تو نے شادی دفتر کھولا ہے 'اندر ہی اندر!" اس نے آتے ہی ڈیلینٹ سے ڈاکٹر کے کندھے پہ دھپ لگائی تھی۔

"بڑے بد اخلاق ہو۔" وہ اپنا کندھا مسلتا رہ گیا۔ فلک 'زوہیب کو دیکھ کر کچن دیکھنے کے بہانے اٹھ گئی تھی۔

آدم کے ساتھ بھی ڈھیر سارے ایلیے جڑے تھے۔ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ کہیں بات نہ بن پاتی تھی۔ یوں اس کی نیا ابھی بیچ منجدھار میں ڈول رہی تھی۔ زوہیب کی امی ہی آدم کے لیے اچھے رشتے کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

فلک کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر آدم اس کے لیے

پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے' لیکن اس کی سرد مہری کے باعث وہ خود بخود پیچھے ہٹ گیا تھا۔

وہ زوہیب کے لیے سنجیدہ تھی اور اسی کو سوچتی تھی۔ لیکن اس کی تمام سوچیں' خیال' خواب ٹوٹ گئے تھے۔ جب اسے زوہیب کی شادی کا اچانک کارڈ دکھائی دیا تھا۔

کوئی حرفِ معذرت' تھوڑی سی ندامت' ہلکا سا ملال۔۔۔؟ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کی امید' آس' تمنا' خواب توڑ کر وہ کس قدر آسانی سے اپنا گھر بسا رہا تھا۔ اسے ایک مرتبہ بھی فلک کا خیال نہیں آیا؟ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا؟

تو پھر وہ ذرا سی سزا کا حق دار تو تھا' نا؟

ذرا سا بدلہ لینا تو بنتا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات بھر آندھی کے بعد صبح مطلع تو صاف تھا تاہم پورا گھر گرد آلود ہو چکا تھا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تب سوا نو بج رہے تھے۔ زوہیب ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ "انا" "فانا" باہر آئی تو امی بھی جاگی ہوئی تھیں۔ فینا کارپٹ پہ کھیل رہی تھی۔ اس کا فیڈر نیچے پڑا تھا۔ جبکہ امی کا منہ خاصا سوجا ہوا تھا۔

جب وہ فینا کو لے کر اندر گئی تھی تب زوہیب اٹھ چکا تھا مگر اس کا منہ بھی پھولا ہوا تھا۔ شاید رات کی باتوں سے۔

"اٹھ چکے ہیں تو منہ ہاتھ دھو کر مارکیٹ سے ہو آئیں۔ لنچ ٹائم تک آپ کے مہمان بھی تشریف لے آئیں گے۔ مجھے ابھی صفائی بھی کرنی ہے۔" زوہیب جو مکمل اسے نظرانداز کیے ٹی وی کا ریموٹ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی بات پہ گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔

"جاتا ہوں۔" زوہیب بے زاری سے بولا تھا۔

"واپسی پہ اسٹاپ تک بھی جانا ہے؟"

"مجھے کیا پتا امی سے پوچھ لیں۔" اس کا موڈ بھی آف تھا۔ زوہیب باہر جاتے جاتے رک گیا۔

"تم رات سے مرچیں کیوں چبا رہی ہو؟" وہ ایسے رک کر پوچھ رہا تھا جیسے بڑی ضروری بات کرنا تھی۔

"کیونکہ مجھے مرچیں پسند ہیں۔" شافیہ نے دوبدو جواب دیا تھا۔

"میرے ساتھ اتنا روڈلی بی ہیویئر کا مقصد؟ رات کو بھی کروٹ بدل کر سو گئی تھیں۔" وہ اپنا اصل غصہ اگل رہا تھا۔ شافیہ نے بمشکل خود پہ قابو رکھا۔

"آپ جا رہے ہیں مارکیٹ یا نہیں؟" وہ بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔ کیونکہ اسے کاموں کا انبار دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر تک فلک بھی آجاتی۔ شام کو آمنہ کے بچے بھی۔ مصروفیات بھی بڑھ جاتیں اور کام بھی کیونکہ آمنہ کے بچے بہت خوش خوراک تھے۔

زوہیب باہر نکل گیا تو شافیہ بھی اس کے پیچھے آگئی۔ امی کو زوہیب کی صورت کیا نظر آئی تھی' وہ ایک دم فارم میں آگئیں۔

"یہ وقت ہے اٹھنے کا؟ رات کو ہل جوتے تھے کیا؟ بچی میرے پاس تھی۔ حد ہے بھئی۔" ان کا زلزلہ اصل میں شافیہ پہ گر رہا تھا۔ وہ زوہیب کی آڑ میں شافیہ کو سنا رہی تھیں جو اس کے پیچھے ہی باہر نکل آئی تھی۔

"رات بھر لڑتے رہے؟" ان کا انداز بدل گیا تھا۔ شافیہ پہ آیا غصہ خود بخود سمٹ گیا۔ زوہیب ہمدردی لینے کے چکر میں ماں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

"پوچھیں اس سے' میرا جینا محال کر رکھا ہے۔ ہر وقت لڑتی ہے مجھ سے۔" زوہیب کے اتنے بڑے جھوٹ پہ شافیہ کا دماغ تپ گیا تھا۔

"کیوں لڑتی ہو شافیہ! میرے بچے کو تنگ کر رکھا ہے۔ اتنی سی صورت نکل آئی ہے' بے چارے کی۔" امی نے شافیہ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"آپ کے بچے کی صورت آج کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ کچن میں جاتے ہوئے چیخی تھی۔ زوہیب اس کا طنز صاف سمجھ گیا تھا۔ وہ فلک کے حوالے سے طعنہ مار رہی تھیں اور فلک کی آمد سے ہی بگڑ بھی رہی تھی۔

"امی! مجھ پہ طنز کرتی ہے۔" وہ جان بوجھ کر بسورا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" امی کچھ حیران ہوئیں۔
"فلک کے حوالے سے۔" زوہیب ان کے کان میں گھسا تھا۔ امی ہکا بکا رہ گئیں۔
"ابھی تو وہ بے چاری آئی بھی نہیں۔۔۔ اس نے بیر بھی باندھ لیا۔" فلک کے لیے وہ آج بھی خاصی حساس تھیں۔
شافیہ کا دماغ تپ گیا تھا۔ زوہیب کان دبا کر باہر نکل گیا۔

پھر جب مارکیٹ سے فارغ ہوا تو بس اسٹاپ کی طرف چلا آیا تھا۔ فلک کی ویگن جلدی آگئی تھی۔ اور فلک، زوہیب کو دیکھ کر اتنی حیران ہوئی کہ لمحہ بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی تھی۔
وہ اسے لینے کے لیے آیا تھا؟ کیا اس کی بیوی نے اسے بھیج دیا؟ کس قدر حیرانی اور تعجب کی بات تھی۔
پھر زوہیب کے انداز بھی پرانے تھے۔ وہ تو ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ پہلے والا اٹ کھٹ، خوش مزاج حاضر جواب۔۔۔ فلک تو سوچ رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ کس قدر اجنبی ہو گا۔ بدل چکا ہو گا۔
بس اسٹاپ سے لے کر گھر جانے تک وہ فلک سے ایسے باتیں کرتا رہا تھا جیسے بیچ میں ڈیڑھ سال آیا ہی نہیں تھا۔ ویسی ہی بے تکلفی، ویسی ہی گفتگو، حاضر جوابی برجستگی ہنسی مذاق۔
فلک جو سوچ رہی تھی جانے زوہیب کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کتنا عرصہ لگے۔ دوبارہ سے اپنے مدار میں لانے کے لیے کتنا وقت درکار ہو، حیران رہ گئی تھی۔ زوہیب اس کے دائرے اور مدار سے نکلا ہی نہیں تھا۔

ایک ایک پرانی بات دہراتا۔ یونی ورسٹی کے قصوں سے گرد جھاڑتا۔۔۔ وہ بالکل پرانا زوہیب تھا۔ جس کے ہاتھ سے کون، چھین کر فلک بڑی بے تکلفی سے کھا لیا کرتی تھی۔ اور وہ اس کے پاپ کارن چرا لیا کرتا تھا۔

فلک بھی اجنبیت بھرا وہ احساس، جو اپنے گاؤں سے لے کر ویگن پہ سوار ہوئی تھی اسی ویگن اسٹاپ پہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی۔
زوہیب تو زوہیب آنٹی نے بھی اس کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ وہ ابھی تک وہیل چیئر پہ تھیں۔ پھر بھی دروازے تک آئی تھیں اسے خوش آمدید کہنے۔
ایک تو آمنہ کی سسرالی عزیزہ ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ خاص پروٹوکول ملتا تھا اور دوسرے زوہیب کی دوست ہونے کے علاوہ وہ آنٹی کی پسندیدہ شخصیت تھی۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟" فلک کو خود ہی پوچھنا پڑا۔ وہ جو لاؤنج کے صوفے پہ ڈھیر ہو رہا تھا۔ مسکرا کر بولا۔
"یہیں کہیں جل رہی ہو گی۔" زوہیب اپنے ازلی خوش مزاج، منہ پھٹ انداز میں بول رہا تھا۔
"کیا واقعی؟" فلک کو بڑا ہی مزہ آیا۔ وہ جو ذہن میں عجیب عجیب سی سچویشن بنا کر آئی تھی کہ کس طرح سے زوہیب اور اس کی بیوی کے رویوں کو برداشت کرے گی۔ ان کی محبت بھرے جذباتی سین آنکھوں سے دیکھنا اور برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ یہاں آ کر اسے قطعاً "مختلف" ماحول ملا تھا۔
اس نے سن رکھا تھا زوہیب کی بیوی بڑی خوب صورت ہے اور اپنے ہی ذہن سے اندازہ لگایا تھا کہ خوب صورت بیوی کو پا کر زوہیب اسے تو بھول چکا ہو گا۔ اس کے نخرے اٹھاتا ہو گا۔ ناز سہتا ہو گا۔ لاڈ کرتا ہو گا۔ مگر اس کے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔

زوہیب کی اپنی بیوی کے ساتھ بنتی ہی نہیں تھی۔ ہر وقت ان کی چو نچیں لڑتی رہتیں۔ زوہیب اپنی بیوی کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اسے دوبدو جواب دیتا۔ طعنے مارتا۔ طنز کرتا اور پھر مزے سے انجوائے کرتا تھا۔ جب اس نے پہلی مرتبہ شافیہ کو دیکھا تب وہ اندر ہی اندر اس سے متاثر ضرور ہوئی تھی۔ خوب صورتی کسے متاثر نہیں کرتی؟ فلک کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ شافیہ کم از کم ایک چیز میں اس

سے بہت آگے ہے۔ باقی کسی بھی معاملے میں شافیہ اس کی ٹکر اور مقابلے کی نہیں تھی۔

"قابلیت، تعلیم اور ذہانت۔" ان تین چیزوں میں شافیہ فلک کے قطعی طور پر ہم پلہ نہیں تھی۔

اگر فلک اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتی تو وہ شافیہ کو پچھاڑ سکتی تھی۔ کم از کم زوہیب کو اپنی طرف ملتفت کر کے اپنا بدلہ تو لے سکتی تھی۔ بغیر قصور کے مسترد کرنے اور ٹھکرانے کا بدلہ۔

اگر شافیہ بیچ میں نہ آتی تو زوہیب فلک کا ہوتا۔ اور شافیہ کیوں آئی تھی؟ فلک نے اس بات پہ کبھی غور و فکر نہیں کیا تھا۔ ذہین لوگ اتنی چھوٹی باتوں پہ ذہن لڑا کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔

اس کی جاب بھی زوہیب کی کمپنی میں تھی۔ ان کا شعبہ بھی ایک تھا۔ وہ دونوں اکٹھے آفس جاتے تھے، اکٹھے واپس آتے تھے۔

زوہیب نے بخوشی اس کی ——— ذمہ داری ——— اٹھائی تھی۔ وہ آفس کی طرف سے پک کرنے والی وین کو جواب دے چکا تھا۔

"جب گاڑی ہے تو وین کی ضرورت نہیں۔ تم پر فرض ہے سیلری بچانا۔ کنوینس الاؤنس اس طرح بچ جائے گا تمہارا.... آخر تمہیں یہاں آنے کا کچھ تو بینی فٹ ملے۔" جب وہ مسکرا مسکرا کر اپنی طرف سے مخلصانہ مشورے پیش کر رہا تھا تب شافیہ بڑے ضبط کے ساتھ اس کی گفتگو کو سن رہی تھی۔

فلک نے اک نظر مصروف سی شافیہ کو دیکھا اور مسکرا کر مشورہ قبول کر لیا۔

"تھینک یو ویری مچ زوہیب! ہمیشہ کی طرح تمہیں آج بھی میرا خیال ہے۔" فلک نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا تھا تاکہ شافیہ تک بخوبی آواز پہنچ سکے۔

زوہیب نے اس کی بات کا برجستہ جواب دیا۔

"منہ دھو رکھو، پرانے احسان اتار رہا ہوں۔"

"مطلب....؟" فلک نے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

اندر سے وہ خاصی گڑبڑا گئی تھی۔ یہ زوہیب بھی نا؟

"مطلب یہ کہ یونی میں تمہارے اچھے نوٹس میری کامیابی کی ضمانت ہوتے تھے۔" اس نے مسکرا کر فلک کو کریڈٹ دیا تو شافیہ کے سامنے اس کی گردن کچھ اور تن گئی تھی۔

"تو تم تسلیم کرتے ہو۔ یونی میں میری ٹکر کا کوئی نہیں تھا۔" وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

"کیوں نہیں.... میں تھا نا۔" زوہیب نے شرارتاً کہا تھا۔ فلک نے مترنم سا قہقہہ لگایا۔

"ہاں.... تم تو تھے نا.... اور تم ہو نا۔"

"کوئی شک ہے کیا؟" زوہیب بھی اترایا۔

شافیہ سے مزید اٹھکیلیاں برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ ضبط کرتی رہی۔ اسے زوہیب کی عادت کا بھی پتا تھا۔ وہ اپنی چونچالی سے باز نہیں آتا تھا۔ پھر یہ تو اس کی سابقہ یا موجودہ دوست تھی۔ سو اس کے ساتھ بے تکلفی اور برجستگی کے مظاہرے عام سی بات تھی۔

لیکن یہ مظاہرے وقت گزرنے کے ساتھ بہت بڑھتے جا رہے تھے یہاں تک کہ....

اسی شام آمنہ کے بچے بھی کراچی سے آگئے تھے۔

بچوں کی آمد کے ساتھ ہی شافیہ کی مصروفیات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ آمنہ کے بچے بہت نخریلے تھے۔ چونکہ شافیہ عادی تھی اس لیے.... اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن فلک اور زوہیب کی بے تکلفی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

فلک کو دیکھ کر شافیہ کو بے انتہا مایوسی ہوئی تھی۔ وہ ایسی نہیں تھی جس کے فراق میں زوہیب گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جاتا۔

مجموعی طور پر فلک کا پہلا تاثر بس یہی تھا۔

لیکن کہتے ہیں نا.... دل آئے گدھی پر تو؟ بس زوہیب کا یہی معاملہ تھا۔ اپنی پری تو اس گدھی کے سامنے نظر ہی نہیں آتی تھی۔

پھر آمنہ کے بچوں کی وہ گدھی مطلب فلک آیا ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی اسے خاص پروٹوکول دیتے تھے جس

کا مطلب تھا وہ بچوں کے پاپا یعنی اپنے چاچا کی خاصی لاڈلی اور منہ چڑھی بھتیجی تھی۔

ان دنوں زوہیب بچوں اور ان کی آپا کو گھمانے پھرانے کی مہم پہ نکلا ہوا تھا۔ اکثر امی شافیہ کو بھی زبردستی ساتھ بھیج دیتی تھیں۔ عموماً" شافیہ انکار کردیتی، کیونکہ بچے باہر کے کھانے وغیرہ کے عادی نہیں تھے۔ وہ آؤٹنگ پہ جانے سے پہلے اعلان کرکے جاتے تھے۔

"کھانا تو بس ماں کے ہاتھ کا۔ اتنا کمال کا بناتی ہیں۔"

یوں شافیہ کا آدھا دن صفائی میں اور آدھا دن پکانے میں گزر جاتا تھا۔ ان دنوں وہ خود سے بھی لاپروا ہو گئی تھی اور امی اس سے بیزار۔

"تین تین دن کپڑے نہیں بدلتیں فلک کو دیکھا ہے؟ دن میں چار' چار جوڑے بدلتی ہے۔" وہ اسے آتے جاتے سناتی تھیں۔

"فلک کو اور کوئی کام نہیں۔ بن ٹھن کر دفتر جاتی ہے۔ بنی ٹھنی واپس آتی ہے۔ کھانا تیار ملتا ہے۔ کپڑے دھلے ہوئے استری شدہ کہ مہمانوں سے کام کا رواج نہیں یہاں پہ' سو وہ سارا دن بیر بہوٹی بنی رہے تو اس کے کیا کہنے؟" وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔

"شافیہ! مرد کو لاپروا بیوی پسند نہیں ہوتی۔ یہ جو زبی تمہارا دم بھرتا تھا' نا۔۔۔ تمہارے بجنے سنورنے کی وجہ سے۔ پورا دن عورت کولہو کے بیل کی مانند جتی رہتی ہے۔ لیکن مرد کو اپنی بیوی فریش اور ہشاش بشاش چاہیے۔ تم خود پہ توجہ نہیں دے رہیں۔" ان کا بس نہیں چلتا تھا۔ خود اٹھ کر اسے دلہن بنا ڈالیں۔ وہ تو چاہتی ہی یہی تھیں۔ گھر صاف ستھرا ہو۔ بچے تیار' کھانا لذیذ اور وقت پہ مہیا ہو۔ کپڑے دھلے' استری شدہ الماری میں نظر آئیں اور بہوئیں لگے جیسے ابھی ابھی پارلر سے لشکارے مارتی آرہی ہے۔

یعنی بہو نہ ہوتی۔۔۔ کوئی بجلی کا بٹن ہوگئی یا افسانوی ہیروئن۔ جو پلک جھپکنے میں پہاڑ بھی توڑ لائے۔

"زوہیب کو مجھے دیکھنے کا آج کل وقت نہیں مل رہا امی! وہ بڑے مصروف ہیں۔ جس دن انہیں ٹائم ملا۔ تیار ہو جاؤں گی۔" وہ شدید بیزاری سے بولی تھی۔ امی کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ بات کو اپنے ہی پیرائے میں لیتی تھیں۔

"بچے سال بعد آئے ہیں۔ کیا ان کا اکلوتا ماماان کو گھمائے پھرائے بھی' نا؟" وہ سخت برامان گئی تھیں۔ شافیہ نے اپنا ماتھا پیٹا۔

"بچوں کی بات کون کرر رہا ہے امی! میں تو بچوں کی آپا کا ذکر کر رہی تھی۔"

"آمنہ کی سسرالی عزیزہ ہے۔ اس کے شوہر نے بار بار کہا تھا۔ فلک کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس کی بھتیجی ہے۔ بیٹی کا سسرالی معاملہ ہے۔۔۔ اس نزاکت کو تو سمجھنا ہے نا۔" انہوں نے اسے جتلایا تھا۔

آمنہ آپی کا لحاظ ہی تو آڑے آجاتا تھا۔ کچھ شافیہ میں مروت بھی بہت تھی۔ پھر مہمان کی تکریم کا بھی احساس تھا۔ اس کی رہائش کا بندوبست ہو جاتا۔ آخر پہلے بھی تو ہاسٹل میں رہتی تھی۔

بچوں کے آنے تک کھانا تیار ہو چکا تھا۔ ہما آج زبردستی فینا کو بھی باہر لے گئی تھی۔ سو شافیہ نے بھی کھانا بنا کر خود پہ توجہ دینے کا سوچ لیا۔

اپنا امبرائڈڈ کاٹن کا سوٹ پہن کر اس نے خود کو خوشبو میں مہکایا۔ لائٹ سا میک اپ کیا اور باہر آگئی۔ امی بچوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ لاؤنج کا دروازہ کھلا تھا۔ ان کی نظریں گیٹ پہ ٹکی تھیں۔ باہر خاصی رات پھیل چکی تھی۔

شافیہ باہر آئی تو ڈھیروں خوشبو بھی ساتھ لائی۔ امی نے چونک کر گردن گھمائی تھی۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"ایک بات ہے شافی! تم سعادت مند بہت ہو۔ فوراً" عمل کرتی ہو۔" ان کا چہرہ کھل سا اٹھا تھا۔ "ایسے ہی رہا کرو۔ مہکتی' کھلتی' گلاب سی۔" انہوں نے جیسے اس کی نظروں ہی نظروں میں بلائیں لے ڈالی تھیں۔

"بس آپ کو اچھی لگتی ہوں۔" اس نے آہ بھر کر کہا تو امی چونک گئیں۔

"تو اور کسے اچھی لگنا چاہتی ہو؟"

"آپ کے بیٹے کو۔" وہ اپنے ہی دھیان میں تھی۔

اس لیے روانی میں کہہ گئی۔ امی نے چونک کر اسے دیکھا تھا پھر مسکرا دیں۔

"اچھی کیوں نہیں لگتیں اسے... اسے پیاری ہو تب ہی اس گھر میں دکھائی دے رہی ہو۔" انہوں نے ملائمت سے اسے سمجھایا تھا۔

"رہنے دیں امی! مجبوری بھی کوئی بلا ہوتی ہے۔" وہ چڑ کر گویا ہوتی تھی۔ امی اس کی بات پہ ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

معاً گیٹ پہ ہارن سنائی دیا تھا۔ شافیہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ جب وہ گیٹ بند کر کے اندر آئی تب تک سب لوگ گاڑی سے نکل کر اندر جا چکے تھے۔

بچے اسے دیکھ کر چلا اٹھے تھے۔

"مامی! آپ کہیں جا رہی ہیں؟" بچوں کا ماما بھی ٹھٹک گیا تھا اور آپا بھی... سب کی نظریں خود پہ جمی پا کر وہ جھنجلا گئی تھی۔

"میں نے کہاں جانا ہے؟ تم لوگوں کے لیے تیار ہوئی ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ تم لوگوں پہ خاص زور دیا گیا تھا۔ زوہیب ننھی فینا کو گدگداتا اس کے قریب آیا۔

"اتنے دن سے میلی کچیلی گھومنے کے بعد بالآخر تمہیں ان "بچہ لوگوں" کی خاطر سنورنے کا خیال آ ہی گیا۔ اس بات پہ بچوں تالیاں ہو جائیں۔" زوہیب نے بچوں کو جوش دلایا تو انہوں نے تالیاں بجائی تھیں۔

زوہیب فینا کو اس کی گود میں ڈال کر پیچھے ہٹا۔

"کیا خیال ہے بچو! میں بھی نہ میلا کچیلا رہنا شروع کر دوں؟ پھر جب اتنے دن بعد اچھا سا تیار ہوں گا تو میرے لیے بھی تالیاں بجیں گی؟" وہ صاف شافیہ کو تپاتا' امی کے قریب جا بیٹھا تھا۔ تب امی نے اسے دھپ لگائی تھی۔

"بے شرم! کبھی تو اس کی تعریف کر دیا کرو۔ ہر وقت فضول مذاق کرتے رہتے ہو۔"

"دیکھ لیں امی! کر دوں سب کے سامنے تعریف! پھر نہ کہیے گا۔ زوہیب! تو بڑا بے شرم اور بے حیا ہے۔ معصوم بچوں کا بھی خیال نہیں مہمان کا بھی خیال نہیں۔" وہ ٹھنک کر گویا ہوا تھا۔ امی نے اسے ایک اور دھپ لگائی تھی۔

"تو واقعی بڑا بے شرم ہے۔" امی نے ہنس کر کہا تھا۔ زوہیب نے گم صم کھڑی شافیہ کو مخاطب کیا۔ جو جانے کن سوچوں میں محو تھی اور جانے کون سے مسئلے حل کرنے کا سوچ رہی تھی۔

"یہ غور و فکر بعد میں فرمالینا علامہ صاحبہ! بچوں نے اسنیکس اور جوس کے علاوہ کچھ نہیں کھایا پیا۔ کھانا لگا دو ہم دونوں بھی ان کے ساتھ "فاقہ" فرما کے آرہے ہیں۔"

زوہیب کے جتانے پر شافیہ چونک کے کچن میں چلی گئی تھی۔ بچوں کے ساتھ ساتھ فلک کی واضح تھی کہ اسے آخری حد تک تپا چکی تھی۔

✲ ✲ ✲

گھڑیال نے رات کے گیارہ بجائے تو اس نے وہما اور زنیر کو دودھ کا گلاس دے کر معمول کے مطابق امی کو دوا کھلائی' ان کی ٹانگوں کی مالش کی۔ انہیں دودھ کا گلاس دیا اور جب تک وہ اونگھ نہیں گئی تھیں' تب تک شافیہ ان کی ٹانگیں دباتی رہی تھی۔ یہ اس کا پہلے دن سے معمول تھا۔ چاہے جتنی بھی تھکی ہوتی' جس قدر نیند آرہی ہوتی' وہ سب کام پس پشت ڈال کر امی کی ٹانگوں کی مالش کیا کرتی تھی۔ اس نے اپنی اماں تو دیکھی نہیں تھی — ان کو اپنی ماں سمجھ کر خدمت کرتی تھی۔

یہ کام وہ نہ دکھاوے کے لیے کرتی تھی۔ نہ زوہیب اور آمنہ کی خاطر۔ امی کی خدمت سے اسے سکون ملتا تھا۔

اور اب وہ کچن سمیٹ کر لائٹس آف کرتی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ فلک کا کمرہ بھی پیچھے تھا۔ اور کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ شاید اپنا دفتری کام کر رہی تھی۔

شافیہ سر جھٹک کر اندر آئی تو کمرہ بھاں بھاں کر رہا تھا۔ اس وقت وہ کہاں تھا؟ فینا کاٹ میں سو رہی تھی۔ وہ الٹے قدموں باہر آئی تھی۔ پھر اس نے لب بھینچ

کر فلک کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ آخری کونے میں سٹنگ روم تھا۔ وہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے ہی فلک اور زوہیب بیٹھے دکھائی دیے تھے۔ وہ دونوں کسی دفتری بات میں الجھے تھے اور ڈھیروں کاغذ پھیلا کر کام میں مصروف تھے۔

وہ الٹے قدموں سلگتی ہوئی باہر آگئی۔ کافی دیر ٹہل ٹہل کر اپنا غصہ کم کرنے کے بعد جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں آئی تو سامنے ہی زوہیب بیڈ پہ لیٹا دکھائی دیا تھا۔

شافیہ لب بھینچ کر بیڈ کی دوسری طرف آگئی تھی۔ جب وہ لیٹ چکی تب زوہیب نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"کہاں تھیں تم...؟"

"جہنم میں۔" جواب خاصا تپتا ہوا ملا تھا۔ زوہیب کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

"پھر جنت میں انٹری کیوں ماری؟" بڑی معصومیت سے سوال کیا گیا تھا۔

"میری مرضی۔" اس نے دھیمے سلگتے لہجے میں جواب دیا تھا۔ زوہیب کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چونکہ اس کی نیند کا وقت نکل چکا تھا اس لیے وہ جاگنے کے موڈ میں تھا۔ شافیہ نے جب اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تب اس نے بے ساختہ اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"شافی! سنو تو۔"

"کیا ہے؟" وہ جھنجلائی تھی۔ زوہیب اس کے کان پہ جھک آیا۔

"ایک بات بتانی تھی تمہیں..."

وہ ایک مرتبہ پھر اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ اور شافیہ کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ ایک تو اس بے مروت کی خاطر اتنی تیاری کی تھی۔ اوپر سے اس نے اتنی باتیں سنائیں، خوامخواہ فلک کے سامنے خفت اٹھانا پڑی تھی۔

"کون سی بات۔" وہ منہ ہی منہ میں بدبدائی تھی۔

"ایسے تھوڑی بتاؤں گا... ذرا ادھر منہ کرو۔" اس نے کندھا ہلا کر اس کی کروٹ بدلی تو شافیہ نے اپنے منہ پر کشن رکھ لیا تھا۔

"بتادیں بس... مجھے نیند آرہی ہے۔" شافیہ نے جھلا کر کہا تھا۔ اس کی "نیند" کا سن کر زوہیب تپ اٹھا تھا۔

"اللہ کرے ہمیشہ کی نیند سو جاؤ تم۔ سارا موڈ غارت کردیتی ہو۔"

شافیہ اس "بددعا" پہ تڑپ اٹھی تھی۔ ساری جھوٹی نیند ہوا ہو چکی تھی۔ اس کا صدمے کے مارے برا حال ہو گیا تھا۔

"آپ تو چاہتے ہی یہ ہیں۔ میں مرجاؤں اور آپ اپنی پسند کی دوسری لے آئیں۔" وہ صدمے کے زیر اثر بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ زوہیب نے ترچھی نظر سے اسے گھورا تھا۔

"دوسری لانے کے لیے تمہارا مرنا شرط نہیں ہے۔"

"یعنی کہ...؟" شافیہ کا دل صدمے سے چور ہو گیا۔

"یعنی کہ... میں تم پہ سوکن بھی لا سکتا ہوں۔" اس نے سینہ ٹھونک کر کہا تھا۔ یعنی نوبت یہاں تک آنے والی تھی؟ اس کی ناک تلے کون سا کھیل چل رہا تھا؟

"مجھے آپ کے کرتوتوں سے یہی نظر آرہا تھا۔" وہ رو پڑی تھی۔ زوہیب کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ ایک دم اور بھی تپا تھا۔

"احمق، بدھو، جاہل، ان پڑھ... کند ذہن عورت! کبھی تو بات سمجھ لیا کرو۔"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ اتنی بھی کند ذہن نہیں۔"

"اور ایسی توپ بھی نہیں ہو..." زوہیب نے طنزیہ کہا۔

"توپ تو بس ایک ہی ہے۔ ذہانت اور قابلیت کا مجسمہ۔" اس نے دھیمی سلگتی آواز میں اندر کی کھولن نکالی تھی۔ زوہیب خفگی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"وہاں تک مت جایا کرو شافیہ۔" وہ ڈپٹ کر بولا

تھا۔ اس کا لہجہ بھی دھیما ہو گیا تھا۔ اس نے کراؤن سے دوبارہ ٹیک لگالی تھی۔ اب کے موڈ تھوڑا تبدیل شدہ تھا۔ وہ شافیہ پہ غور و فکر فرما رہا تھا۔

"ویسے ایک بات بتانی تھی تمہیں ... اب موڈ خراب کر دیا ہے... بس اتنا بتا دو اگر لوگوں کے لیے اتنا بیر بھوٹی بنی تھیں تو اب تک لباس فاخرہ بدلا کیوں نہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ تاہم اس کے لہجے میں واضح شرارت تھی۔

شافیہ نے ترچھی نظر سے اسے گھورنا چاہا تھا مگر اس کی ہنسی نکل گئی تھی۔ زوہیب کے تاثرات ہی کچھ ایسے تھے۔ وہ خود بھی ہنس پڑا تھا اور کمرے کی فضا سے سابقہ گھٹن بڑے دنوں بعد رینگتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ دونوں کے درمیان جو اجنبیت کی دیوار آ رہی تھی۔ وہ خود بخود گرتی چلی گئی تھی۔

باہر گیلی رات کا فسوں پھیل رہا تھا۔ اور اندر نرم ملائم چاندنی سی چٹک رہی تھی۔

ایک مہکتا خوب صورت احساس بکھر رہا تھا۔

اپنائیت اور چاہت کی پر فضا مہک کو پا کر بھی شافیہ اس بات کا اظہار نہیں کر سکی تھی کہ وہ لوگوں کے لیے نہیں صرف زوہیب کے لیے تیار ہوئی ہے۔

رویے اظہار کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور یہاں شافیہ عموماً "کنجوسی" دکھا جاتی تھی۔ اور یہ ٹھیک نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ساون کے مہینے اسے بھاتے نہیں تھے۔

جیسے ہی ساون کی جھڑی لگتی تھی ہر سو، ہر چیز سیلی ہوئی دکھائی دیتی، اوپر سے زوہیب کی فرمائشیں عاجز کر دیتی تھیں۔

کبھی اسے پھلورے، چنے کھانے ہوتے، کبھی پورے، کبھی مٹھیاں۔ سب محنت طلب پکوان تھے۔ شافیہ کا پورا پورا دن کچن میں نکل جاتا تھا۔

اور جب وہ میٹھے پکوان بنا کر باہر نکلتی تب امی کی دہائیاں اسے الٹے قدموں کچن کی طرف دوڑاتی تھیں۔

"بہو ہو تو بہو بن کر دکھاؤ گی۔ میرا ذرا بھی خیال نہیں... میٹھا نہیں کھا سکتی۔ نمکین تو کھا سکتی ہوں۔ اتنا نہیں ہو سکا۔ نمک پارے بنا لیتیں۔ پکوڑے تل لیتیں۔ بیسن کی ٹکیہ بنا دیتیں۔"

امی کا فرمائشی پروگرام کیا شروع ہوتا، بچے بھی بھوک بھوک چلاتے پہنچ جاتے تھے۔ ان کے لیے منچورین بنتا تو فلک اور زوہیب بھی تب تک دفتر سے آجاتے۔

وہ بھی برسات کی ایک شام تھی۔

شافیہ نے عصر کے وقت مشین لگا کر کپڑے دھوئے تھے، اسی وقت رم جھم بوندیں گرنے لگیں۔ جیسے تیسے وہ کپڑے سمیٹ کر نیچے آئی تو امی نے بھوک بھوک چلانا شروع کر دیا تھا۔ شوگر کی وجہ سے انہیں وقت بے وقت بھوک لگ جاتی تھی۔ اس نے پکوڑے بنانے کے لیے آمیزہ تیار کیا تو ہما اور زنیر نے میکرونی کی فرمائش کر دی تھی۔

پہلے امی کو پکوڑے تل کر دیے تھے۔ پھر بچوں کو میکرونی بنا کر دی تھی تب ہی فہنا کا بینڈ بجنے لگا۔ آج شاید اس کے پیٹ میں درد تھا۔ اس کی ایک آنکھ بھی سوجی ہوئی تھی۔ شاید کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ برسات میں پتنگے بھی تو بہت نکلتے تھے۔ اسے پیٹ کے درد کی دوائی دی تھی۔ اس کے باوجود فہنا کا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔

امی کو کہنا ہی پڑا۔

"اسے آدم کے پاس لے جاؤ۔ اس کی آنکھ میں درد ہے۔" وہ فہنا کو ہلکان ہوتے کب سے دیکھ رہی تھیں۔

"اکیلی جاؤں؟" وہ منمنا کر رہ گئی تھی۔

"یہ کارنر تک جانا ہے۔" امی نے خفگی سے کہا تھا۔

"زنیر کو ساتھ لے جاؤ۔ زوہیب کے آنے تک تو بچی ہلکان ہو جائے گی۔" اسے جانا ہی پڑا تھا۔ زنیر اس کے ساتھ تھا۔

ڈاکٹر آدم بیزار نے سارے "بیزار مریضوں" کو

چھوڑ کر فینا کا چیک اپ کیا تھا۔ اس کی آنکھ میں انفیکشن تھا۔ ٹریٹ منٹ کے بعد ایسے پر سکون ہو کر سوئی کہ پھر جاگی نہیں۔

آدم بھی ساری خوش اخلاقی ان کی فیملی پہ نچھاور کر دیتا تھا۔ اب بھی امی اور زوہیب کا حال احوال پوچھنے لگا۔ "وہ بے وفا نظر نہیں آتا۔" آدم کا اشارہ زوہیب کی طرف تھا۔

"وہ بے وفا ہمیں نظر نہیں آتا۔ آپ کو کہاں سے آئے گا۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ پھر آدم نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا تھا۔

"آپ کے گھر مہمان آئے ہیں بھابھی!" اس کے لہجے میں کچھ تجسس سا تھا یا شاید پھر شافیہ کو ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"ہاں۔۔۔ جی بچے آئے ہیں۔ آمنہ آپی کے۔"

"اور۔۔۔؟" آدم کے اور میں خاصی بے تابی تھی۔ شافیہ نے سادگی سے بتایا تھا۔

"اور آپی کے شوہر کی بھتیجی۔۔۔ اس کی یہاں جاب ہے۔" فلک کے ذکر پہ اس کا اندر سلگ گیا تھا۔

"آپ کے ہاں قیام ہے کیا۔۔۔؟"

"جی ہاں۔" وہ فینا کو کندھے سے لگا کر اٹھنے لگی تھی۔ آدم نے بھی اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"رات کو میں فینا کو چیک کرنے آؤں گا۔"

"بہت شکریہ۔" شافیہ کا انداز متشکرانہ ہو گیا۔ جب وہ اور زنیر دوائی لے کر گھر پہنچے تھے تب تک فلک اور زوہیب بھی گھر آچکے تھے۔

وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ زوہیب کا منہ پھولا ہوا تھا۔ شافیہ کو پتا تھا زوہیب کا موڈ وقت پہ کھانا نہ ملنے پہ آف ہو جاتا تھا۔ وہ کچن میں جانے لگی تھی تب وہ تپ کر بول اٹھا تھا۔

"اب رہنے دو کیا ضرورت ہے میرے لیے تردد کرنے کی۔ صبح بھی ناشتے کے بغیر گیا تھا۔ لنچ کا بھی ٹائم نہیں ملا اور اب خالی برتن منہ چڑا رہے تھے۔" زوہیب کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

"جانے تم گھر میں فارغ رہ کر کرتی کیا ہو۔" اسے طنز کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ شافیہ لب بھینچ کر کچن میں گھس گئی۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا اپنے فارغ رہنے کی پوری تفصیل اسے سنا دیتی کہ ایک لمحہ بھی آرام کے لیے نہیں ملتا تھا۔

"دوسری عورتوں کو دیکھو وہ کماتی بھی ہیں اور گھر بھی سنبھالتی ہیں۔" فلک کے سامنے اس بے عزتی پہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ فلک بہت انجوائے کر رہی تھی۔

"اور تم سے وقت پہ کھانا تک نہیں بنتا۔" زوہیب کا بھونپو بجتا جا رہا تھا۔ شافیہ لب بھینچ کر چکن فرائی کرنے لگی۔ مسالہ تو تیار تھا۔ بس چکن ڈال کر بھوننا اور دم دینا تھا۔ دوسرے چولہے پہ اس نے توا رکھ کر چپاتیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔

باہر ابھی تک زوہیب کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ پھر وہ اپنا دفتری بیگ اٹھا کر سٹنگ روم میں چلا گیا تھا۔ امی بھی بڑبڑا رہی تھیں۔

"شافیہ پتا نہیں کرتی کیا ہے۔ اتنا نہیں ہوتا۔ زوہیب کے آنے سے پہلے کھانا بنا لے۔ پتا بھی ہے' وہ باہر کا کھانا نہیں کھاتا۔ پھر فلک بھی موجود ہے۔ کم از کم مہمان کا خیال ہی کر لے۔" فلک ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اپنا ہاتھ ان کے گھٹنے پہ رکھ کر بولی۔

"آنٹی! میں مہمان تھوڑی ہوں۔ میرا اپنا گھر ہے۔ آپ میرے لیے گلٹی فیل نہ کریں۔ میں تو خود پکا کر کھا سکتی ہوں۔" فلک کے میٹھے لہجے پہ امی نہال ہو گئی تھیں۔

"تمہارا اپنا گھر ہے بیٹا! جو دل کرے کھایا پکایا کرو۔"

"تو پھر کل سے میں ناشتہ بنا لیا کروں گی۔" فلک نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ امی نے سر ہلا دیا۔ مبادا فلک کو برا نہ لگ جائے کہ اسے گھر کا فرد نہیں سمجھتے۔ ویسے بھی صبح شافیہ بمشکل سے نیند قربان کر کے اٹھتی تھی۔ رات بھر فینا جگائے رکھتی۔ اکثر زوہیب صرف شیک وغیرہ پی کر چلا جاتا تھا۔ پھر شافیہ امی کو ناشتہ دے کر آدھا گھنٹہ ضرور سوتی تھی۔ ورنہ سر کا درد ہی نہ

جاتا۔ ان دنوں ہما' زنیر کی وجہ سے روٹین ڈسٹرب تھی۔

جب شافیہ نے روٹیاں بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دیں۔ کڑاہی کو دم دے دیا۔ تب ہی فلک کچن میں آئی تھی۔ اس نے آنا" فانا" ہاٹ پاٹ اٹھایا۔ چکن کو ڈش میں ڈالا' فریج سے سلاد نکالا اور برتن ٹرے میں رکھ کر پانچ منٹ میں کھانا چُن دیا۔

وہ کھانا سٹنگ روم میں لگا آئی تھی۔

شافیہ کی شروع سے عادت تھی۔ وہ کھانا بنا کر پہلے سارا کچن سمیٹتی تھی پھر کھانا لگاتی اور سب مل کر کھاتے تھے۔ وہ کچن کے پھیلاوے کو جب تک ٹھکانے نہ لگا لیتی اسے بے چینی لگی رہتی تھی۔

وہ اب بھی سارے جھوٹے برتن دھو کر' کچن صاف کر کے سٹنگ روم میں آئی تو سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ محض جھوٹے برتن منہ چڑا رہے تھے اور یہ ڈیڑھ سال میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ شافیہ کا انتظار کیے بغیر ہی کھانا کھا لیا گیا۔

شافیہ کو ایک دم دھچکا لگا تھا۔ اس کے قدم آگے بڑھ ہی نہ سکے۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی رہ گئی تھی۔ اندر سے خوشگوار ماحول میں بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"تم نے کڑاہی بہت اچھی بنائی تھی فلک... تمہارے ہاتھ میں بہت ٹیسٹ ہے۔" یہ زوہیب کی آواز تھی۔

جواباً" فلک نے مسکرا کر تعریف وصول کی تھی۔ کہا کچھ بھی نہیں... تردید بھی نہیں کی اور زوہیب کیا شافیہ کے ہاتھ کا ذائقہ بھی بھول گیا تھا۔؟ اسے پتا نہیں چلا تھا کہ کھانا شافیہ نے بنایا ہے فلک نے نہیں؟ دل چاہ رہا تھا ابھی کے ابھی وہ اندر جا کر بھانڈا پھوڑ دے۔ مگر وہ ایسی بدلحاظ ہرگز نہیں تھی۔

"ویسے فلک آپا! آپ کے ہاتھ میں ماما جیسا ٹیسٹ ہے۔" یہ ہما تھی شافیہ رک سی گئی۔ اسے ہما پہ ٹوٹ کے پیار آ گیا تھا۔ زوہیب سے اچھی تو ہما تھی۔ کم از کم پہچان تو رکھتی تھی۔

"کہیں اس نے تمہاری ماما کا ٹیسٹ تو نہیں چُرا لیا۔" زوہیب نے شرارتاً" ہما سے پوچھا تھا۔

"بچ کے رہنا فلک! شافیہ کی کوئی چیز بھی چراؤ گی تو وہ بہت برا پیش آئے گی۔" اب وہ فلک کو ڈرا رہا تھا۔

فلک اس کی شرارت سمجھ کر ہنس دی تھی۔

"میں ڈر کے میدان چھوڑ کر بھاگنے والی نہیں ہوں۔" فلک کی آواز آئی تھی۔ درپردہ وہ شافیہ یہ کیا جتا رہی تھی؟ شافیہ جیسے سُن سی ہو گئی تھی۔ فلک کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا؟ یقین' اعتماد' استحکام۔ کچھ کر دکھانے کے ارادے۔

اس کے اردگرد خدشات پھن پھیلا رہے تھے۔ آگے کیا ہونے والا تھا؟

☼ ☼ ☼

اگلی صبح بھی بارش کی بوندوں کے ساتھ طلوع ہوئی تھی۔

رات سے فینا کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اسے بخار نے گھیر لیا۔ ساری رات وہ وقفے وقفے سے روتی رہی تھی۔

فینا کا بھونپو زوہیب کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ کمرے میں روشنی کی وجہ سے اسے ویسے بھی نیند نہیں آتی تھی۔ اوپر سے فینا کا رونا۔

"اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے! چپ کیوں نہیں ہوتی۔ مجھے سونا' مرنا ہے۔" زوہیب بلاوجہ شافیہ پہ چڑھ دوڑا تھا۔ وہ جو فینا کو کندھے سے لگا کر تھپک تھپک کے سلا رہی تھی۔ ایک دم غصے میں آ گئی۔

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ جو اس کا مسئلہ بیان کر سکوں۔ بخار کی وجہ سے رو رہی ہے۔" شافیہ نے غصے میں جواب دیا تھا۔

"تو کوئی میڈیسن دو۔ اس کے مسئلے تو ختم نہیں ہوتے۔ کبھی آنکھ میں درد' کبھی پیٹ میں درد۔" وہ چڑتے ہوئے بولا تھا۔ شافیہ کی تیوری پہ بل آ گئے تھے۔

"بچوں کے ساتھ یہ تکلیفیں لگی رہتی ہیں۔ بچے بیمار ہوتے رہتے ہیں۔ بجائے بچی کی تکلیف سمجھنے

کے 'اس کا حال پوچھنے کے آپ اپنی نیند کے لیے ہلکان ہو رہے ہیں۔ جانے آپ کیسے باپ ہیں۔" شافیہ کو غصے کے ساتھ ساتھ بے طرح دکھ نے بھی گھیر لیا تھا۔

"یعنی میں بہت برا باپ ہوں؟" زوہیب کو پوری بات میں بس یہی قابل اعتراض پوائنٹ ملا تھا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے۔" شافیہ چڑ گئی تھی۔

"تمہاری بات کا مطلب تو یہی ہے۔ میں برا باپ ہوں۔ آج یہ کہہ رہی ہو۔ کل یہ کہنا' میں برا شوہر ہوں۔" وہ تڑختا چلا گیا تھا۔ شافیہ کا پہلے سے دکھتا سر کچھ اور دکھنے لگا۔

"زوہیب! آخر آپ کو کیا ہو رہا ہے۔" وہ فینا کو تھپکتے تھپکتے تھک گئی تھی۔ زوہیب نے تکیہ اٹھایا اور منہ پر رکھ لیا تھا۔

"صبح کام کرنا ہے دفتر میں۔ رات بھر نیند پوری نہیں ہوتی۔ تمہیں کمانا پڑے تو پتا چلے۔" زوہیب نے تکیے کے نیچے سے جواب دیا تھا۔ آج کل وہ بات بے بات اسے یہی طعنہ مار رہا تھا کہ اسے کمانا پڑتا تو پتا چلتا۔ وہ گھر میں فارغ' ویلی نکمی روٹیاں توڑتی ہے۔ وہ بھی عورتیں ہیں جو سارا دن مردوں کے شانہ بشانہ کماتی بھی ہیں۔ گھر بھی سلیقے سے چلاتی ہیں۔ بچے بھی پالتی ہیں۔ سسرالیوں کے ساتھ بھی اچھے مراسم رکھتی ہیں۔ جانے وہ مثالی عورتیں کہاں تھیں؟

"میں بھی کوئی فارغ نہیں رہتی۔ پورا دن ڈنگروں کی طرح کام کرتی ہوں۔ یہاں دس نوکرانیاں بھی اتنا کام نہ کر سکیں۔" شافیہ کو بھی بالآخر جتانا پڑا تھا۔

"بہت ناشکری عورت ہو تم! گھر میں بیٹھے سب کچھ مل رہا ہے تب ہی زبان گز بھر لمبی ہے۔ ان بے چاری عورتوں سے پوچھو' جو صبح صبح دھکے کھاتی' روزی کی تلاش میں دن بھر ذلیل ہوتی ہیں۔ گھر بھی چلاتی ہیں۔ بچے بھی پالتی ہیں۔"

اور یہ تب سے ہو رہا تھا جب سے فلک یہاں آئی تھی۔

"آپ خوامخواہ جھگڑا طویل کر رہے ہیں۔" شافیہ اب یہ فضول سی چخ چخ ختم کرنا چاہتی تھی۔

"اب تم مجھے جھگڑالو کہو گی۔" زوہیب ان دنوں الٹی گنگا میں بہہ رہا تھا۔ ہر سیدھی بات بھی اسے الٹی لگتی تھی۔

"اف' میرے خدا! کہاں پھنس گئی ہوں۔" شافیہ کا مارے جھنجلاہٹ کے برا حال ہو گیا تھا اور ادھر زوہیب کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس نے تکیہ ہٹا کر شافیہ کو دیکھا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟ پھنس گئی ہو؟ میرے گھر کے قفس میں؟ یعنی میرا گھر تمہارے لیے قید خانہ ہے؟ اور تم یہاں ایک مظلوم کنیز کی طرح رہ رہی ہو؟" زوہیب اس کی جھنجلاہٹ کو اپنے من پسند معنی پہنا کر پھٹ پڑا تھا۔ شافیہ نے اپنا سر ہی تھام لیا۔

"میں نے یہ سب نہیں کہا۔" شافیہ جھنجلا کر تڑخی تھی۔

"تم بھلا کیا کہہ سکتی ہو کند ذہن عورت! کاش تم میں عقل ہوتی۔ ذہن ہوتا' دماغ ہوتا۔" اب زوہیب نے نیا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں اسے شافیہ بہت کند ذہن' کم عقل اور احمق نظر آتی تھی۔ بات بے بات اسے کند ذہنی کے طعنے دیتا تھا۔ خاص طور پر فلک کے سامنے اور وہ اپنی ذہانت سے بھرپور آنکھوں سے حظ اٹھاتی تھی۔ مسکراتی تھی اور شافیہ کو متبسم اور شرارتی انداز میں دیکھ کر زچ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

پھر رات ایسے ہی بحث و تکرار میں گزر گئی تھی۔ فجر کے قریب شافیہ کی آنکھ لگی۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو بارش رک چکی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔

زوہیب گو کہ پراٹھے وغیرہ کا ہیوی ناشتہ نہیں کرتا تھا پھر بھی ٹوسٹ' آملیٹ کچھ نہ کچھ ہلکا پھلکا ضرور کھاتا تھا۔ شافیہ کو افسوس ہوا۔ کیا زوہیب بغیر کچھ کھائے پیے دفتر چلا گیا تھا؟

وہ جلدی سے لاؤنج میں آئی تو میز پہ ناشتے کی باقیات رکھی تھیں۔ چائے کے برتن تھے۔ شاید فریچ ٹوسٹ بنائے تھے۔ ملک شیک بھی بنا ہوا تھا۔ زوہیب تیار

شیار ناشتہ کر چکا تھا۔ اب صوفے پہ بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ فلک شاید تیار ہونے اپنے کمرے میں گئی تھی۔

شافیہ کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ زوہیب اخبار دیکھتا فلک کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دونوں اکٹھے ہی دفتر جاتے تھے۔ شافیہ پہ نظر پڑی تب بھی وہ بے نیاز ہی رہا تھا۔ اور شافیہ جانتی تھی وہ ناشتہ کر چکا ہے۔ پھر بھی محض اسے مخاطب کرنے کے لیے پوچھا تھا۔

"زوہیب! ناشتہ لاؤں؟"

اس کی آواز پہ زوہیب ایسے چونکا جیسے یہ آواز قطعی طور پہ غیر متوقع سنائی دی تھی۔

"کیا تمہاری قریب کی نظر کمزور ہے؟ میں ناشتہ کر چکا ہوں۔ تم اپنی نیند پوری فرمالو۔" زوہیب کا انداز خاصا خفا خفا تھا۔ شافیہ لب بھینچ کر کھڑی رہ گئی تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"آج معمول سے ہٹ کر ناشتہ کیا ہے؟" اس کا اشارہ فرنچ ٹوسٹ کی طرف تھا۔ زوہیب کو اس کا انداز طنزیہ لگا تھا۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"کوئی معمول سے ہٹ کر پیار سے ناشتہ بنا کر دے گا تو کھا لینے میں کوئی قباحت ہے کیا؟" اس کا لہجہ بلا کا چبھتا ہوا تھا۔ شافیہ کے سر پہ جا لگی تھی۔ اس کے اندر دھواں سا بھرنے لگا۔

"پیار سے؟" اس نے دھیمی سلگتی آواز میں پوچھا تھا۔ زوہیب اس کا کاٹ دار لہجہ نظر انداز کر گیا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"کم از کم تمہیں مہمان کا احساس کر لینا چاہیے۔ اور اپنے فرائض پہ بھی نظر ثانی فرمالینی چاہیے۔ مجھے ناشتہ دینا فلک کی ذمہ داری نہیں۔"

اس کی آنکھوں اور لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ جو شافیہ کو ذرا شرمندہ کر گیا۔ زوہیب اس سے خفا تھا۔ بالکل غیر متوقع اس نے آگے بڑھتے زوہیب کا ہاتھ اچانک پکڑ لیا تھا۔ زوہیب کچھ پل کے لیے رک سا گیا تھا۔

اچانک ہی اس کے تاثرات بدل گئے تھے اور آنکھوں میں خفگی اور سختی کی جگہ نرمی اتر آئی تھی۔

"کیا ہے؟" زوہیب کا لہجہ ملائم تھا۔ تب شافیہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے نم آواز میں پوچھا۔

"مجھ سے خفا کیوں ہیں آپ زوہیب!" اس ادا پہ زوہیب گرتے گرتے بچا تھا۔ شافیہ کبھی اس کی خفگی کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ وہ خود ہی خفا ہو کر مان جاتا تھا۔ آج کچھ انوکھا ہوا تھا۔

"خفا تو میں ہوں۔" زوہیب نے بھی مٹی گیلی اور نرم دیکھ کر سانچے بدل لیے تھے۔ اب جا کے تو وہ اس انداز میں ہاتھ لگی تھی۔ اس کی خفگی اور ناراضی کی پروا کرتی ہوئی۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کیوں؟" شافیہ نے جھنجلا کر کہا۔

"تم مجھے نظر انداز کرتی ہو۔" وہ کہنا چاہتا تھا مگر رک سا گیا۔ پیچھے شاید فلک کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے بالکل الگ اور غیر متوقع بات کی تھی۔

"تم مجھے کچھ ٹیڑھی میڑھی لگتی ہو اس لیے۔" اس نے شرارت اپنے اندر دبا کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ شافیہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ تو کیا نوبت یہاں تک آ گئی تھی؟ وہ زوہیب کو ٹیڑھی میڑھی لگنے لگی تھی؟

"ارے یار! ہاتھ تو چھوڑو۔ صبح صبح رومینس خیر تو ہے۔" زوہیب نے اس کی طرف جھک کر بڑے مزے سے کہا تھا۔ وہ خفیف ہو کر قدرے دور ہٹ گئی تھی۔

"اب میں نے یہ بھی نہیں کہا۔ تم دس میل دور کھڑی ہو جاؤ۔" وہ اس کے قریب آ گیا تھا۔ پھر اس نے شافیہ کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"تم آج کل اتنا کباب کیوں ہو رہی ہو؟ ارے میں نہیں تمہارے ہاتھوں سے نکلنے والا۔" زوہیب نے ایک آنکھ دبا کر شرارت کی تھی۔ شافیہ مسکرا بھی نہ سکی۔

"بھلا تمہارے جیسے مردوں کا کیا بھروسا۔ جب لکشمی خود چل کر پاس آئے تو کون کافر نگاہ چراتا ہے؟" شافیہ کو میز پہ رکھے لوازمات کی باقیات اپنا منہ چڑاتی نظر آ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں ساون ماند پڑ گیا تھا۔ بارشیں رک چکی تھیں۔ دھوپ چڑھتی اور پورا دن سورج آگ اگلتا تھا۔

گرمی کا زور ایک مرتبہ پھر بڑھ گیا تھا۔

ان دنوں امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ شافیہ ہروقت ان کی نظر کے سامنے رہے۔ اوپر سے گھر کی ذمہ داری بھی تھی۔ آمنہ کو عمرہ کرکے واپس آنا تھا۔ تب تک زنیرا اور ہما یہیں تھے۔

اس دن کے بعد ناشتے کی ذمہ داری خود بخود فلک نے اٹھالی تھی۔ اور یہ ذمہ داری شافیہ کو بہت بھاری پڑی تھی۔ اس کے بار بار منع کرنے کے باوجود فلک علی الصبح کچن میں جلوہ افروز ہو جاتی تھی۔ گو کہ وہ صرف اپنا اور زوہیب کا ناشتہ بناتی تھی، تاہم پھیلاوا اتنا ہوتا جیسے دس بندوں کا ناشتہ بنا ہو۔

برتنوں کا انبار لگ جاتا تھا۔ بس ملک شیک، چائے اور سلائس، آملیٹ، فرنچ ٹوسٹ بنانے کے چکر میں سنک برتنوں سے بھر دیتی تھی۔

امی چونکہ ان دنوں بیمار تھیں، اس لیے وہیل چیئر پہ بیٹھ کر سارے گھر کا جائزہ لینے سے قاصر تھیں۔ اگر ان کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ فلک ان کے کچن کو اتنے "پھوہڑ پن" سے استعمال کر رہی ہے۔ تو انہوں نے بغیر لحاظ کیے اسے باہر کی راہ دکھا دینی تھی۔ اس معاملے میں وہ بد لحاظی کی حد تک صاف گو تھیں۔

گندگی، بد سلیقگی اور پھوہڑ پن ان کی برداشت سے باہر تھا۔

وہ تو ایسی خاتون تھیں جو کچن میں کام کے دوران ایک ایک چیز کو ٹھکانے پہ رکھتی جاتی تھیں۔ شافیہ میں ایسا ہی سلیقہ تھا اور فلک ان دونوں کے برعکس تھی۔ بلاشبہ کھانا وہ لاجواب بناتی تھی۔ تاہم پھیلاوا پھیلانے میں بھی لاجواب تھی۔

صبح جب وہ ناشتہ بنا کر بن ٹھن کے زوہیب صاحب کی ہمراہی میں دفتر روانہ ہوتی تب شافیہ کو ڈیڑھ گھنٹہ لگتا تھا کچن سمیٹنے میں۔ اس کے بعد وہ اپنا اور امی، بچوں کا ناشتہ بناتی تھی۔

اس صبح بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ فلک جیسے ہی ٹرے اٹھا کر باہر نکلی شافیہ اندر آتی دکھائی دی تھی۔ اس نے رستے میں ہی فلک کو روک لیا تھا۔

"دیکھیں فلک! آپ مہمان ہیں زحمت مت کیا کریں۔ زوہیب کو بھی برا لگتا ہے۔ میں اٹھتی ہوں تو آپ ناشتہ بنا چکی ہوتی ہیں۔" اس نے بڑی شائستگی سے کہا تھا۔

"زحمت کیسی؟ میں فارغ ہوتی ہوں اور جلدی اٹھ جاتی ہوں۔ ویسے زوہیب کو کیا برا لگتا ہے؟" فلک نے ایک بھوں اچکا کر پوچھا تھا۔

"آپ کا ناشتہ بنانا۔" شافیہ صاف گوئی سے بولی تھی۔ فلک کے چہرے کا واضح طور پر رنگ بدل گیا تھا۔

"لیکن اس نے تو مجھے کبھی نہیں کہا۔" وہ بمشکل گڑبڑا کر اپنا اعتماد بحال کر سکی تھی۔

"آپ کو کیوں کہیں گے؟ وہ مجھے کہتے ہیں۔ میں خود ناشتہ بنایا کروں۔ آفٹر آل میں ان کی بیوی ہوں۔" شافیہ نے صاف لفظوں میں اسے اپنے اور زوہیب کے رشتے کا احساس دلایا تھا۔ جسے وہ جان کر نظر انداز کرتی تھی۔ "اور آپ مہمان ہیں۔ مہمانوں کو تکلیف دینا ہمارے ہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔" اس نے مزید ٹکڑا لگایا۔ مہمان پر زور دیتے ہوئے اس نے فلک کو اس کی حیثیت یاد دلائی تھی۔

"تکلیف کیسی؟ میں اپنی خوشی سے کرتی ہوں۔" فلک کو بھی لاجواب کرنا آتا تھا۔

"آپ کی خوشی کیا ناشتے تک ہی محدود ہے؟ کبھی ڈنر وغیرہ بھی بنالیا کریں۔" شافیہ کا دل چاہا کہہ ڈالے۔ پھر لحاظ آڑے آگیا تھا۔

"زوہیب تو ہر روز جوس اور شیک کی ڈائٹ لے کر آفس جاتا تھا۔ میں نے اس کی ڈائٹ کو چینج کر دیا ہے۔ وہ لنچ نہیں لیتا۔ خود کو فٹ محسوس کرتا ہے۔ مجھے تھینکس کہہ رہا تھا۔" اب وہ اتراتے ہوئے اپنی قابلیت ظاہر کر رہی تھی۔ شافیہ اندر تک سلگ گئی۔

"اسے میرے ہاتھ کا ناشتہ پسند ہے۔" فلک نے نخوت سے اسے جتلایا۔ "اسی لیے تم سے اب ناشتہ نہیں بنواتا۔" وہ اب بھی اترا رہی تھی۔ شافیہ کے اندر تپش بڑھنے لگی۔

"ان کا معدہ ہے کوئی کنواں نہیں۔ جو وہ دہرے ناشتے کا بار اٹھا سکے۔ آپ زحمت کر لیتی ہیں تو پھر مجھے زحمت دینا' زوہیب کو پسند نہیں۔" شافیہ نے بڑے سلیقے سے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ اندر سے وہ بہت تپی ہو گی۔ تاہم بظاہر مسکرا کر چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

صحن میں پھیلی دھوپ سے نگاہ چرا کر اس نے سبزی والے سے ٹوکری بھر کے سبزی لی تو کار نر والی کوٹھی سے آدم بھائی باہر نکلتے اور اسی طرف آتے دکھائی دیے تھے۔

شافیہ نے سبزی والے کو روک لیا۔

"لگتا ہے آدم بھائی کو سبزی لینی ہے۔" وہ آدم کے ہاتھ میں ٹوکری دیکھ چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں آدم ان تک پہنچ گیا تھا۔ وہ سبزی والے کو سخت ڈانٹ رہا تھا۔ جو آواز لگا کر آگے بھاگ آیا تھا۔ سبزی والا پرانا جاننے والا تھا۔ ڈانٹ پہ دانت نکوستا رہا۔۔۔ پھر مسکرا کر آدم کے قریب ہوا۔ کافی دیر اسے دیکھنے کے بعد۔ غور کرنے کے بعد پھر جب آدم نے سبزی خرید لی اور والٹ نکال کر پیسے دینے لگا تب سبزی والے نے گہرے یارانہ انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر جی! تسی ہن ویاہ کر ہی لو۔ کدوں تک آپوں سبزی خریدو گے؟"

آدم نے اس کی بات سمجھ کر شافیہ پہ نگاہ ڈالی۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ اور دلچسپی سے اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"اپنی باجی سے کہو' میرے لیے لڑکی دیکھیں۔"

"باجی نے شادی دفتر تے نئیں کھولا ہوا؟" سبزی والے کو کھد بد سی ہوئی۔ آدم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"نہیں یار۔" آدم نے اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

"پر میں کہاں سے ڈھونڈوں گی؟ آپ کو پتا تو ہے۔ میں کہیں آتی جاتی نہیں۔" شافیہ نے گڑبڑا کر جواب دیا تھا۔

"حد ہے بھابھی! واقعی آپ کی قریب کی نظر کمزور ہے۔ آپ آئیے گا کلینک' چیک اپ کروں گا۔" آدم نے چڑ کر کہا۔

"مطلب۔۔۔؟"

"لڑکی آپ کے بغل میں موجود ہے۔ اسے تلاشنے کی ضرورت نہیں۔" اب کہ آدم نے مسکرا کر اشارہ کیا تو شافیہ ہکا بکا رہ گئی۔

"آپ فلک کی بات کر رہے ہیں؟" اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"سو فیصد۔" وہ اور بھی مسکرایا۔

"اچھا۔۔۔!" شافیہ کا اچھا ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا تھا۔

"آپ فلک کے لیے سیریس ہیں؟" اس کا سوال احمقانہ سا تھا۔ آدم چڑ گیا۔

"سیریس ہوں۔ تب ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ فلک کی رائے معلوم کر لیں۔ باقی معاملہ تو آنٹی کے سپرد ہے۔" اس نے زوہیب کی امی کا نام لیا تھا۔ شافیہ سر ہلا کر اندر چلی گئی تھی۔ پوری رات وہ اسی پہ غور کرتی رہی۔

کیا وہ زوہیب سے بات کرے؟

"اوں ہوں' ہرگز نہیں۔" اس نے پہلے خیال کو خود ہی مسترد کر دیا تھا۔ فلک' زوہیب کی پہلی پہلی محبوبہ رہ چکی تھی۔ کیا خبر وہ کوئی رکاوٹ کھڑی کر دیتا۔

کیا فلک سے؟

"اوں ہوں۔" اس نے دوسرے خیال کو بھی مسترد کر دیا۔ بھلا فلک کہاں مانے گی۔ وہ تو زوہیب کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔

پھر کس سے بات کرنی چاہیے؟ امی سے؟ ہوں' یہ ٹھیک ہے۔

اس نے پوری رات کروٹیں بدلنے میں گزاری

تھی۔ پھر صبح اٹھتے ہی امی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ نماز ادا کر کے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

شافیہ کو دیکھا تو اشارے سے پاس بٹھالیا۔ پھر فارغ ہو کر اس پہ پھونک ماری اور زوہیب کا پوچھا۔

"سو رہے ہیں۔" اس نے اشارے سے بتایا تھا۔

"اور فبنا۔"

"وہ بھی۔" شافیہ انگلیاں چٹخاتی خاصی مضطرب تھی۔ امی نے تسبیح مکمل کر کے رکھ دی تھی۔ اب اس کی طرف متوجہ تھیں۔ شافیہ نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

"امی! آدم بھائی ملے تھے گیٹ کے باہر... سبزی لے رہے تھے۔ انہوں نے فلک کا ذکر کیا تھا۔" امی کو پوری تفصیل بتا کر اب وہ ان کی رائے جاننا چاہ رہی تھی۔ امی کا انداز بھی پر سوچ ہو گیا تھا۔ انہیں یہ بات پسند آئی تھی۔

"میرے ذہن میں بھی یہ خیال آچکا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ آدم کا گھر بن جائے گا اور فلک بھی کھونٹے سے لگے گی۔ شتر بے مہار پھر رہی ہے۔" امی نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"تو پھر آپ فلک سے بات کریں نا۔" شافیہ بہت بے تاب نظر آرہی تھی۔

"میں اس سے بات کرتی ہوں۔" امی نے ہامی بھرلی تھی۔ اور شافیہ کے سر سے ایک نادیدہ بوجھ کھسک گیا تھا۔ فلک نام کا "ہوا" سر سے اترنے والا تھا۔ لیکن یہ شافیہ کی خام خیالی ہی تھی۔

ہوا کچھ یوں۔

☆ ☆ ☆
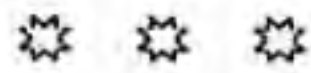
فلک کو یہاں آئے ہوئے مہینہ ہو چکا تھا۔ ابھی تک وہ اپنے گھر ایک ویک اینڈ پہ بھی نہیں گئی تھی۔ عجیب لڑکی تھی۔ اسے اپنا گاؤں اپنا گھر اور اپنے ماں باپ یاد نہیں آتے تھے۔

حالانکہ اسی صبح فلک کی اماں نے کال کی تھی۔ وہ فبنا کا دودھ لینے کے لیے اٹھی تھی۔

فلک کے کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا تھا۔ اندر سے صاف آواز آرہی تھی۔

"اماں! کہہ تو رہی ہوں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ آپ یہ اونگے بونگے رشتے اپنے پاس رکھیں۔" فلک شدید جھلا رہی تھی۔

"اسکول ہیڈ ماسٹر ہے' کوئی کمشنر نہیں۔ مجھے نہیں کرنی۔" اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"حد ہے اماں! مجھے گاؤں میں نہیں رہنا۔ میں یہاں جاب کرتی ہوں۔ شادی بھی یہیں کروں گی۔ آپ اسی شہر میں رشتہ ڈھونڈیں۔" فلک نے اماں کو ٹالتے ہوئے کہا تھا۔ شافیہ مزید سننے کے لیے کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ سوچتی ہوئی کچن میں چلی گئی تھی۔

پھر اسی دوپہر امی نے فلک کو آڑے ہاتھوں لے لیا تھا۔ وہ جو سندھی بریانی بنانے کی تیاری کر رہی تھی' بددل سی ہو گئی۔ امی نے ذرا بھی لحاظ روا نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

"فلک! کب تک ایسے رہو گی' کیا شادی نہیں کرنی؟ یہی مناسب عمر ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ پڑھ بھی لیا۔ نوکری بھی ہے۔ اب شادی کرلو۔"

"آنٹی! ایسے کیسے کرلوں۔ کوئی ڈھنگ کا پرپوزل تو ہو۔" صاف لگ رہا تھا' وہ امی کو ٹالنا چاہ رہی تھی۔

امی تو لمحوں میں پرجوش ہو گئی تھیں۔

"پرپوزل تو ہے۔ اپنا آدم' اتنا نیک اور سجیلا۔ اگر تم ہامی بھرو تو میں تمہارے ابا سے بات کرلوں گی۔" امی نے جیسے ہتھیلی پہ سرسوں جمانے والی بات کردی تھی۔ اور فلک جیسے ہکا بکا رہ گئی۔

"نن' نہیں پلیز۔" اس کا سارا اعتماد ہوا ہو گیا تھا۔

"ارے نہیں کیوں؟" امی کو بہت برا لگا۔ "اپنے آدم میں کیا کمی ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ اپنا گھر' اپنا کلینک۔ کوئی جھنجھٹ نہیں۔ تم تو راج کرو گی۔"

شافیہ کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ صاف لگ رہا تھا۔ وہ انکار کیوں کر رہی تھی؟ زوہیب کی وجہ سے۔ شافیہ سر تاپا سلگ اٹھی تھی۔

"فی الحال نہیں۔" فلک نے جان چھڑائی تھی۔

اس کی گردن پھنسی دیکھ کر زوہیب کو مداخلت کرنی پڑی تھی۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا تھا۔ امی کے پاس فلک کو پھنسے دیکھ کر فوراً مدد کے لیے آگے بڑھا۔

"امی! یہ فلک کا پرسنل میٹر ہے۔ آپ اسے کیوں فورس کرتی ہیں۔"

"حد ہے بیٹا! کیا بڑے سمجھاتے بھی نہیں۔۔۔ میں اس کے بھلے کی بات کر رہی ہوں۔" امی کو سخت ہی برا لگا تھا۔

"امی! وہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، مگر فلک پڑھی لکھی ہے۔"

"آدم میں کیا کمی ہے۔ ایسے رشتے نصیب والوں کو ملتے ہیں۔"

"آدم۔۔۔" زوہیب اٹھتے اٹھتے چونک گیا تھا۔ "کیا اس نے پروپوزل دیا ہے۔" اس کا انداز کچھ پر سوچ تھا۔ اب کہ اس کے لہجے میں تیزی نہیں تھی۔

"ہاں تو اور کیا۔" امی نے کلس کر جواب دیا تھا۔ اب کے فلک بھی چونکی تھی، تاہم اس کے تاثرات وہی تھے۔ گویا اسے آدم کے پروپوزل سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ظاہر ہے امیدیں زوہیب سے جو لگا رکھی تھیں۔

"اچھا۔۔۔" زوہیب کا اچھا خاصا معنی خیز تھا۔ اس نے بلا ارادہ ہی فلک کی طرف دیکھا تھا۔ فلک نے گہرا سانس کھینچا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔

پھر جاتے جاتے لمحہ بھر کے لیے رکی۔

"مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی۔ اس لیے آپ تردد نہ کریں۔" بڑے شائستہ انداز میں لپیٹ لپاٹ کر وہ انکار ان کے منہ پہ مار گئی تھی۔ امی اور شافیہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ بڑے روکھے پھیکے اور بدمزہ سے یہ دن گزرتے جا رہے تھے۔

شافیہ اور زوہیب کے تعلقات بھی سرد مہری کا شکار تھے۔ کیونکہ فلک ان دنوں پوری طرح زوہیب پہ چھائی ہوئی تھی۔ دونوں ہی بڑے مصروف نظر آتے تھے۔ صبح نکلتے تو شام کی خبر لاتے تھے۔ اور زوہیب دفتر سے آ کر بھی اتنا ہی لاتعلق نظر آتا تھا۔ یا تو ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھ جاتا تھا یا پھر بستر پہ پڑ کے سوجاتا تھا۔

زوہیب کو اس سے شکایتیں تھیں۔ وہ اسے بلاتا تو شافیہ کاموں کی فہرست نکال کر لے آتی۔ **نتیجتاً** دونوں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔

زوہیب کو شافیہ سے گلے تھے اور شافیہ کو زوہیب سے۔

"دنیا کا ہر کام ضروری ہے سوائے میرے۔" وہ آتے جاتے اسے طعنے مارنے سے باز نہیں آتا تھا۔

"اور آپ کو دوسروں کے مسئلے سلجھانے سے فرصت نہیں۔ میں جاؤں بھاڑ میں" آپ بس اپنی ڈیوٹیاں نباہیں۔ ڈرائیور بنے رہیں۔" شافیہ بھی فلک کے حوالے سے چوٹ کرنے سے باز نہیں آتی تھی۔

ان ہی بدمزہ، فضول اور روکھے دونوں میں فلک کی اماں اس سے ملنے کے لیے آ گئی تھیں۔ وہ شاید فلک کو لینے کے لیے آئی تھیں یا اسے شادی کے لیے رضامند کرنے۔

مگر فلک کی ایک "ناں" ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو صاف انکار کر دیا تھا۔ اور وہ یہ انکار کس کی ایما پر کر رہی تھی؟

فلک کی ماں شافیہ کے سر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم ہی اس کو سمجھاؤ۔۔۔ یہی وقت ہے شادی کا۔ انکار کیوں کرتی ہے یہ۔ اگر کوئی پسند ہے تو بتا دے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

پسند تو اسے ہے۔ مگر یہاں دال نہیں گل رہی۔ بیچ میں میرا کانٹا جو موجود ہے۔ شافیہ کا اندر تک دل جل جل کر خاک ہو رہا تھا۔ پھر فلک کی اماں مایوس اور نامراد لوٹ گئی تھیں۔ امی نے آدم کو فی الحال کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ آدم کسی کانفرنس میں شرکت کرنے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔

اپنی اماں کے جاتے ہی فلک کے انداز بدل گئے تھے۔ وہ شافیہ کو پورے گھر پہ چھاتی نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ ان دنوں زوہیب کے ڈھنگ بھی نرالے تھے بن ٹھن کر جاتا تو پھر رات کو ہی واپس آتا تھا۔ اس دوران بھی فلک اس کے سر پہ سوار رہتی تھی۔

وہ دونوں اکٹھے کام کرتے تھے۔ اس دوران سب لوگ کھانا کھا چکے ہوتے اور وہ دونوں آخر میں کھانا کھاتے۔ فلک زوہیب کے لیے کھانا گرم کرتی۔ اکثر اپنے کپڑے پریس کرتی تو زوہیب کے بھی کر دیتی۔ اسے وقت بے وقت چائے کی طلب ہوتی تب بھی فلک چائے سمیت حاضر ہو جاتی تھی۔

پھر یوں ہونے لگا کوئی ڈاکومنٹری ہارر مووی دیکھنے کا ارادہ بنتا تو فلک زوہیب کو آواز لگاتی۔

"بڑی سنسنی خیز مووی ہے۔ آجاؤ زوہیب۔"

اور زوہیب ایسے بھاگ کر جاتا جیسے اسی آفر کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

اس شام بھی سات بجے کے بعد فون کی گھنٹی بجی تو شافیہ نے کچن سے نکل کر فون اٹھایا۔ آج وہ زوہیب کے لیے جل فریزی بنا رہی تھی۔ بہت دن بعد زوہیب کی پسند کا کھانا بنا کر وہ اس کا موڈ بحال کرنا چاہتی تھی، کیونکہ زوہیب اس سے بہت اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔

جب اس نے فون اٹھایا تو غیر متوقع فلک کی کال تھی۔ اس کی آواز سن کر شافیہ حیران رہ گئی۔

"تم کیا کر رہی تھیں شافیہ!" اس نے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا تھا۔ شافیہ کو بتانا ہی پڑا۔

"زوہیب کے لیے جلفریزی بنا رہی تھی۔"

"او' اچھا میں نے تمہیں اس لیے کال کی ہے کہ میں اور زوہیب ڈنر باہر کریں گے۔ تم تکلیف مت کرو۔" فلک نے اطلاع دے کر فون کھٹاک سے بند کر دیا تھا۔ ورنہ شافیہ اسے منہ توڑ جواب ضرور دیتی کہ بی بی! اپنے شوہر کے لیے کچھ بناتے ہوئے، مجھے کیسی تکلیف؟"

شافیہ بے دم سی صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

آخر فلک اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہی تھی۔

کچھ دیر بعد بچوں کو اسپگیٹھی کھلا کر جل فریزی کا سارا سامان سمیٹنے کے بعد وہ بے آواز اپنے کمرے میں بند رو رہی تھی۔ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔

اس نے گھڑی پہ نظر ڈالی اور دھک سے رہ گئی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ فینا کو ہما نے سلا دیا تھا۔ امی نے بھی اسپگیٹھی کھالی تھی۔ زنیرا اور ہما ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

امی شاید سو چکی تھیں۔ ہما نے ان کو دوا بھی کھلا دی تھی۔ شافیہ نے امی کی ٹانگوں کی مالش کی۔ ان کے پیر دبائے اور اپنے آنسو پیتی رہی۔ پھر لائٹ آف کر کے وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ فینا' ہما کے پاس تھی۔ اس نے اسے اپنے پاس سلا لیا تھا۔ کافی دیر بعد باہر باتوں کی آواز آئی تھی۔ پھر دروازہ کھول کر زوہیب اندر آیا۔ اس نے معمول کے مطابق سلام کیا تھا۔ شافیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ کروٹ بدل کر سوتی بن گئی تھی۔

زوہیب کو اچنبھا ہوا۔ پھر وہ کندھے اچکا کر کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا تھا۔ کافی دیر بعد واپس آیا تب بھی شافیہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔

وہ بہت دیر تک شافیہ کے اٹھنے کا منتظر رہا۔ پھر اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ جارحانہ انداز میں شافیہ تک آیا تھا۔ پھر اس نے بہت شدت سے شافیہ کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ وہ چلاتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

"یا وحشت۔" اس نے چلا کر کہا۔ "قیامت آگئی ہے کیا؟"

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟" وہ تنک کر پوچھ رہا تھا۔

"میرے ساتھ مسئلہ ہے؟" وہ بھی چیخ پڑی تھی۔

"تو اور کس کے ساتھ ہے؟ کیا تم اپنے فرائض بھول گئی ہو؟ تمہیں میرا ہوش ہے نہ میرے کھانے پینے کی فکر' اور نہ ہی میری کسی ضرورت کا خیال۔" زوہیب نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جتلایا تھا۔

"آپ کا خیال رکھنے والے کیا کم ہیں؟" شافیہ کا انداز بھی گہرا کاٹ دار تھا۔ زوہیب اسے سلگتی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"تم میری بیوی ہو۔" وہ جتا جتا کر بولا تھا۔

"شکر ہے' آپ نے یاد رکھا۔" اس نے بھی طنز

کیا۔

"شافیہ! میرا میٹر مت گھماؤ۔" اسے غصہ آگیا تھا۔

"اور آپ چاہے جو مرضی کرتے رہیں۔ میرا میٹر جتنا مرضی گھماتے رہیں۔" شافیہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"میں نے کیا کیا ہے۔۔۔" وہ معصوم بن گیا تھا۔

"آپ نے تو کچھ نہیں کیا۔ میری قسمت خراب ہے بس۔" شافیہ زہریلے انداز میں بولی تھی۔

"اچھا چھوڑو' اس بیکار بحث کو کھانا لاؤ میرے لیے۔" زوہیب نے خود ہی سیز فائر کر دیا تھا۔ اس کی بات پہ شافیہ ہکابکا رہ گئی تھی۔

"کھانا؟ تو جو اتنا کچھ رومانٹک ڈنر ٹھونس کر آئے ہیں' وہ کدھر گیا؟" اس کے لفظ لفظ میں کاٹ تھی۔ اب کہ زوہیب ہونق تھا۔

"رومانٹک ڈنر؟ او' اچھا۔" وہ جیسے سمجھ کر سرہلا گیا تھا۔ پھر اسے غصہ آگیا۔ "میرے کولیگ کی پروموشن ہوئی تھی۔ اس نے ڈنر دیا سب کو۔ اور سب میں مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ اور تم اچھی طرح سے جانتی ہو' میں باہر کا کھانا نہیں کھاتا۔ سونے کا بھی بنا ہو تب بھی نہیں۔"

زوہیب کے جتلانے پہ شافیہ پہلے تو ہونق ہوئی تھی' پھر اس پہ گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ واقعی اس چیز کو اس نے کیوں نظر انداز کر دیا تھا۔ زوہیب تو باہر کھانا کھاتا نہیں تھا۔ پھر فلک کو اتنا لمبا چوڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا انداز بھی ایسا تھا کہ بندے کو خواہ مخواہ غصہ آجائے۔ پھر اس نے بات کو اتنا گھما کر کیوں کیا؟ غصہ دلانے کے لیے؟ شک ابھارنے کے لیے؟

ان دونوں کے درمیان "دراڑ" لانے کے لیے!

شافیہ کا دماغ کھلنے لگا تھا۔ سوچ کے کئی در 'وا' ہوتے رہے۔ وہ اس پہلو پہ غور نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اب کر رہی تھی۔

مگر زوہیب نے زیادہ غور و فکر کرنے نہیں دیا تھا۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ شافیہ کو کچن میں جانا پڑا۔ جب وہ آملیٹ بنا کر لائی تب زوہیب نے ناک بھوں چڑھالی تھی۔

"کیا سالن نہیں بنایا تھا؟"

"بنانے لگی تھی۔ پھر ایک مسئلہ ہو گیا۔" اس نے مسئلے کی گہرائی اور تفصیل نہیں بتائی تھی۔ اس مسئلے کو شافیہ نے حل کرنا تھا۔ زوہیب نے نہیں۔

پہلے شافیہ کو فلک کے رویوں میں اترنا تھا۔ اس کی سوچ کو پرکھنا تھا؟ آخر وہ چاہتی کیا تھی؟

☆ ☆ ☆

اور پھر یکے بعد دیگرے ہی ایسے چونکا دینے والے واقعات سامنے آئے کہ شافیہ دور تک چوکنا ہو گئی تھی۔ پہلی مرتبہ اس نے جلنے کڑھنے' کسلنے اور لڑنے کے بجائے بڑی گہرائی اور معاملہ فہمی سے حالات کا جائزہ لیا تھا۔ دراصل اس کی توجہ ان معاملات پہ آمنہ نے دلائی تھی۔

آمنہ آپی عمرہ کر کے واپس آچکی تھیں۔ اب وہ اپنے بچوں کو لینے کے لیے آئی تھیں۔ ان کا قیام بس دو دن پر مشتمل تھا۔ ان دو دنوں میں جو کچھ آمنہ نے ملاحظہ کیا۔ وہ انتہائی قابل گرفت تھا۔ آمنہ نے اپنے ہی گھر میں فلک کی اجارہ داری محسوس کر لی تھی۔ پھر زوہیب کی بے تکلفی۔ وہ بیوی سے زیادہ فلک سے لگاؤ رکھتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے۔۔۔ کہ فلک خود زوہیب سے زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔ اور اسے ہر معاملے میں زبردستی گھسیٹتی تھی۔ کیرم کھیلنے یا لڈو' بیڈ منٹن یا شطرنج۔۔۔ ہر کھیل میں فلک زبردستی زوہیب کو شامل کر لیتی تھی۔ پھر اس کی پارٹنر بھی بن جاتی تھی۔

آمنہ نے ہر طریقے سے جائزہ لیا تو زوہیب کی طرف سے ایسی قابل گرفت بات نظر نہیں آئی تھی۔ جس طرح وہ مزاجاً" کھلا ڈھلا' خوش مزاج' ہنسوڑ اور منہ پھٹ تھا اسی طرح ہر ایک سے بے تکلف ہو جاتا تھا۔ مذاق کرنا' چوٹ کرنا' طنز کرنا۔۔۔ اس کی عادت کا ایک حصہ تھا۔

لیکن فلک اس بے تکلفی کو دوسرے معنوں اور قالب میں ڈھال لیتی تھی۔ جیسے اس دن زوہیب نے شافیہ سے کہا تھا۔

"بچوں کے کپڑے لے کر آنے ہیں۔ تم فارغ نہیں۔ امی جا نہیں سکتیں۔ آپی تھکی آئی ہیں۔ میں فلک کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ اسے ہما اور زنیرہ کی چوائس کا پتا ہے۔" یہ ایک عام اور سادہ سی بات تھی۔

اس کے باوجود فلک کا بات دہرا کر محض شافیہ کے دل میں دراڑ ڈالنے کے لیے جتانا آمنہ کو بہت قابل گرفت لگا تھا۔

"زوہیب کو میری چوائس پہ بھروسا ہے۔ وہ مجھے کہہ رہا تھا۔ اس کی شاپنگ میں بھی اگر میں ہیلپ کر دیا کروں.... تمہیں تو اندازہ نہیں.... نہ فیشن کی سمجھ ہے۔" فلک کا جتلانا آمنہ کو بھی سخت ناگوار گزرا تھا۔

پھر جب وہ لوگ شاپنگ کر کے واپس آئے تھے تب بطور خاص فلک نے دو سوٹ شافیہ کو دکھائے۔

"یہ مجھے زوہیب نے لے کر دیے ہیں۔ وہ کہتا ہے' میں ایسے کلر پہنا کروں۔ مجھ پر سوٹ کرتے ہیں۔" فلک کی اتراہٹ کا کوئی انت نہیں تھا۔ شافیہ کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ ضبط کر گئی تھی۔

کیونکہ آمنہ نے آج ہی شام کی فلائٹ سے چلے جانا تھا۔ جاتے جاتے وہ سارے حالات کو دیکھتے ہوئے شافیہ کے کان میں سرگوشی کر کے گئی تھی۔

"یو ڈونٹ وری شافی! میں کراچی جا کر اس کے انکل سے فائنل بات کرتی ہوں۔ اس کا اپنے ہی سرکل میں کوئی رشتہ دیکھ کر انگیج کرتے ہیں۔ مگر تم خدارا' ثابت قدم رہنا۔ مجھے تمہاری ذہانت پہ بھروسہ ہے۔"

آمنہ اسے بھرپور تسلی دے کر گئی تھی۔

جانے اسے شافیہ کی کس ذہانت پہ پورا بھروسا تھا۔ ان کا بھائی تو اسے ہر وقت جاہل' ان پڑھ' کند ذہن اور جانے کیا کیا خطاب دیتا تھا۔

آمنہ کے چلے جانے کے بعد پورا ماحول ساکت اور خاموش ہو گیا تھا۔ بچوں کے دم سے رونق تھی جو ختم ہو گئی۔ امی کا دل بھی بڑا اداس تھا۔ انہوں نے فلک سے کہا۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھے۔ مگر وہ کام کا بہانہ بنا کر لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر مصروف ہو گئی تھی۔

شافیہ کو کچن سے نکل کر امی کو کمپنی دینا پڑی۔ وہ جانتی تھی ان کا دل اداس ہو رہا ہے۔ اس نے بہت ساری ادھر ادھر کی باتوں سے انہیں بہلا لیا تھا۔ جب وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔

"تمہیں میرے من کی خبر ہو جاتی ہے؟"

شافیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی تھیں۔ پھر انہوں نے شافیہ کو دعا دی۔ "سدا سہاگن" رہو۔

شافیہ کا دل۔ بھر آیا تھا۔ وہ بمشکل آنسو چھپاتی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ دل کی حالت عجیب تھی۔ برا ہو اس گھڑی کا۔ جو زوہیب بھی عین وقت پہ پہنچ گیا۔

ان دونوں کے درمیان پہلے بھی بہت الفت نہیں تھی۔ ایک دوسرے سے اکھڑے اکھڑے نظر آتے تھے۔ اس وقت تو زوہیب کا میٹر ہی گھوم گیا۔

"کس کے سوگ میں ہر وقت غم کی تصویر بنی رہتی ہو؟ کبھی تمہارے چہرے پہ مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ کون مر گیا ہے؟ میں تو ابھی زندہ سلامت ہوں۔" اس کے چلانے پہ شافیہ بھی پھٹ پڑی تھی۔

"کبھی اپنے گریبان میں بھی جھانک لیا کریں۔ شرم نہیں آتی آپ کو۔" شافیہ کے جواب پہ اور الزام پہ زوہیب ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"میں کس بات پہ شرم کروں؟" وہ بھی پھٹ پڑا تھا۔

"میری ناک تلے شرمناک کھیل رچانے پہ۔" شافیہ کا انداز آگ لگا دینے والا تھا۔ زوہیب کا مارے غصے اور اشتعال کے برا حال ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا اور گھٹیا الزام' وہ بھی بلاوجہ۔

"آخر آپ کھل کر سامنے کیوں نہیں آتے؟ چوہے بلی' والا کھیل ختم کر دیں۔ سب کچھ جان چکی ہوں میں۔" شافیہ مزید شعلے اگلنا چاہتی تھی مگر اچانک آمنہ کی تنبیہہ اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ اس نے ایک دم بات بدل دی۔

"فلک کو سوٹ گفٹ کیے اور مجھے بتایا نہیں۔۔۔ تحائف کے لین دین سے محبت بڑھتی ہے۔ اتنا تو میں جانتی ہوں۔"

اس کا انداز بڑا سنجیدہ اور سرسری سا ہو گیا تھا۔ زوہیب ایک دم اس کے پینترا بدلنے پہ چپ ہو گیا۔

"تم اس بات پہ رو رہی تھیں؟" اس کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔

"آپ نے مجھے بتایا نہیں۔۔۔ کیا میں منع کر دیتی؟" شافیہ کا مارے دکھ سے برا حال تھا۔ زوہیب لمحوں میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ بدگمان ہو رہی تھی۔ یہ ٹھیک نہیں تھا۔ زوہیب کو وضاحت کرنی چاہیے تھی۔ وہ اس کے قریب ہی دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"وہ میرے ساتھ گئی تھی بلکہ میں لے کر گیا تھا۔ جب آمنہ آپی کا سوٹ لیا تو اسے بھی دو سوٹ پسند آ گئے تھے۔ وہ اپنے پیسے دینا چاہتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ بہت برا اور انتہائی چیپ لگتا۔"

زوہیب نے ملائمت سے بات صاف کر دی تھی۔

"تم خوامخواہ شک میں پڑ کے بدگمان ہوتی جا رہی ہو۔ جو تم سمجھتی ہو ایسا کچھ نہیں۔ بلکہ تم خود مجھ سے دور ہو رہی ہو اور یہ بات لوگ محسوس کرتے ہیں۔"

زوہیب کے اگلے الفاظ اسے ہکا بکا کر گئے تھے۔ کون لوگ محسوس کر رہے تھے؟ اور زوہیب کو بتا بھی رہے تھے؟ اور زوہیب اپنے کرتوتوں پہ پردہ ڈالتے ہوئے سارا الزام اس پہ رکھ رہا تھا۔ شافیہ نفی میں سر ہلاتی رہ گئی تھی۔ پھر ان دونوں کی لمبی جھڑپ ہو گئی۔ زوہیب نے غصے میں آ کر کہہ دیا۔

"جان چھوڑو میری کند ذہن عورت، کہاں سے متھے لگ گئی ہو۔ میری قسمت خراب کرنے کے لیے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتا رہا تھا۔ "نکل جاؤ میری زندگی سے۔ میرے گھر سے۔ تاکہ سکون آئے مجھے بھی۔" غصے میں وہ اول فول بک رہا تھا۔

"جانے کب جان چھوڑو گی میری۔" وہ کشن اور تکیے پٹختا باہر نکل گیا تھا۔ اور شافیہ سر تھام کر کارپٹ پہ بیٹھ گئی۔ آخر یہ ہو کیا رہا تھا؟

وہ کتنی ہی دیر اسی گورکھ دھندے میں الجھی رہی تھی۔ کئی دفعہ دل چاہتا تھا کہ زوہیب کے سارے کرتوت اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔

وہ ساری باتیں جو فلک اسے بتاتی تھی۔ لنچ کے وقت میں گھومنا، پھرنا، ہوٹلنگ، شاپنگ۔۔۔ زوہیب کا اس سے بڑھتا التفات، بے تکلفی اور ملال۔

اس بات پہ کہ فلک اسے مل نہیں سکی تھی۔ کیونکہ بیچ میں شافیہ آ گئی تھی۔ فلک اسے اتنے غیر محسوس انداز میں فیڈ اپ کرتی تھی جیسے کسی اور کی باتیں سنا رہی ہو۔

اور شافیہ آخر کب تک اور کہاں تک صبر اور حوصلے سے سنتی اور برداشت کرتی؟

اس کے صبر کی طنابیں چھوٹ رہی تھیں۔ آمنہ کی تمام تر تنبیہہ اور نصیحتوں کے باوجود اس رات شافیہ کے ضبط اور صبر کی ہر حد ختم ہو گئی تھی۔

اس رات جب زوہیب شافیہ سے لڑ جھگڑ کر رات ایک بجے فلک کے چرنوں میں جا بیٹھا تھا۔ دوسرے پہر کی تنہائی میں اپنی بیوی سے لڑنے کے بعد ایک غیر عورت کی قدم بوسی کا آخر مقصد کیا تھا؟

جو کھیل ڈھکے چھپے کھیلا جا رہا تھا؟ کیا وہ کھل کر سامنے آنے والا تھا؟ کیا آج فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی؟

شافیہ آر یا پار اترنے کا آخری فیصلہ کر کے پورے جلال اور اشتعال کے ساتھ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے سٹنگ روم میں پہنچ گئی تھی۔

پھر وہاں پہنچ کر ہوا کیا؟

☆ ☆ ☆

سٹنگ روم کا پردہ ہل رہا تھا۔

کمرے میں نیم روشنی تھی۔ لیپ ٹاپ کی روشنی۔ میز پہ ڈھیروں کاغذات پڑے تھے۔ فلک کام کرتے کرتے چونک گئی تھی۔ کیونکہ اس کے قریب زوہیب کھڑا تھا۔ بہت بکھرا بکھرا، الجھا الجھا، غصے میں۔

فلک کی تمام حسیات بیدار ہو گئی تھیں۔ اس نے نفی

الفور کاغذ قلم سمیٹ دیے تھے۔ پھر وہ زوہیب کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ وہ قریب ہی کارپٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ بار بار اپنی کنپٹیاں دبا رہا تھا۔ جیسے اس کے سر میں درد ہو۔ اس کا چہرہ بھی سرخ تھا اور آنکھیں بھی لہو رنگ تھیں۔ فلک نے نرمی اور ہمدردی سے پوچھا۔

"تم ٹھیک تو ہو!"

زوہیب نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ کوئی بات کر رہا تھا۔ بے آواز سی۔ جیسے منہ ہی منہ میں۔ فلک کو کان لگا کر سننا پڑا تھا۔ تو گویا زوہیب اس اسٹیج پہ آچکا تھا۔ جب وہ اس کے من پسند جملے لبوں سے ادا کرتا۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں۔۔۔ شافیہ میرے ساتھ خوش نہیں۔۔۔ میں نے زبردستی اسے اپنے ساتھ باندھ رکھا ہے۔

مجھے اندازہ ہوچکا ہے۔ تم ٹھیک تھیں میں غلط تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں' میں شافیہ کو اپنے ساتھ باندھے رکھوں۔ میں اسے آزاد کردوں گا۔ وہ اپنی من پسند زندگی جیے۔ پھر کیا تم مجھے قبول کرو گی؟" فلک کے کانوں میں اپنے سوچے گئے جملوں کا رس اتر رہا تھا۔ ابھی وہ اپنی سوچ میں اتر کر خوش بھی نہیں ہوپائی تھی جب زوہیب نے ایک الگ ہی بات کہی۔

"پتا نہیں فلک! شافی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ پچھلے ایک ماہ سے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ جانے اسے کیا ہوتا جارہا ہے۔ مذاق تک نہیں برداشت کرتی۔ ذرا سی بات پہ بگڑ جاتی ہے۔" وہ اپنی بھڑاس نکالنے آیا تھا۔ فلک کو اندر تک مایوسی نے گھیر لیا۔ وہ تو کچھ اور ہی سننے کی متمنی تھی۔

"ایک بات کہوں۔ تمہیں ہمیشہ کی طرح بری ہی لگے گی۔" فلک نے بھی کچھ سوچ کر گویا نرم دیکھ کر چوٹ کی تھی۔

"ہاں۔۔۔ کہو۔" وہ اپنے ہی خیالوں میں تھا۔ جیسے شافیہ کے بگڑنے کی وجہ سوچ رہا ہو۔

"شافیہ تمہارے ساتھ خوش نہیں۔"

فلک نے اتنی بڑی بات آرام سے کہہ دی تھی۔ زوہیب کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ ایک دم نفی میں سر ہلاتا لب بھینچ کر رہ گیا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ اسے اس بات پہ مزہ چکھا دیتا۔

"میں مان ہی نہیں سکتا۔ وہ میرے ساتھ بہت خوش تھی۔ جو بھی مسئلہ ہوا ہے۔ اب ہوا ہے۔" زوہیب نے شدت سے نفی کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بمشکل ہی اپنے اوپر قابو بھی پایا تھا۔

"کیا پتا۔ اس کی زندگی میں اب کوئی آیا ہو۔" فلک نے روانی میں کہہ تو دیا تھا۔ مگر پھر کہہ کر ہمیشہ کے لیے پچھتائی تھی۔ اس نے زوہیب کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔ اسے غصہ میں آتے دیکھا تھا۔ اسے اشتعال میں مٹھیاں بھینچ کر کھڑے ہوتے دیکھا تھا۔

فلک اندر تک کانپ گئی تھی۔ زوہیب پہ اچانک وحشت سوار ہوگئی تھی۔ وہ ایک دم پوری قوت سے دہاڑا تھا۔

"شٹ اپ فلک! آئندہ ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔ میں ایسا قیامت تک سوچ نہیں سکتا۔ مجھے اپنی بیوی پہ اعتبار ہے۔ اس کی محبت پہ اعتبار ہے۔ تم آئندہ ایسی بکواس کبھی نہیں کرو گی۔" وہ غیض و غضب میں دھاڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ زوہیب کا ایک دم غصے میں آجانا' بنتا تھا۔ فلک جانتی تھی۔ جب بھی وہ ایسی بات کرے گی۔ زوہیب کا ری ایکشن یہی ہوگا۔ مگر پتھر میں سوراخ کرنے کے لیے ایسی ضربیں لگانا ناگزیر تھا۔

فلک کو امید تھی۔ ایسی ہی دو تین سچویشن کے بعد نتیجہ حسب منشا ہوگا۔ زوہیب کب تک اعتبار کا راگ الاپتا رہے گا! کب تک شافیہ کی سرد مہری برداشت کرتا رہے گا؟ آخر ایک دن اسے یقین آجائے گا کہ فلک کا کہا غلط نہیں۔ کیونکہ فلک شافیہ کو زوہیب سے آخری حد تک بدگمان کردے گی۔

زوہیب کے تن فن کرنے کے بعد' وہ لیپ ٹاپ اٹھاتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر زیرلب بڑبڑا رہی تھی۔

"میں زوہیب کو واپس اپنے دائرے میں کھینچ لاؤں گی۔ اس پہ اپنا تسلط قائم کرکے۔ اس کی روٹین کو

اپنے ہاتھوں میں لے کر۔ اس کی من پسند ڈشز بنا کر۔ اس کے گھر پہ کنٹرول کر کے۔

زوہیب کو شافیہ پہ اعتبار ہے۔۔۔ شافیہ کو تو زوہیب پہ اعتبار نہیں نا؟ بہت جلدی شافیہ خود اپنے منہ سے زوہیب کو بے اعتبار کر کے یہاں سے چلی جائے گی۔ وہ ایک نادان' کند ذہن' کم تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ وہ اتنی گہرائی میں جا ہی نہیں سکے گی۔ زوہیب کو ایک مرتبہ شافیہ کے ہاتھوں بے اعتبار کرنا ہے۔ اسے شافیہ کے ہاتھوں ذلیل کروانا ہے۔ جیسے اس نے مجھے بے اعتبار کیا تھا۔ شادی کا لارا لگا کر راہ بدل گیا۔ کم از کم اتنی سزا تو زوہیب کو ملنی چاہیے؟

بعد میں بھلے وہ شافیہ کو منا کر گھر لے آئے۔۔۔ لیکن ایک مرتبہ تو اسے "ڈسٹرب" ہونا پڑے گا۔ جیسے اس نے مجھے ڈسٹرب کیا تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی اپنا اگلا لائحہ عمل تیار کر رہی تھی۔

"اور اگر شافیہ نہ آئی۔ ضد میں آگئی۔ تو میں قربان گاہ پہ قربان ہونے کے لیے آل ریڈی تیار ہوں۔"

فلک نے مسکرا کر اپنی پلاننگ کو انجوائے کیا تھا پھر چیزیں سمیٹ کر اندر چلی گئی تھی۔

جبکہ پردے کے پیچھے کھڑی شافیہ اس کی شاطرانہ چال پہ دم بخود سی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے کئی پردے ہٹ گئے تھے۔ پھر اس کند ذہن شافیہ نے اس ذہین فلک کو بغیر مات کھائے' چت کر دیا تھا بھلا کیسے؟

☼ ☼ ☼

کچھ لوگوں کو اپنی عقل اور ذہانت پہ بڑا مان ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ اپنی عقل اور ذہانت سے وہ معصوم' احمق اور بدھو لوگوں کو بڑی آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں۔

فلک کو بھی کچھ اسی طرح سے اپنی عقل پہ مان تھا۔ گو کہ معاملہ وہی روایتی سا تھا۔ ایک لڑکے کو ایک لڑکی سے پسندیدگی نما محبت ہوئی۔ یہ محبت بھی نہیں تھی۔ ایک دوسرے کو پسند کرنا محبت نہیں ہوتا۔ بیچ میں کچھ ایسے حالات آئے کہ ان دونوں کی شادی نہ ہو سکی۔ وقتی طور پر زوہیب نے تھوڑا سا اثر لیا تھا بعد میں بھول بھال گیا۔ کیونکہ پسند بدلتی رہتی ہے محبت ہرگز نہیں بدلتی۔

آمنہ نے فلک پہ شافیہ کو کچھ سوچ کر ہی ترجیح دی تھی۔ وہ جانتی تھی فلک اس کی ماں کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی۔ فلک گھر نہیں سنبھال سکتی۔ فلک اس کی ماں کے مزاج کو برداشت نہیں کر سکتی۔

اس کی ماں نکتہ چین' وہمی اور تنگ مزاج عورت تھی۔

صفائی کے معاملے میں وہ اچھے اچھوں کا ناطقہ بند کر دیتی تھیں۔ ان کے ساتھ پورا دن گزارنے والا بندہ ایوارڈ کا حق دار تھا۔ وہ پورے دن دوڑائے رکھتی تھیں۔ ان کے سوال ختم نہیں ہوتے تھے۔ کوکنگ انہیں کلاس کی متاثر کرتی تھی۔ ہر چیز میں وہ سو سو کیڑے نکالتی تھیں۔ قصہ مختصر ان کے ساتھ رہنا ان کو برداشت کرنا بڑے حوصلے کا کام تھا۔ اور یہ حوصلہ صرف شافیہ کے پاس تھا۔ اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ فلک کے پاس تو بالکل بھی نہیں' فلک جب ان کے گھر ویک اینڈ پہ آتی تھی تب امی تندرست تھیں۔ وہ ہر چیز کو خود مین ٹین رکھتی تھیں' تب فلک بھی ایک آدھ ڈش بنا کر امی کا دل جیت لیتی تھی۔

اب جب وہ یہاں رہنے کے لیے آئی تھی اور اس نے زوہیب کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے کچن اور گھر میں دلچسپی لینا شروع کی' تب بھی شافیہ بیک پہ موجود تھی۔ وہ گھر اور کچن کو برابر صاف کرتی تھی۔ فلک کے پھیلاوں کو سمیٹ دیتی تھی۔ امی کو فلک پہ نکتہ چینی کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اور نہ ہی فلک کا پھوہڑپن انہیں نظر آیا تھا۔

اسی طرح فلک بھی امی کے اصل جوہر دیکھنے سے محروم تھی۔

اسی نکتے کو فوکس کر کے شافیہ نے زوہیب کے نام مختصر خط لکھا اور روپوش ہو گئی۔

اس خط کا متن کچھ یوں تھا۔ "آپ نے مجھے گھر سے نکلنے کی دھمکی دی ہے۔۔۔ اور میں یہ گھر چھوڑ کر جا

رہی ہوں۔ آپ مجھ جیسی جاہل 'ان پڑھ 'کند ذہن سے تنگ آچکے ہیں۔ آپ کے لیے اجازت ہے۔ اپنی من پسند شریک حیات کو لے آئیں۔ جو لمبی چوڑی ڈگریاں جہیز میں لائے۔"

اس خط کو دیکھ کر قیامت آگئی تھی۔ بلکہ قیامت تین گھنٹے پہلے آچکی تھی۔

ہوا کچھ اس طرح سے تھا۔

شافیہ کے منظر سے ہٹتے ہی فلک کی شامت آگئی تھی۔ اسے گھر'کچن 'امی اور فینا کو ایک ساتھ سنبھالنا پڑا تھا۔ شافیہ کے جاتے ہی کرائسس کے اس دور میں اپنے محسنوں کو تنہا 'بے یارومددگار چھوڑ کر جانا کہاں کا انصاف تھا؟

پھر امی اسے جانے بھی نہیں دے رہی تھیں۔

"میری شافیہ نجانے کہاں چلی گئی۔ اب تم بھی جا رہی ہو۔ ہرگز نہیں۔ تم یہیں رہو گی۔ ہمیں کون سنبھالے گا۔" اس وقت تو فلک نے جی جان سے ہامی بھرلی تھی'مگر اگلے تین گھنٹوں میں اسے نانی 'دادی اور اماں تک یاد آگئی تھیں۔

زوہیب کی امی نے اسے تگنی کا ناچ نچا ڈالا تھا۔ صرف ایک دن میں فلک خوفناک حد تک اس گھر سے اور اس گھر کی بزرگ سربراہ سے تنگ آگئی تھی۔

شافیہ کے جاتے ہی جس استحقاق سے اس نے پورے مالکانہ حقوق کے ساتھ کچن میں قدم رکھا تھا۔ یہ سارا نشہ ناشتے کے دوران ہی ہرن ہو گیا۔ جب آنٹی اپنی وہیل چیئر کے ہمراہ اس کے سر پہ سوار ہو گئی تھیں۔ تب ان پہ فلک کے پھوہڑپن کے ۔۔۔ کئی راز آشکار ہوئے تھے۔ اس نے پورا کچن چھلکوں اور برتنوں سے بھر دیا تھا۔ آنٹی کی کنٹری اور واویلے کو سنا تو ہاتھ سے آئل کی بوتل گر پڑی۔ پورا فرش چکنائی سے بھر گیا تھا۔ وہ فرش دھونے میں لگی تو دودھ ابل ابل کر فنا ہو گیا۔ اوپر سے فینا کا بھونپو۔

پھر کپڑوں کا ڈھیر دھوتے ہوئے اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔ صفائی کرتے'دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا۔ آنٹی سر پہ کھڑی ہو کر صفائی کرواتی تھیں۔ ایک ایک کونے سے گرد نکلواتی تھیں۔

پھر دوپہر کے کھانے کی باری آئی۔ تب بھی آنٹی سر پہ سوار۔۔۔ سالن جل گیا۔ روٹیاں کچی رہ گئیں۔ برتن ہاتھوں سے گر گر کر ٹوٹتے رہے۔ فینا بھوکی چلاتی رہی۔ آنٹی سر تھام کر بیٹھی تھیں اور زوہیب جو شافیہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ابھی ابھی گھر آیا اور مچھلی بازار بنے گھر کو دیکھ کر چکرا گیا۔ فلک تھک ہار کر اپنا سر گود میں گرائے بیٹھی تھی۔ امی دہائیاں دے رہی تھیں۔ فلک کو کوسنے 'طعنے 'باتیں ۔۔۔ لحاظ تو وہ بھی نہیں کرتی تھیں۔

"ارے 'ایسی پھوہڑ تھی ۔۔۔ ہمیں تو اللہ نے بچالیا۔ کیسی سلیقہ مند بہو خدا نے مجھے دی۔ ایک دن بھی ماتھے پہ شکن نہ آئی ۔۔۔ میں کہتی ہوں زیبی!میری شافی کو رات سے پہلے پہلے گھر لے آ ۔۔۔ ورنہ اپنی شکل مت دکھانا ۔۔۔ کیا کہہ دیا تم نے۔ جو وہ دل پہ صدمہ لے کر گھر چھوڑ کے چلی گئی۔" امی کو مارے صدمے کے ہول اٹھ رہے تھے۔ انہیں زوہیب کی طرف متوجہ دیکھ کر فلک نے بھی بے ساختہ زوہیب کو مخاطب کیا تھا۔

"زوہیب!تم ابھی کے ابھی شافیہ کو لے آؤ۔ شافیہ کے بغیر اس گھر کو کوئی نہیں چلا سکتا ۔۔۔ اور تمہاری بیوی دنیا کی سب سے اچھی بیوی ہے۔ ایک آسکر سے اوپر والے ایوارڈ کو ڈیزرو کرتی ہے۔ مجھے اماں کے بلاوے کی فکر نہ ہوتی تو شافیہ کو ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کرتی ۔۔۔ اور تم پلیز!کبھی کسی نادان دوست کی باتوں میں آکر اپنی ہیرے جیسی بیوی کو کبھی مت کھونا ۔۔۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی۔ اس کے لیے شافیہ سے بھی غائبانہ معافی مانگتی ہوں۔ اچھا ۔۔۔ جلد ملنے کے لیے خدا حافظ ... عنقریب ملاقات رہے گی۔ جب ہم پڑوسی بنیں گے یا محلہ دار میں شافیہ سے اس کے پہاڑ جتنے حوصلے اور برداشت صبر'تحمل اور سلیقے کی کلاس ضرور لوں گی۔"

فلک نے اپنے الجھے بکھرے بالوں کو سمیٹا ۔۔۔ اندر سے اپنا بیگ اٹھایا اور لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"میری ویگن نکلنے والی ہے۔ جاتی ہوں' بائے بائے آنٹی!" اس کی آواز پیچھے تک اور اوپر تک گونجتی رہ گئی تھی۔ اور یعنی؟ جی ہاں ٹھیک سمجھے۔ اوپر والا پورشن۔ جس کے کارنر والے کمرے کی کھڑکی میں شافیہ کھڑی تھی۔ اور نیچے کے تمام مناظر کو دیکھ رہی تھی۔

جو کچھ نیچے چل رہا تھا۔ وہ شافیہ کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

اور نیچے کیا ہوا تھا۔ اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

سدا کی کند ذہن شافیہ نے منظر سے ہٹ کر ہر چیز کی اصلیت واضح کر دی تھی۔ اس کے منظر سے ہٹتے ہی ہر ایک چیز منظر پہ ہی نہیں اپنی جگہ پہ بھی آگئی تھی۔

گو کہ تھوڑا صبر سے کام لینا پڑا تھا۔ جب فینا بھوک سے چلا رہی تھی یا پھر زوہیب جب اسے ڈھونڈنے کے لیے باہر دھکے کھانے جا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ چھلانگ لگا کر اسے باہر جانے سے روک لے۔

لیکن بہت ساری چیزوں کو ٹھیک کرنے کے لیے یہ سب کرنا ضروری تھا۔

سب سے پہلے فلک جیسی کوالیفائیڈ لڑکی کو احساس دلانا تھا کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ انسان اپنی قسمت سے زیادہ کچھ نہیں پا سکتا۔ اور جو کوئی بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بوجھ اٹھانے کی طاقت بخشتا ہے۔

اور یہ بھی کہ ہر خواہش کا پورا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ زوہیب کو پا لیتی مگر کبھی نباہ نہ کر سکتی۔ کیونکہ زوہیب اپنی ماں سے جڑا تھا اور اس کی ماں کو برداشت کرنا ایسا آسان کام نہیں تھا۔

اس لیے آمنہ نے فلک پہ شافیہ کو ترجیح دی تھی۔ کیونکہ شافیہ میں تحمل' صبر اور برداشت کا مادہ بے بہا تھا۔ منظر سے ہٹنے کا ایک مقصد زوہیب کو یہ جتلانا بھی مقصود تھا کہ اسے شافیہ کی محبت کا احساس ہو اور وہ کم از کم آئندہ زندگی میں اسے کند ذہن کہنے سے گریز کرے۔

اور یہ تو شافیہ جانتی ہی تھی۔ جیسی ہی اس نے اوپر والے پورشن سے نیچے اترنا تھا۔ تھکے ہارے گلی گلی کی خاک چھان کر آئے زوہیب نے ہکابکا ہو جانا تھا۔ پھر ساری کہانی تو اسے سمجھ آہی جاتی۔ سو زوہیب آئندہ زندگی میں کبھی اسے کند ذہن یا احمق نہیں کہہ سکتا تھا۔

جہاں تک زوہیب کی اس سے محبت کا تعلق تھا۔ تو شافیہ کو یقین آچکا تھا۔ زوہیب کی زندگی میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں... کیونکہ زوہیب کے اعتبار اور فلک کے سامنے اقرار نے عمر بھر کے لیے اسے سرخرو کردیا تھا۔ منظر سے ہٹنے کا ایک اور مقصد بھی تھا۔

اب زوہیب اور زوہیب کی امی کبھی بھی 'عمر بھر مذاق میں بھی فلک کو بہو بنانے کے ملال کا اظہار نہیں کریں گے اور زوہیب کبھی بھی فلک کے نام پر ٹھنڈی آہ نہیں بھرے گا۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز تھی... جسے شافیہ کی اعلیٰ ظرفی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس نے فلک کی پلاننگ اور سطحی سوچ کو زوہیب اور امی سے ہمیشہ کے لیے چھپالینے کا عہد 'خود سے کر کے فلک کا بھرم رکھ لیا تھا اور جس طرح اس نے شافیہ کو زوہیب سے بدگمان کرنا چاہا تھا۔ وہ سب کچھ درگزر کر گئی تھی۔ وہ کبھی بھی زوہیب یا فلک کو نہیں بتائے گی کہ اس نے فلک کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ فلک کو زوہیب کی نظروں سے کبھی نہیں گرائے گی۔ اور جو دراڑ ان دونوں کے درمیان اس کی وجہ سے آئی تھی اسے خود مٹادے گی۔ کیونکہ فلک عنقریب زوہیب کے دوست ڈاکٹر آدم بیزار کی زوجہ محترمہ بننے والی تھی۔

فلک نے یہاں سے بھاگنے اور آدم کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے بہت غور و فکر کیا تھا۔ آدم چھڑا چھانٹ تھا۔ نہ ماں نہ باپ یعنی نہ ساس نہ سسر نہ نند نہ دیور... کوئی بھی جھنجٹ نہیں تھا۔ اس کی زندگی اس گھر سے زیادہ اس گھر میں پرسکون گزر سکتی تھی۔

لیکن فلک ایک بات پہ غور کرنا بھول گئی تھی کہ آدم کی پہلی دو منگنیاں کیوں ٹوٹیں؟

جی ہاں... آدم بھی نا... زوہیب کی امی کے قبیلے سے ہے۔ انتہائی صفائی پسند 'تنگ مزاج اور بلا کا نکتہ چین... امی اور آدم بیزار میں ایک ہی روح بیک وقت قیام کرتی ہے۔

نوکرانی وہاں بھی نہیں ٹکتی... کیونکہ آدم بیزار بھی امی کی طرح سر پہ کھڑے ہو کر... جی ہاں 'سمجھ گئے نا'!

اور اب شافیہ کو نیچے چلے جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ساس اور شوہر کا مزید امتحان لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے خوش مزاج 'ہنس مکھ اور پل بھر میں ہر ایک سے بے تکلف ہو جانے والے محبوب شوہر کی بے بسی اور صبر کا مزید امتحان نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ فیصلہ کر کے نیچے اترنے لگی تھی۔ اور اسے شان بے نیازی سے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر زوہیب چیخ رہا تھا۔ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

''امی... امی شافیہ اوپر ہے۔'' خوشی کی شدت 'تعجب 'حیرت اور شافیہ کی اسی گھر میں موجودگی نے اسے ہکلا دیا تھا 'وہ خوشی کے مارے چلا رہا تھا۔ اور امی شکرانے کے نفل ادا کرنے جارہی تھیں۔

صد شکر کہ شافیہ 'اوپر والے نے 'دوبارہ بھیج دی تھی۔ انہوں نے اپنے تئیں زوہیب کی بات دعائیہ انداز میں مکمل کردی تھی۔ شافیہ کی قدر و قیمت کوئی ان چند گھنٹوں میں امی سے پوچھتا۔

لیکن زوہیب ساری صورت حال کو لمحوں میں سمجھ کر ہنسنے پہ آیا تو پھر ہنستا ہی چلا گیا تھا۔ کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ کس طرح شافیہ نے منظر سے ہٹ کر ماحول کو فلک کے وجود سے پاک کیا تھا۔ کس طرح اپنے دماغ کو کام میں لا کر فلک کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور کس طرح فلک کا بھرم توڑے بغیر اسے ٹھکانے لگادیا تھا۔

اور پھر شافیہ نے زوہیب پہ عمر بھر کے لیے ثابت بھی کردیا تھا کہ کند ذہن کون ہے؟

✡

بنتِ سحر

کھٹی میٹھی یادیں

کاش.... کہ کبھی ایسا ہو سکتا کہ جس طرح مردہ تتلیوں اور سوکھے پھولوں کو ڈائریاں اپنے اندر مقید کر لیتی ہیں اسی طرح "یادوں" کو بھی کسی بوسیدہ کتاب میں بند کر دیا جاتا اور جب، جب دل اداس ہوتا تو رات کے دھندلکے میں — ہلکی روشنی میں انہیں پڑھا جاتا ہنسا جاتا... رویا جاتا... جیسے ہی میں نے زنگ آلود تالا کھولا گھر کے در و دیوار سے لپٹی پھپھوندی زدہ ہوا کسی دباؤ کے تحت باہر نکلی تھی، اس ہوا میں زرد رُتوں کی سی اداسیاں تھیں... میں نے آنگن میں قدم رکھا تو دل کے اندر سے کہیں ہلکی سی ٹیس ابھری، موم بتی کے دم توڑتے شعلے کی طرح گول برآمدہ کی گولائی دائرہ در دائرہ گھومتی ہوئی آج بھی اپنی جگہ قائم تھی۔ تین ستون آج بھی اسی شان و شوکت سے ایستادہ تھے۔ آنگن میں لگا شہتوت کا قد آدم درخت خزاں کی زد میں آ کر اپنا لباس اتار چکا تھا، مگر کئی زرد پتے ابھی باقی تھے۔ وسیع و عریض صحن میں لگا چمن کب کا اجڑ چکا تھا۔ اب وہاں ویرانیاں مقیم تھیں۔ شان و شوکت اور شاہانہ طرز سے... وقت نے مجھے گھسیٹا اور ماضی کے بیس سالہ چکر میں — لا کھڑا کیا۔ زرد اور نارنجی دھوپ اتراہٹ سے آنگن میں قدم دھر رہی تھی... ہواؤں میں خوشی کے رنگ تھے پرندوں کی آوازوں میں علی سازوں کا سا گمان گزرتا تھا... میں بریانی میں چمچہ ہلاتے ہوئے خیالوں کی رت پر محو پرواز تھی... اماں کی پاٹ دار آواز نے خیالوں کے طلسم کو چھناکے سے توڑا تھا۔

"اری او شکریہ خانم!... بریانی دیگچی سے لگنے نہ پائے ورنہ تیرے ابا تجھے تو کچھ نہ کہیں گے اور دنیا جہاں کے ساری مغلظات مجھے سنائیں گے جو ان کی دانست میں کافی شیریں اور شریفانہ — ہیں۔" میں بے دھڑک ہنستی چلی جاتی... آنکھوں میں پانیوں کی محفل جم جاتی، شہادت کی انگلی کی پور سے آنسو صاف کرتے ہوئے اماں کو جواب دیتی۔

"اماں... اللہ جھوٹ نہ بلوائے سنا تھا، بھلے وقتوں میں جان دینے چلے تھے آپ کے پیچھے.... بھلا خودکشی کرنے کا سوچا بھی تو پتنگ کی ڈور گلے سے باندھ لی۔"

بیس سال کے عرصہ کو انگلیوں پر گننا کتنا آسان ہوتا ہے ناں.... کچن کے دروازے کا پینٹ ویسا ہی تھا کچھ بھی تو فرق نہ آیا تھا۔ اماں نے اسی پینٹ کے سلسلہ میں ابا سے لڑائی کی تھی۔ ابا سفید پینٹ کروانے کے حق میں تھے، مگر اماں کوئی گہرا رنگ کروانے پر مصر تھیں، جب کافی دیر تک

صلح صفائی نہ ہوئی تو ثالثی کی طرف رخ کیا گیا تھا۔

"بھلا بتاؤ شکریہ! باورچی خانے کی دیواروں پر سفید رنگ اچھا لگے گا؟" اماں نے پوچھا تھا مجھے کوئی ایسا حل تلاش کرنا تھا جس سے دونوں فریقین کے دل میں بھڑکتے، پھڑکتے جذبات پر برف پڑ جائے۔

"باہر کی دیواروں پر سفید رنگ کروالیں اور اندرونی دیواروں پر کوئی گہرا رنگ ٹھیک رہے گا۔" اور دونوں نے میری دانائی، فہم و فراست کو سراہا تھا۔

عصر کا وقت تھا، ہوا میں ہلکی ہلکی یادوں کی سرگوشیاں تھیں۔۔۔ اماں، ابا کی میں اکلوتی لاڈلی اولاد تھی۔۔۔ لڑکیاں تو ماں باپ کے آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں۔۔۔ جنہیں دوسروں کے سپرد کرنا ہی پڑتا ہے، پھر دوسرے اس چڑیا کو اس طرح قید کرتے ہیں کہ واپسی کی امید ممکن ہی ہو جاتی ہے۔ ابا نے اپنی دوستی کے زعم میں مجھے اپنے پاکستانی دوست جو کہ لاس اینجلس میں مقیم تھے۔۔۔ کے بیٹے سے بیاہا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ دولت خوشی نہیں دیتی، اصل چیز تو محبت اور عزت ہوتی ہے۔۔۔ اور میں آج یہ گواہی دینے کو تیار ہوں کہ مجھے دیار غیر میں نہ عزت ملی تھی اور نہ ہی محبت نامی چیز کو میرے دامن میں ڈالا گیا تھا۔۔۔ میں صابر بن گئی ان محنتوں کو کیسے رائیگاں ہونے دیتی، جو اماں، صبح شام مجھ پر کرتی تھیں۔۔۔ صبر میری گھٹی میں پڑا تھا، گھٹی میں پڑی ہوئی چیزوں سے بغاوت نہیں کی جاتی۔۔۔ میں بھی نہ کر سکی چاہ کر بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

سیلی سیلی ہواؤں میں جانے کہاں سے نمی کا ظہور ہوا تھا۔۔۔ سارے جسم و جاں میں کپکپی کسی موذی مرض کی سی اذیت سے وارد ہوئی تھی میں برآمدے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں پہروں میں اور ابا مباحثہ کرتے تھے۔ اماں اکتا کر اٹھ جاتیں۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، کرشن چندر سے لے کر ابوالکلام آزاد اور میر تقی میر تک بات چل نکلتی۔۔۔

برآمدے کی سات سیڑھیاں تھیں۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہیں، مگر میں نے انہیں پھر بھی گنا تھا۔ میرے پیچھے آہٹ سی ہوئی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ ماہا ہوگی، میری بیٹی ماہا بالکل میری طرح ہے۔

"امی۔۔۔! نانو اور نانا نے کتنی اچھی زندگی گزاری ہو گی ناں؟" وہ پوچھ رہی تھی اسے گزرے وقت کے اوراق پلٹ کر دیکھنے میں گہری دلچسپی ہے۔

"ہاں۔۔۔ ان کی زندگی مکمل تھی ہر لحاظ سے۔۔۔ دونوں میں لڑائیاں بھی خوب ہوتی تھیں، مجھے ثالث بنا دیا جاتا۔ اماں جب ناراض ہوتی تھیں تو انھی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ جاتی تھیں۔۔۔ بہت روتی۔۔۔ تھیں اور ساتھ ساتھ چاند سے باتیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں گفتگو کے بہت سے رموز آتے تھے۔۔۔ ابا کو چاند اپنا رقیب لگا کرتا، وہ تلملاتے رہ جاتے۔ کھانا بھی نہ کھاتے مکمل ناراضی کا اظہار کرتے تھے، مگر صبح ——— پتا چلتا پاٹ باٹ سے کھانا غائب اور۔۔۔ اماں کہہ رہی ہوتی تھیں کہ کمبخت بلی آکر کھانا نوش فرما گئی۔ مگر ایک بات کہوں شاید ہم دونوں جانتے تھے کہ وہ "بلی" کون تھی۔۔۔ مگر ہم ہمیشہ اس رائے پر قائم رہتے کچھ باتوں پر قائم رہنے میں ہی ان کا اصل حسن پوشیدہ ہوتا ہے۔"

سنہری دھوپ سی یادوں کا عکس میرے چہرے پر پھیلا تھا۔ ماہا برآمدے میں جا کھڑی ہوئی تھی اور کونے میں رکھے تخت کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ بیگ زمین پر ہی چھوڑ گئی تھی میں بھی بیگ تھامے برآمدے میں آ گئی۔

صنوبر کی خوشبودار لکڑی سے بنے اس تخت کا ایک پایہ ٹوٹ چکا تھا۔ میرے وجود کی دنیا میں افسردگی داخل ہو گئی تھی ماہا کہہ رہی تھی۔

"امی! یہ تخت کس لیے تھا۔۔۔ اس پر کون بیٹھتا تھا؟"

"تمہاری نانو یہاں آرام کرتی تھیں۔۔۔ کبھی کبھار میں اور ابا بھی اس پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے لگتے تو اماں سخت غصہ ہوتی تھیں۔۔۔ مگر شاید میں اور ابا مستقل مزاج

تھے، بہرے بن جاتے۔ ابا کہتے تھے ہم دونوں اس دنیا کے سب سے اچھے فنکار ہیں... تالیاں بجتیں... مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے... مگر اصل قصہ تو شام کے کھانے پر ہوتا تھا۔"

مجھے لگ رہا تھا آج بھی میں پرانے وقت میں کھڑی ہوں... آنسو آنکھوں میں محفل جمانے کے منتظر نظر آنے لگے تو میں نے انہیں بمشکل واپس دھکیلا... ماہا نے میرا ہاتھ پکڑا۔

"پھر کیا ہوتا تھا امی! پلیز بتائیں۔" اس کا تجسس عروج پر تھا۔

"پھر شام کو اماں بینگن کا بھرتہ بنا لیتی تھیں... اسی طرح ہم سے بدلہ لیا جاتا' وہ جانتی تھیں کہ ابا اور مجھے بینگن کچھ خاص پسند نہ تھے... ابا کہیں سے اچار کا پیکٹ برآمد کرتے جو ہم نے ایسے حالات میں حفظ ماتقدم کے طور پر —— چھپا رکھا ہوتا تھا... چٹخارے لے لے کر چپاتی کے ساتھ اچار کے مزے اڑائے جاتے... اماں تیکھی نظروں سے قتل کرنے کے درپے نظر آتیں اور ہماری طرف سے پیٹھ موڑ لیتی تھیں' جانے آج وہ اچار ملتا بھی ہے یا نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

برآمدے کی چھت والا پنکھا مکھیوں کی بیٹ سے اٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ اماں —— تھیں تو مجال ہے، جو گرد کا کوئی ذرہ بھی نظر آجاتا۔ مائیں سب سے بڑی نعمت ہوتی ہیں... کسی حریری کپڑے میں ملبوس فرشتہ کی طرح' مقدس اپسراؤں کی سی... میں نے اسٹور روم کا خطی دروازہ کھولا تھا... ابا نے اس دروازے کو خطی دروازہ یوں کہا تھا کہ وہ دروازہ ایک کھو کھلی جگہ کے ساتھ تھا۔ جہاں خط اور بل وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ فرش پر گرد کی طویل۔ چادر پھیلی ہوئی تھی۔ روشن دان بند تھے... کونوں میں جالے نظر آرہے تھے... مجھے لگا اہرام مصر کی کسی عمارت میں محبوس ہوئی کھڑی ہوں جہاں روشنی کا کوئی روزن ہی نہیں... میں آہستگی سے چلتی ہوئی دیوار گیر الماری کی طرف آئی تھی... گرد پر میرے پیروں کے نشان نظر آنے لگے تھے... میرے پیروں سے اک رسی کا ٹکڑا ٹکرایا تھا۔ میں دیوانگی کے عالم میں دوڑتی ہوئی ماہا کی طرف باہر آئی تھی۔

"ماہا! یہ دیکھو... یہ جھولے کی رسی کا ٹکڑا ہے' پتا ہے یہ کیسے بنا تھا؟" وہ برآمدے کے فرش پر بیٹھی وہاتی ٹرنک کھولے دیکھ رہی تھی۔ میری طرف نظر اٹھائی تو میں نے دیکھا اس کے آئی میک اپ کا حشر ہو چکا تھا۔ وہاں اب گرد کی تہہ جم چکی تھی۔

"پتا ہے —— یہ رسی میں نے اور ابا نے پرانے ہو چکے ادوان کو ادھیڑ کر بنائی تھی... پورے آٹھ دن لگے تھے اس کو بنانے میں... شام کی راجدھانی میں جب دودھیا چاند آسمان کی چوکھٹ پر وارد ہوتا... تو میں اور ابا جھٹ سے رات کا کھانا کھا کر دوبارہ رسہ بنانے لگ جاتے۔ اماں صلواتیں سناتی رہتی تھیں مگر شاید ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا ابا کا محبوب مشغلہ تھا۔" میری ابھی بات بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ ماہا چیختی چلاتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

"امی... وہ دیکھیں میرے ہینڈ بیگ پر موٹی تازی چھپکلی بیٹھی ہوئی ہے ذرا آنکھیں دیکھیں اس کی اف یہ تو دیکھ بھی میری طرف رہی ہے۔" وہ خوف سے تھر تھر کانپتی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی...... وہ موٹی تازی چھپکلی اس کے ہینڈ بیگ سے رینگ کر برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف نکل گئی تھی... ماہا کی آنکھیں بند تھیں اور وہ باقاعدہ لرز رہی تھی۔ مجھے کسی نے اٹھا کر ماضی کے ست رنگی ماحول میں لا کھڑا کیا تھا... جہاں تتلیوں کے رنگ سنہری تھے... اور ہواؤں میں عطر کی مہک تھی... میں جو کیمسٹری کے فارمولے رٹ رہی تھی اماں کو دیکھ کر حیران رہ گئی جو غصے سے لال ہو رہی تھیں۔

"تمہارے ابا اب اس گھر میں رہیں گے یا میں... بڑی چچی بنی پھرتی ہو باپ کی... کان کھول کر میری بات سن لو شکریہ خانم۔" وہ جب بھی غصہ میں ہوتی تھیں

میرا پورا نام لے کر پکارتی تھیں۔۔۔ میں ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مگر اماں ہوا کیا ہے۔۔۔؟" میں نے ادھر سوال کیا اور ادھر اماں پھٹ پڑیں۔

"ساری زندگی تمہارے ابا کو مجھ سے بیر رہا۔۔۔ انہیں پتا بھی ہے کہ اس وقت میرے ڈرامے کا ٹائم ہوتا ہے۔۔۔ چھپکلیوں والا چینل لگا کر چلے گئے' کہنے لگے ابھی اشتہار چل رہے ہیں کچھ دیر میں ڈرامہ آئے گا۔۔۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھیں ڈرامہ نہ لگا۔ سوچا گھڑی کے سیل خراب ہو گئے ہوں گے۔۔۔ کچھ دیر گزری چھپکلیاں' سانپ نظر آنے لگے۔۔۔ اگر آج میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو۔۔۔ کہہ دو اس شخص کو کہ یا تو وہ رہے گا اس گھر میں یا پھر میں۔" اماں کو چھپکلیوں سے بہت ڈر لگا کرتا تھا اب وہ ـــــ کانپ رہی تھیں۔۔۔ ابا غسل خانے سے باہر آئے تولیہ کندھے پر رکھا ہوا تھا۔

"چچ۔۔۔ ثریا خانم۔۔۔ اس وقت شام کے وقت آپ کہاں جائیں گی۔۔۔ صبح ہو لینے دیجیے پھر چلی جائیے گا۔"

دھماکے سے ثریا خانم نے تن فن کرتے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے ابا کو دیکھا وہ گنگنا رہے تھے اس کا مطلب کل صبح ناشتہ مجھے بنانا تھا۔۔۔ میرا تو ٹیسٹ بھی تھا۔ اس قیامت خیز دھماکے کی گونج سے اندازہ ہو رہا تھا کہ خاتون خانہ کافی غصے میں ہیں۔۔۔ صبح کا ناشتہ نہ ملنا یقینی بات تھی مگر غالب امکان تھا۔۔۔ دوپہر کے کھانے میں مجھے اور ابا کو بازاری چپاتیاں اور اچار کے چٹخارے لینے تھے۔۔۔ وقت نے میرے دامن میں یادوں کے بہت سے خزانے رکھے ہیں۔۔۔ میں بیتے دنوں کی پہیلیاں کھوجتی ماہا کو یقین دلا رہی تھی کہ اب کوئی چھپکلی نہیں آئے گی۔۔۔ اماں کی یاد بہت شدت سے آ رہی تھی۔۔۔

نیم کی موٹی شاخ پر جھولا ڈالا گیا۔۔۔ میں ہر وقت کھاتے پیتے' پڑھتے اس پر جھولتی رہتی تھی۔ ابا بچپن سے مجھے اپنی سائیکل پر اسکول چھوڑنے جاتے تھے۔۔۔ سائیکل کی جوانی ڈھل چکی تھی اور بڑھاپے کی آمد آمد تھی۔۔۔ راستے میں یہ بات یقینی تھی کہ سائیکل کا چین چھ بار اترتا تھا۔۔۔ میں اور ابا باری باری چین چڑھاتے تھے۔ میرا یونی فارم خراب ہو جاتا تھا مگر ہم دونوں کو مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔۔۔ اماں تھیں نا کپڑے دھونے والی۔۔۔ صفائی' ستھرائی کی دلدادہ۔۔۔

راستے میں خوب باتیں ہوتی تھیں اتوار کے روز فٹ پاتھ پر لگنے والے کتابوں کے اسٹال پر گھنٹوں میں اور ابا کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے۔۔۔ وہیں روڈ پر کتابیں منتخب کرنے کے معاملے میں ہماری بحث چھڑ جاتی۔۔۔ ابا کو کرشن چندر اور اشفاق احمد کی کتابیں لینی ہوتی تھیں اور مجھے بانو قدسیہ اور مستنصر حسین تارڑ کی چاہ ہوتی تھی۔۔۔ بک اسٹال والے انکل ہم باپ بیٹی کی دھواں دھار بحث پر زیر لب مسکرائے جاتے۔۔۔ آخر کار دونوں کی پسند سے کتابیں لی جاتی تھیں۔۔۔ میں نے نویں کلاس میں مستنصر حسین تارڑ کی "پیار کا پہلا شہر" پڑھی تھی۔ آج تک میں اس اداسی کے حصار میں ہوں جو مجھے پہلی بار اسے پڑھنے پر ہوئی تھی' کیا لفظ تھے' اداسی کا احساس لفظوں میں ڈھل گیا تھا۔۔۔ میں نے اس دن "سنان" کو بہت برا بھلا کہا تھا۔۔۔ اور میں "پاسکل" کے ساتھ ساتھ روئی تھی۔۔۔ جس کسی نے بھی یہ کتاب نہیں پڑھی اس نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔۔۔ میں ہر کلاس میں پوزیشن لیتی تھی۔۔۔ ہر سال میں رزلٹ والے دن تمغہ تھامے گھر میں داخل ہوتی تھی۔۔۔ ابا پر اس دن میری فرمائش پوری کرنا لازم ہوتا تھا۔۔۔ اماں اپنی خوشی کا اظہار کچھ خاص چیز پکا کر کرتی تھیں۔۔۔ ابا نے لکڑی کی الماری بنوائی تھی۔۔۔ اس میں میرے تمغے سجا دیے گئے۔۔۔ ہر صبح میں انہیں دیکھتے ہوئے اسکول جاتی تھی۔۔۔ پھر بچپن سے لڑکپن اور جوانی نے میرے گھر کے آنگن میں قدم رکھا۔۔۔ ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔۔۔ ابا اور اماں نے ہامی بھر لی تھی۔ میں نے شور مچایا' دہائیاں دیں مگر میری کسی بات کو خاطر میں نہ لایا گیا۔۔۔ اس کے ایک ہفتے بعد رات کے تین بجے چاند کی گھٹتی روشنی میں میں نے ابا کو دیکھا۔۔۔ وہ رو رہے تھے بے تحاشا میں حواس باختہ سی بیٹھی تھی۔۔۔ وہ کہہ رہے تھے

"تیری ماں ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔۔۔ وہ تمانی وہاں چلی گئی جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔۔۔ ہمیں اکیلا چھوڑ گئی۔۔۔ کتنا لڑتی تھی ہم سے۔۔۔ ہم تنہا ہو گئے۔"
وقت نے ابا اور میرے وجود پر اداسیوں کی چادر اوڑھا دی۔ اب دن چڑھتے تھے شامیں اترتی تھیں 'راتیں ڈھلتی تھیں مگر وہ جو "کچھ" کھونے کا احساس تھا وہ ہمارے وجود میں سرایت کر گیا۔ اماں ہمیں اکیلا چھوڑ گئی تھیں۔۔۔ اب جھولا خالی – نیم سے لٹکتا رہتا۔۔۔ ابا اور میں نے خاموشی کو اپنا اوڑھنا' بچھونا بنا لیا تھا۔۔۔ مجھے وہ شعر اب سمجھ میں آیا تھا جس کی تشریح کے حوالہ سے میں اور ابا اکثر بحث کرتے رہتے تھے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

میں نے گھر کی صفائی' ستھرائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔۔۔ اماں نے مجھے سینا' پرونا' کھانا پکانا' سب سکھایا تھا۔ انسان اکیلا کر جاتے ہیں' مگر ان کی یادیں ہمیشہ' ہر پل' ہر لمحہ زندگی کے سفر میں ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔

لاس اینجلس کی فضاؤں میں' میں انہی یادوں کے سہارے زندہ تھی۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو شکریہ خانم کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔۔۔ زندگی جانے اب کس رنگ میں ڈھلنے والی تھی۔۔۔ آنگن کی چڑیاں پرواز کر جاتی ہیں' مگر یادوں کی پوٹلیاں سدا اپنے ساتھ ساتھ رکھتی ہیں۔ رات کے آخری پہر پورے چاند کی رات میں بابل کے آنگن کی یادوں پر ہنسا جاتا ہے۔۔۔ رویا جاتا ہے۔۔۔ اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بیتے وقت کو کھوجا جاتا ہے' آنکھوں میں نمی کے ساتھ۔۔۔ ماہا میرے پاس کھڑی تھی۔

"امی ہم اب واپس نہیں جائیں گے۔۔۔ بابا کی وفات کے بعد دادا نے ساری زندگی آپ سے کمائی کروائی ہے اور کھائی ہے۔ امی جانے لوگ کیوں بیٹیاں اتنی دور بیاہ دیتے ہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"
میرے شوہر کی موت نے مجھے توڑ دیا تھا۔ فاصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ میں ابا کی وفات پر بھی نہ آسکی تھی۔ لاوارثوں کی طرح انہیں دفنا دیا گیا تھا۔ میں نے ماہا کا سر تھپکا۔

"بیٹا جی' جانے کیوں بھولے والدین کو لگتا ہے کہ ان کی بیٹیاں دیار غیر میں خوش رہیں گی۔ ہر کسی کو لگتا ہے کہ دیار غیر میں پیسہ بہت ہوتا ہے' مگر سچ کہوں ایسا بالکل بھی نہیں ہوتا۔۔۔ اگر ایسا ہو بھی تو لعنت ایسی دولت پر جو عزت نہ دے سکے۔" میں نے کتنی کوشش کی تھی ناں۔۔۔ ان آنسوؤں کو روکنے کی مگر یہ چھلک ہی پڑے۔ ماہا میرے آنسو پونچھ رہی تھی۔
"امی آپ مجھے بھی کہیں دور تو نہیں بھیج دیں گی؟؟"
اس کی آواز میں وسوسے تھے' خوف تھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔
"نہیں۔۔۔ ایسا سوچنا بھی مت۔۔۔ مجھے تمہیں یہی سبق دینا تھا کہ اپنے وطن کی مٹی سے عزیز کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بابل کے آنگن کی چڑیوں کو اتنا دور نہیں ہونا چاہیے کہ انہیں بابل سے ملنے کے لیے صدیوں کا سفر طے کرنا پڑے۔۔۔" شام کی نارنجی سرخی آسمان کی سرحدوں سے منعکس ہو کر زمین پر پہنچ رہی تھی۔۔۔ مجھے لگا ایک پل کے لیے میں واپس ماضی کی سڑک پر پہنچ گئی ہوں۔۔۔ جہاں آج بھی درختوں کی موٹی شاخوں پر جھولے لٹک رہے ہیں اور میں ابا کے ساتھ کسی نئی کتاب پر بحث کر رہی ہوں۔ اور اماں باورچی خانے میں بیٹھی بریانی کو دم دے رہی ہیں۔۔۔ اور بریانی کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ اور میں آج جھولا ڈالے سنہری ڈائری کے تعارفی صفحے پر لکھی نظم گنگنا رہی ہوں۔۔۔

"کچھ کھٹی میٹھی یادیں ہیں
کچھ الجھی سلجھی باتیں ہیں

کچھ بابل کی یادیں ہیں
کچھ آنگن کی برساتیں ہیں۔۔۔
کچھ زرد زرد سی دوپہریں' کچھ نارنجی سی شامیں ہیں
کچھ رات کا آخری پہر بھی ہے کچھ آسمان پہ اکیلا چاند بھی۔
کچھ کھٹی میٹھی یادیں ہیں۔۔۔"

نازیہ رزاق

"ہم حویلی کب تک پہنچ جائیں گے کبیر چاچا۔" ٹیب پہ اپنی پسندیدہ مووی دیکھتے دیکھتے یکدم اکتا کر عیان نے کہا۔

"بس بی بی۔ سمجھیں اپنا علاقہ شروع ہوا ہی چاہتا ہے" کبیر چاچا نے مؤدب انداز میں جواب دیا اور گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔

"اچھا!" عیان نے کھڑکی سے باہر بے دلی سے نگاہ ڈالی پھر نگاہ واپس پلٹنا بھول گئی۔ عیان حسن شاہ نے آج سے پہلے کبھی اتنا حسین منظر نہیں دیکھا تھا یا پھر پہلے کبھی محسوس ہی نہ کیا تھا۔ دراصل دیکھنے اور محسوس کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پورے علاقے میں اس وقت سرمئی شام پھیل چکی تھی سڑک کے دونوں اطراف دیو قامت درخت کھڑے تھے جبکہ سڑک کے بائیں جانب نہر تھی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ نہر سڑک کے ساتھ چل رہی ہے یا سڑک نہر کے۔ بہرحال دونوں ساتھ ساتھ تھیں۔ گندم کی فصل جو پک کے تیار ہو چکی تھی۔ شام کے دھندلکے میں ایسے چمک رہی تھی جیسے پیتل کے برتن۔ عیان حسن شاہ بہت سالوں بعد اپنے آبائی گاؤں "سیداں والی" میں قدم رکھ رہی تھی۔ آج سے بہت سالوں پہلے وہ اپنی

مکمل ناول

منجھلی پھوپھو کی شادی پر گاؤں آئی تھی مگر یہ بہت سالوں پہلے کی بات ہے۔ عیان کو اب اتنا یاد بھی نہیں تھا۔ ابھی بھی اسے گاؤں آنے کی اجازت کبھی نہ ملتی اگر اس کے بابا جان کی طبیعت اتنی بگڑ نہ گئی ہوتی۔ وہ اب پہلے سے بہتر تھے مگر سفر نہیں کر سکتے تھے اس لیے عیان نے بڑی مشکلوں سے گاؤں آنے کی اجازت لی تھی۔ عیان اپنی سوچوں میں مستغرق تھی جب گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔

"کیا ہوا کبیر چاچا؟" اس نے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے ذرا نخوت سے پوچھا لیکن پھر جواب سننے کی مہلت ہی نہ ملی اور عقب سے شدید فائرنگ کی آواز گونجی۔ اس شور میں اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے بازو سے کھینچ کے باہر نکالا۔ عیان پوری قوت کے بل چیخ رہی تھی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے مدد کے لیے کبیر چاچا کو پکارا مگر وہ خون میں لت پت زمین پر گرے ہوئے تھے۔ خوف نے اس کے اعصاب کو مفلوج کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے ایک تیز رفتار چیز گرم سریے کی طرح اس کے دائیں بازو کو چیرتے ہوئے گزری تھی۔ عیان زمین پر گری اور اس کے بعد اس کے ذہن پہ اندھیرا چھا گیا۔

☆ ☆ ☆

پیر قدرت اللہ شاہ کے آستانے پر اس وقت ہجوم تھا کیونکہ آج جمعرات تھی اس لیے پیر قدرت اللہ شاہ خود مریدگان کے درمیان آستانے پر موجود تھے۔

کشادہ صحن میں صرف پیر قدرت اللہ شاہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ گدی نشین تھے۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا جب ایک دیو قامت شخص بڑی تیزی سے دربار میں داخل ہوا اور پیر قدرت اللہ کے کان میں بڑے مؤدب انداز میں کچھ کہا۔ پیر قدرت اللہ شاہ غیض و غضب کے مارے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے سے تفکر و پریشانی ہویدا تھی۔

"اکرم! ڈرائیور کو کہو گاڑی نکالے میں ابھی نکلوں گا اور ہاں جلال شاہ کو بتایا؟" پیر قدرت اللہ شاہ نے اکرم نامی شخص سے بیک وقت پوچھا اور بتایا تھا۔

"جی شاہ جی! چھوٹے شاہ جی تو پہنچ بھی گئے ہوں گے۔" اکرم، پیر قدرت اللہ شاہ کو مطلع کرتا ہوا عجلت میں پلٹ گیا اور کچھ دیر بعد پیر قدرت اللہ شاہ کی گاڑی دھول اڑاتی شہر جانے والی سڑک پر رواں دواں تھی۔

☆ ☆ ☆

"شاہ صاحب! اب ان کی طبیعت ٹھیک ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ آپ تھوڑی دیر بعد ان سے مل سکتے ہیں" بڑے جان لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹر نے یہ خبر سنا کر گویا تمام گھر والوں کو نئی زندگی بخش دی تھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ تشکر بھری سانس لے کر ویٹنگ روم کے صوفے پہ ڈھے سے گئے۔ کوریڈور میں مسلسل چکر کاٹنے کی وجہ سے اعصاب جیسے شل ہو گئے تھے۔ پیر قدرت اللہ شاہ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"اگر درّیہ کو کچھ ہو جاتا تو؟" اس سوالیہ نشان سے آگے ان سے کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔

پیر قدرت اللہ شاہ اپنے علاقے کی سب سے بڑی سیاسی سماجی اور روحانی شخصیت تھے۔ شہرت، عزت، حکومت صحیح معنوں میں ان کے گھر کی باندی تھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ اپنے والد محمد حسین شاہ کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی شادی پھوپھی زاد جنت بی بی سے ہوئی جو کہ نہایت نیک و صالح اور شاہ صاحب کی دل پسند بیوی تھیں۔ اللہ نے انہیں اوپر تلے تین "رحمتوں" سے نوازا پھر منتوں اور دعاؤں کے بعد "نعمت" سے بھی نواز دیا۔ تینوں بیٹیوں بالترتیب شاہینہ، زرمینہ اور بختاور کی جان ان کے اکلوتے بھائی سید حسن شاہ میں تھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ کو اپنی تینوں بیٹیوں سے بہت محبت تھی مگر چھوٹی بیٹی بختاور میں تو ان کی جان اٹکی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ بختاور کو اپنے لیے "بخت آور"

سمجھتے اور کہتے۔

"میری یہ بیٹی میرے لیے بڑی ہی بخت آور ہے اس کی پیدائش والے دن میں نے ملکوں کے خلاف اپنی سینکڑوں ایکڑ اراضی کا مقدمہ جیتا تھا۔" ملک خاندان سے دشمنی سیدوں کے خاندان میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو وراثت میں ملتی اور گھٹی میں تحفے کے طور پر دی جاتی تھی۔

وقت کا خمیر کسی مسلسل حرکت کرنے والے مادے سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ کبھی بھی کسی کے لیے بھی نہیں رکتا۔ لوگ سالوں کسی حسب خواہش لمحے کا انتظار کرتے ہیں مگر وقت ظالم عقاب کی طرح وہ لمحات چڑیا کے بچے کی طرح چھین کر لے جاتا ہے۔ صرف یاد کی کسک لیے دھندلا سا عکس ذہن و دل پر رہ جاتا ہے پھر وہ کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔

اسی چلتے ہوئے وقت کے پہیے نے پیر قدرت اللہ شاہ کے مزاج کو ایک ٹھہراؤ دیا تو دوسری طرف ان کی اولاد کو جوانی کی دہلیز پہ لا کھڑا کیا تھا۔ شاہینہ اور زرمینہ معمولی تعلیم حاصل کر کے گھر بیٹھ گئیں۔ حسن شاہ کو پیر قدرت اللہ شاہ نے پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا۔ بختاور نے بھی تعلیم جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی جسے تھوڑی پس و پیش کے بعد مان لیا گیا۔ وقت کچھ اور آگے کو سرکا۔ شاہینہ کی شادی سید وقار شاہ جو کہ پیر قدرت اللہ شاہ کے رشتہ دار تھے، سے کر دی گئی جبکہ زرمینہ کا رشتہ شاہ صاحب کے چچا زاد بھائی کے بیٹے سے طے تھا۔ جو ابھی صرف ایک سال کا تھا۔ حویلی پہ قیامت تو اس وقت ٹوٹی جب پیر قدرت اللہ شاہ نے بختاور کی منگنی کسی جگہ طے کی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ یہ سن کر سب انگشت بدنداں رہ گئے کیونکہ حویلی میں اس طرح کی جرأت پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ حویلی کے ماحول میں عجیب تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر کوئی دوسرے سے آنکھ چرائے پھرتا۔ نہ شاہ صاحب اپنی بات سے پیچھے ہٹ رہے تھے اور نہ بختاور کوئی لچک دکھانے کو تیار تھی۔ جنت بی بی کی طبیعت روز بروز بگڑتی چلی گئی ایک دن وہ شاہ صاحب کے قدموں میں اپنا دوپٹہ ڈال کر نڈھال سی فرش پر گر گئیں اور اپنی لاڈلی بیٹی کی خوشیاں مانگ لیں۔

پیر قدرت اللہ شاہ کو چپ لگ گئی تھی۔ زندگی کے کسی محاذ پر انہیں اتنی بری طرح سے شکست نہیں ہوئی تھی مگر انہوں نے اپنی زندگی کا کٹھن ترین فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ جس نے بھی سنا وہ دنگ رہ گیا۔ قدرت اللہ شاہ نے حسن شاہ کو حکم دیا تھا کہ وہ بختاور کو شہر لے جا کر ان کی شادی اسی لڑکے سے کروا دیں جس سے کہ وہ چاہتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی پورے خاندان سمیت ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ بختاور روتی رہیں، تڑپتی رہیں مگر انہیں صفائی کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ قدرت اللہ شاہ نے اپنا دل جیسے پتھر کر لیا تھا۔ بختاور کی شادی کے بعد ان کا نام بھی حویلی میں لینا ممنوع تھا۔

قدرت اللہ شاہ نے انہیں اپنی زندگی سے ایسے نکال دیا تھا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔

حسن شاہ اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ قدرت اللہ شاہ نے اپنی کسی جاننے والی کی بیٹی سے ان کا رشتہ طے کر دیا۔ شادی کے بعد حسن شاہ، روحیلہ جیسی خوب صورت اور پڑھی لکھی بیوی پا کر مسرور و مطمئن تھے۔ ابھی شادی کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ جنت بی بی چل بسیں۔ قدرت اللہ شاہ بہت مغموم ہوئے۔ حسن شاہ کو اللہ نے ایک بیٹے جلال اور بیٹی عیان سے نوازا تھا۔ حسن شاہ جو کہ اپنے حلقہ سے ایم این اے منتخب ہو چکے تھے بذریعہ کار لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے شدید قسم کے حادثے کا شکار ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے، اس وقت جلال شاہ نو برس جبکہ عیان صرف پانچ برس کی تھی۔ قدرت اللہ شاہ کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ اکلوتے بیٹے کا بھری جوانی میں ساتھ چھوڑ جانا انہیں بالکل ہی توڑ گیا تھا۔ روحیلہ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے شہر میں ہی رہائش پذیر تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حسن شاہ کو پوری منصوبہ بندی سے قتل کیا گیا تھا اس لیے قدرت اللہ شاہ بچوں کو گاؤں اور دشمنوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

قدرت اللہ شاہ نے اپنے داماد وقار شاہ کو ایم این اے کی سیٹ دلا دی جبکہ خود وہ صوبائی وزیر ثقافت تھے۔ قدرت اللہ شاہ اپنے پوتے اور پوتی دونوں سے بڑی محبت رکھتے تھے مگر عیان سے محبت کا اور ہی عالم تھا۔ وہ لاشعوری طور پر عیان میں بختاور کا عکس ڈھونڈتے تھے۔ عیان کے پاس ہر چیز کی فراوانی تھی چاہے وہ حسن ہو، دولت ہو یا سب کی محبت۔

وقت کی مٹھی سے سال ریت کی طرح پھسلے تھے۔ عیان تیرہ سال کی ہوئی تو روحیلہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ عیان ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ دکھوں کا اظہار کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ جلال جو کہ اس سے کچھ سال بڑے تھے، اپنی بہن کے لیے جذباتی اور اخلاقی سہارا ثابت ہوئے۔ قدرت اللہ شاہ کی توجہ بچوں پر کچھ اور بڑھ گئی۔ جلال شاہ نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی

کلاس فیلو سارہ سے دادا جان کی رضامندی کے ساتھ شادی کی جو کہ ایک بریگیڈیر کی بیٹی تھی۔ قدرت اللہ شاہ کو جلال شاہ کے باپ بننے کا شدت سے انتظار تھا کیونکہ حویلی کی روایت کے مطابق جلال شاہ بیٹے کی پیدائش کے بعد ہی گدی نشیں ہو سکتے تھے ورنہ نہیں۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شادی کے چار سال بعد بھی جلال شاہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ سارہ کے تمام ٹیسٹ کلیئر تھے مگر جلال شاہ کی رپورٹس کے مطابق وہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھے، یہ خبر خاندان بھر کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی، قدرت اللہ شاہ تو جہاں کے تہاں رہ گئے۔ تقدیر نے کیسا بے بس کیا تھا۔ اگر سارہ میں کوئی نقص ہوتا تو وہ اپنے پوتے کے لیے بیویوں کی لائن لگا دیتے مگر بات ان کے پوتے پہ آ گئی تھی۔ ان دنوں عیان کالج جانے لگی تھی۔ وہ اپنے دادا کا حد سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ جلال شاہ حویلی کے اکلوتے وارث ہیں اور خاندان کا نام و نشان ان کے دم سے ہی چلنا تھا۔ مگر قدرت اللہ شاہ مجبور تھے۔ انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اور اپنی بیٹی شاہینہ کے ایما پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ عیان کی شادی اپنے نواسے تبریز شاہ سے کر دیں اس طرح عیان کا بیٹا ہی حویلی کا اگلا گدی نشیں ہو گا۔ اس طرح خاندان بھر کی امیدوں کا مرکز عیان کی ذات تھی جو ان تمام فیصلوں سے بے خبر لمز یونیورسٹی سے آئی آر میں ماسٹرز کر رہی تھی مگر اس واقعے نے سب کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے اگر عیان کو کچھ ہو جاتا تو......؟

"داجان" جلال شاہ نے نرمی سے پیر قدرت اللہ شاہ کا کندھا ہلایا تو وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئے تھے۔

"ہوں" انہوں نے سوالیہ نظروں سے جلال شاہ کی طرف دیکھا۔

"داجان، وہ میں کہہ رہا تھا کہ آپ حویلی چلے جائیں میں اور سارہ ہیں یہاں پر ______ کل آپ کی بہت ضروری میٹنگ ہے جبکہ ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ عیان کو شاک لگا ہے ورنہ تو گولی کندھے کو چھو کر گزری

ہے۔" وہ کچھ دیر کو رکے تھے۔ "ویسے بھی کل تک اسے ڈسچارج کردیا جائے گا تو ہم اسے لے کر سیدھے حویلی جائیں گے۔ اب اس کا اکیلا شہر میں رہنا ٹھیک نہیں۔" جلال شاہ نے انھیں حویلی جانے کے لیے تیار کرنا چاہا وہ کسی بھی طرح قدرت اللہ شاہ کو حویلی بھیجنا چاہتے تھے۔ قدرت اللہ شاہ بھی الوداعی کلمات کہہ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

پیر قدرت اللہ شاہ اس وقت شدید اضطراب کے عالم میں مسلسل یہاں سے وہاں ٹہل رہے تھے۔

"جب ہم نے کسی بتایا ہی نہیں تھا کہ عیان آرہی ہے تو دشمنوں کو کیسے خبر ہو گئی؟" قدرت اللہ شاہ اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے تھے اور اضطراب و پریشانی سے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے انھوں حویلی کے سب سے پرانے اور قابل اعتماد بزرگ ملازم دینو چاچا سے کہا۔

"شاہ صاحب تھالی کا چھید تو رہا ہے کہ یہ کسی اپنے خاص بندے کا کام ہے۔" دینو چاچا نے اپنے مخصوص انداز میں غداری کا سراغ لگانا چاہا تھا۔

"بہرحال' یہ کام جس نے بھی کیا ہے سیدھا سیدھا ہماری پگڑی پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ اب نتیجہ تو اسے بھگتنا ہی پڑے گا مگر پہلے تو ملکوں سے نمٹنا ہے جنھوں نے حملہ کروا کے اپنی تباہی پر مہر لگادی ہے۔" قدرت اللہ شاہ نے اپنے انتہائی رعب دار لہجے میں کہا۔

"دین محمد' تم ملک کو بلاوا بھیجو اور اسے کہو کہ جلد حاضری دے۔" شاہ صاحب نے حکم دیا۔

"اور ہاں کسی کو خبر نہ ہو ملک کے آنے کی ورنہ دشمن چوکنا ہو جائے گا۔" شاہ صاحب نے مزید کہا۔

"جی شاہ صاحب۔" یہ کہتے ہی دین محمد باہر نکل گئے جبکہ شاہ صاحب کچھ پرسکون ہو گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب ملک سب سنبھال لے گا۔

پیر قدرت اللہ شاہ کی داؤد ملک سے ملاقات پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ داؤد ملک' دین محمد کی بیوی بختاں کی بھانجی کا بیٹا تھا۔ ماں باپ کی وفات کے بعد مستقل طور پر دین محمد اور بختاں کے پاس قیام کے لیے آگیا تھا۔ دین محمد اپنے بیٹے بخش محمد اور داؤد ملک کو شاہ صاحب کے پاس نوکری چاکری کی غرض سے لایا تھا۔ بخش محمد دس جماعتیں پاس تھا اس لیے شاہ صاحب نے اسے حساب کتاب پہ لگادیا۔ جبکہ داؤد ملک کے مضبوط قد کاٹھ اور تنومند وجود کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ سیکیورٹی کے لیے رکھ لیا۔ بعد میں قدرت اللہ شاہ کو اس بات کا صحیح معنوں میں ادراک ہوا کہ ان کا فیصلہ کس قدر درست تھا۔ شاہ صاحب کو وہ شروع دن سے ہی غیر معمولی طاقت ور محسوس ہوا تھا اس لیے انھوں نے اپنے ایک گارڈ کو جو کہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا' داؤد ملک کی ٹریننگ کی خاص ہدایت کی اور کچھ عرصے کی ٹریننگ نے اسے ناقابل تسخیر بنادیا۔ قدرت اللہ شاہ نے داؤد ملک کے متعلق مکمل چھان بین کروائی کہ وہ کہیں ان کے دشمنوں کا بھیجا ہوا تو نہیں مگر وہ واقعی بختاں کی بھانجی کا بیٹا تھا جو کراچی کے کسی گوٹھ کی رہنے والی تھی اور پنجاب کے کسی علاقے سے بیاہ کر گوٹھ گئی تھی۔ اب وہ شاہ صاحب کے بہت ہی خاص بندوں میں سے تھا۔ وہ پورے علاقے کے لیے دہشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ شاہ صاحب کا دشمن خاندان "ملک خاندان" بھی داؤد ملک کا کچھ نہیں بگاڑ سکا کیونکہ اردگرد کے گاؤں میں جتنے بھی بدقماش اور بدمعاش لوگ بستے تھے وہ سب داؤد ملک کے زیردست اور دوست تھے اور کہیں اور سے "بندے" منگوا کر داؤد ملک پر حملہ کروانے کا مطلب سارے علاقے کے "آسیبوں" سے دشمنی مول لینا تھا' اس لیے اب قدرت اللہ شاہ کو خطرہ نہ تھا اور نہ ہی ان کی سلطنت کو۔ مگر اس واقعے نے انھیں صحیح معنوں میں مضطرب کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ملک' دشمن کو ایسا زخم لگانا ہے جو ساری عمر نہ بھر پائے۔" قدرت اللہ شاہ نے اپنے مخصوص رعب دار انداز میں داؤد ملک کو حکم دیا تھا جو کچھ ہی دیر پہلے بڑی

حویلی پہنچا تھا۔

"جو حکم سائیں۔" جواباً" داؤد ملک نے بھی اپنے ازلی مئودب لہجے میں نظروں کو جھکائے ہوئے کہا۔

"میری پوتی آج شام حویلی آرہی ہے اس کے آنے سے پہلے دشمن کا حساب بے باق کردو۔" شاہ صاحب نے مزید کہا۔

"جو حکم سائیں۔" داؤد ملک نے کہا اور سلام کرتا باہر نکل گیا۔ اب قدرت اللہ شاہ کو شام کا بے تابی سے انتظار تھا کیونکہ ان کو دو خوشیاں ملنے والی تھیں۔ ایک عیان کے گھر آنے کی۔ دوسری دشمن کے تلملانے کی۔

"احتیاط سے بیٹا۔ زیادہ بازو نہیں ہلانا۔" شاہینہ پھوپھو نے بے جا لاڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ عیان حویلی آ گئی تھی اور اس وقت سے ڈرائنگ روم مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔ شاہ صاحب جلال شاہ کے علاوہ گھر کی خواتین اور نوکروں میں عجیب افراتفری پھیلی تھی، وقار شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔ کچھ ملازمین بھاگم بھاگ رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے تو کچھ قدرت اللہ شاہ کی اکلوتی پوتی کو دیکھنے کے اشتیاق میں بلاوجہ ڈرائنگ روم کے چکر کاٹ رہے تھے۔ باہر تاریکی زمین پر اپنے قدم جمانے کے لیے ہلکان ہو رہی تھی۔

"زیادہ درد تو نہیں ہو رہا دادا کی جان کو؟" قدرت اللہ شاہ نے عیان کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔

"نو، اٹس آل رائٹ۔" عیان نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس حادثے کے بعد وہ تھوڑا سہم گئی تھی۔

شاہینہ پھوپھو کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی سیماب تھیں جو کہ نکاح شدہ تھیں جبکہ رخصتی ابھی ہونا تھی۔ اس سے چھوٹا تبریز شاہ جو کہ ان دنوں شکار پر گیا ہوا تھا۔ جبکہ سب سے چھوٹا سالار شاہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم تھا۔ زرمینہ پھوپھو کی دو جڑواں بیٹیاں تھیں۔ انزلہ اور انشراح جو کہ اولیول میں تھیں۔

"کھانا لگ گیا ہے شاہ صاحب۔" ملازم نے کہا تو قدرت اللہ شاہ سے تھا مگر دیکھا بغور عیان کو تھا۔

"چلو عیان، پہلے ڈنر باقی باتیں بعد میں۔" قدرت اللہ شاہ کے کہنے پہ سب ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئے جبکہ شاہ صاحب اپنے فون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جس پہ کال آرہی تھی۔

ڈائننگ روم میں سب اپنی اپنی کرسیاں سنبھال چکے تھے اور قدرت اللہ شاہ کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل انواع واقسام کی ڈشز سے بھرا پڑا تھا۔ قدرت اللہ شاہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے پہ فتح کی سرشاری تھی۔

"سنا ہے ملکوں کے اکلوتے داماد کا قتل ہو گیا ہے۔" ٹیبل پر اپنی مخصوص کرسی سنبھالتے ہوئے انہوں نے وقار شاہ اور جلال شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا جو کہ قدرت اللہ شاہ کے لہجے میں دبا دبا جوش دیکھ کر حیران رہ گئے تھے جبکہ خواتین بالکل چپ تھیں۔

"میں نے ملک کو کہا ہے۔ وہ کل آئے گا۔ اسے راضی کر دینا۔" شاہ صاحب نے جلال شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔" جلال شاہ سمجھ گئے کہ یہ کارنامہ بھی داؤد ملک کے ہاتھوں ہی انجام پایا۔

"داجان آپ نے بلایا تھا۔" جلال شاہ نے قدرت اللہ شاہ کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت پیر قدرت اللہ شاہ کے اسٹڈی روم میں موجود تھے۔

"میں نے عیان کی یونیورسٹی کے متعلق کچھ فیصلہ کیا ہے، سوچا تم سے ڈسکس کرلوں۔" قدرت اللہ شاہ نے اپنا چشمہ اتار کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور، پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے۔" جلال شاہ آگے کو جھکتے ہوئے بولے۔

"جلال! میں نے سوچا ہے کہ ملک کو عیان کے ساتھ حفاظت کے لیے رکھوں۔ فارم ہاؤس کا کیا ہے وہ تو کوئی بھی دیکھ لے گا۔ عیان کی زندگی سب سے اہم

ہے۔" وہ سانس لینے کو رک کے پھر بولے۔

"صرف آٹھ دس مہینوں کی ہی تو بات ہے۔ اس کا تھرڈ سمسٹر چل رہا ہے۔ فروری تک وہ فارغ ہو جائے گی پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے جلال شاہ کی طرف دیکھا جو گلا کھنکار کے گویا ہوئے۔

"مجھے کیا کہنا ہے دا جان! آپ نے یقیناً" بہتر ہی سوچا ہو گا مگر واوڈ ملک؟" وہ ذرا ہچکچائے۔

"ہی از ٹو ینگ۔" وہ رک کے پھر بولے۔

"یقیناً" ملک سے زیادہ عیان کسی کے ساتھ محفوظ نہیں لیکن پھر بھی۔۔۔" وہ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ فیصلہ یقیناً" بہت دشوار تھا" اگر آپ کہیں تو ہم گارڈز کی ایک گاڑی ساتھ بھیج سکتے ہیں۔" یعنی جلال شاہ کی طرف سے انکار تھا۔ شاہ صاحب پیشانی مسلتے ہوئے بولے۔

"تمہارے خدشات بجا ہیں کہ وہ ستائیس، اٹھائیس سالہ نوجوان ہے۔ وہ بھی ایک نہایت خوبرو نوجوان" وہ ہلکا سا مسکرائے۔

"لیکن میں اپنی پوتی کو جانتا ہوں۔ وہ اپنے معیار سے نیچے کبھی نہیں اترے گی۔" قدرت اللہ شاہ نے جلال شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے کہا۔ جلال شاہ نے بے ساختہ نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایسا تو نہیں کہا کہ عیان۔۔۔!" پھر قدرت اللہ شاہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اگر گاڑی بھر کر گارڈز ساتھ بھیج بھی دوں تو میری تسلی نہیں ہو گی بلکہ اس طرح وہ خوف کا شکار ہو جائے گی کہ یقیناً" اس کی جان کو زیادہ خطرہ ہے۔۔۔ اور بیٹا موت کا خوف موت سے بھی زیادہ جان لیوا ہوتا ہے۔ میں عیان کو کسی خوف کے حوالے نہیں کر سکتا۔" انہوں نے قطعی انداز میں کہا۔ گویا وہ فیصلہ کر چکے تھے۔

"جی بہتر جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" جلال شاہ جانتے تھے کہ وہ عیان کے بارے میں کبھی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یمی کو بھجوا دو۔ کچھ بات کرنی ہے۔" قدرت اللہ شاہ نے رائٹنگ ٹیبل پہ پڑا ہوا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا۔ شب بخیر۔" جلال شاہ واپس مڑ گئے۔

☼ ☼ ☼

"پلیز دا جان آئی ایم گیٹنگ لیٹ" عیان نے ملتجی انداز میں قدرت اللہ شاہ کی جانب دیکھا جو اسے بھرپور ناشتہ کروانے پر تلے ہوئے تھے۔

"اونہوں پہلے جوس ختم کرو۔" شاہ صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے حکم جاری کیا تو اس کا روکھا انداز دیکھ کر سبھی مسکرا اٹھے سوائے شاہینہ پھوپھو کے جو شاہ صاحب کی وجہ سے عیان کو الوداع کہنے کے لیے اٹھ تو گئی تھیں مگر نیند سے بوجھل آنکھیں لیے ابھی تک "صم" "بکم" کی عملی تفسیر بنی بیٹھی تھیں۔

"لیں ہو گیا ختم!" عیان نے ایک ہی سانس میں جوس اندر انڈیلا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ قدرت اللہ شاہ ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھے اور عیان کے کندھوں پر بازو پھیلا کر اسے لیے باہر کو چل دیے۔

"میں نے یمی کو کہا تھا تمہیں سب کچھ بریف کر دے۔ آئی ہوپ تم معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرو گی۔" قدرت اللہ شاہ نے بات کے آغاز کے لیے تمہید باندھی تھی۔

"اوہ ہاں، رات کو یمی آپی نے بہت لمبا اور بورنگ لیکچر دیا تو تھا" عیان نے شرارت و لاپروائی سے جواب دیا اور تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔

"مائے گاڈ! آپ سب لوگ مجھے ایسے سی آف کرنے جا رہے ہیں جیسے میں کسی مونٹیسوری اسکول جا رہی ہوں وہ بھی پہلے دن' اینڈ پلیز مجھے ان تکلفات کی عادت نہیں ہے۔" عیان کے کہنے پر شاہ صاحب نے سب کو جانے کا اشارہ کیا اور عیان کو لے کر آگے بڑھے وہ مین ڈور پار کر کے کار پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہ صاحب نے ابھی بھی عیان کو کندھوں سے

تھام رکھا تھا۔

"عیان تم جانتی ہو ناں کہ تم ہمارے لیے کتنی امپورٹنٹ ہو۔" انہوں نے ہمارے پر زور دے کر کہا تھا۔ "تمہارے بغیر سب ادھورا ہے... نامکمل۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کوئی لاپروائی نہیں بیٹا۔ ملک کو بالکل بھی نہیں ستانا۔ اسے چکمہ دے کر غائب ہونے کی عقل مندی کبھی مت کرنا ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔" قدرت اللہ شاہ کی آواز لرزی تھی۔ انہوں نے عیان کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا۔ وہ ایک دم بولی۔

"کیا ہے دادا ڈارلنگ! آپ تو بالکل ٹین ایجرز والے ڈائیلاگ بول رہے ہیں۔ آپ رہنے ہی دیں۔ میں ویسے ہی "اس کی" ہربات مان لوں گی۔" کتنی ہی دیر سے وہ گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر عہد و پیمان کر رہے تھے۔ عیان نے گاڑی دیکھی تو جوش سے تالی بجا کر بولی۔

"یا ہو... cadillac escalade آئی لائک اٹ' بلٹ پروف ہے ناں۔ اب مجھے بلٹ سے بہت ڈر لگتا ہے۔" عیان نے گاڑی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی پسند کا اظہار کیا تھا اور ڈر کا بھی۔ پھر شاہ صاحب کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو' مجھے لینڈ کروزر نہیں چاہیے۔ یونیورسٹی میں ہر تیسرے اسٹوڈنٹ کے پاس ہوتی ہے۔" عیان نے منہ بسور کر کہا۔ کچھ فاصلے پہ کھڑی ٹیوٹا لینڈ کروزر کے پاس کھڑے وجود نے بے حد ناگواری سے عیان حسن شاہ کی بات کو سنا تھا۔

"اوکے' یہ تمہاری ہوئی۔ ملک ادھر آجاؤ۔ عیان کو اس گاڑی میں جانا ہے۔" شاہ صاحب نے بڑے لاڈ کے ساتھ عیان کو ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا جبکہ عیان تو سامنے سے آتے... وجود کو دیکھ کر حیران و مبہوت رہ گئی۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں اتنا شاندار مرد نہیں دیکھا تھا۔

"رفیق جاؤ اس گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔" قدرت اللہ شاہ نے ملازم آواز دے کر کہا اور داؤد کو کچھ ہدایات دینے لگے۔ عیان نے ذرا فرصت سے اس کا جائزہ لیا۔

کیمل کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس وہ نوجوان چھ فٹ سے اوپر کا ہی ہو گا۔ وہ مسلز مین تھا' اس بات کا اندازہ اسے دیکھتے ہی ہو جاتا تھا۔ بال بہت سیاہ تھے' ماتھے پہ گرے ہوئے۔ بے حد شفاف رنگ۔ چہرے پہ ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو تھی۔ عیان نے اسے دس میں سے دس نمبر دے دیے۔ اسی لمحے داؤد نے نظریں اٹھا کر قدرت اللہ شاہ کو اپنی فرمانبرداری دکھاتے ہوئے "جو حکم سائیں" کہا تھا۔ عیان کا حیرت کے مارے منہ کھل گیا۔ اس کی آنکھیں بالکل عیان جیسی تھیں' ہیزل براؤن۔

"اوکے بیٹا۔ گڈ بائے۔ رات کو ملاقات ہوتی ہے پھر۔" قدرت اللہ شاہ کی بات پر وہ ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"اوکے دا جان' گڈ بائے" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے مڑی تو حیران رہ گئی کہ داؤد ملک اس سے پہلے گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ عیان نے بے ساختہ مڑ کے شاہ صاحب کو دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے اور اس کے کان میں بولے۔

"یہ تمہارا شوفر نہیں ہے۔" اس بات پر عیان نے پہلے حیرت پھر غصے سے شاہ صاحب کو دیکھا اور پاؤں پٹخ کے گاڑی میں جا بیٹھی۔ پیر قدرت اللہ شاہ کی مسکراہٹ کچھ مزید گہری اور ذومعنی ہو گئی جبکہ عیان حسین شاہ کے لیے یہ دن "سرپرائز ڈے" ثابت ہوا تھا۔

صبح سے مسلسل پیریڈ اٹینڈ کر کر کے عیان کوفت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اب فری کلاس میں وہ چاروں دوست کیفے ٹیریا میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھیں' برگر انجوائے کر رہی تھیں جبکہ عیان ہمیشہ کی طرح "سوں سوں" کرتی ناک کے ساتھ چوتھے سموسے کے لیے ہاتھ بڑھا چکی تھی۔ داؤد ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھیں جبکہ باقی سب کی اس پر۔ عیان صبح سے اس کا تعارف کرواتے کرواتے تھک گئی تھی حالانکہ جس طرح وہ

اس کے ساتھ ساتھ تھا کوئی بھی ذی ہوش سمجھ سکتا تھا کہ وہ عیان کو گارڈ کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود لڑکیاں تو لڑکیاں' لڑکے تک عیان سے اس کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ اس کے تحمل سے بتانے پر وہ داؤد کو ایسی نظروں سے دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں "لگتا تو نہیں!"

"عیان یار! اس کی آنکھیں بالکل تمہارے جیسی ہیں۔ آفت" شہرین نے اپنے ہی انداز میں تعریف کی تھی۔ عیان نے چونک کر داؤد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ویسا ہی سکوت تھا اور آنکھیں سرد مہری۔ جانے کیوں عیان کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نظر آئی تھی۔ عیان کے بھیجے سموسے اور کوک اس کے سامنے ویسی کی ویسی ہی پڑی تھی۔

"ویسے تیرے دادا نے کیا سوچ کر اس سپر ہینڈ سم بندے کو تیرے ساتھ باندھ دیا ہے وہ بھی آٹھ نو ماہ کے لیے۔ ابھی تو مئی چل رہا ہے۔ فروری تک تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" زویا جسے سب ٹام بوائے کہتے تھے اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"کیا مطلب کیا ہو سکتا ہے' ہاں؟" عیان نے اپنی پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے زویا کو گھور کر کہا۔ اسی لمحے عفیرہ نے اس کی کہنی زور سے ہلائی تو اس نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت اور ناز و ادا والی لڑکی عشناء یوسف ان لوگوں کی طرف آ رہی تھی۔

"ہیلو! عیان ڈیئر کیسی ہو؟ تمہارے ایکسیڈنٹ کا سن کر بہت افسوس ہوا" عشنا چھا جانے والی شخصیت رکھتی تھی۔ ابھی بھی وہ نشست سنبھالتے' اتنے سوالات بھی کر گئی تھی جبکہ وہ سب تو اسی شاک میں تھیں کہ عشناء نے ان کو ملاقات کا شرف بخشا۔ عشناء سکاٹ لینڈ میں پلی بڑھی تھی اور وہیں کی گریجویٹ تھی۔ لیمن کلر کی بیگی شرٹ' وائٹ ٹائٹس اور سفید ہی پمپس (Pumps) پہنے' کمر تک آتے بالوں کے ساتھ جن میں ایک بھی لہر نہ تھی۔

خوب صورت خدوخال کی مالک عیان بھی کسی سے کم نہ تھی مگر عشناء میں ادا بہت تھی۔

"تمہارا کزن تو بہت رُوڈ ہے۔ کس ڈپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لیا ہے اس نے؟" عشناء نے اپنی دھیمی آواز میں نزاکت کے ساتھ باٹم اور رچ بلونڈ بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے عیان سے پوچھا اور ترچھی نظروں سے داؤد کو دیکھا۔

"واٹ! کزن.... تمہیں کس نے کہا کہ یہ میرا کزن ہے۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن وہ میرا پرسنل باڈی گارڈ ہے۔" عیان نے ذرا سخت لہجے میں کہا تھا کیونکہ اسے عشناء کا رویہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیوں پر یقین تھی کہ داؤد عیان کا کزن ہی ہے۔

"باڈی گارڈ! ڈونٹ ٹیل می یار" عشناء نے ستائشی نظروں سے داؤد کو دیکھتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

"مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔" عشناء نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"جب تمہیں یاد آجائے تو مجھے بھی بتا دینا" یہ کہتے ہوئے عیان نے گویا کہا تھا کہ "تم اب جا سکتی ہو۔" عشناء کا بھی جیسے مطلب پورا ہو چکا تھا۔ وہ اٹھی اور داؤد کی ٹیبل کے عین سامنے کھڑی ہو گئی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں کو خاص انداز میں لہرا کر داؤد کو "ہائے" بولا تھا۔ اس نے لاپروائی سے دیکھ کر دوبارہ اپنی نظریں دروازے پہ جما دیں تھیں۔ زویا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ عشناء برا مانے بغیر مسکراہٹ اچھالتی باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

ٹیلر سوفٹ (Taylor Swift) کا گانا گنگناتے ہوئے وہ اپنی ہی دھن میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب اچانک کسی سے ٹکرائی۔ اس کا تو سر ہی گھوم گیا تھا۔

"دھیان سے عیان حسن شاہ۔" اس سے ایک سیڑھی اوپر کھڑے جوان نے اسے بازو سے تھام رکھا تھا۔ عیان نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے تبریز شاہ کہتے ہیں' نام تو سنا ہی ہو گا۔" تبریز نے قہقہہ لگایا تو۔ عیان کو وحشت سی محسوس ہوئی' وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

"او ہیلو! کیسے ہیں تبریز بھائی؟" عیان نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوں بلکہ بہت اچھا ہوں۔" تبریز نے دھیرے سے مسکرا کر ذو معنی لہجے میں کہا۔ جینز کے ساتھ پرپل اینڈ وائٹ ٹی شرٹ پہنے' بڑی بڑی مونچھوں کو بائیں ہاتھ سے بار بار تاؤ دیتا تبریز شاہ' عیان کو کچھ عجیب ہی لگا تھا۔ عیان کو سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر بات کرنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن تبریز اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

"کس کے ساتھ گئی تھیں یونیورسٹی؟" تبریز نے بغور اسے دیکھتے ہوئے عام سے انداز میں سوال کیا۔

"میں۔۔۔ وہ۔"

"یہ داؤد ملک کے ساتھ گئی تھی۔" سیمی آپی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عیان کی جان چھڑاتے ہوئے خود جواب دیا۔ مگر تبریز کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

"واٹ! داؤد ملک کے ساتھ۔" حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"اور یہ کس عقل مند کا فیصلہ ہے" تبریز تو پہلے سے ہی اکھڑ چکا تھا۔ اور اب تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ غصے سے کسی کو کال ملا رہا تھا۔ عیان نے اسے ذرا ناگواری سے دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

تبریز شاہ کو عیان کا داؤد کے ساتھ ہونا ہرگز گوارہ نہ تھا لیکن قدرت اللہ شاہ کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اس لیے وہ تھک کے خود ہی خاموش ہو گیا جلال شاہ ممبر قومی اسمبلی تھے اس لیے ان کا قیام زیادہ تر اسلام آباد میں ہی ہوتا تھا اسی طرح سینیٹر وقار شاہ بھی اسلام آباد میں رہتے تھے۔ عیان کو یونیورسٹی آتے' جاتے دو ماہ گزر گئے۔ اس دوران عیان نے کبھی بھی داؤد کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر اس بات کا اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ داؤد جب بھی اسے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نفرت ہی ہوتی۔ مون سون کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مون سون کی پہلی بارش' دھیمی دھیمی سی مگر مسلسل۔ عیان جب یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نیچے آئی تو لاؤنج میں یوگا کرتی سیمی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"عیان آج چھٹی کر لیتیں۔ ویسے بھی باہر بارش ہو رہی ہے۔"

"آج ہی تو یونیورسٹی جانے کا مزا ہے۔ سیمی آپی" وہ تیزی سے کہتے ہوئے مین ڈور پار کر گئی تھی جبکہ اپنے کمرے سے نکلتے تبریز نے جلدی سے موبائل پہ کسی کو کال کی تھی۔ "احتیاط علاج سے بہتر ہے۔" تبریز شاہ دل و جان سے۔ اس مقولے کا قائل تھا۔

عیان کے فائنل ایگزامز قریب تھے اس لیے سب ہی اسٹوڈنٹس زور و شور سے پڑھائی میں مشغول تھے۔ عیان نے داؤد کو تنگ کرنے کے لیے خود کو اسٹوڈنٹس کی بھیڑ میں گم کر لیا تھا اور نظر بچا کے لائبریری میں گھس گئی اور لائبریری کی کھڑکی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ متوحش سا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور عیان کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ہونٹ کا دایاں کونہ دانتوں تلے دبائے' مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے سیل فون سے اس کی تصویر بنائی اور اسے اقرار کرنا پڑا کہ وہ بلاشبہ بہت ہینڈسم تھا۔

"کسی کو ستانے کا یہ طریقہ بالکل ٹھیک نہیں ہے عیان۔" وہ تصویر سیو (Save) کر رہی تھی جب اچانک زویا کے کہنے پر فوراً" ڈر کے موبائل اپنے پیچھے چھپایا تھا۔

"میں تو۔۔۔ صرف" وہ ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھی جب زویا نے کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے" عیان نے گردن موڑ کر دیکھا جانے کیوں اسے یہ منظر برا لگا تھا۔ بہت برا وہ باہر کو لپکی "تو جادو چل گیا عشناء کا" زویا کی بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ وہ عشناء کے سر پہ پہنچ گئی

جبکہ داؤد دوسری طرف جا چکا تھا۔
"بڑی ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں داؤد سے مجھے بھی تو بتاؤ کونسا عالمی مسئلہ زیر بحث تھا" عیان کے چبا چبا کے کہنے سے عشناء حق دق رہ گئی۔
"آئندہ اسے ادائیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اگر تم نے اس سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش کی تو... بہت برا پیش آؤں گی" عیان نے شہادت کی انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو عشناء محظوظ ہونے والے انداز میں ہنس دی۔
"Oops عیان حسن شاہ" تم تو بچوں کی طرح لڑنے ہی پہنچ گئیں۔ مانا کہ وہ تمہاری تفریح ہے لیکن کیا ہے ناں کہ میں خوب صورت چیز دیکھ کے رہ ہی نہیں پاتی اس لیے..."
"اوجسٹ شٹ اپ "تفریح" کی ضرورت تم جیسیوں کو ہوتی ہے اور صرف اتنا یاد رکھو کہ داؤد پہ ٹرائی نہیں مارنا۔ انڈرسٹینڈ!" جانے کیوں وہ اس قدر مشتعل ہو رہی تھی۔
"او کم آن عیان! اب یہ مت کہنا کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے کیونکہ یہ اسٹوری بہت گھسی پٹی ہے۔ بہت فلمیں اور ڈرامے بن چکے اس ٹاپک پہ تم یہ تاریخ مت دہرانا" عشنا نے خباثت سے مسکرا کر کہا۔ "کیوں تم کوئی نئی تاریخ رقم کرنے والی ہو۔ آئی مین کلاس فیلو کا سپر ہینڈسم باڈی گارڈ..." زویا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ عشناء نے تیز نظروں سے زویا کو گھورا جبکہ وہ پھر سے گویا ہوئی۔
"یاد رکھنا مس عشناء یوسف محبت کی کہانی تو روز اول سے وہی ہے۔ بس کردار بدل جاتے ہیں۔"
"پھر بھی میری پیش گوئی کو ایزی مت لینا" زویا کی بات کے جواب میں عشنا نے صرف اتنا کہا اور تیزی سے پلٹ گئی۔ عیان نے گہری سانس بھر کر زویا کو دیکھا جو سامنے سے آتے داؤد کو دیکھ رہی تھی پھر آہستگی سے بڑبڑائی۔
"یہ کم از کم اس زمین کا نہیں ہے' یہ بات تو پکی ہے۔" عیان نے مسکرا کر زویا کو دیکھا اور پھر داؤد کو جو اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا اسی کی طرف آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈپارٹمنٹ میں فیرویل پارٹی تھی۔ عیان خوب صورت ڈیزائنر سوٹ میں ملبوس تھی۔ آٹھ بجے کے قریب ڈنر سرو کر دیا گیا۔ سبھی انجوائے کر رہے تھے۔ عیان کی دوست اس کی تعریفیں کر کر کے ہلکان ہو رہی تھیں اور یہ کوئی غلط بھی نہیں تھا۔ وہ جب سے یونیورسٹی آئی تھی تعریفیں ہی وصول کر رہی تھی۔ ہر طرف لڑکے لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر کسی نے اپنے لباس سے اپنی کلاس شو کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب بھی ٹھہرے تھے۔ کچھ اسٹوڈنٹس کو اپنی انگلش مہمان خصوصی کی الوداعی تقریر بہت پسند آئی تھی جس میں انہوں نے اپنے انگریزی لب و لہجے میں اردو کا جملہ بولتے ہوئے کہا۔ "لیز والا ام سالا بہت ٹیلنٹڈ ہے۔" اسٹوڈنٹس نے اس تعریف پہ آسمان سر پہ اٹھا لیا تھا۔ عنیزہ اور شہرین بار بار عیان کو یہی کہہ رہی تھیں کہ ہو نہ ہو اس نے اور داؤد نے ڈیسائیڈ کر کے بلیک اینڈ وائٹ کنٹراسٹ پہنا ہے کیونکہ داؤد اتفاقیہ طور پر بلیک شلوار سوٹ میں تھا۔ صرف عنیزہ اور شہرین ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کو یہی خیال آیا تھا۔ ڈنر کے بعد تمام ٹیچرز اور وی سی، مہمان خصوصی کے ساتھ کولڈ کافی انجوائے کر رہے تھے جبکہ تمام اسٹوڈنٹس علیحدہ ہال میں چلے آئے تھے۔ ڈی' جے کے سونگ پلے کرنے کی دیر تھی' سب نے ادھم مچا دیا تھا۔ جسٹن بیبر کے گانے Boy Friend پر سب ہی پاگل ہو رہے تھے۔ داؤد کو عیان کے ساتھ ساتھ رہنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ عیان نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا چیخ کے داؤد کو مخاطب کیا تھا۔
"تم نے ڈنر کیوں نہیں کیا میں...!" وہ ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ داؤد کے عقب سے عشنا نمودار ہوئی۔ ہاتھ میں مشروب تھامے وہ لڑکے لڑکیوں سے

پچتی ہوئی داؤد کے قریب آئی عیان کے اندر کچھ سلگنے لگا تھا۔

"ہیلو مسٹر داؤد' کیسے ہیں آپ' اینڈ یو آر لکنگ ایکسٹریملی سٹننگ۔" عشنا ہمیشہ کی طرح چھا گئی تھی۔ اس نے بلیک جینز پہ بلیک ٹاپ پہن رکھا تھا جو سامنے سے بہت چمکیلا تھا۔ بالوں کا رنگ برگنڈی ہو چکا تھا۔ عیان کو یہ بے تکلفی ذرا نہ بھائی وہ ذرا رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی اور اپنے ہاتھ میں موجود مشروب کی سطح پہ تیرتے آئس کیوبز کو بغور دیکھنے لگی جو اس کی طرح گھل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ۔ مگر مسلسل۔

"ہیلو گارجئس"۔ کسی نے عیان کے قریب سرگوشی کی۔ عیان نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے فائنل ایئر کا سمیر فاضل کھڑا تھا۔

"ہیلو۔" عیان نے بمشکل مسکراتے ہوئے فارمیلٹی نبھائی۔

"مس شاہ آپ تھوڑی دیر کے لیے میری بات سن سکتی ہیں' جسٹ فار فیو منٹس۔" سمیر نے اپنی سرخ آنکھیں عیان پہ گاڑتے ہوئے پوچھا۔ سمیر کو وہ ہائی اسکول کے زمانے سے جانتی تھی۔ سمیر کا جھکاؤ ہمیشہ سے عیان کی جانب تھا۔ عیان کی نظر میں وہ ایک بے ہودہ انسان تھا کیونکہ اس میں اپر کلاس کی تمام برائیاں بدرجہ اتم موجود تھیں لیکن سمیر کے لجاجت بھرے انداز کے پیش نظر عیان نے مسکراتے ہوئے "شیور" کہا تو وہ نہال ہوتا اسے ساتھ لیے باہر نکلنے لگا۔

"کہاں جانا ہے سمیر؟" عیان نے جھنجلا کر پوچھ ہی لیا کیونکہ وہ اسے لیے یونیورسٹی کے قدرے تاریک حصے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ عیان کو اب گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ داؤد کو بتائے بغیر ہی آ گئی تھی۔ ارد گرد اور بھی کپل موجود تھے اور آپس میں مگن تھے۔ عیان کو خوف سا محسوس ہوا۔

"میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو ایکچوئلی تم ہو ہی گارجئس۔" سمیر نے اپنے لڑکھڑاتے وجود کو بمشکل سنبھالا ہوا تھا۔

"یہ تو تم مجھے اندر بھی کہہ سکتے تھے۔" عیان نے بغیر لحاظ کیے تنک کر کہا اور مڑ کے دیکھا۔ "نہیں' یہاں تو تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لایا تھا۔" سمیر نے خباثت سے کہتے ہوئے عیان کے چہرے پہ جھولتی ہوئی لٹ کو ہٹایا۔

"بی ہیو سمیر۔" عیان نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے سمیر کا ہاتھ جھٹکا۔ جواباً" سمیر نے وہی ہاتھ تھام لیا۔

"تم نے میرا ہاتھ کیسے پکڑا۔" عیان کا چہرہ غصے کے مارے سرخ پڑ گیا۔

"ایسے۔" سمیر نے کمینگی سے قہقہہ لگاتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" عیان نے اپنے ہاتھ چھڑانے کے لیے پوری طاقت کا استعمال کیا مگر سمیر صرف اسے تنگ کر رہا تھا اس کا ایسا ویسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ عیان کا فیملی بیک گراؤنڈ اچھی طرح جانتا تھا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا' داؤد کے ایک ہی جھٹکے نے اسے دھول چاٹنے پہ مجبور کر دیا۔ سمیر کی چیخ و پکار کی وجہ سے اور لوگ بھی متوجہ ہو گئے جبکہ داؤد پہ تو گویا کوئی جنون سوار تھا۔ داؤد اسے بے تحاشا پیٹتے ہوئے گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔ ارد گرد موجود اسٹوڈنٹس سمیر کی حالت دیکھ کر خوف سے کانپنے اور چیخنے لگے تھے۔ عفیرہ بھاگ کے بت بنی عیان کے پاس آئی۔

"عیان روکو اسے' وہ مار دے گا سمیر کو۔ پلیز روکو اسے۔" عفیرہ چیخ کے بولی تو عیان گویا ہوش میں آئی۔

"داؤد چھوڑو اسے۔۔۔ چھوڑو۔" عیان نے داؤد کو بازو سے تھام کے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے ایک بار پھر سمیر کو ہاتھوں میں اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تو سب ہی اسٹوڈنٹس کی چیخیں نکل گئیں۔ عیان کا دوپٹہ نیچے گر گیا۔

"چھوڑو جنگلی۔۔۔ مر جائے گا وہ۔" عیان نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پہ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔ داؤد رک گیا تھا۔ عیان اب گھٹنوں کے بل سمیر کے قریب بیٹھ کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس کے گال تھپتھپا رہی تھی مگر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکا

تھا۔

"بی بی چلیں۔" داؤد کی سرد مہر آواز سنائی دی مگر عیان نے اپنا کام جاری رکھا۔ وہ سمیر کے دوستوں کو آواز دینے لگی جو خوف زدہ سے آگے بڑھ آئے۔

"بی بی چلیں۔" داؤد نے پھر مداخلت کی۔

"میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں جو تمہاری مرضی سے آؤں جاؤں گی۔" عیان نے چیخ کے جواب دیا۔ داؤد نے نیچے پڑا عیان کا دوپٹہ اٹھایا اور عیان کا بازو تھام کر اسے کھڑا کیا۔

"مجھے نہیں جانا۔" عیان نے اپنے بازو سے اس کا ہاتھ ہٹانا چاہا مگر وہ عیان کو کھینچتے ہوئے پارکنگ لاٹ تک لایا' پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھنے لگا جب عیان نے غصے سے اسے پیچھے دھکیلا مگر وہ وہیں جما کھڑا تھا۔

"سمجھتے کیا ہو خود کو' ہاں کیا سمجھتے ہو۔ وہ دوست ہے میرا تم نے مجھ سے پوچھے بنا ہی اس پہ دھاوا بول دیا۔" وہ غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ داؤد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم مجھے پروٹیکٹ کرنے کے لیے ہو نہ کہ ڈکٹیٹ کرنے کے لیے۔" عیان نے لڑاکا عورتوں کی طرح بایاں بازو کمر پر ٹکا کے دائیں ہاتھ کی انگلی اس کے سینے پہ بجا کے کہا جبکہ داؤد بازو سینے پہ باندھے بایاں ابرو اچکا کے اسے دیکھتا رہا۔ عیان نے بھی اسی طرح ابرو اچکا کے اسے دیکھا۔۔۔ وہی ہمزاد آنکھیں۔ کچھ سے ہوتے ہیں جو باندھ لیتے ہیں۔ یقیناً "یہ وہی لمحہ تھا" "بی بی چلیں" داؤد نے ان لمحوں کے فسوں سے دامن چھڑاتے ہوئے کہا۔ عیان کی فطری ہٹ دھرمی عود کر آئی تھی۔

"نہیں جاؤں گی' میں بھی دیکھتی ہوں تم مجھے کیسے لے کے جاتے ہو یہاں سے۔" عیان نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا' داؤد اس کی طرف گھوما' اس نے عیان کو بازوؤں سے تھاما اور کسی کانچ کی گڑیا کی طرح اٹھا کے گاڑی میں ڈال دیا اور گاڑی کا دروازہ زور سے بند کر کے گویا اسے چڑایا تھا۔ عیان پہلے تو حیرانی سے کچھ بول ہی نہ پائی پھر اس نے زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے وہ داؤد پہ چیخ رہی تھی۔

"ہاؤ ڈیر یو۔۔۔ یو سلیو (تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔ بدتمیز) عیان نے خونخوار لہجے میں کہا اور اپنے داجان کا نمبر ملانے لگی۔ اس نے روتے ہوئے انہیں ساری بات بتائی۔

"مجھے نہیں چاہیے یہ آئرن مین۔۔۔ اگر اس کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا تو میں یونیورسٹی ہی چھوڑ دوں گی۔" عیان نے غصے سے فون بند کر دیا۔ داؤد زیر لب مسکرایا۔

"آئی ہیٹ یو مین۔" عیان نے آئی فون ڈیش بورڈ پہ دے مارا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد عیان حویلی میں داخل ہو رہی تھی۔ اب وہ نارمل ہو چکی تھی۔ گاڑی پورچ میں رکی تو پیر قدرت اللہ شاہ کے ساتھ جلال شاہ اور تبریز شاہ بھی باہر نکلے اور پورچ کی طرف آئے۔ عیان کو اب صحیح معنوں میں شرمندگی ہو رہی تھی۔ عیان نے داجان کو سلام کیا تو انہوں نے اسے ساتھ لگا لیا اور پیچھے سے آئے داؤد ملک کو بغور دیکھا جس نے ہاتھ میں عیان کا کلچ اور آئی فون تھام رکھا تھا۔ تبریز شاہ پہلے ہی داؤد کے خلاف بھرا بیٹھا تھا اس نے قدرت اللہ شاہ کے بولنے کا انتظار کیے بغیر ہی داؤد پر چڑھائی کر دی۔

"یہ کیا تماشا کیا ہے تم نے آج۔۔۔ تم' تم عیان کے باپ بننے کی کوشش مت کرو۔ ملازم ہو تو ملازم ہی بن کر رہو۔ ہمارے لیے چار بندوں کو مار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم ہمارے سر پر چڑھ کے ناچنے لگو۔ تمہاری اوقات ہی کیا ہے کہ تم اس کے دوستوں پہ تشدد کرو اور اس کے ساتھ زبردستی" تبریز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اتنے دقیق الفاظ استعمال کرے کہ پیر قدرت اللہ شاہ داؤد کو اس نوکری سے ہی فارغ کر دیں جبکہ داؤد ہمیشہ کی طرح بے تاثر نظروں سے تبریز کو دیکھ رہا تھا۔ عیان تو تبریز کے الفاظ پہ حق دق رہ گئی۔

"آپ کون ہوتے ہیں داؤد سے اس طرح بات کرنے والے' اس کی انسلٹ کرنے والے' یہ ہمارا

آپس کا معاملہ ہے۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔" عیان نے شدید اشتعال کے باعث داجان کی پروا کیے بغیر ہی تبریز کو بے نقط سنا ڈالیں۔

" یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا عیان۔۔۔ ایکسکیوز کریں تبریز سے فوراً" ۔" جلال شاہ نے اپنے نرم لہجے میں عیان کو سختی سے کہا۔ پیر قدرت اللہ شاہ بغور داؤد کو دیکھ رہے تھے جو اپنے جوتے دیکھ رہا تھا۔

" نیور۔۔۔ پہلے یہ داؤد سے ایکسکیوز کریں۔" عیان کے سختی سے کہنے پہ باقی تو باقی خود داؤد بھی حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا جو اس کے لیے ڈٹ گئی تھی۔ تبریز کو داؤد کے سامنے شدید ہتک کا احساس ہوا۔

"عیان کیا ہوا میری جان۔۔۔ ڈونٹ بی چائلڈ۔ تبریز آپ کے لیے پریشان تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ آپ کو اس طرح بی ہیو نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں ملک تم بھی جاؤ اب' کل شام فارم ہاؤس پہ بات ہوتی ہے پھر۔۔۔" قدرت اللہ شاہ داؤد کو حکم دے کر عیان کو لیے اندر کی جانب بڑھ گئے۔ داؤد بھی عیان کا آئی فون اور کلچ جلال شاہ کو دے کر باہر کو چل دیا جبکہ تبریز وہیں کھڑا رہ گیا۔

قدرت اللہ شاہ نے معاملہ بہت مشکل سے سنبھالا تھا۔ سمیر کے والد ایک بہت بڑے صنعت کار تھے' انہوں نے اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کے خاصا شور مچایا تھا مگر قدرت اللہ شاہ نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے بات دبا دی اور داؤد کو بھی تنبیہہ کی۔

✡ ✡ ✡

یونیورسٹی میں کلچرل ڈے منایا جا رہا تھا۔ ہر طرف رنگ و نور کی بہار اتری ہوئی تھی۔ عیان نے بلیک کھلے گھیر والی شلوار' بلیک قمیص جس کے گلے اور دامن پر زرد رنگ کی ایمبرائیڈری تھی۔ زرد بڑے سے دوپٹے کے ساتھ پہن رکھا تھا۔ داؤد سے اس کی بول چال مکمل طور پر بند تھی۔ وہ اس سے حقیقتاً" ناراض تھی۔ وہ اپنے گروپ کے ساتھ کیفے جا رہی تھی جب ماس کمیونیکیشن ڈپارٹمنٹ کی ونیشا راجپوت نے اسے گھیر لیا اور اپنے اسٹال سے اسے زبردستی مہندی لگانے لگی۔ ونیشا نے بہت خوب صورت مہندی لگائی اور عیان کے دونوں ہاتھ بھر دیئے جبکہ عیان ایک دم پریشان ہو گئی' اب وہ بیگ کیسے اٹھائے گی؟ اس نے مدد طلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر اسے اپنی کوئی دوست کہیں نظر نہ آئی' داؤد آگے بڑھا۔ اس کا شولڈر بیگ اٹھایا اور مؤدب انداز اپنا مخصوص جملہ بولا۔

" بی بی چلیں۔" عیان اپنی مہندی دیکھتی آگے بڑھ گئی۔

عیان کے موبائل کی گھنٹی زور و شور سے بج رہی تھی۔ اس نے ناراض نظروں سے داؤد کو دیکھا پھر اپنی نیم خشک مہندی کو دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ داؤد کے لبوں پہ مسکراہٹ نے جھلک دکھائی تھی' اس نے کال پک کر کے فون عیان کے کان سے لگا دیا۔ وہ پہلی بار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فون اس کے کان سے لگائے۔ دوسرے ہاتھ میں اس کا بیگ تھامے۔ دیکھنے والوں نے شاید پہلے اتنا پیارا منظر نہ دیکھا ہو گا۔ دور دور سے انہیں دیکھتی' ان کا پتا پوچھتی محبت ان تک آن پہنچی تھی اور ان کے درمیان کھڑی سانس لینے لگی تھی۔ فون بند ہو جانے کے بعد داؤد نے فون بیگ میں رکھا اور سر اٹھا کے عیان کو دیکھا جو اتنے دنوں بعد مسکرائی تھی۔

" تم۔۔۔ تم عجیب لگ رہے ہو ایسے۔۔۔ لڑکیوں کی طرح بیگ اٹھائے گھومتے ہوئے۔" وہ اپنی ہنسی روکنے کے لیے کتنے جتن کر رہی تھی۔ اس نے اپنا بایاں بازو آگے کیا تو داؤد نے بیگ کندھے پہ ڈال دیا۔ وہ اچانک بولی۔

" سنو' میرے بائیں ہاتھ کی تیسری والی بڑی انگلی ڈھونڈو۔" اس نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دائیں ہاتھ سے ڈھانپ کر اس کے آگے کیا۔ داؤد مسکراتے ہوئے بے ساختہ آگے بڑھ کے دیکھنے لگا۔ مہندی کی وجہ سے وہ کچھ احتیاط کر رہی تھی' داؤد نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اسی لمحے فضا میں زوردار دھماکا ہوا' ایک لمحے

کے لیے تو کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ داؤد نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کے عیان کو اندر کیا۔ اپنی رائفل نکال کے ابھی وہ سیدھا ہی ہوا تھا کہ اسے رک جانا پڑا' اس کے ہاتھ اس کے پہلو میں گر گئے عیان کا قہقہہ اس کے کانوں سے ٹکرایا کیونکہ یہ اسٹوڈنٹس کی سیلیبریشنز تھیں' فضا میں ہر طرف افشاں اڑ رہی تھی۔ غباروں کے جتھے اڑائے جا رہے تھے۔ ڈی جے اور بھی دھماکے دار آوازیں پیدا کر رہا تھا۔ عیان نے داؤد کو دیکھا جو بغور اسے دیکھ رہا تھا مگر یہ کچھ دیر پہلے والا داؤد نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیان کو وہی نفرت نظر آئی جو وہ ہمیشہ سے اپنے لیے محسوس کرتی تھی۔ اس بار وہ نفرت اتنی واضح تھی کہ چاہنے کے باوجود عیان کوئی خوش کن خیال نہ سوچ سکی۔

☆ ☆ ☆

ستمبر کا اینڈ چل رہا تھا عیان کے تھرڈ سمسٹر کے پیپرز ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ مون سون کی بارشیں بھی۔ عیان کو داؤد ان دنوں بہت مضطرب دکھائی دے رہا تھا' پہلے سے بھی زیادہ چوکنا۔ جیسے اس کا بس چلتا تو وہ حویلی میں بھی اس کی پہرہ داری کرتا۔ جبکہ عیان کچھ تھکی تھکی سی تھی' اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔۔۔ یا وہ جو چاہتی ہے وہ ممکن بھی ہے۔۔۔ یا نہیں۔

☆ ☆ ☆

"داؤد" عیان کی دل سوز چیخ سے حویلی کے در و دیوار لرز اٹھے تھے۔ اور خود عیان کے گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں جیسے وہ اب کبھی نہ بول سکے گی۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"داؤد" وہ ایک بار پھر چیخی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسے کچھ یاد نہ رہا' وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے۔ یاد رہا تو صرف ایک منظر۔ وہ جوتا پہنے بغیر باہر کو بھاگی۔ اونچی آواز میں روتے ہوئے بغیر ادھر ادھر دیکھے وہ مین ڈور کی طرف گئی' باہر نکلنے تک وہ ہانپنے لگی۔

"داؤد" وہ اسے آواز دے کر ایک بار پھر رونے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کی طرف جاتی' پیچھے سے یمی آپی کی حیران و پریشان آواز سنائی دی۔

"عیان کیا ہوا؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟" یمی آپی کے ساتھ لگتے ہی وہ اور زور و شور سے رونے لگی۔

"داؤد' یمی آپی! اسے کچھ ہوا ہے۔ پلیز مجھے اس کے پاس جانا ہے۔" وہ عجیب بے ربط گفتگو کر رہی تھی۔ یمی آپی اسے لیے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھیں۔ ننگے پیر' بکھرے بال' سوجی آنکھیں۔ اس کی حالت مخدوش ہو رہی تھی۔

"اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟" یمی آپی نے اسے کاؤچ پہ بٹھایا اور خود ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"یمی آپی۔۔۔ وہاں بہت اندھیرا تھا۔ داؤد کا خون نکل رہا تھا۔ پلیز یمی آپی میں مر جاؤں گی ایسے۔ داؤد کو بلا دیں اسے کچھ ہوا ہے۔" وہ پھر سے بے ربط باتیں کرنے لگی۔ یمی آپی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ بے یقینی سے عیان کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ میں اسے کال کرتی ہوں۔ یا اللہ وہ ٹھیک ہو۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بڑبڑاتے ہوئے لینڈ لائن سے داؤد کا نمبر ملانے لگی۔

"تم نے خواب دیکھا ہے۔ صرف "خواب"۔" یمی آپی نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں یمی آپی' پلیز میرا دل بند ہو رہا ہے۔" وہ ایک بار پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھا چکی تھی۔

"تم اس طرح کی حرکتیں کر کے اپنے خواب کو سچ ثابت کرنے پر کیوں تل گئی ہو لڑکی؟" یمی آپی کے تیز لہجے میں کہنے پہ وہ جیسے حقیقت کی دنیا میں واپس آئی۔ اس کے آنسو ایک دم سے رکے' اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"مسئلہ یہ نہیں کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں' مسئلہ یہ ہے کہ تم کیا "کرنا" چاہتی ہو۔ تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے عیان کہ ان اونچے شملوں والوں کے پاس غلاموں کی کمی نہیں ہوتی اور نہیں ہی ان کی بندوقوں

میں گولیوں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارا تو کچھ نہ جائے گا عیان حسن شاہ مگر وہ غریب ناحق مارا جائے گا۔" سمی آپی سانس لینے کو رکیں جبکہ عیان کا سانس حلق میں اٹک گیا۔

"وہ میرے لیے ایڈونچر نہیں ہے سمی آپی۔ محبت کرتی ہوں اس سے۔" وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

"چپ ہو جاؤ عیان خدارا چپ ہو جاؤ۔ اس بات کو یہیں دفن کردو۔" سمی آپی اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں مگر عیان سر گھٹنوں میں دیے مراقبے کی کیفیت میں تھی۔ صبح اس کا آخری پیپر تھا اور اسے فیصلہ کرنا تھا۔۔۔ آخری فیصلہ۔

"بی بی۔۔۔" وہ ایک دم سوتے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ پسینے سے تربتر ہو رہا تھا۔ سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں۔

"شکر ہے یہ خواب تھا" داؤد نے شکر ادا کیا' وہ اپنے گھر میں تھا۔ وہ ننگے پاؤں چلتا ہوا سیڑھیاں اتر کر صحن میں دائیں طرف رکھے گھڑے کی جانب بڑھا۔ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پانی پی رہا تھا جب اسے وہ خواب دوبارہ سے یاد آیا' بڑی مشکل سے اس نے گھونٹ کو حلق سے نیچے اتارا۔

کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا
میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے

وہ وہیں کونے میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔ اس نے خواب میں خود کو بہت چیختے سنا تھا۔ بہت اندھیرا اور ویرانی تھی۔ عیان کی گردن سے خون نکل رہا تھا۔ داؤد نے کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہ کیا تھا لیکن جو "خواب" وہ لے کر اس حویلی میں آیا تھا اس کے سامنے اس "خواب" کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ تو گویا یہ طے پا چکا تھا کہ اسے اپنا مقصد ہر حال میں حاصل کرنا ہے چاہے دل خالی رہ جائے۔ وہ بے جان قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

☆ ☆ ☆
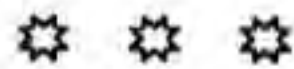
"تم ٹھیک تو ہو نا داؤد؟" پارکنگ ایریا میں کھڑی وہ گاڑی لاک کرتے داؤد سے بے تابانہ انداز میں چوتھی بار پوچھ چکی تھی۔ داؤد نے کچھ حیران ہو کر پلٹ کے اس کی طرف دیکھا جو آنسو پینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ داؤد کو وہ صدیوں کی بیمار دکھائی دی۔

"میں ٹھیک ہوں بی بی۔" اس نے وہی تلخی بھرا رویہ اپنایا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئی کیونکہ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے اپنے دادا کا مان رکھنا ہے اور داؤد کو زندہ دیکھنا ہے۔ یہ اس کا اور داؤد کا آخری دن تھا ایک ساتھ میں کیونکہ اس کے بعد وہ دادا سے بات کرے گی کہ وہ داؤد کو ہٹا دیں اس نوکری سے۔

عیان کا پیپر ہو چکا تھا اور وہ باقی دوستوں کے درمیان کھڑی سب کو سن رہی تھی مگر دیکھ صرف کچھ دور کھڑے داؤد کو رہی تھی۔ عزتیں' روایات' ذات پات۔ کہنے کو یہ لغت کے عام الفاظ ہی سہی مگر ان کو جھیلنا بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ عیان بھی اسی درد سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوج چکے تھے' وہ باربار آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتی' پلو کے سہارے کھڑی تھی۔ اتنے میں عشنا یوسف ان کے قریب آئی اور سب سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد عیان سے مخاطب ہوئی۔

"اے ہیلو! کہاں ہو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ خیر چھوڑو۔۔۔ مجھے تمہیں بہت اہم بات بتانی ہے۔ کچھ وقت کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہو؟" وہ اپنا ڈائمنڈ رنگ والا بایاں ہاتھ ضرورت سے زیادہ ہی جھلا رہی تھی کیونکہ حال ہی میں اس کی منگنی ہوئی تھی۔

"سوری عشنا آئی ایم ناٹ فیلنگ گڈ۔۔۔ میں واپس جاؤں گی پھر کبھی سہی۔" عیان یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی جب عشنا نے اسے بازو سے تھام لیا۔

"اگر بات بہت ضروری نہ ہوتی تو میں کبھی اصرار نہ کرتی بٹ بلیو می یہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے سن لو۔" وہ خلاف توقع ذرا نرمی سے بولی۔

"اوکے چلو۔" عیان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایکچولی عیان تم اپنے ہنری کیول (Henry Cavell) سے کہو کہ ذرا دور ہی رہے۔" عیان نے سر ہلایا اور داؤد کو کہہ کر کیفے ٹیریا میں چلی آئی۔

"عشنا پلیز ذرا جلدی۔۔۔" عیان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا عیان حسن شاہ کہ میں نے داؤد کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ تو بات کچھ یوں ہوئی کہ میں نے ذہن پہ بہت زور ڈالا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے کیونکہ میں خوب صورت چہروں کو کبھی نہیں بھولتی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"ایکچوئلی میں نے اسے پہلی بار نیویارک برج (Bridge) پہ دیکھا تھا جب میں اے لیول میں تھی اور اپنے انکل کے پاس نیویارک گئی تھی کرسمس کی چھٹیاں منانے۔" اس نے اپنے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور نظریں ترچھی کر کے عیان کو دیکھا جو بہت حیرانی و بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے پتا تھا تم بالکل یقین نہیں کرو گی اس لیے میں نے سوچا کہ پہلے کچھ شواہد اکٹھے کروں پھر تم سے بات کروں۔ اس لیے یہ دیکھو" عشنا نے تیزی سے اپنے ٹیب پہ انگلی چلاتے ہوئے ایک جگہ پہ رک کے موبائل اس کے سامنے کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے داؤد ملک کا پورٹ فولیو۔ جو کہ میرے کزن اور فیانسی رضوان خان نے بنایا ہے۔ ایکچوئلی یہی لینے میں مجھے دیر ہو گئی کیونکہ رضوان انکل سے ناراضی کی بنیاد پر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔" عشنا نے اپنی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو پھٹی پھٹی نظروں سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ یقیناً" وہ داؤد ہی تھا۔ ایک کے بعد ایک تصویر اس کے داؤد ہی ہونے کی تصدیق کر رہی تھی۔ رہی سہی کسر نیچے لکھے نام نے پوری کر دی تھی جہاں جلی حروف میں داؤد ملک ولد حیدر ملک، اسٹوڈنٹ آف آکسفورڈ اسکول آف بزنس لکھا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

"رضوان پروفیشنل فوٹو گرافر ہے نیویارک میں اور خوب صورتی کو بہت ایڈمائر کرتا ہے۔ تو جب ہم نے اسے نیویارک برج پر دیکھا تو رضوان نے اسے اپنا پورٹ فولیو بنوانے کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ داؤد لندن سے اپنے رشتے داروں کے ساتھ چھٹیاں منانے آیا تھا۔" وہ رکی۔

"اب بتاؤ کیا کہتی ہو؟" عشنا نے اس سے استفسار کیا۔

"نہیں' یہ داؤد نہیں ہو سکتا۔ وہ تو کراچی کے کسی گوٹھ کا رہنے والا ہے اور ہمارے بہت پرانے ملازم کا رشتہ دار ہے' یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔" عیان نے بے چینی سے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"او کے۔۔۔ تو تمہیں یقین نہیں ہے کہ یہ وہی داؤد ہے۔۔۔ آل رائٹ تم ابھی چیک کر سکتی ہو وہ اس طرح کہ میں نے جس داؤد کو نیویارک میں دیکھا تھا اسے ایکروفوبیا (اونچائی کا خوف) تھا۔ وہ نیویارک برج سے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کے دوست اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اسے نیچے دیکھنے سے چکر آنے لگتے تھے۔ اور ویسے بھی۔۔۔"

"او کے عشنا۔ تھینک یو فار یو Antcipation بٹ آئی ہیو ٹو گو ناؤ" عیان عشنا کی بات درمیان سے کاٹ کر اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"او کے۔" عشنا نے بھی سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی تھی اور اپنا ٹیب دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔

وہ کیفے ٹیریا سے باہر نکلی تو داؤد حسب معمول اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا مگر وہ پارکنگ ایریا جانے کی بجائے یونیورسٹی کے سیکنڈ فلور کی طرف بڑھی وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب اسے داؤد کی آواز سنائی دی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں بی بی۔" اس کے معصومیت سے "بی بی" کہنے پہ عیان کا دل چاہا کہ وہ پھٹ پڑے اور جا کر اس سے پوچھے کہ وہ کون ہے۔ کس مقصد کے لیے آیا ہے ان کی زندگی میں۔ مگر وہ خاموشی سے دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مجبوراً" وہ بھی پیچھے ہو لیا۔ وہ بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی اور پلٹ کے داؤد کو دیکھا

جس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے عیان کو گھورا تو وہ گھبرا کر تیزی سے وضاحتی انداز میں بولی۔

"وہ میں تمہیں دکھانے لائی تھی کہ وہ شخص دو دن سے ہمیں فالو کر رہا ہے۔" اس نے ایسے ہی اندازے سے نیچے درخت کے پاس کھڑے شخص کی طرف اشارہ کیا جو فوراً" درخت کی اوٹ میں ہو گیا تھا مگر داؤد تیزی سے نیچے جھکا مگر پھر اپنا سر تھام کے پیچھے ہٹا' وہ کراہا تھا اور عیان سب ہی کچھ بھول بھال کر اس طرف بڑھی۔

"داؤد' تمہیں کیا ہو رہا ہے۔" وہ گھبرا گئی اور روہانسی ہو کر اس سے پوچھنے لگی۔ وہ وہیں نیچے بیٹھ گیا اسے شدید چکر آ رہے تھے۔

"داؤد ہم نیچے چل رہے ہیں پلیز اٹھو..... میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گی سیکنڈ فلور پہ۔ داؤد تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ پلیز دیر نہ کرو میرا دل بند ہو رہا ہے۔" اس کے قریب بیٹھے وہ رو ہی پڑی تھی پھر ہمت کر کے اٹھی اور داؤد کو لے کر نیچے اترنے لگی۔

"داؤد یہ پانی پیو۔" عیان نے اسے بنچ پہ بٹھا کر پانی کی بوتل دیتے ہوئے کہا۔ وہ پانی پینے لگا۔ وہ زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ابھی بھی رو رہی تھی۔ داؤد نے سرخ آنکھوں سے تعجب کے ساتھ دیکھا جو اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری داؤد' یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اب کبھی ایسا نہیں کروں گی۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ نہ جانے کون کون سے غم تھے جن پہ ابھی رونا تھا۔ داؤد بڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی مگر خود سے کیے وعدوں نے اس کی سانسوں کو جکڑ رکھا تھا جب وہ رو رو کے تھک گئی اور داؤد خود کو روک روک کے' تو دونوں واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شام کے پانچ بج رہے تھے مگر بادلوں کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم "واپسی" کا سفر کر رہے تھے جو یقیناً" تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ٹریفک جام تھا۔ لوگ پاگل ہو رہے تھے مگر یہ دونوں اپنے آپ میں گم تھے اچانک عیان نے سوال کیا۔

"تمہیں ایکروفوبیا کب سے ہے داؤد؟" داؤد کے سامنے کی ونڈ اسکرین دھندلانے لگی اور اس دھند میں ماضی کے بہت سے منظر ہلکورے کھانے لگے مگر ایک منظر سب سے اہم تھا اور یقیناً" اذیت ناک بھی۔ وہ لندن کی ایک کہر زدہ قیامت خیز سردی کی صبح تھی۔ دھند کی وجہ سے حد نگاہ صفر تھی۔ High Street میں Merceere Eastgate Oxford کے لگژری فلیٹس جس کی 23 ویں منزل کی ایک بالکونی' جس میں ایک خوب صورت مرد اپنے پانچ سالہ بیٹے کو الٹا لٹکائے کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ بچے کی چیخیں دل دہلا دینے والی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے اور آسمان کی طرف جا رہا ہے۔ جب اس کی چیخیں تھمنے لگتیں تو اس کا باپ اپنے بیٹے کی کمر پہ تھپکی دیتا۔

"میرا شیر' شیر بنے گا میرا بیٹا" اس کی ماں پاگلوں کی طرح چیختی چلی جاتی یا پھر اپنے شوہر کے دائیں بائیں چکر کاٹنے لگتی۔

"پلیز خدا کے لیے رحم کریں' یہ معصوم بچہ ہے اگر آپ کا ہاتھ سرک گیا..... حیدر پلیز ایسا کیوں کرتے ہیں' دیکھیں اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئیں ہیں۔" ماں کی گریہ وزاری۔

"بند کرو یہ ڈرامہ اس طرح یہ مرد بنے گا۔ ملکوں کی سات پشتوں نے ایسا جوان نہ دیکھا ہو گا۔" اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کی بنیاد پر وہ سمجھانے کے انداز میں کہتا یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ بھلائی ان کے بیٹے کے لیے ساری عمر کا روگ بن سکتی ہے۔ ٹریفک کھل چکی تھی اور گاڑیوں کے مخصوص شور نے اسے حال میں لا پٹخا تھا۔

"تو بالآخر وہ وقت آن پہنچا جب ان دونوں کے لوح آئندہ پہ جدائی کندہ کر دی گئی۔ عیان نے داؤد کی سمت دیکھا اسے ہمیشہ کی طرح اس کا بایاں کندھا اور ہاتھ نظر

آرہا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔
گاڑی اپنے مخصوص رستوں پہ رواں دواں تھی جب
اچانک داؤد نے بریک لگائی' عیان کا دل انجانے خوف
سے کانپ اٹھا۔ ان کی گاڑی کے سامنے ایک گاڑی
کھڑی تھی جس کی ان کے گزرنے کا رستہ بند ہو چکا
تھا۔ داؤد نے ہارن بجایا تو ایک شخص اس کی کھڑکی پر
جھکا اور ذرا بے ڈھنگے انداز میں کہنے لگا۔

"بات کرنی ہے ملک صاحب۔" اس نے ایک
طرف بنے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا اور
بغور عیان کو دیکھا۔ داؤد نے زور سے دروازہ کھولا جو
اس شخص کو لگا تھا' وہ بے ساختہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ داؤد
باہر نکلا اور پچھلا دروازہ کھول کر عیان کو کہا۔

"چلیں بی بی' یہاں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

عیان چپ چاپ نیچے اتر گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں
اندھیرا تھا مگر تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی وجہ سے کم
محسوس ہو رہا تھا۔ عیان' داؤد کے بالکل ساتھ چل رہی
تھی کیونکہ وہ اتنے سارے آدمیوں کو دیکھ کر ڈر گئی
تھی۔

داؤد دائرے میں کھڑے آدمیوں کے درمیان جا
کھڑا ہوا جہاں سامنے ایک آدمی گاڑی کے بونٹ پہ
ایک ٹانگ رکھے غرور سے کھڑا تھا۔ عیان نے دیکھا'
داؤد کے چہرے پر بالکل خوف نہ تھا۔

"کہاں گم رہتے ہیں ملک صاحب۔ دیکھیں چاہنے
والوں نے ڈھونڈ ہی نکالا۔ اب جو ڈیل ہوئی اس کے
مطابق لڑکی دو اور بادشاہت لو۔" وہ استہزائیہ انداز میں
ہنسا اور اپنے ایک بندے کو اشارہ کیا جو عیان کی طرف
بڑھا۔ عیان نے داؤد کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

"یہ ڈیل کینسل سمجھو' یہ اب نہیں ہو گا۔" وہ
عیان کو لے کر واپس مڑنے لگا۔

"کیسے نہیں ہو گا ملک صاحب' یہ طے ہو چکا ہے
اور اس کام میں زبان سب سے اہم چیز ہے۔"

"میں نے کہا ناں کہ لڑکی نہیں ملے گی' اگر نہیں
دوں گا تو کیا کرو گے؟" وہ تن کے کھڑا ہو گیا۔

"دیکھ ملک ہم لڑنے نہیں آئے۔ ہمارے
درمیان یہ ڈیل ہوئی تھی کہ تم لڑکی ہمارے حوالے کرو
گے اور ہم سارے علاقے کی راجدھانی تمہارے
حوالے۔ ہماری ملکوں سے بات طے ہو چکی ہے۔ ہم
نے آج کی تاریخ میں لڑکی ان کے حوالے کرنی ہے۔"

اب کہ اس نے مصالحتی انداز اپنایا مگر داؤد ڈر کا نہیں۔ وہ
حق دق کھڑی عیان کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنے لگا جبکہ
وہ آدمی تیزی سے درمیان میں آیا۔

"جس نے بھی ہاتھ لگایا بی بی کو میں اس کے ہاتھ توڑ
دوں گا۔ تم سب جانتے ہو ناں مجھے" داؤد نے دھاڑ کے
کہا تو وہ آدمی رک گیا پھر پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا۔

"دیکھ ملک' جذباتی نہ ہو میرے بھائی۔ یہ بہت بڑی
ڈیل ہے یار۔" وہ رکا پھر بولا۔

"لیکن اگر تو نہ مانا تو انگلی تو ٹیڑھی کرنی پڑے گی۔"

"کیا کرو گے تم ہاں۔ کیا کرو گے۔" داؤد نے اسے
پیچھے دھکیلا۔ اسی وقت اس آدمی کا فون بجا۔ وہ داؤد کو
شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے کال ریسیو کرنے لگا۔
اگلے ہی لمحے اس کا انداز بدلا تھا اور وہ فوراً" اپنے
ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ
گیا۔ داؤد کچھ حیران ہوا ان کے یوں اچانک چلے جانے
پر۔ اب وہ عیان کی طرف پلٹا جو خوف زدہ سے اس کے
بازو سے چپکی کھڑی تھی۔

"بی بی چلیں۔" وہ آگے بڑھنے لگا۔

"تم کون ہو داؤد؟ ہماری زندگیوں میں کیوں آئے ہو؟
کیا چاہتے ہو؟" اس کی آواز بھرا گئی جبکہ وہ طیش سے
پلٹا۔

"کبھی کسی اپنے کو مرتے دیکھا ہے۔ عیان حسن
شاہ۔ میں نے دیکھا ہے۔ جانتی ہیں کتنی تکلیف ہوتی
ہے' کیسا درد ہوتا ہے جب آپ کو وجود بخشنے والا خود
لاوجود ہو جائے۔ نہیں دیکھا ناں پر میں نے دیکھا بھی
ہے اور سہا بھی ہے اور جانتی ہیں مجھے اس مقام تک
لانے والا کون ہے؟ وہ شخص جو مجھے دو وقت کی روٹی
دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجھے خرید لیا۔" وہ رکا۔

"میں برباد کر دوں گا سب کچھ... میں برباد کر دیتا

سب کچھ... مگر آج میں... میں ہار گیا۔" یہ دکھ اور غصے کی ملی جلی کیفیت تھی جو اس پر طاری تھی۔ اس نے حیران سی کھڑی عیان کو کندھے سے تھام کے قریب کیا۔

"میں بتانا چاہتا ہوں بی بی کہ میں کیوں ہارا... میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ میں سب بتانا چاہتا ہوں... بی بی میں..." اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس سیدھی اس کی آنکھوں میں پڑی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے تیزی سے عیان کو چھوڑا تھا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ جان تو عیان بھی گئی تھی مگر وہ داؤد کی طرف دیکھ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

"مجھے تم پہ یقین ہے داؤد اور تم جو بھی ہو جیسے بھی ہو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اس سے۔" قدرت اللہ شاہ کے قدم ست پڑے تھے جبکہ تبریز شاہ کی چال میں اور تیزی آئی۔ اس نے ہاتھ میں رائفل تھام رکھی تھی وہ عیان پہ جھپٹا، اسے بازو سے تھام کے قدرت اللہ شاہ کے حوالے کیا اور خود داؤد پہ بندوق تان لی۔ بادل زور سے گرجے۔ مگر قدرت اللہ شاہ اس سے بھی زیادہ زور سے دھاڑے۔

"دکھا دی ناں اپنی اوقات تم نے بھی داؤد ملک۔ تم کیا سمجھے تھے کہ میں اپنی پوتی تمہارے حوالے کر کے خود آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ تم جیسے چھوٹے لوگ ان اوچھے ہتھکنڈوں سے ہی اپنی قسمت سنوارتے ہیں ہمیشہ اور بڑے لوگوں کی..."

"آپ کیا کہہ رہے ہیں داجان کیا ہوا ہے؟ آپ کیوں کہہ رہے ہیں یہ سب داؤد سے" وہ چیخ کے بولی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

"تم چپ رہو عیان۔ تم جو کر چکی ہو وہی کافی ہے۔" جلال شاہ نے عیان کو کھینچ کے تھپڑ دے مارا۔

"بی بی کا قصور نہیں ہے۔ میں ہی انہیں یہاں لایا ہوں۔" داؤد بولا۔

"دیکھا نانا ابا۔" تبریز نے قہربار نظروں سے داؤد کو دیکھا۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں داجان بس ختم کریں یہ ڈرامہ۔" جلال شاہ کا بس نہ چل رہا تھا وہ کیا کر ڈالیں۔

"تبریز! یہ زندہ نہ بچ سکے۔" عیان چیخی۔ داؤد نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ داؤد نے جھٹکا کھایا اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دل پہ دونوں پاؤں رکھ کے کھڑا ہو گیا ہے۔ بست جان لیوا تکلیف۔ مگر اگلے لمحے اس کو جلال شاہ کی دبی دبی چیخ سنائی دی۔ داؤد نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی سامنے کھڑی عیان لہرا کے گری، اس کی گردن سے خون کی ندی بہہ نکلی تھی۔ قدرت اللہ شاہ تو پتھرا گئے تھے۔ داؤد اس کی طرف بڑھا مگر تبریز نے اپنی رائفل اس پہ خالی کر دی اور تب ہی بارش کا پہلا قطرہ دھرتی سے آن ملا تھا۔ داؤد نے اسے بھاگ جانے کا اشارہ کرتی عیان کی انگلیوں کو ساکت ہوتے دیکھا تھا۔ مگر پھر وہ خود ہی ساکت ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

اندھیرا، دھواں، گولی، خون اور پھر اندھیرا، داؤد نے آنکھیں کھولیں۔ اسے اپنی آنکھوں کے پیچھے اور اپنے سینے میں شدید درد محسوس ہوا۔ اس کا ذہن آہستہ آہستہ ماحول سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔

"ماما... ماما بھائی، پلیز ماما، دیکھیں بھائی کو ہوش آ گیا۔" بے تحاشا روتی لڑکی کی آواز اسے سنائی دی۔ کچھ دیر بعد ایک عورت اس پہ جھکی اسے کہہ رہی تھی۔

"داؤد... میرے بچے میری جان۔" وہ اس کی ماں تھی۔ یقیناً" وہ اس کی ماں ہی تھی جو اسے بے تحاشا چومتے ہوئے خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اس کا ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

"بی بی... بی بی۔" وہ ہولے سے بڑبڑایا پھر اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ تیز روشنی کی وجہ سے اسے آنکھیں پوری کھولنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسے ایک بار پھر اسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"ماما... بھائی کو ہوش آگیا۔ ماما دیکھیں ناں پلیز۔"

لڑکی نے لفظوں کے ردوبدل کے ساتھ وہی بات دہرائی۔ داؤد نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا کیونکہ اسے اپنے جسم میں شدید درد محسوس ہوا۔

"داؤد بیٹا! ہاؤ آر یو فیلنگ ناؤ" اس کی ماں نے بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے اس کے بال سنوارے جبکہ ان کے پیچھے کندھے کے پاس کھڑی لڑکی جو بے تحاشا خوب صورت تھی، وہ اس کی بہن تھی دعا ملک۔ داؤد نے نظریں گھما کے دیکھا، وہ اسلام آباد میں اپنے گھر میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بہن بے تحاشا رو رہی تھی جبکہ اس کی ماں اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کو اس کے ہاتھ چومنے لگی۔

"میں یہاں کیسے... آیا ماما؟" وہ بہت وقت سے یہ الفاظ بول پایا۔ جبکہ اس کی ماں نے نظریں چراتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

"بخشی چھوڑ کے گیا تھا" خاموشی کا وقفہ ان کے درمیان ٹھہرا اور سرک گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا ہے داؤد۔ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ کیوں ہوا ہے یہ سب۔ بخشی جب تمہیں وہاں سے لایا تو تم شاید اپنی زندگی کی آخری سانسیں بھی لے چکے تھے۔" ایک اور طویل خاموشی کا وقفہ۔ اس کی ماں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

"اس سارے معاملے کو کانفیڈینشل رکھنے کے لیے مجھے ایسے ایسے لوگوں کے پاس جانا پڑا جن سے میں بات کرنا پسند نہ کرتی تھی۔" وہ تلخ ہوئیں۔ داؤد نے خالی نظروں سے اپنی ماں کا خوب صورت چہرہ دیکھا جسے وقت چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ ایک بہت بڑی بیوروکریٹ اور باکمال عورت۔ "آخر کو قدرت اللہ شاہ کی پوتی پہ فائرنگ ہوئی تھی۔" داؤد جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اسے وہ رات یاد آئی اپنی مکمل تباہی سمیت۔

"بی بی!" وہ ہلکے سے بڑبڑایا اور پھر چیخا۔ وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا تھا اور جسم میں ہونے والے شدید درد کے باوجود باہر کو بڑھا۔ اس دوران اس کی ماں اور بہن مسلسل چیخ رہی تھیں اور اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ رک ہی نہیں رہا تھا۔ قصور اس کا نہیں تھا دراصل اسے کچھ سنائی ہی نہ دے رہا تھا اور نہ کچھ دکھائی۔ محبت یہی تو کرتی ہے۔ وہ آپ کے ذہن کو ایک ایسی آرٹ گیلری تک محدود کر دیتی ہے جس میں ہر طرف محبوب کی تصویریں ہی آویزاں ہوتی ہے۔ داؤد کو چلنا دشوار تھا مگر وہ بھاگ جانا چاہتا تھا وہیں، جہاں وہ تھی جسے اس نے سب سے زیادہ اپنی نفرت کا نشانہ بنایا تھا۔

"رک جاؤ داؤد... وہ مر چکی ہے... عیان مر چکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی ماں کی سانسیں یوں پھول گئی تھیں جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ وہ رک گیا یوں جیسے کبھی نہ ہل پائے گا۔ کبھی آگے نہ بڑھ پائے گا۔ پھر وہ کھڑکی کی طرف بڑھا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے وہ جیسے اپنے زندہ ہونے کا یقین کرنا چاہ رہا تھا۔

"آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔" وہ اتنی زور سے چیخا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر لگے سارے ٹانکے ادھڑ گئے ہوں۔ وہ وہیں زمین پہ بیٹھ گیا اس کی روتی ہوئی ماں اور بہن اس کی طرف بڑھیں۔

وہ خاموش ہو گیا تھا کہ جیسے شہر خموشاں کا باسی ہو۔

کچھ حادثے زندگی میں ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ انسان بچ تو جاتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا

"مجھے یو کے جانا ہے اسی ہفتے۔" کھانا کھاتے ہوئے اس کی ماں کے ہاتھ رکے جبکہ دعا کے چہرے پہ بے چینی رقص کرنے لگی پھر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولنے لگیں۔

"ٹھیک ہے تم جانے کی تیاری کرو میں۔ ذیشان صاحب سے بات کرتی ہوں۔" وہ اٹھ کے جا چکی تھیں جبکہ وہ وہیں بیٹھا تھا بالکل ساکت۔ دعا نے اسے جھجکتے ہوئے بغور دیکھا۔ وہ گلاس ٹیبل کی سطح کرید رہا تھا۔ اس کی لک بالکل چینج ہو چکی تھی۔ کول گلے والی وائٹ اینڈ بلیو ٹی شرٹ جینز، بالوں کا کریو (Crew)

کٹ اور ہلکی ہلکی شیولائٹ گولڈن کلر کی ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت مکمل انگلش لک میں تھا جیسے وہ شروع میں تھا۔ وہ ناقابل یقین حد تک خوب صورت تھا اور یقیناً" دعا بھی غیر معمولی حسن رکھتی تھی لیکن ان دونوں بہن بھائیوں قسمت عام لوگوں کی طرح نہیں تھی اور نہ ہی ان کی زندگی۔ دعا نے حسرت و یاس بھری نگاہوں سے اپنے بھائی کو دیکھا جو تب تک یہاں بیٹھا رہنے والا تھا جب تک کوئی اسے اپنے کمرے میں جانے کو نہ کہتا۔

"تم... تم آج کل کیا کر رہی ہو؟" داؤد نے اسے دیکھتے ہوئے خالی لہجے میں پوچھا جس پر وہ معصوم و حساس لڑکی نہال ہی ہو گئی۔

"میں ایم ایس سی کر رہی ہوں سائیکالوجی میں... بھائی" وہ رک رک کر بولی۔ ان دونوں کا تعلق ایسا ہی تھا۔ بچپن میں جب بھی وہ پاکستان آتا تو وہ اسے یونہی دیکھا کرتی تھی چھپ کے۔ کبھی ماما کے پیچھے سے تو کبھی کتاب کے پیچھے سے۔

"ہوں" وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی' کہنا چاہتی تھی کہ اسے اور ماما کو داؤد کی ضرورت ہے مگر اس نے اپنے بھائی کو مرتے دیکھا تھا اندر سے۔ وہ اس کی آنکھوں کی ویرانیاں نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے خاموش ہو رہی۔ بے شک بعض معاملات میں خاموشی تریاق کا کام کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ گریٹ ایسٹر اسٹریٹ پہ چلتا چلا جا رہا تھا' جب وہ شمال کی جانب لیونارڈ اسٹریٹ (Leonard) کی جانب مڑا اور روئی کے گالوں کی طرح برف اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اس کی تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ چلتے چلتے اس کا بدن شل ہو چکا تھا۔ دو ماہ ہو گئے تھے اسے لندن آئے ہوئے اور ان دو ماہ میں اس نے ایک ہی تو کام کیا تھا۔ وہ دن بھر چلتا رہتا تھا' جب شل ہو جاتا تو بیٹھ جاتا اور جب بیٹھ بیٹھ کر بدن شل ہو جاتا تو پھر سے چل دیتا جانے وہ لوگوں میں کس کو تلاش کرتا تھا جو تھک کے نہ دیتا۔ وہ لیونارڈ اسٹریٹ (Leonard street) میں موجود' دا بک کلب (TBC) (The book Club) کی پر شکوہ عمارت میں داخل ہوا جہاں عموماً" لوگ اپنے کام کے سلسلے میں ہونے والی میٹنگز (Meetings) میں شرکت کے لیے آتے۔

اسٹوڈنٹس کے لیے الگ جگہ مختص تھی جہاں وہ کمبائن اسٹڈی کے علاوہ chill کرنے کے لیے بھی آتے تھے۔ وہ گلاس وال کے بالکل سامنے والی ٹیبل پہ جا بیٹھا۔ اس کی آرڈر کی کافی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ کافی کی سطح پر جمنے والی تہ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ شاید ہر وہ چیز جسے نظر انداز کیا جاتا ہے اس کے اوپر ایسی ہی کوئی تہ جم جاتی ہے۔ جو اندر ہونے والے تغیر و تبدل کو ڈھانپ دیتی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہوتا کہ تہ کے نیچے کی دنیا پر سکوت ہے۔ اندر کی ٹوٹ پھوٹ نظر نہیں آتی اس پہ بھی تو لوگ تہیں چڑھا لیتے ہیں۔ اس کی سوچ کہاں سے کہاں جا نکلی تھی جب اچانک کوئی اس کے سر پہ کھڑا ہو کر تقریباً" چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ڈیوڈ... اٹس یو... ان بلیو ایبل" داؤد نے خالی خالی نظروں سے سامنے موجود دو لڑکوں کو دیکھا' دماغ نے ان کے چہروں کو کوڈ کیا اور ان کے نام لبوں نے ادا کیے۔

"روحیل۔ جیک۔" وہ آہستگی سے بڑبڑایا۔ اب کے وہ دونوں اس پہ جھپٹ پڑے تھے۔ پرانے دوستوں سے ملنے کی خوشی بچپن میں سب سے زیادہ عیدی ملنے کی خوشی سے بھی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ داؤد نے مسکرانا چاہا مگر ناکام رہا۔ روحیل اور جیک اتنے خوش تھے کہ وہ اس کی خوشی دیکھنا بھی بھولے ہوئے تھے۔ وہ دونوں داؤد کے بڈی تھے' اسکول' ہائی سکول' یونیورسٹی' وہ اپنی تکون کی وجہ سے ہر جگہ مشہور تھے۔ اب وہ دونوں ایک اوسط درجے کی کنسٹرکشن کمپنی چلاتے تھے۔ دس بجے کے قریب وہ کلب سے نکل آئے تھے لیکن کار کی بجائے لوکل ٹرانسپورٹ سے داؤد کے گھر جانے کا فیصلہ روحیل نے آناً" فاناً" کیا۔ وہ تینوں لیونارڈ اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے جا رہے تھے' جب

روحیل نے کہا۔

"کیا ہوا بول کیوں نہیں رہے۔ تم جب سے ہمیں ملے ہو صرف سن رہے ہو۔ پہلے تم نے ہمیں آنے کی اطلاع نہیں دی پھر ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش تک نہ کی۔ اب جب سے ملے ہو میوٹ (Mute) ہو کے پھر رہے ہو" وہ تیز تیز انگلش میں شکوے کرتا داؤد کو اپنا سا لگا تھا۔ داؤد نے اپنی جیکٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر آپس میں مسلے اور اپنے چہرے پر ہاتھ لگاتا ہوا بولا تو فقط اتنا۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔۔۔ تم اپنی سناؤ۔" اور وہ واقعی لگا اپنی سنانے۔

"تمہیں وہ جورڈن یاد ہے۔ جس کی گرل فرینڈ تم پہ لٹو ہو گئی تو اس نے تمہارے خلاف یونیورسٹی میں احتجاج کروایا کہ تم باقاعدہ پلاننگ سے سب کی گرل فرینڈز کو پھانستے ہو اور جان بوجھ کے بریک اپس کرواتے ہو۔۔۔ نہیں آیا یاد ڈیوڈ' وہی جورڈن جو فرانس سے آیا تھا اور۔۔۔"

"اس کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔۔۔ ہونہہ جورڈن' دا فرینچ ڈنکی" (Franch Doncky) جیک تو جورڈن کے خلاف بھرا بیٹھا تھا۔

"کیسے ناں نام لوں وہ ہمارا بزنس پارٹنر ہے 25 پرسینٹ کا جناب انتھونی جیکسن دا انگلش منکی (English Monkey)۔" روحیل نے جیک سے حساب بے باق کیا تو وہ دونوں قہقہہ لگا کے ہنسے جبکہ داؤد بھی اس دفعہ مسکرانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ میں ایسا حزن تھا کہ ان دونوں کی ہنسی تھم گئی۔

"کوئی مسئلہ ہے ڈیوڈ؟" جیک نے پوچھا۔ اس کے دوست اسے ڈیوڈ ہی کہتے تھے اس لیے تمام انگریز دوست اسے ڈیوڈ ہی کہتے تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جب دائیں طرف سے آتا ایک کپل ان سے ٹکرا گیا۔

"اوہ۔۔۔ سوری گائیز (guys)۔ لڑکی کے بال بہت خوب صورت تھے کمر تک آتے براؤن بال بالکل سیدھے۔ داؤد جیسے مجسمہ ہی بن گیا تھا۔ وہ کچھ فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ داؤد دیوانہ وار بھاگتا ہوا اس لڑکی کی طرف گیا تھا وہ اپنے حواسوں میں ہرگز نہ تھا۔

"وہ بی بی۔۔۔ بی بی" کہتا ہوا اس لڑکی کے بال اور اوور کوٹ ہٹاتے ہوئے اس کی گردن دیکھنے لگا۔ لڑکی خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی تھی۔ روحیل اور جیک نے بڑی دقتوں سے اس لڑکی اور ساتھ موجود لڑکے کو تسلی کروائی تھی کہ یہ سب ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے جبکہ داؤد اس لڑکی کا چہرہ دیکھنے کے بعد فٹ پاتھ پہ بیٹھ گیا۔ اس کی کنپٹیوں میں شدید درد جاگا تھا۔ جس نے سارے سر کا محاصرہ کر لیا تھا' درد اتنا شدید تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی سنسنا اٹھی تھی۔ روحیل اور جیک دونوں پریشانی سے اس کی جانب بڑھے۔ روحیل نے داؤد کی حالت کے پیش نظر جیک کو کہا۔

"جیک! ڈاکٹر رچرڈ سے پوچھ' کیا وہ اس وقت مل سکتے ہیں۔" روحیل نے جیک کے ایک ڈاکٹر انکل کا نام لیا۔ جیک نے کال ملائی اور روحیل تب تک کیب روک چکا تھا۔

★★★

"ان کاغذات پہ سائن کرو" روحیل نے کچھ پیپرز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت روحیل' جیک اور جورڈن کے درمیان ان کے آفس میں موجود تھا۔

"یہ کیسے کاغذات ہیں؟" داؤد نے ٹس سے مس نہ ہوتے ہوئے روحیل سے پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لو۔" روحیل بھی اپنی ریوالونگ چیئر پر مزید پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا سب ہی اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ داؤد نے کاغذات کو سرسری انداز میں دیکھا پھر کاغذات روحیل کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"میں اتنی انویسٹمنٹ نہیں کر سکتا۔" کاغذات کے مطابق وہ تینوں داؤد کو کمپنی میں 25 فیصد حصے کا شراکت دار بنا رہے تھے۔ روحیل اور جورڈن ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

"انویسٹمنٹ کی ساری اماؤنٹ اب تک ہمارے

اکاؤنٹ میں جمع بھی ہو چکی ہو گی آپ کو صرف یہاں سائن کرنے ہیں۔" داؤد کچھ نہ بولا وہ صرف ان دونوں کو گھور رہا تھا۔ جیک فوراً" بولا۔

"ہمیں ایسا کرنے کو آنٹی نے کہا تھا۔ ویسے بھی تمہیں جاب تو کرنی ہی ہے تو کیوں ناں سارے دوست مل کے اس کمپنی کو دیوالیہ کریں۔" وہ تینوں قہقہہ لگا کے ہنسے اور داؤد نے پیپرز پہ سائن کر دیے۔

☆ ☆ ☆

ایک... دو' تین... آٹھ۔ پورے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ داؤد کے باہر کی دنیا بہت بدل گئی تھی مگر اندر سے وہ وہیں اسی نقطے پر کھڑا تھا۔ سائیکالوجسٹ کی تھراپیز' سائیکاٹرسٹ کی میڈیسنز سب ناکام ہو چکا تھا۔ اس کے اندر پلنے والا ایک جذبہ سب پہ حاوی تھا۔ دا پلینرز کمپنی (The planer's company) کے نام سے وہ کمپنی جو ان چار لوگوں نے مل کے بنائی تھی وہ اس وقت انگلینڈ کی ٹاپ فائیو کنسٹرکشن کمپنیز میں شامل تھی۔ وہ خود millioner سے Billioner ہو چکا تھا مگر یہ سب اس کے کسی کام کا نہ تھا کیونکہ وہ تو آج بھی خود کو ویسا ہی کنگال سمجھتا تھا جیسا اس رات ہوا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے داؤد' اس دفعہ سیلیبریشن پارٹی کہاں ہونی چاہیے۔" روحیل نے داؤد کے قریب پڑے ریموٹ کو اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ اس وقت کمپنی کی عالیشان عمارت میں موجود آفیشل سٹنگ روم میں موجود تھے۔ جیک نے کھڑکی کی سلائیڈز اٹھائیں اور پھر داؤد کی موجودگی کی وجہ سے فوراً" گرا دیں۔ انہوں نے حال ہی میں نیویارک میں ایک بہت بڑے پراجیکٹ کا کانٹریکٹ حاصل کیا تھا۔

پارٹی کے بعد وہ بہت تھک گیا تھا ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا اور اپنے جوتے اتارنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی گھڑی اتاری اور اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ گلاس میں پانی ڈال کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی میڈیسن لینی تھی۔ وہ اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوا تھا لیکن اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے پلٹ کے دیکھا' ایک انتہائی خوب صورت لڑکی کارنر میں موجود کاؤچ پہ بیٹھی تھی مگر اس کا لباس... وہ پیشہ ورانہ انداز میں مسکرائی۔ داؤد کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

"آؤٹ... آئی سے آؤٹ آف ہیئر۔" وہ دھاڑا تو وہ لڑکی جلدی سے باہر نکل گئی۔ داؤد نے روحیل کا نمبر ملایا' وہ جیسے کال کے انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔

"کیسا لگا سرپرائز" وہ چہکا۔

"شٹ اپ... بہت ذلیل حرکت کی ہے تم نے۔ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے فون بند کر کے اسے پاور آف کر دیا۔ اپنی میڈیسن کھانے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ وہ لڑکی ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بیٹھی تھی اب اس نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اس کی طرف بڑھی اور لجاجت بھرے انداز میں کہنے لگی۔

"پلیز مجھے یہاں رات بھر رہنے دیں... میں ایک رات ہی سہی مگر سکون سے رہنا چاہتی ہوں۔" داؤد کو اس کی آنکھوں میں سچائی نظر آئی۔

"تم اس کمرے میں سو سکتی ہو۔" وہ کہہ کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا جبکہ وہ لڑکی اسے ممنون نظروں سے دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے کی جانب چل دی۔

"پھر کتنی قیمت دی تم نے اس لڑکی کی... رات کو تو کچھ اور کہہ رہے تھے... دیکھو داؤد ایسی لڑکیوں کے لیے پیسہ ضائع نہیں کرتے... کیوں خریدا اسے۔" روحیل کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ داؤد نے ایلن روز' نامی اس کال گرل کو خرید لیا ہے جسے روحیل نے اس کے پاس بھیجا تھا' وہ ان ہی احساسات کا شکار ہو رہا تھا جبکہ داؤد اس سے مکمل بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مزید بولا۔

"ٹھیک ہے غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اسے

بھیجا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ کسی عورت کا غم کوئی عورت ہی بھلا سکتی ہے۔" روحیل کی بات داؤد کو تیر کی طرح لگی تھی۔ وہ زور سے ٹیبل پر ہاتھ مار کے کھڑا ہوا۔

"تم اس لڑکی کا موازنہ بی بی سے کر رہے ہو۔" وہ غرایا۔

"تو تم اس حقیقت کو کیوں نہیں مان لیتے کہ وہ لڑکی مر چکی ہے۔ تم ہمیشہ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم سے اور بھی بہت سے لوگ وابستہ ہیں۔ تمہیں یہ ماننا ہوگا کہ وہ مر چکی ہے اور۔۔۔"

"شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ۔ تم نے کہا بھی کیسے کہ وہ۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی جیسے اس میں کہنے کی سکت نہ ہو۔ "جو بات میں ان آٹھ سالوں میں ایک بار بھی خود سے نہ کہہ سکا وہ تم نے چند لمحوں میں کیسے کہہ دی روحیل۔" داؤد کی سانسیں پھولنے لگیں۔ یہ اس کے انگزائٹی اٹیک کی پہلی علامت تھی۔ روحیل پریشانی سے اس کی طرف بڑھا' داؤد نے اسے پیچھے کیا۔

"اگر میری سانسیں چل رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا یقین اس بات پہ اور بھی پختہ ہو رہا ہے۔" داؤد نے انگلی اٹھا کے روحیل کو وارن کرتے ہوئے کہا۔

"آج کے بعد ایسا کبھی مت کہنا روحیل۔ بی بی کو کچھ نہیں ہوا۔" اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی تھی۔ اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے منرل واٹر کی بوتل منہ کو لگا لیا۔ روحیل نے اسے میڈیسن تھمائی تو وہ اس کا ہاتھ جھٹکتا باہر نکل گیا۔

روحیل اور جیک اس کے اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ داؤد اس لڑکی کو Hampstead villege میں موجود اپنے گھر لے کر جانے والا تھا۔ وہ دونوں اس سے بات کرنے آئے تھے جہاں ایک نیا انکشاف ان کا منتظر تھا۔

اس لڑکی کا نام ایلین روز نہیں بلکہ خائفہ محمود ہے۔ فلسطین سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے فلسطین سے اسمگل کر کے یہاں لایا گیا۔ کامن ویلتھ گیمز (Common wealth games) کے موقع پر دنیا سے 42 ہزار لڑکیاں اسمگل کر کے لائی گئی تھی جن کی یہاں یہ منڈی لگی تھی۔ خائفہ کو بھی وہیں سے خرید ا گیا۔ وہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔ اور اس جیسی بیالیس ہزار لڑکیاں بیچی گئیں اور خریدی گئیں تب کہاں جا سوئیں یہ ہیومن رائٹس این جی اوز کہاں گئیں حقوق نسواں کا پرچار کرتی تنظیمیں۔ کہاں تھے خود کو تہذیب یافتہ کہلانے والے ورلڈ پاور کے حامل ممالک۔۔۔ کیا یہی ہے اب تک کی انسانی تہذیب کہ جہاں عورتوں کی منڈیاں لگتیں ہیں ہونہہ۔۔۔ وہ نفرت سے ہنکارا بھرتے ہوئے ذرا دیر کو رکا۔

"دنیا میں اگر کوئی مسلمان اپنی بیٹی' بہن یا بیوی کو حجاب پہنواتا ہے یا اسے تعلیم حاصل کرنے سے روکتا ہے تو اسے fundamentalist کہا جاتا ہے۔ مسلمان ممالک پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ انہیں دہشت گرد کہا جاتا ہے لیکن کسی یورپین ملک میں عورتوں کی اتنی بڑی منڈی لگتی ہے تو کسی تنظیم کے منہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی۔" وہ رکا پھر بولا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا' صرف ایک لڑکی کو بچایا ہے... صرف ایک کو۔" داؤد یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تھا جبکہ ان دونوں کے لیے بہت سے سوالات چھوڑ گیا تھا۔

داؤد خائفہ کو اپنے گھر لے آیا تھا جہاں وہ ہر ویک اینڈ پہ آتا تھا۔ اس کا گھر Mension Hampstead میں تھا جو دنیا کی سب سے مہنگی پراپرٹی سمجھی جاتی ہے Hampstead villege چیرنگ کراس سے چار کلو میٹر کے شمال مغربی فاصلے پر موجود تھا۔ یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ یہاں John Keats کا گھر بھی موجود ہے جہاں اس نے اپنی شہرہ آفاق نظم Ode to a nightingate لکھی تھی۔ خائفہ کو یہاں رہنا تھا اور دوسرے ملازموں کو سپروائز کرنا تھا۔ وہ بہت خوش تھی اور داؤد بہت پریشان تھا۔ سب دوائیاں اپنا اثر کھو چکی تھیں۔

وہ رات ڈیڑھ بجے کے قریب گھر سے نکل آیا' وہ بھاگنے کے انداز میں تیز تیز چل رہا تھا مگر اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ جانے کیوں وہ Hampstead اسلامک سینٹر کے سامنے رک گیا۔ کافی دیر باہر کھڑا رہنے کے بعد اس نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ مسجد میں صرف چند ہی لوگ موجود تھے۔ وہ ایک کونے میں جا بیٹھا ایک طرف بیٹھے قاری صاحب بہت لحن سے سورہ رحمن کی تلاوت کر رہے تھے' داؤد کو یک گونہ سکون ہوا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی اسے وہاں بیٹھے ہوئے جب ایک بزرگ اس کے برابر آن بیٹھے اور اس سے پوچھنے لگے۔

"پریشان دکھائی دیتے ہو بیٹا۔ کیا بات ہے؟" جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ اس شخص کو سب بتا دے جو اس نے جھیلا ہے۔۔۔ جو اس پہ بیتا ہے اس نے وہ سب بتا دیا تھا جو شاید وہ ابھی تک کسی کو نہ بتا پایا تھا۔

"کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا۔۔۔ میرے ساتھ ہی کیوں۔ میں نے تو کبھی بی بی کو آنکھ بھر کے دیکھا نہ تھا۔ ابھی تو میں نے کوئی خواب نہ دیکھا تھا پھر کیوں۔۔۔ کوئی ہے میرے اندر جو روتا رہتا ہے۔ میں کھوکھلا ہو گیا ہوں ان آٹھ سالوں میں۔۔۔ میں جی بھر کے رونا چاہتا ہوں اپنے ہر خسارے پر لیکن میری آنکھیں جیسے بنجر ہو گئی ہیں' مجھے سکون نہیں ملتا ایسا کیوں ہوا۔۔۔ کیوں ہوا۔"

"کیوں کہ تمہاری نیت ٹھیک نہیں تھی۔ تم وہاں اپنا انتقام لینے گئے تھے اور تم نے لیا بھی۔ پھر تمہیں انعام کس چیز کا ملتا۔ انعام تو صبر کرنے والوں کو' معاف کر دینے والوں کو ملتا ہے۔" داؤد نے چونک کر ان بزرگ کی طرف دیکھا' وہ ہولے سے مسکرائے۔

"انتقام لینا میرا حق تھا" اس نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

"اور معاف کر دینا تم پہ واجب۔۔۔ کیوں کہ تمہاری ماں انہیں معاف کر چکی تھی۔ خود کو انتقام کی بھٹی میں جھونک کے انسان خود پہ ہی ظلم کرتا ہے اور بے شک اللہ ظالموں کو پسندیدہ نہیں رکھتا۔ جب انسان کے اندر سے دھواں نکلنے کا رستہ ہی نہیں تو جانے کیوں وہ اپنے اندر آگ لگاتا ہے۔۔۔ نادان انسان" داؤد کو چپ لگ گئی تھی۔ تصویر کا یہ رخ اسے کبھی کسی نے نہ دکھایا تھا۔ "میری مانو اگر سکون چاہیے تو واپس جاؤ اپنی ماں کے پاس۔ دنیا میں اگر کہیں سکون ہے تو ماں کی پناہوں میں ہی ہے۔۔۔ اور اگر ہو سکے تو اس لڑکی کی قبر پہ جا کے فاتحہ پڑھ لو۔ سکون مل جائے گا۔"

"نہیں وہ زندہ ہے۔۔۔ پلیز ایسا نہ کہیں" داؤد نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تو انہوں نے داؤد کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا۔

"اب اٹھو اور دو رکعت نفل پڑھ لو اور دعا مانگو۔۔۔ فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔"

"سر نماز کیا کرتی ہے۔۔۔ سبھی کہتے ہیں نماز پڑھو۔" وہ رکے اور مسکرائے۔ پھر بولے۔

"نماز کچھ نہیں کرتی صرف اتنا کرتی ہے کہ تمہیں تمہارے رب سے ملا دیتی ہے۔" داؤد خاموشی سے اٹھ کے ان کے ساتھ وضو کرنے چل دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ لاہور ایئرپورٹ پہ اترا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ وہ زندگی کی کوئی سانس اس ملک کی فضا میں نہ لے گا لیکن وقت نے اسے وہیں لا پھینکا تھا جہاں سے وہ چلا تھا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع دعا کو دی تھی جو لاہور آنے کے بعد اسے ریسیو کرنے والی تھی۔ دعا کی شادی اپنے کلاس فیلو شہوز سے ہوئی تھی اور وہ شادی کی بعد لاہور شفٹ ہو گئی تھی۔ اس نے دور ہی سے ہاتھ ہلاتی دعا کو پہچان لیا' وہ آج بھی اتنی ہی جذباتی تھی۔ داؤد سے ملنے کے بعد وہ کتنی دیر اس کے گلے لگی روتی رہی۔ شہوز شرمندہ سا ہو گیا پھر دعا کو پیچھے ہٹانے کو آگے بڑھا مگر داؤد نے اسے روک دیا۔ اس کی بہن پہلی بار اس کے گلے سے لگی تھی۔

"چلیں بھائی" وہ خود ہی داؤد سے الگ ہوتے ہوئے کہنے لگی۔ دعا نے اسے بتایا کہ وہ ماما کو داؤد کے

آنے کا بتا چکی ہے اور وہ کل کسی بھی وقت آئیں گی۔ ان کی کچھ ضروری میٹنگ تھی آج۔ دعا کچھ زیادہ ہی بولنے لگی تھی یا پھر اس کی خاطر اتنا بول رہی تھی جبکہ شہوز اس سے اچھا خاصا متاثر نظر آرہا تھا۔ ڈنر کے دوران دعا نے باتوں ہی باتوں میں اپنی سالگرہ بھی یاد دلا دی جو کل تھی' داؤد اس حسن اتفاق پہ حیران تھا۔ ڈنر کے بعد داؤد کمرے میں جانے کی بجائے لان میں چلا آیا جبکہ شہوز اور دعا شہوز کی معذور ماں کو کھانا کھلانے اور میڈیسن دینے چلے گئے۔ دعا کا گھر بہت خوب صورت اور بڑا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک کونے میں پڑے بنچ پہ جا بیٹھا اور چاند کو دیکھنے لگا۔ اسے اپنے تاثرات چھپانے میں دقت ہو رہی تھی لیکن اسے مضبوط رہنا تھا۔ وہ یہاں ان حقیقتوں کا سامنا کرنے کرنے آیا تھا جن سے وہ آٹھ سالوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اس نے شہوز کو تیزی سے پورچ کی جانب جاتے دیکھا پھر وہ مڑا اور اس کی جانب آیا۔

"آئی ایم سوسوری داؤد بھائی' مجھے ذرا اسپتال تک جانا ہوگا۔ ایک ایمرجنسی کیس آگیا ہے۔ پھر صبح ملاقات ہوتی ہے۔" داؤد نے سرہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ شہوز جانے کے لیے مڑ گیا۔ اسے دعا کا بھائی پہلی نظر میں ہی کچھ مغرور سا لگا تھا۔

"کیوں نہ ہو بھئی۔" شہوز بڑبڑایا۔ کچھ دیر بعد دعا دونوں ہاتھوں میں کافی کے مگ اٹھائے داؤد کے پاس چلی آئی۔ داؤد کا مگ اسے تھماتے ہوئے وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ کتنا ہی وقت خاموشی کی نذر ہو گیا۔ پھر داؤد بولا۔

"تمہیں ماما کو نہیں بتانا چاہیے تھا میں خود ان کے پاس جاتا۔"

"ارے نہیں بھائی' وہ میری برتھ ڈے کی وجہ سے خود آنے والی تھیں کچھ دنوں میں۔ پھر آپ کی وجہ سے انہوں نے سوچا کہ وہ ابھی آجاتی ہیں۔" دعا نے جلدی سے وضاحت کی مبادا اس کا موڈی بھائی برا ہی نہ مان جائے۔

"تمہیں برتھ ڈے گفٹ کیسا چاہیے دعا۔" داؤد کے یوں پوچھنے پر وہ کچھ جھینپ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگی۔

"اگر آپ پہلے کہتے تو میں آپ سے یہی کہتی کہ آپ واپس آجائیں۔ مجھے میرے بھائی کی ضرورت ہے مگر اب میں آپ سے یہ کہوں گی کہ مجھے اپنا پرانا والا بھائی واپس چاہیے جو یہ سمجھتا تھا کہ وہ دنیا کو اپنے ابرو کے اشارے سے چلا سکتا ہے۔ جسے بابا سے عشق تھا اور جو شرارتیں کر کر کے گوروں کے ناک میں دم کیے رکھتا۔" داؤد گھبرا کے کھڑا ہو گیا اور تیز تیز سانس لینے لگا۔

"مجھے عشاء کی نماز پڑھنی ہے دعا۔" وہ واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

وہ دعا مانگ کے فارغ ہوا تو دعا دروازہ ناک کر کے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ داؤد نے جائے نماز تہ کر کے رکھی اور واپس مڑا۔ دعا اس کے سائیڈ ٹیبل پہ پڑی دوائیوں کو اٹھا اٹھا کے دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر شاک کے نشان واضح تھے۔ وہ ایک سائیکاٹرسٹ تھی اور شہوز کے ساتھ مل کے ایک بہت بڑا پرائیویٹ اسپتال چلا رہی تھی داؤد صوفے پہ بیٹھ گیا۔ وہ دعا کے نارمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

"میں یہ کہنے آئی تھی داؤد بھائی کیا آپ صبح میرے اسپتال کا وزٹ کر سکتے ہیں۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی' داؤد گلا کھنکار کے اس سے مخاطب ہوا۔

"دراصل دعا مجھے کل سارا دن عفان کے ساتھ رہنا ہے' کچھ ضروری میٹنگز ہیں۔" دعا داؤد کے منیجر عفان کو جانتی تھی۔

"کچھ دیر کے لیے' پلیز بھائی منع نہ کریں۔" دعا نے لجاجت سے کہا۔

"اوکے میں ضرور کوشش کروں گا۔" داؤد نے ذہن میں کیلکولیشن کرتے ہوئے کہا۔

"تھینکس۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ حیرت انگیز طور پہ اس نے داؤد سے ان دوائیوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تھا۔ داؤد کچھ مطمئن ہوا۔

داؤد نے گھڑی دیکھی جہاں ڈیڑھ بج گیا تھا مگر اسے

ایک پل کی بھی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ داؤد نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی باقی ساری میٹنگز کینسل کروا دیں اور خود عفان اور ڈرائیور کے ہمراہ دعا کے اسپتال کو چل دیا۔ دعا کو اس کے آنے کی پیشگی اطلاع مل چکی تھی اس لیے وہ اپنے سینئر اسٹاف کے ہمراہ اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔ یہ ایک نہایت شاندار اور وسیع نفسیاتی اسپتال تھا۔ دعا نے سب کے ساتھ اس کا تعارف کروایا۔ وہاں کچھ صحافی بھی موجود تھے۔ داؤد تو اب اس پروٹوکول کا عادی ہو چلا تھا۔ دعا کے ہمراہ وہ اس کے آفس چلا آیا۔ کچھ دیر میں شہوز بھی چلا آیا۔ داؤد سے رات کے بعد اب ملاقات ہو رہی تھی شہوز کی۔ دعا نے چائے کے ساتھ ریفریشمنٹ منگوالیا۔ کہیں دور کسی مریض کی چیخیں بلند ہوئیں۔ داؤد نے چونک کر دعا کو دیکھا جبکہ شہوز نے سر اپنے ہاتھوں میں گرالیا۔

"کمرہ نمبر 5 کا مریض بہت تنگ کر رہا ہے یار۔" شہوز نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

"لیکن اسے تو میں نے اینتھیسز یا دیا تھا۔" دعا نے آواز دبا کے کہا اور داؤد کو دیکھا جو ذرا بے چینی سے آوازیں سن رہا تھا۔

"اوکے میں دیکھتی ہوں۔" وہ اٹھی تو داؤد بھی بے ساختہ کھڑا ہوا۔

"کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں۔" داؤد نے جیسے التجا کی۔

دعا نے حیران نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا جو اس کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ دعا بھی تیزی سے کمرہ نمبر 5 کی طرف بڑھی۔ کسی کے چیخنے اور کراہنے کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ داؤد کے اندر اتھل پتھل شروع ہوئی تھی کیونکہ وہ یہ آواز کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ دعا جلدی سے اس کے آگے سے گزر کر کمرے میں چلی گئی جبکہ وہ اپنی ساری توانائی جمع کر کے کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں ایک لڑکی داؤد کی طرف پشت کیے چیخ رہی تھی اور اس کے لمبے بال فرش پہ پھسل رہے تھے۔ داؤد اس کی پشت سے پہچان گیا تھا وہ تیزی سے گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

"بی بی۔" وہ ہلکے سے بڑبڑاتا ہوا اس کے قریب زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا جبکہ وہ ایسی چپ ہوئی کہ جیسے کسی نے فل والیوم پہ چلتائی وی ایک کلک سے میوٹ کر دیا ہو۔

"بی بی میں داؤد..... میں داؤد ہوں۔ پلیز ایسے نہ دیکھیں" وہ رو رہا تھا بے تحاشا۔

"دعا یہ بول کیوں نہیں رہیں" داؤد نے ساکت کھڑی دعا سے استفسار کیا۔

"یہ بول نہیں سکتیں ان کے گلے میں گولی لگی تھی جس کی وجہ سے ووکل کارڈز (Vocal Cards) شدید Demage ہوئے ہیں" داؤد کو لگا وہ بھی کبھی نہیں بول سکے گا۔

اور باقی کی کہانی ہم بتا دیتے ہیں ملک صاحب۔" تبریز کی سرد آواز اور قدرت اللہ شاہ کی سرد نگاہیں وہ سُن ہو گیا تھا۔ عیان گویا کسی خواب سے چونکی تھی اور اس کے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کونسا خواب زیادہ بھیانک ہے۔ جو وہ دیکھ چکی ہے وہ یا جو دیکھ رہی ہے۔ عیان نے داؤد کو پیچھے دھکیلا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ وہ کسی بھی طرح داؤد کو وہاں سے ہٹانا چاہتی تھی۔ ایک بے بس لڑکی اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

"تم سمجھے کہ ہم بھول گئے ہیں سب کچھ مگر یہ تمہاری بھول تھی ملک۔ اب تم نہیں بچ پاؤ گے۔ قسمت ہر دفعہ یاوری نہیں کرتی۔" تبریز کے کہنے پر عیان زرد ہوئی تھی جیسے کوئی بے جان لاشہ۔ اس نے داؤد کو پیچھے دھکیلا اور پیر قدرت اللہ شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ جبکہ تبریز شاہ خباثت سے بولا۔

"اور ہم نے کیسا دانہ پھینکا داؤد ملک تم خود چل کے یہاں آ گئے ہو۔" اس نے عیان کی طرف اشارہ کر کے کہا جبکہ عیان اتنا زور سے چیخی کہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ دونوں نرسیں اس کی طرف بڑھیں داؤد نے اسے تھامنا چاہا۔

"ہاتھ مت لگانا ملک ورنہ یہ دن تاریخ کا بدترین دن

ہو گا۔" قدرت اللہ شاہ دھاڑے، داؤد رکا۔ تبریز چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔
"تمہارا اس پہ کوئی حق نہیں یہ حق صرف میرا ہے۔"
"میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہارا۔ اگر تم قدرت اللہ شاہ کے نواسے ہو تو میں بھی ان کی بیٹی کی اولاد ہوں۔" داؤد نے تبریز کا سر دیوار میں دے مارا۔ الفاظ تھے یا صور اسرافیل سب ہی اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے تھے۔ اسی لمحے بختاور شاہ بھی کمرے کے دروازے میں آن رکی تھیں۔ داؤد چیخ رہا تھا، رو رہا تھا۔
"ہاں میں بختاور کا بیٹا ہوں جن کا بیٹا ہونا میری سزا بن گیا۔ آپ کی محبت میری زندگی کی خوشیاں نگل گئی ماما۔ آپ کا باپ جو آپ کے ساتھ نہ کر سکا وہ اپنی پوتی کے ساتھ کر رہا ہے۔" وہ روتے ہوئے اسی کونے میں بیٹھ گیا۔ پیر قدرت اللہ شاہ نے دروازے کے سہارے نیچے بیٹھی اپنی عزیز از جان بیٹی کو دیکھا اور ان دونوں کے لیے وقت کی گردش رک گئی۔

☆ ☆ ☆

داؤد کو ہمیشہ لگتا کہ اس کی زندگی میں کچھ کمی ہے۔ ہاں اس کی زندگی میں ماں باپ کے پیار کی ایک فیملی کی کمی تھی۔ وہ پیدائش سے لے کر ساری عمر لندن میں رہا کیونکہ اس کے ماں باپ اسے پاکستان میں اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ حیدر ملک نے بھی بختاور سے شادی اپنے پسند سے کی تھی جس کی ان کے خاندان میں شدید مخالفت کی گئی۔ ان کے والد نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ حیدر کا نام باقی نہ رہنے دیں گے یہی وجہ بنی کہ جب داؤد پیدا ہوا تو انہوں نے اسے انگلینڈ کے شہر لیڈز میں موجود اپنے ایک دوست کی فیملی کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے چھپائے رکھنا چاہتے تھے جب تک کہ وہ کسی قابل نہ ہو جائے مگر داؤد یہ بات نہ جانتا تھا۔ اس کے ماں باپ چھٹیوں میں اس سے ملنے آتے اور یہ دن داؤد کی زندگی کے خوشگوار دن ہوتے مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا اس کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ رہی تھی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ کیوں

نہیں رہ سکتا۔ وہ شروع سے ہی جارحانہ انداز کا حامل تھا۔ وہ پندرہ سال کا تھا جب چھٹیوں میں اس کی فیملی اس سے ملنے آئی' وہ بہت خوش تھا وہ ماما' بابا اور دعا کے ساتھ سینٹرل پارک گیا۔ اس کے ماں' باپ ایک جگہ بیٹھ گئے جبکہ وہ خوشی خوشی کانچ کی گڑیا جیسی اپنی بہن کو گھمانے لگا جو اس وقت دس سال کی تھی۔ وہ دونوں بینچ پہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب ایک خاتون اپنے نو دس سالہ بیٹے کو لیے ان کے برابر آن بیٹھی۔ وہ تیز تیز بولتی اپنے بیٹے کو کچھ کہہ رہی تھی۔ داؤد لاشعوری طور پہ ان کی طرف متوجہ ہوا' وہ عورت اس بچے کو کسی سے دوران ملاقات 'خاموش رہنے کا کہہ رہی تھی اور یہ کہ وہ اسے ماں نہ کہے کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کے ہسپانوی بوائے فرینڈ کو پتا چلے کہ وہ اس کی اِل لیگل اولاد ہے۔ برطانوی معاشرے کے لحاظ سے تو یہ ایک عام بات تھی مگر داؤد کے لاشعور میں کہیں یہ بات اٹک گئی تھی کہ اِل لیگل بچوں کو چھپایا جاتا ہے۔ وہ خاموش ہوا تھا۔ پہلی بار اس نے طویل خاموشی اختیار کی اور پندرہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ اپنے سود و زیاں کا حساب لگایا تو نتیجہ یہ نکلا کہ شاید وہ بھی اپنے والدین کی ایسی ہی غلطی ہے جسے وہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ اسے خود سے گھن محسوس ہوئی پھر دعا سے حسد اور سب سے آخر میں اپنے والدین سے نفرت۔ اس دن کے بعد سے وہ صرف ایک برطانوی شہری تھا اور بس اس کے کردار میں وہاں کی سب خوبیاں اور خامیاں تھیں۔ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد اس نے الگ گھر مانگا تھا جو اسے گفٹ کر دیا گیا۔ وہ اتنا بدل گیا تھا کہ اس کے ماں' باپ انگشت بدنداں رہ گئے۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ انجانے میں اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کر بیٹھے ہیں۔ لیکن وہ اندر سے اپنے رشتوں کی محبت ختم نہ کر پایا وہ ماں کی بجائے باپ سے زیادہ قریب تھا اور کہا کرتا تھا کہ بابا میری پہلی محبت ہیں۔

جب وہ ایم بی اے کر چکا تو حیدر ملک نے اسے پاکستان بلانے اور سب سے متعارف کروانے کا فیصلہ کیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی' داؤد کو یہی بتایا گیا کہ ایک سنگین ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ پاکستان آیا اور اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس ایکسیڈنٹ کی حقیقت وہ کبھی نہ جان پاتا اگر وہ ماما کو ذیشان انکل سے بات کرتے نہ سن لیتا۔ ماما بے تحاشا روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"میں نے معاف کر دیا انہیں ذیشان۔ میں نے معاف کر دیا اپنے باپ کو' جس نے میرے بچوں کا باپ چھین لیا۔۔۔ ہم جانتے تھے ایسا ہو گا' جہاں کسی کا وار چلے گا وہ ہمیں برباد کرنے کی کوشش کرے گا۔۔۔ ہم اپنے بیٹے کو چھپاتے پھرتے تھے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ یوں ہو جائے گا۔" ذیشان انکل انہیں تسلی دے رہے تھے جبکہ داؤد پہ بہت سے راز عیاں ہوئے تھے۔ اسے اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی پھر اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ وہ اپنے ننھیال اور ددھیال کو لڑائے گا اس حد تک کہ سب ختم ہو جائیں اور اس کے لیے اس نے عیان حسن شاہ کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن تقدیر نے سب الٹ کر دکھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

جلال شاہ نے داؤد کا نکاح عیان سے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قدرت اللہ شاہ نے وقار شاہ کو حویلی سے نکال دیا تھا کیونکہ حیدر ملک کا قتل انہوں نے ہی بڑی منصوبہ بندی سے کروایا تھا جبکہ ان کی بیوی اور ان کے بچوں نے اپنے نانا کا ساتھ دیتے ہوئے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ داؤد' وقار شاہ کو معاف کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ زندگی سے وہ ایک بہت بڑا سبق لے چکا تھا کہ معاف کر دینے میں ہی عظمت اور بھلائی ہے۔

"بھائی۔۔۔ آجائیں عیان اس کمرے میں ہے۔" داؤد کا نکاح ہو چکا تھا جب دعا اسے بلانے آئی تھی اور یہ داؤد کا ہی فیصلہ تھا وہ عیان سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کے روحیل اور جیک جو ابھی کچھ دیر پہلے پہنچے تھے' دونوں کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ داؤد نے اپنی مسکراہٹ بڑی مشکل سے روکی اور مدبر سی شکل بنا کے کمرے کی

طرف بڑھ گیا۔ داؤد دروازے کو ناک کر کے اندر داخل ہوا جہاں یمی آپی اور سارہ بھابھی اسے دیکھ کر ایک دم چپ ہوئیں اور پھر شرارتی انداز میں داؤد کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ عیان کاؤچ پہ گلاس وال کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی۔ اس نے کچے سیب جیسے سبز رنگ کی ٹخنوں کو چھوتی فراک پہن رکھی تھی جس پہ میرون امبر ائیڈری بنی ہوئی تھی۔ داؤد خاموشی سے اس کے برابر آن بیٹھا عیان کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ آیا تھا وہ ہنوز گلاس وال سے باہر لان میں دیکھ رہی تھی۔ داؤد گھٹنوں پہ کہنیاں ٹکا کے آگے کو جھک کے بیٹھا تھا۔ وہ کبھی عیان کو زیادہ دیر تک سامنے سے نہ دیکھ پایا تھا۔ مگر ابھی اس نے دیکھا تھا' عیان بہت ضبط سے بیٹھی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کے ضبط کی لگامیں ڈھیلی ہو رہی تھیں اور اس کی ہیزل براؤن آنکھیں پانیوں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ داؤد نے گود میں دھرا اس کا حنا بستہ ہاتھ مضبوطی سے تھاما تھا' عیان کے آنسو بے قابو ہوئے۔ اس نے عیان کا دوپٹہ ذرا سرکایا اور بال پیچھے کیے۔ عیان کے رونے میں شدت آ گئی۔ اس نے وہ نشان دیکھا جو عیان کی گردن کے درمیان میں موجود تھا کافی بڑا نشان۔ داؤد نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے نشان کو ذرا سا رگڑا جیسے وہ مٹانا چاہ رہا ہو۔ عیان ہچکیوں سے رونے لگی' وہ شاید سارے غموں پہ آج ہی رو لینا چاہتی تھی۔ اس نے داؤد کا ہاتھ جھٹکا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے اونچی آواز میں رونے لگی۔ داؤد نے بے ساختہ اسے ساتھ لگایا' اسے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ اگر کچھ کہنا بھی چاہ رہی تھی تو کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے داؤد کو یوں مضبوطی سے پکڑا تھا جیسے اسے اس کے کھو جانے کا ڈر ہو۔

"نہ روئیں بی بی مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" داؤد نے دو انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ عیان نے سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو داؤد نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

"سوری سوری جب تک عیان کہنے کی پریکٹس نہیں ہو جاتی بی بی سے کام چلانا پڑے گا۔" وہ شرارت سے بولا جبکہ عیان حیران رہ گئی تھی کہ وہ صرف اس کے دیکھنے سے اس کے دل کا حال کیسے جان گیا۔ داؤد نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کے اسے ساتھ لگایا تو وہ دونوں آسودگی سے مسکرا دیے۔ "یقیناً" زندگی بہترین گزرنے والی تھی۔ کوئی ان کے قریب گنگنایا تھا۔

تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا
محبت بھی ضروری تھی' بچھڑنا بھی ضروری تھا
ضروری تھا کہ ہم دونوں طواف آرزو کرتے
مگر پھر آرزوؤں کا بکھرنا بھی ضروری تھا

فرزانہ عامر

وقت کا آئینہ

"کیا۔۔!" ہادیہ نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا تھا اور بڑی بے چارگی بھری سانس سینے سے خارج کی تھی۔

"یعنی ایک بار پھر۔۔!"

"جی جناب ایک بار پھر۔۔" مصطفیٰ نے اطمینان سے دونوں ہاتھ جھاڑے تھے اور مطمئن سا اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا اور پل بھر ہی لگا تھا ہادیہ کا دماغ گھومنے میں۔۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو قریب رکھا شولڈر بیگ کھینچ کر اسے دے مارا تھا۔

"آؤچ۔۔ ہائے ظالم لڑکی مار دیا غریب کو۔۔" مصطفیٰ نے مصنوعی آہیں بھری تھیں۔

"قسم سے لڑکی تم نا۔۔ ذرا جو لحاظ ہو تمہارے اندر۔" دونوں ہاتھوں سے سر کی پشت کو سہلایا تھا۔

"اف مصطفیٰ۔۔! میں کیا کروں تمہارا' زندگی کو کب سیریس لوگے آخر تم؟ لوگے بھی یا نہیں۔۔ کچھ احساس بھی ہے تمہیں کہ کس طرح کھیل رہے ہو تم' نہ صرف اپنی زندگی سے بلکہ میری زندگی سے بھی۔۔" وہ بری طرح چڑی بیٹھی تھی۔

"اب میں نے کیا کردیا؟ یہی تو کہا ہے ناکہ ہاتھ ذرا ہولا رکھا کرو' مارو مگر پیار سے (تھوڑی سی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبی تھی) آخر کو تمہارا اکلوتا منگیتر ہوں یار اور مستقبل کا ہونے والا مجازی خدا بھی۔۔" معصومیت کی انتہا تھی۔

"دفع ہو جاؤ تم۔۔!" ہادیہ کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا' وہ جھٹکے سے اٹھی تھی۔ "کوئی بھی بات کرنا فضول ہے تم سے۔۔ میں ہی پاگل ہوں جو تمہیں اچھے فیوچر کے لیے فورس کرتی رہتی ہوں۔"

"ارے رکو تو۔۔ اف سنو تو یار۔۔ تم بھی نا بس۔۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جایا کرو۔۔" مصطفیٰ نے آگے بڑھ کر اسے روکا تھا اور زبردستی واپس بٹھایا تھا۔

"یہ ذرا سی بات ہے؟" جواباً وہ اور بھڑکی تھی۔ "سات ماہ میں یہ تیسری بار ہے جب تم جاب چھوڑ کر بیٹھ گئے ہو۔"

"تم میری ایوریج تو دیکھو سات ماہ کے حساب سے۔۔۔ اچھا بابا سوری۔۔" وہ اس کی گھوری سے خائف ہوا تھا۔

"مگر یار! تم مانو یا نہ مانو' میں یہ سب جان کر نہیں کرتا' بس کچھ نہ کچھ حالات ہی ایسے ہو جاتے ہیں کہ۔۔"

"تمہارے ہی حالات ایسے ہو جاتے ہیں۔۔ دنیا میں اور بھی تو لوگ ہیں جو مستقل مزاجی سے کئی سالوں سے ایک ہی جگہ ٹک کر کام کرتے ہیں اپنا نام بناتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں' مجھے تم یہ بتا دو کہ ان کے حالات غلط رخ کیوں نہیں اختیار کرتے۔۔" وہ کسی صورت اسے بخشنے پر تیار نہ تھی۔

"اب کسی اور کے حالات پر میں بھلا کیا تبصرہ کروں؟"

"دیکھا۔۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بات کا جواب تک تو تم سیدھے نہیں دیتے ہو۔۔ جاب کیا خاک سنجیدگی سے کرو گے۔۔ لیکن میں اب کی بار تمہیں صاف صاف بتا رہی ہوں مصطفیٰ کہ یا تو تم آئندہ کے لیے سنجیدہ ہو جاؤ اور کچھ بن کے دکھاؤ ورنہ۔۔"

"ورنہ۔۔؟" مصطفیٰ نے حیران سا اسے دیکھا تھا۔

"ورنہ میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔" وہ بیگانگی سے کہہ کر رخ پھیر گئی تھی۔

"اور۔۔"

مصطفیٰ بس اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری خالہ آئی تھیں کل....؟" اماں نے ناشتے کی ٹرے لا کر تخت پر اس کے برابر رکھی تھی، پھر خود بھی وہیں ٹک گئی تھیں مصطفیٰ نے بغیر کوئی تبصرہ کیے ٹرے آگے کھسکا کر ناشتہ شروع کر دیا تھا۔

"پوچھو گے نہیں کہ کیوں آئی تھیں....؟" وہ اسے ناشتے میں مگن دیکھ کر دوبارہ بولی تھیں۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے.... وہ بہن ہیں آپ کی۔" مصطفیٰ نے باقر خانی کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا تھا" ویسے کیوں آئی تھیں خالہ جان؟" وہ اماں کے بگڑتے زاویے کن اکھیوں سے دیکھتے دھیمے سے بولا۔

"بچے نہیں ہو اب تم مصطفیٰ....! سب سمجھتے ہو، یوں کہو کہ ماں کا دل جلا کر خوشی محسوس کرتے ہو...." وہ تڑخ کر گویا ہوئی تھیں "اور اب تمہارے پیچھے مجھے دوسروں سے بھی سننے کو ملنے لگی ہیں۔"

"ہوا کیا ہے اماں....؟" اس نے چائے کا گھونٹ لے کر کپ واپس تخت پر رکھا تھا۔

"پتا تو تمہیں بھی ہے کہ کیا ہوا ہے.... زیادہ انجان مت بنو.... اگر تمہاری نوکریاں چھوٹنے کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا نا تو پھر بھول جاؤ کہ ساجدہ اپنی بچی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے گی۔ بول گئی ہیں، وہ صاف صاف، بلکہ خوب جتا کر گئی ہیں.... اور وہ ہی کیا.... اگر یہی سب چلتا رہا تو مجھے نہیں لگتا کہ پھر خاندان میں کوئی بھی...."

"اماں! میں کوشش کر تو رہا ہوں نا.... اب آج بھی دو جگہ جا رہا ہوں انٹرویو دینے.... ان شاء اللہ بات بن ہی جائے گی اور یہ بات کل میں نے ہادیہ کو بھی بتا دی تھی۔"

وہ رسان سے ان سے مخاطب ہوا تھا۔

"بات تو بن ہی جاتی ہے مگر بگڑتے بھی دیر نہیں لگتی.... مسئلہ تو سارا یہی ہے نا.... ابھی تو میں شکر کرتی ہوں کہ اللہ بخشے تمہارے باوا اپنی زندگی میں ہی دونوں بچیوں کو اپنے گھر کا کر گئے، ورنہ تمہارے آسرے پر ہوتیں تو اب تک شاید وہ بھی بیٹھی ہی ہوتیں۔"

"اماں! اب آپ زیادتی کر رہی ہیں...." وہ سخت نالاں ہوا تھا ان کی اس بات سے....

"برا لگ رہا ہے نا میری بات کا تو پھر سوچو بچے! کہ جب دوسرے لوگ آ کر مجھ سے تمہارے بارے میں

اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو مجھے بھی برا لگتا ہے بیٹا' میں ماں ہوں آخر۔ جبکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں' یہ سب اللہ کی رضا ہے' مگر' میں یہ سب لوگوں کو تو نہیں سمجھا سکتی نا'

دیکھ بیٹا۔۔۔!" وہ کچھ نرم دلی سے گویا ہوئی تھیں۔

"مجھے پتا ہے کہ میرا بچہ کام سے جی چرانے والا نہیں ہے نہ ہی غیر مستقل مزاج ہے' بہت محنتی اور جی جان سے کام کرنے والا ہے' مگر بچے! دوسروں کو اس بات کا یقین ہم اپنی باتوں سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے دلاتے ہیں' جب ہم اپنے آپ کو باعمل بناتے ہیں نا تو پھر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کسی سے۔۔۔ سب لوگ خود بخود ہمیں جان لیتے ہیں۔۔۔ سمجھے کچھ۔" وہ اپنی بات کہہ کر جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں۔

"جی ماں سمجھ گیا۔۔۔ کہ یہاں پر سب لوگ چڑھتے سورج کو پوجتے ہیں۔۔۔ اچھا اب میں چلوں؟ دیر ہو رہی ہے انٹرویو کے لیے۔"

"اللہ پاک تمہیں کامیاب کرے!" اماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جذب سے بولی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"سمجھ میں نہیں آتا یار! کہ کیا کروں۔۔۔؟ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میں خود ہی اپنی غیر مستقل مزاجی کا ذمہ دار ہوں۔۔۔ واقعی بہت سے لوگ ہیں' جو مستقل مزاجی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور بہت کامیاب بھی ہیں' صرف میں ہی کیوں۔۔۔؟ وجہ صرف ایک ہی سمجھ میں آتی ہے کہ میں زندگی کو اس کے ڈھب پر گزارنے کے بجائے اسے اپنے انداز میں جینے کی کوشش کرتا ہوں' اور یہی وجہ ہے کہ ناکام رہتا ہوں۔۔۔" مصطفیٰ نے چائے کے کپ کے گرد انگلی سے کئی دائرے کھینچ دیے تھے۔

"ہوں۔۔۔" عاشر نے ساری بات کے آخر میں ایک گہرا سانس خارج کیا تھا۔

"تجھے پتا ہے کہ اس دنیا میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔۔۔" عاشر اور مصطفیٰ اسکول اور کالج کے دوست تھے' دونوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

"ایک قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے۔ جو زندگی کی تگ و دو میں بہت آگے نکل جاتے ہیں اور ایک کامیاب فیوچر بناتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس دنیا کے حساب سے' بہت پیچھے ہوتے ہیں' مگر وہ کامیاب انسان ہوتے ہیں اور تو ان لوگوں میں سے نہیں جو کامیاب فیوچر کے مالک ہوتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں سے ہے' جو کامیاب انسان بن کر زندگی کامیاب بناتے ہیں۔ میرے بھائی! فیوچر کس نے دیکھا ہے۔۔۔" عاشر نے اپنے طور پر بڑے مدلل دلائل دیے تھے۔

"پتا نہیں یار۔۔۔! کون کہاں کتنا اور کیسے کامیاب ہے؟" مصطفیٰ جیسے بے زار سا ہوا تھا۔ "میں تو بس یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں آج انٹرویو دے کر آیا ہوں' وہاں سے جاب کی کال آجائے۔"

"وہ بھی ٹھیک ہے۔" عاشر نے سرہلایا تھا۔۔۔ "مگر میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟"

"تو ان باوانی والوں کو جانتا ہے جو پچھلے سال۔۔۔ بہت بڑی کمپنی ہے یار' بہت نام ہے ان کا۔" "ہاں جانتا تو ہوں پر صرف نام کی حد تک۔۔۔ کیوں؟"

"میں اس حوالے سے کچھ سوچ رہا ہوں۔" اس نے پرسوچ انداز میں مصطفیٰ کو دیکھا تھا۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا؟" وہ الجھن سے اسے دیکھ کر بولا تھا۔

"بتاؤں گا یار۔۔۔ پہلے میں کچھ ہاتھ پیر مار لوں۔۔۔ پھر سب بتاؤں گا۔۔۔ چل چلیں۔۔۔ لنچ ٹائم ختم ہو رہا ہے میرا۔" دونوں ایک ساتھ ریسٹورنٹ سے نکلے تھے۔

☆ ☆ ☆

"کوئی نئی بات کریں اماں۔۔۔! یہ کون سی نئی خبر ہے میرے لیے۔" ہادیہ نے ہاتھوں پر مساج کرتے تمسخر

سے سہلایا تھا۔

"کیوں۔۔۔ تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی کہ مصطفیٰ کو نئی جاب مل گئی ہے؟"

"خوشی مجھے تب ہوگی جب وہ اس نئی جاب کو ٹک کرے گا اور یہ ہوتا مجھے نظر نہیں آتا۔۔۔ دیکھنا کچھ دن میں ہی۔۔۔"

"خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔۔۔ محنتی تو وہ بہت ہے' اس میں کوئی شک والی بات نہیں ہے' مگر بے چارے کی قسمت پتا نہیں کیوں ہر بار دھوکا دے جاتی ہے بہرحال۔۔۔ اب اللہ کرے کہ یہ جاب قائم رہے تو میں بھی تمہارا کچھ سوچوں۔۔۔ آخر کو تمہارے بعد تین اور بیٹھی ہیں ابھی۔۔۔ تمہارے باوا بھی اب جلدی کا کہہ رہے ہیں۔"

دوسری طرف ہادیہ نے بوتل کا ڈھکن بند کرتے گہری پرسوچ نظروں سے اماں کو دیکھا تھا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔

✿ ✿ ✿
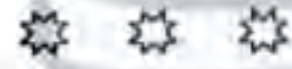
"کیا؟ یہ کیا بکواس ہے ہادیہ؟" اماں کا پارہ منٹوں میں ہائی ہوا تھا۔ "بات سوچ سمجھ کر منہ سے نکالا کرو۔"

"سوچ سمجھ کر نہیں بلکہ۔۔۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے یہ بات کہی ہے اور ایک بات میں آپ کو اور کہہ دوں۔۔۔ میرا یہ فیصلہ بہت اٹل اور آخری ہے۔۔۔ کوئی بھی جذباتی بلیک میلنگ مت کیجئے گا پلیز۔" ہادیہ نے دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا۔

اس کی نظروں میں سعد کا چہرہ گھوما تھا۔ سعد اس کا کلاس فیلو تھا' پچھلے دنوں شاپنگ کرتے ہوئے اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ سعد نے گفتگو کے دوران اسے جن نظروں سے دیکھا تھا اور پھر اس سے فون نمبر بھی لیا تھا تو اس نے اسے بہت سی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

"مگر پتا بھی تو چلے کہ آخر بیٹھے بٹھائے مصطفیٰ میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں اور پھر سارا خاندان کیا کہے گا۔۔۔ سب تھو تھو کریں گے ہم پر۔۔۔"

"سب کے لیے کیا میں اپنی زندگی داؤ پر لگا دوں اماں۔"

"مگر پہلے تو یہ بہانہ تھا کہ اس کی نوکری نہیں مگر اب تو وہ بہت اچھی جگہ کام کر رہا ہے۔"

"اونہہ! وہ نوکری جس میں وہ صرف بارہ ہزار کما رہا ہے۔" ہادیہ نے طنز سے کہا تھا۔

"ان بارہ ہزار میں کتنا خوش رکھ سکے گا وہ مجھے؟ ہوتا کیا ہے آج کل اتنے پیسوں میں؟ یہ صرف میرے لیے بھی ناکافی ہیں۔۔۔ نہیں اماں بالکل بھی نہیں۔۔۔ اتنی کم تنخواہ کے ساتھ مجھے مصطفیٰ کسی صورت قبول نہیں۔۔۔ آپ خالہ کو صاف جواب دے دیں۔" اس کا انداز دو ٹوک ہی نہیں سفاکانہ بھی تھا۔

"تو کیا میں انکار کی وجہ صرف یہ بیان کروں کہ تمہارا بچہ معمولی تنخواہ لاتا ہے؟ تو پچھتائے گی ہادیہ!" اماں تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔ "ساری دنیا باتیں بنائے گی۔۔۔ مصطفیٰ بہت اچھا لڑکا ہے۔"

"دنیا یہاں پر سب کچھ بھلا دیتی ہے' لوگ مر جاتے ہیں تو لوگ وہ بھی تو بھول جاتے ہیں' یہ تو پھر معمولی بات ہے' کوئی کچھ یاد نہیں رکھتا یہاں پر۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں تھی۔

✿ ✿ ✿

وقت چیونٹی کی رفتار سے گزرے تو بھی گزر ہی جاتا ہے' ہادیہ نے مصطفیٰ سے شادی سے انکار کیا تو خاندان بھر میں حیرانگی کی لہر دوڑ گئی' ہر ایک نے اپنی سمجھ اور نظریے کے مطابق تبصرے کیے تھے۔ سب ہی کے ہاتھ ایک ٹھیک ٹھاک موضوع آ گیا تھا۔

بڑی مامی کے بقول "ہادیہ کے تو تیور شروع سے ہی الگ نظر آتے تھے ہمیشہ ہی اونچا ہاتھ مارتی ہے۔"

منجھلی چچی کیوں پیچھے رہتیں۔ "بھئی سچی بات ہے نوکری معمولی سہی پر پھر بھی لاکھوں میں ایک تھا مصطفیٰ' اے ہاں 'بھیا' یہ تو نرالی ہی سننے میں آئی کہ جی لڑکی کے تنخواہ کم ہے تو ہم نہیں کرنے کے شادی۔"

"ایسی بات تھی تو رشتہ کیا ہی کیوں... اور خاندان میں بھلا یہ سب کون دیکھتا ہے۔" صائمہ پھپھو منہ میں پان رکھ کر اور انگلی پر لگا کتھا بالوں سے پونچھتے آنکھیں نچاتی بولی تھیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں... مگر ہادیہ پر کسی کی بھی کہی بات کا اثر نہ ہوا تھا۔

سعد سے اس کی بات کافی آگے بڑھ گئی۔ سعد نے رشتہ بھجوایا تھا۔ اماں اور ابا کچھ وقت لینا چاہتے تھے مگر ہادیہ کے لیے تو یہ ہی کافی تھا کہ سعد کی تنخواہ پچیس ہزار ہے۔ اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی سو جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی۔ سعد ایک اچھا لڑکا تھا، ہادیہ بہت خوش تھی اس کے ساتھ اسے اپنی سمجھ داری پر یقین تو پہلے ہی تھا اب فخر بھی ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼
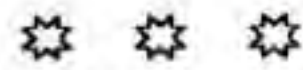
"سعد! آج آپ ذرا جلدی آجائیں گے پلیز؟" ہادیہ نے صارم کی گیلی نیکر تبدیل کرتے جلدی جلدی کہا تھا۔

"کیوں... ؟ خیر ہے۔" سعد نے ٹائی کی ناٹ درست کرتے آئینے میں اسے دیکھا تھا۔

"سردیاں آرہی ہیں، تینوں ہی بچوں کے گرم کپڑے لانے والے ہو رہے ہیں اور نبیلہ کا تو اسکول کا سوئیٹر بھی بہت رف ہو گیا ہے۔"

"ارے یار... خرچے کے علاوہ بھی کچھ سوچ لیا کرو۔" سعد حسب معمول خرچ کا سن کر جھنجلایا تھا...

"وہ پچھلی سردیوں کے کپڑے کہاں گئے؟"

"وہ تو بہت چھوٹے ہو گئے ہیں اور پرانے..."

"اسی لیے کہتا ہوں تم سے کہ تھوڑا بڑا سائز لے لیا کرو... مگر تم کوڑھ مغز کہاں سمجھتی ہو ان باتوں کو... ہماری اماں۔"

سعد کا لیکچر شروع ہو چکا تھا اس کے جانے کے بعد بکھرے گھر کو سمیٹتی ہادیہ کتنی دیر کڑھتی رہی تھی۔ سعد کی حد سے بڑھی کنجوسی اس کا ڈھیروں خون جلاتی تھی۔ بچوں کو ٹیوشن وہ خود پڑھاتی تھی کہ بقول اس کے۔ "تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، خود پڑھاؤ، یہ ٹیوشن والے صرف پیسہ بٹورتے ہیں۔"

کبھی کسی موقع پر اگر پارلر جانے کا کہہ دیتی تو، "ارے یار تمہیں اس سب لیپا پوتی کی کیا ضرورت ہے، تم ویسے بھی بہت پیاری لگتی ہو مجھے یوں بھی بار بار یہ سب کروانے سے چہرے پکے لگنے لگتے ہیں۔"

"اپنے گھر کے کپڑے تم خود سیا کرو، مجھے نہیں پسند کے میری بیوی غیروں کو اپنی ناپ دیتی پھرے۔"

"یہ بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں کیا رکھا ہے، اس سے اچھا اور سستا سامان تو بچت بازاروں میں مل جاتا ہے۔"

اب تو ہادیہ نے بحث کرنی بھی چھوڑ دی تھی، کیا فائدہ جب سامنے والے پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔

☼ ☼ ☼

بڑی مشکل سے وہ سعد کو اس بڑے مال میں لانے پر راضی کر پائی تھی، وہ بھی یہ سن کر کہ یہاں بچوں کی اچھی ورائٹی سیل پر دستیاب ہے، آگیا تھا۔

"چلو اب جلدی کرو... سارا دن چھٹی کا میں یہاں نہیں کھپانا چاہتا..." سعد نے خریداری سے پہلے ہی جلدی کا شور مچا دیا تھا پھر سعد بچوں کے شور کرنے پر انہیں پلے لینڈ کی طرف "مجبوراً" لے ہی گیا تھا، ہادیہ نے موقع غنیمت جان کر جلدی جلدی شاپنگ کی تھی۔ سعد کے دیے روپوں میں کچھ اپنی بچت شامل کر کے اس نے ٹھیک ٹھاک شاپنگ کرلی تھی، کچھ اس نے اپنے لیے بھی خرید لیا تھا پھر وہ جلدی سے لفٹ کی جانب بڑھی تھی کہ اچانک سامنے سے آتے شخص کو دیکھ کر وہ پل بھر کے لیے ساکت رہ گئی تھی، وہ بلاشبہ مصطفیٰ ہی تھا، ڈھیر سارے شاپنگ بیگز دونوں ہاتھوں میں تھامے... مصطفیٰ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

"کیسی ہو تم...؟" مصطفیٰ کا انداز نارمل تھا۔

"میں ٹھیک ٹھاک... تم سناؤ کیسے ہو؟" ہادیہ نے اس کا جائزہ لیا تھا، اچھا قیمتی سوٹ، برانڈڈ گھڑی اور قیمتی سی کلون کی مہک...

"تم تو سنا تھا کہ باہر چلے گئے تھے۔ کب آئے؟"

"ہاں ٹھیک سنا تھا اور اب تو کافی ٹائم ہو گیا آئے ہوئے۔" مصطفیٰ نرمی سے مسکرایا تھا۔ "تم سناؤ؟ خوش ہو؟" (میرے بغیر)

"ہاں بہت۔ سعد بہت اچھے ہیں۔ ہم بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔" وہ نجانے اس پر کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی۔

"ایک بات کہوں تم؟ اگر تم برا نہ مانو تو؟" ہادیہ کو یکدم کچھ خیال آیا تھا۔

"ہاں بولو۔"

"تم بھی برے نہیں تھے مصطفیٰ۔ پر میری کچھ ترجیحات تھیں اور مجھے لگتا تھا کہ تم وہ سب مجھے۔ زندگی میں پیسہ بہت معنی رکھتا ہے مصطفیٰ! ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے، تمہیں معلوم ہے؟ آج میرے شوہر کی سیلری چالیس ہزار ہے اور۔"

"میرا خیال ہے کہ اب میں چلوں، دیر ہو رہی ہے مجھے۔" مصطفیٰ نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے اس کی کسی بات کا کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا تھا۔

"شادی ہو گئی تمہاری۔؟" ہادیہ نے چبھتا ہوا سا سوال کیا تھا۔

"ہاں تین سال پہلے ایک بیٹا بھی ہے صوفیہ بہت اچھی بیوی ہے اس کی برتھ ڈے ہے کل ہمیں اسی لیے یہ شاپنگ کر رہا ہوں اس کے لیے۔"

ہادیہ کے اندر جیسے چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ سعد کو تو یہ برتھ ڈے وغیرہ بہت فضول لگتی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی وہ یوں پیار سے اس کے لیے کچھ لایا ہو، بے اختیار ہی اسے صوفیہ پر رشک آیا تھا۔

"ارے سر آپ یہاں؟" تب ہی سعد کی آواز پر وہ چونکی تھی، وہ مصطفیٰ سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

"آپ انہیں جانتے ہیں؟" وہ سعد کا مصطفیٰ سے تعارف بطور کزن کرواتے کچھ حیران ہوئی تھی۔

"ارے بھئی یہ ہماری فرم کے ایم ڈی ہیں، میرے باس۔ چلیے نا سر! کہیں چل کر لنچ کرتے ہیں۔" سعد کو اس کے رتبے کا خیال آیا تھا۔

"ارے نہیں، بہت شکریہ۔ میں آج ذرا جلدی میں ہوں پھر کبھی ان شاء اللہ۔"

وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا تھا۔ جاتے جاتے ایک نظر ہادیہ پر بھی ڈالی تھی۔ اور اس نظر میں کیا کچھ نہیں تھا۔

"کتنی جلدی تھی تمہیں سب کچھ پانے کی ہادیہ، کاش تم تھوڑا سا صبر رکھتیں۔ یہ سب تو تمہیں ملنا ہی۔ ساتھ میرا بھرپور ساتھ، عزت، محبت بھی۔ تم مجھے اچھے برائٹ فیوچر کے لیے، فورس کرتی تھیں مگر میرے لیے نہیں صرف اپنے لیے، تمہارے خلوص میں مفاد پرستی کی ملاوٹ تھی۔"

اور پچھتاوے ہادیہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ جس پیسے کے لیے میں نے مصطفیٰ کو چھوڑا وہی پیسہ سعد دانتوں سے پکڑ پکڑ کر خرچ کرتے ہیں وقت کا دائرہ گھوم پھر کر وہیں آ رکا تھا، جہاں آج بھی وہ تہی داماں کھڑی تھی۔

"پاپا! یہ آپ کے باس تھے؟" شہزا اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بیٹا۔!" سعد نے مسکرا کر اس کے بال سہلائے تھے۔

"پاپا! آپ کے باس تو بہت امیر لگتے ہیں۔ ہے نا؟" نہد بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

"ارے بھئی دو لاکھ سیلری ہے ان کی۔ اندازہ لگا سکتے ہو تم لوگ۔ چلو چلیں دیر ہو رہی ہے۔ تم کیا سوچ میں پڑی ہوئی ہو؟" سعد نے اسے چونکایا تھا۔

"نہیں بس۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

"واقعی دیر ہو گئی۔ چلیں۔" وہ آگے بڑھی تھی۔

زندگی نے اسے آج آئینہ دکھایا تھا، اس آئینے میں اس کی شکل پچھتاووں سے اٹی نظر آ رہی تھی۔

مہر ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اپنی کزن جائشہ کی منگنی کی تقریب میں اس لیے شرکت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ حنان سے سامنا نہیں چاہتی جو جائشہ کا بھائی ہے۔ یہ جان کر حنان ملک سے باہر ہے۔ وہ تقریب میں شرکت کے لیے چلی جاتی ہے۔ لیکن حنان وہاں آجاتا ہے۔ مہر اسے دیکھ کر اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلتی ہے تو حنان سے سامنا ہوتا ہے۔ مہر کے نفرت بھرے رویے پر وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو معاف نہیں کرے گا۔ حنان، زیب بیگم اور صغیر صاحب پر زور دیتا ہے کہ اب مہر کی زندگی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ وہ کب تک اس طرح کی زندگی گزارتی رہے گی۔ مہر کا نکاح بچپن میں ہو چکا ہے۔

انجم بیگم اور زیب بیگم دونوں بہنیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مہر کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو، لیکن صغیر صاحب اس کے لیے راضی نہیں۔ زیب بیگم کو حنان کے گندے کردار کا بھی اندازہ ہے۔

سیم اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ نازو نعم میں پرورش پائی۔ اس کی زندگی کی اولین ترجیح دولت ہے۔ وہ امریکہ میں تنہا رہتا ہے اور اپنی ذاتی فرم کا مالک ہے۔ جس میں اس کا دوست مارک شریک ہے۔ وہ آزاد زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے

مکمل ناول

سوزی سے اپنی پسند سے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک بار گرل لورین اس کی زندگی میں آئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ پھر ایک دن اس کے فلیٹ کا صفایا کر کے اس کو کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی ہے۔ زمین پر اس کے وجود پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ سیم ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ اسپتال میں کھلتی ہے۔ اس کا پارٹنر اور دوست مارک اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

سیم پر اس حادثے کا گہرا اثر ہے۔ وہ گم صم ہے۔ اسے بار بار وہ خواب یاد آتا ہے، جو اس نے بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ تاریک انجان گلیوں میں دو بھوکے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہا ہے لیکن سب دروازے بند ہیں۔ تب اچانک ایک دروازہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن اندر نہیں جاتا۔ دوبارہ بھاگنے لگتا ہے۔ تب وہ کچرے کے ڈھیر پر جا گرتا ہے اور تیز بو اس کی ناک اور منہ میں گھسنے لگتی ہے۔

اس حادثے کے بعد سیم پہلی بار اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور تب اس کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کس پناہ گاہ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا ہے؟

حنان جسے پیار سے ہنی کہتے ہیں صغیر احمد کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے۔ اس نے آج تک زیب بیگم کو اپنی ماں تسلیم نہیں کیا۔ مہرُ زیب بیگم کے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔ حنان اس پر بری نظر رکھتا ہے۔

تموز جو خود کو سیم کہلواتا ہے۔ اس کا نکاح بچپن میں مہر سے کر دیا گیا لیکن مہر اسے پسند نہیں ہے۔ تموز اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آتا ہے تو یہ جان کر کہ اس کا نکاح تموز سے ہو چکا ہے وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

سیم ایک گھر کرائے پر لے کر سوزی کے ساتھ بغیر نکاح کے رہنے لگتا ہے۔ ابراہیم صاحب کو یہ جان کر شدید دھکا لگتا ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

فیصلہ ہو گیا تھا۔ مہر احمد نہ تو کم ظرف تھی اور نہ ہی احسان فراموش۔ اس نے دل کو ایک طرف رکھا اور مصلحتوں کی انگلی تھامے خاموشی سے سب کے ساتھ ایئرپورٹ چلی آئی تھی۔

فلائٹ کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی جاشی اور نویرہ کے درمیان کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ان دونوں کی بے چینی مہر کا دل مزید دکھا گئی تھی۔ کاش کہ یہ مان 'یہ حق' حنان نے اسے بھی دیا ہوتا تو آج وہ بھی اتنی ہی خوشی سے اپنے بھائی کی آمد کی منتظر ہوتی جتنی کہ وہ دونوں تھیں۔ مگر حنان کے بے لچک رویے نے اسے ایک بہت پیارے رشتے سے محروم کر دیا تھا۔

اسے اس وقت اپنا آپ قاضی فیملی سے زبردستی جڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ایسا جُز جسے کوئی بھی دیکھنے والا بہ آسانی الگ کر سکتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر احساسِ محرومی سر اٹھانے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے دل میں کروٹیں لیتے درد کو چھپائے ان چاروں سے قدرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

تب ہی اندر سے مسافروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ مہر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے یونہی انجان چہروں کی اس بھیڑ پہ نگاہ ڈالی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کی بے نیازی سے بھٹکتی نگاہیں ٹھٹک گئی تھیں۔ شیشے کے بڑے سے دروازے کے اس پار مسافروں کے بیچ اسے حنان کھڑا نظر آیا تھا۔

غیر ارادی طور پر مہر کی نظریں اس پہ ٹھہر سی گئی

تھیں۔ وہ پورے سوا دو سال بعد حنان قاضی کو دیکھ رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا تھا کہ انگلینڈ کی فضائیں حنان کو خوب راس آئی تھیں۔ وہ پہلے سے بڑھ کر نکھرا ہوا اور شاندار لگ رہا تھا۔ اس کی قابل رشک جسامت اس کے اونچے لمبے قد کو مزید نمایاں کر رہی تھی۔

"کیا پتا ان فضاؤں نے اس کے مزاج پر بھی کوئی مثبت اثرات مرتب کیے ہوں۔" مہر کے دل نے گمان کیا تھا۔

"وہ رہے بھائی۔" جاشی کی پکار پہ مہر نے خاموشی سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ وہ بھرپور مسکراہٹ لیے ان کی طرف چلا آیا تھا۔

"السلام علیکم بھائی!" وہ دونوں لپک کر اس کی طرف بڑھی تھیں اور حنان نے بے اختیار ہی دونوں بازو بہنوں کے لیے وا کر دیے تھے۔ اس درجہ وارفتگی پہ صغیر صاحب اور زیب بیگم دونوں ہی مسکرانے لگے تھے۔ جبکہ مہر کا چہرہ اپنا بھرم قائم رکھنے کو بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ ان دونوں سے الگ ہو کے وہ تیز قدموں سے چلتا باپ کے گلے آلگا تھا۔

"السلام علیکم ڈیڈی۔"

"وعلیکم السلام۔ کیسا ہے میرا بیٹا؟" صغیر صاحب نے گرم جوشی سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تھی۔

"فرسٹ کلاس۔ آپ سنائیں؟" وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

اگلی باری زیب بیگم کی تھی۔ حنان قاضی اب کیا کرنے والا تھا مہر شدت سے دیکھنے کی خواہاں تھی۔

باپ سے مل کر حنان کی نظریں زیب بیگم کی طرف اٹھی تھیں اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان میں چمکتی محبت نرمی اور گرم جوشی غائب ہو گئی تھی اور ان کی جگہ عجیب سی سرد مہری نے لے لی تھی۔ جذبوں کی اس واضح تبدیلی نے مہر کو سچ میں حیران کر دیا تھا۔ وہ شاکڈ سے اپنے سامنے کھڑے اس کم ظرف شخص کو دیکھے گئی تھی جس نے زیب بیگم کی طرف اٹھنے والی پہلی ہی نگاہ میں مہر کے نادان دل کی ہر خوش فہمی کو دور کر دیا تھا۔

حنان نے انہیں فقط ایک رسمی سا سلام کیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ زیب جیسی پر خلوص اور درگزر کرنے والی خاتون کے لیے وہ بھی بہت تھا۔ ان کا ہاتھ بے اختیار حنان کی پشت پہ آ ٹھہرا تھا۔

عین اسی لمحے حنان کی نگاہیں بھی اس کی سمت اٹھی تھیں اور وہ ایک پل کو پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ سیاہ دوپٹے کے ہالے میں مہر کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن اس چمکتے چہرے پہ سجی اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں حنان کے لیے واضح ناگواری اور غصہ ہلکورے لے رہا تھا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے وہ بے اختیار ٹھٹک گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" مہر کے مارے باندھے سلام پہ اس نے گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ محض سر کے اشارے سے اسے جواب دیتا اپنے سامان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

سب کے سامنے اس درجہ تذلیل پہ مہر کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جتاتی ہوئی نظر اس کے چہرے پہ ڈالی تھی اور خاموشی سے رخ موڑ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب گہری نیند سوئی ہوئی انجم سوتے سے اچانک اٹھ بیٹھی تھیں۔ ان کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ٹیبل لیمپ روشن کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دائیں جانب دیکھا تھا اور وہاں ابراہیم صاحب کو نہ پا کے ان کا بے چین دل بری طرح گھبرا گیا تھا۔ ابراہیم ملک کمرے میں کہیں بھی نہ تھے۔

تیزی سے خود پہ سے کمبل ہٹاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ننگے پاؤں ہی دروازہ کھول کر باہر چلی آئی تھیں۔ جونہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

لیمپ کی نرم سی روشنی میں ابراہیم صاحب سامنے ہی صوفے پہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھے تھے۔

"ابراہیم! آپ' آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" وہ اڑ کر ان تک آئی تھیں۔ انہیں یوں اچانک اپنے روبرو پا کے ابراہیم ملک نے سرعت سے اپنے بہتے اشک صاف کیے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں اور چہرے کی سرخی بھید کھول گئی تھی۔

"آپ' آپ رو رہے ہیں؟" انجم کو لگا تھا جیسے کسی نے ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

"کچھ تو بولیں ابراہیم۔ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ میرا۔ میرا بچہ تو ٹھیک ہے ناں؟" متوحش سی ہو کے انہوں نے شوہر کا کندھا ہلایا تھا۔ ان کی یہ فکر یہ تڑپ ابراہیم صاحب کا دل چیر گئی تھی۔ وہ خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھے تھے۔

"نہیں مرا وہ بدبخت! کاش کہ وہ مر جاتا تو میرے نصیب میں یہ جلن یہ رسوائی تو رقم نہ ہوتی۔" ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹاتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" انجم نے سہمی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم ہار گئے انجم۔۔۔ تمہاری تربیت' میرا یقین۔ سب کچھ ہار گیا۔ تمہارا خوف صحیح نکلا۔ یہاں کی بے حجاب فضائیں ہماری شرافت و نجابت کو نگل گئیں انجم!" اور انجم بیگم کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو گئی۔ ان کی وحشت زدہ آنکھیں ابراہیم صاحب کے شکستہ چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔

"شادی۔۔۔! شادی کر لی ہے نا اس نے۔" سینے پہ ہاتھ رکھے انہوں نے کانپتی آواز میں اپنے بدترین خدشے کا اظہار کیا تھا۔ ان کی سادگی ابراہیم ملک کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

"تم بہت پیچھے رہ گئیں انجم۔ ہمارے بیٹے نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جہاں ہمارا ذہن پہنچ بھی نہیں سکتا۔" انہوں نے ایک پل کو رک کر اپنی ہمت مجتمع کی۔ "وہ ایک امریکی لڑکی کے ساتھ وہاں بغیر شادی کے رہ رہا ہے۔"

اور انجم ابراہیم کو لگا تھا جیسے پورے گھر کی چھت ان کے سر پر آگری ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے شریک حیات کو دیکھتی صوفے پہ گر سی گئی تھیں۔

"انجم!" ابراہیم صاحب تڑپ کر آگے بڑھے تھے۔ ان کے بازوؤں کا سہارا ملتے ہی انجم بیگم بری طرح رو پڑی تھیں۔

★ ★ ★

ایئرپورٹ سے گھر پہنچنے پر مہر سید ھی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ تنہائی میں اس نے اپنے اندر جلتے ہوئے احساس تذلیل کو جی بھر کے آنسوؤں کی صورت بہنے دیا تھا۔ عجیب بات تھی لیکن گھر والوں میں سے کوئی بھی اسے دوبارہ بلانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ شاید سب ہی اس کی کیفیت سے واقف تھے۔ اور پھر یونہی روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ جواب کہیں جا کے شام میں کھلی تھی۔

طبیعت اتنی مکدر ہو رہی تھی کہ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن ایک گرم پیالی چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پہ پھیلایا تھا اور دروازہ کھول کے نیچے چلی آئی تھی۔ اپنے لیے ایک اسٹرونگ سا کپ چائے کا بنا کر وہ مگ اٹھائے باہر لان میں آبیٹھی تھی۔

سمٹتی دھوپ اور قدم جماتی شام میں وہ آسمان کی نیلگوں وسعت پہ نگاہ جمائے چائے کی چسکیاں لے رہی تھی جب اپنے پیچھے کھٹکے کی آواز سن کر اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا تھا اور صغیر صاحب کو وہاں کھڑے دیکھ کر وہ بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"آئیں ڈیڈی۔" اس نے اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ صغیر صاحب نے ایک نظر اس کی سوجی ہوئی آنکھوں پہ ڈالی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اس کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔

"آئی ایم سوری بیٹا!" انہوں نے مہر کے سر پہ ہاتھ

رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا اور مہر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اس کی تکلیف کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اس کے اکیلے پن پہ اپنا دھیان جمائے رکھا تھا۔ ایسے عظیم انسان کے لیے وہ بھلا کیسے کسی قربانی سے دریغ کر سکتی تھی؟

"پلیز ڈیڈی! مجھے شرمندہ مت کریں۔" اس نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا۔ تو صغیر صاحب کے چہرے پہ پھیلا ملال مزید گہرا ہو گیا۔

"نہیں بیٹا! شرمندہ تو میں تم دونوں کے سامنے ہو جاتا ہوں' جب ہر بار حنان ' زیب اور تم سے بُرے طریقے سے پیش آتا ہے۔" وہ دکھ سے بولے تو مہر خاموشی سے نگاہیں جھکا گئی۔ "میں نے سوچا تھا' اتنے عرصے بعد گھر لوٹا ہے۔ تو اس کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی ہوگی۔ مگر۔"

وہ افسردگی سے' خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی یہ خاموشی مہر کے لبوں پہ اک تاسف بھری مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔ کچھ ایسا ہی گمان اسے بھی تو ہوا تھا۔

"جگہیں بدلنے سے انسان کے دل نہیں بدلا کرتے ڈیڈی۔" اور صغیر قاضی بے اختیار اپنا لب کاٹ کر رہ گئے تھے۔ "حنان بھائی نے مجھے اور امی کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی آنے والے وقت میں ان سے ایسی کوئی امید رکھنی چاہیے۔" مہر نے ایک تکلیف دہ حقیقت بنا کسی پس و پیش کے ان کے سامنے بیان کی تھی اور صغیر صاحب ایک تھکی ہوئی سانس کھینچ کر رہ گئے تھے۔

"بس اللہ تعالیٰ تمہارا نصیب اچھا کرے بیٹا۔ تم اپنے گھر بار کی ہو جاؤ تو میں بھی اپنے رب کے حضور سرخرو ہو سکوں۔" وہ جس تناظر میں سوچ رہے تھے۔ اسی میں بولے تو مہر کا دل ایک نئی اذیت سے بھر گیا۔

میرا تو آنے والا کل بھی کسی کی بے رخی نے دھندلا ڈالا ہے ڈیڈی۔ جانے میرے نصیب میں کوئی خوشی کاتب تقدیر نے پوری لکھی ہے بھی یا نہیں؟ تاسف سے سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

یم اپنی گاڑی میں سوزی کے ساتھ یونیورسٹی سے واپس آ رہا تھا۔ جب اپنے گھر کے ڈرائیو وے پہ گاڑی موڑتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ سامنے ہی ابراہیم ملک کھڑے اسے پرسکون نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

انہیں یوں اچانک اپنے سامنے پا کر اس کا ذہن اس حد تک ماؤف ہو گیا تھا کہ وہ ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھانا ہی بھول گیا تھا۔ نتیجتاً" گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" ساتھ بیٹھی سوزی نے موبائل سے

دعائے مغفرت

ہماری بہت اچھی مصنفہ "بشریٰ سعید" اپنی والدہ محترمہ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے۔ ہم بہن بشریٰ سعید کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں۔ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

نظریں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو ونڈ اسکرین کے اس پار گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"سامنے میرے ڈیڈ کھڑے ہیں سوزی۔" اس کی بات نے سوزی کو تیزی سے رخ موڑنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ لیکن ڈرائیووے میں کھڑے اس شخص نے ایک نگاہ غلط بھی اس پہ ڈالنا گوارہ نہیں کی تھی۔ ان کی نظروں کا مرکز صرف اور صرف سیم کی ذات تھی۔

"تم گاڑی میں ہی بیٹھو۔" سوزی کو ہدایت دیتے ہوئے وہ دروازہ کھول کے باہر نکل آیا تھا۔

"آپ یوں اچانک بابا؟" وہ تیز قدموں سے چلتا ان کی طرف آیا تھا۔

"یہاں کب شفٹ ہوئے؟" ان کے اچانک اور غیر متوقع سوال پہ وہ بے اختیار بوکھلا گیا۔

"آ... ہفتہ ہوا ہے۔" اس نے کم سے کم مدت بتانے کی کوشش کی اس سے زیادہ جھوٹ وہ نہیں بول سکتا تھا کیونکہ اندر سارا گھر مکمل طور پہ سیٹ ہوا پڑا تھا۔ میں آپ کو بتانے والا تھا مگر..."

"مگر ٹائم نہیں ملا ہوگا۔" انہوں نے پرسکون انداز میں اس کا جملہ مکمل کیا تھا۔

"جی ٹائم کا ہی مسئلہ تھا۔" اس نے کھسیا کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"یہ لڑکی تمہارے ساتھ رہتی ہے؟" بنا اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹائے' انہوں نے انگلی سے سوزی کی طرف اشارہ کیا تو سیم کی نظروں میں گھر میں موجود سوزی کا سامان گھوم گیا۔ وہ سچ میں بہت برا پھنسا تھا۔

"جی... مگر میرے ساتھ نہیں' ہمارے ساتھ۔" ابراہیم صاحب اس بات سے واقف تھے کہ عموماً تین چار اسٹوڈنٹس ایک گھر کو شیئر کرتے تھے۔

"اور کتنے اسٹوڈنٹس ہیں یہاں؟" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ باپ کے اتنے سوالوں پہ چڑ جاتا۔ لیکن اس وقت اس کی اپنی سٹی گم تھی۔

"دو لڑکے اور..." اور ابراہیم صاحب کا ہاتھ پوری طاقت سے اس کے چہرے پہ اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ "چٹاخ" کی آواز نے گاڑی میں بیٹھی سوزی کو دم بخود کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اس کے کھلے منہ پہ آٹھہرا تھا۔

"مرد بنو مسٹر سیم! اور مردوں کی طرح اپنے دھوکے کو اون (Own) کرنا سیکھو۔" اسے گریبان سے جکڑے وہ سرد لہجے میں غرائے تھے اور ثموزان کے منہ سے اپنے لیے پہلی مرتبہ "سیم" سن کے ساکت رہ گیا تھا۔

"تم نے ابراہیم ملک کو کیا سمجھا تھا؟ کوئی بے وقوف یا الو کا پٹھا۔ جس کی ناک کے نیچے تم رنگ رلیاں مناتے رہو گے اور اسے خبر تک نہ ہوگی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ غصے سے چلائے تو سوزی کے سامنے اس درجہ تذلیل پہ سیم کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔

"گریبان چھوڑیں میرا۔" دانت پیستے ہوئے وہ جیسے پھنکارا تھا۔ مگر ابراہیم صاحب پہ کوئی اثر نہ پا کے اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"میں کہتا ہوں چھوڑیں میرا گریبان۔" دونوں ہاتھوں سے ان کی کلائیاں جکڑتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے خود کو ان کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ خود کو؟ ہاں میں منا رہا ہوں رنگ رلیاں... کیا بگاڑ لیں گے آپ میرا؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ سرکش لہجے میں دھاڑا تو ابراہیم ملک ایک لمحے کو اسے بے یقینی سے دیکھ کر رہ گئے۔ کیا یہ ان کا وہ بیٹا تھا جو ان کی کل کائنات تھا؟

"واہ! کیا انعام دیا ہے بیٹا!" وہ تاسف سے بولتے ایک قدم آگے آئے تھے۔ "ٹھیک ہے اگر یوں ہے تو پھر یونہی سہی۔" ان کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے تھے۔ "بہت شوق ہے نا تمہیں عیاشی کا تو کرو۔ ضرور کرو۔ مگر میں اپنی حق حلال کی کمائی تم سے بدعہد اور بدکردار شخص کو ان ناپاک کاموں میں لٹانے کے لیے مر کر بھی نہیں دوں گا۔ میں نے تمہیں جتنا دینا تھا دے دیا اور تم نے میری پیٹھ میں جتنے خنجر گھونپنے تھے گھونپ دیے۔ اب بس!" انہوں نے بے اختیار انگلی اٹھائی

تھی۔

"میں تمہیں آج، اسی وقت اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں۔ تم ہمارے لیے مر گئے۔ آئندہ میرے گھر میں کبھی قدم رکھنے کی غلطی مت کرنا مسٹر سیم۔ کیونکہ میں اجنبیوں کی، وہ بھی دھوکے باز اور بدکردار اجنبیوں کی اپنے گھر میں آمد برداشت نہیں کرتا۔" اسے وارننگ دیتے وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر کو بڑھے تھے اور پیچھے کھڑے سیم کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

"یہ میری زندگی ہے۔ میں اسے جیسے چاہوں گا ویسے گزاروں گا۔ آپ ان فضول دھمکیوں سے مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ سمجھے!" ان کی پشت پہ نگاہیں گاڑھے وہ با آواز بلند دھاڑا تھا۔ مگر ابراہیم صاحب کی رفتار میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ان ہی مضبوط قدموں سے چلتے باہر نکل گئے تھے۔

"تم ٹھیک تو ہو نا سیم؟" ان کے منظر سے ہٹتے ہی سوزی دروازہ کھول کے اس کے پاس دوڑی چلی آئی تھی۔ مگر سیم اسے ایک جھٹکے سے اپنے سامنے سے ہٹاتا، گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت اتنے شدید غصے میں تھا کہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے انتہائی تیزی سے بیک کی تھی۔ گاڑی کے ٹائر بری طرح چرچرائے تھے۔ مگر وہ کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بنا، آندھی طوفان کی طرح گاڑی بھگا لے گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
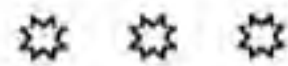
حنان نے مہر کے وجود کو مکمل طور پہ نظر انداز کر دیا تھا۔ نتیجتاً "مہر نے بھی اس پہ لعنت بھیجی تھی اور اپنی زندگی میں مصروف ہو گئی تھی۔ اور کچھ یہی ردعمل باقی گھر والوں کا بھی تھا۔

دوسری طرف حنان نے دو تین دن کے وقفے کے بعد ہی صغیر صاحب کا آفس جوائن کر لیا تھا۔ اس کے اس فیصلے سے انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی۔ یہ ان کی دلی خواہش تھی جو ان کے بیٹے نے بنا ان کے کچھ کہے ہی پوری کر دی تھی۔

یوں حنان نے دفتر میں اپنی ذمہ داریاں بڑے احسن طریقے سے سنبھال لی تھیں۔ لیکن چند معاملوں میں صغیر صاحب کا اسے ٹوکنا بھی کسی بہتری کا باعث نہیں بن پایا تھا۔ جن میں سرفہرست اس کی حد سے بڑھی ہوئی دوستیاں اور گھر میں زیب خاص طور پر مہر کے ساتھ اس کا بلاوجہ کا ناروا سلوک تھا۔

ابھی بھی وہ رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب گھر واپس لوٹا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کے وہ اپنے دھیان میں اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن ٹی وی کے آگے مہر کو بیٹھا دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اور حنان پہ نگاہ پڑتے ہی وہ بے نیازی سے رخ موڑ گئی تھی۔

اس کی یہ بے نیازی حنان کو سرتاپا سلگا گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اسے یعنی حنان قاضی کو، جس کے پیچھے لڑکیوں کی ایک لمبی قطار تھی، نظر انداز کرنے کی جرات کر گئی تھی۔ جو اسے پہلے دن کی طرح بے حد ناگوار گزری تھی۔ جب اس نے ایئرپورٹ پہ مہر کی آنکھوں میں باقی سب کی طرح اپنے لیے ستائش کے بجائے غصہ اور ناگواری دیکھی تھی۔

وہ اچانک اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر کے اس کی طرف چلا آیا اور بنا مہر کی جانب دیکھے صوفے پہ آ کر بڑے ریلیکس انداز میں گر سا گیا۔ یوں جیسے وہ وہاں بالکل اکیلا ہو۔ پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگیں سیدھی کی تھیں اور جوتوں سمیت سامنے موجود ٹیبل پہ رکھ دی تھیں۔

اس کے صوفے پہ بیٹھتے ہی مہر کا سارا دھیان فلم پہ سے ہٹ گیا تھا۔ لیکن اس متکبرانہ انداز پہ تو وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

حنان نے اس کی نگاہوں کی پرواہ کیے بنا ہاتھ بڑھا کر ریموٹ اٹھایا تھا اور چینل بدل دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک، وہ چینل سرچنگ میں مصروف ہو گیا تھا اور مہر

لب بھینچے اسے چند لمحے دیکھنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے خاموشی سے وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے۔ لیکن حنان کی تمسخرانہ آواز نے اسے رک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"فلم نہیں دیکھنی کیا؟" اور اس کی ذلالت پہ مہر کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ جان بوجھ کے اسے تنگ کر رہا تھا۔

"جی نہیں، آپ کی موجودگی میں مجھے کچھ بھی نہیں دیکھنا۔" ایک سلگتی نظر اس کے چہرے پہ ڈالتی وہ خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھی تھی۔

اس کے جواب نے حنان کے چہرے پہ تناؤ پیدا کر دیا تھا مگر اس کے لبوں پر کھیلتی تمسخرانہ مسکراہٹ برقرار رہی تھی۔

"بڑے دماغ ہو گئے ہیں بھئی۔" مہر کو دیکھتے ہوئے اس نے بھنویں اچکائی تھیں۔ "مگر شاید تم بھول رہی ہو کہ کس کی چھت کے نیچے کھڑی ہو اور کس سے بات کر رہی ہو۔"

"میں جس چھت کے نیچے کھڑی ہوں فی الحال وہ آپ کی نہیں ہوئی۔ جس دن ہو جائے گی، اس دن یہ رعب دکھائیے گا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ دوبدو بولی تو حنان کے لبوں پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"شاید تم میرے مقابل اترنے کی کوشش کر رہی ہو مہر احمد۔"

"آپ کے مقابل!" مہر نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائی تھیں۔ "نہیں بھائی! میں اتنا نہیں کر سکتی۔" اور حنان کے لیے اتنے کاری وار کی ضرب سہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا اور اگلی ہی جست میں اس کی کلائی جکڑ گیا تھا۔

"اب کہو کیا کہہ رہی تھیں تم۔" اور مہر اسے اپنے اتنے قریب پا کے بری طرح گھبرا گئی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑیں۔" اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی بے اختیار کوشش کی تھی۔

"کیوں یہ ہاتھ صرف ڈیئر ہنی ہی پکڑ سکتے ہیں؟" اور مہر اس کے منہ سے ایک بار پھر اپنے کردار پہ چوٹ سن کر تڑپ اٹھی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ اور اپنے وجود کی پوری طاقت لگاتے ہوئے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروا لیا تھا۔

"آئندہ اگر آپ نے میرے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" انگلی اٹھائے وہ بنا کسی خوف کے شعلے برساتے لہجے میں بولی تو حنان قاضی کو اس کی یہ جرات آگ لگا گئی۔

"مجھے وارننگ دے رہی ہو تم؟" اس کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔

"ہاں دے رہی ہوں۔ اپنی زبان اور گری ہوئی سوچ سنبھال کے رکھیں۔ میں نے اب تک خاموشی سے برداشت کیا لیکن یہ فضول بکواس میں دوبارہ کبھی برداشت نہیں کروں گی اور میری یہ بات آپ بھولنے کی غلطی مت کیجیے گا۔" وہ اپنے سابقہ لہجے میں بولی تھی اور حنان کے لیے اس جرات کے مظاہرے کو ہضم کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"بے فکر رہو، کبھی نہیں بھولوں گا۔ مگر ایک بات تم بھی یاد رکھنا مہر احمد! ۔ میری یادداشت میں رہنا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

"مجھے میری خاموشی بھی بہت مہنگی پڑتی رہی ہے حنان صاحب۔ اس لیے مجھے اتنی سی بھی پرواہ نہیں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ بنا کسی جھجک کے اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئی تھی اور حنان کی مارے غصے کے مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اٹھو انجم! کچھ کھا لو۔ تمہاری دوا کا وقت ہو گیا ہے۔" ابراہیم صاحب نے آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی انجم بیگم کی طرف دیکھا تھا۔

پانچ دن ہو گئے تھے اس کرب ناک حقیقت کو ان پہ واضح ہوئے اور ان پانچ دنوں میں ہی انجم جیسے بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے انہیں ذہنی دباؤ اور پریشانی

سے دور رکھنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن یہ بھلا ابراہیم صاحب کے ہاتھ میں کہاں تھا؟ وہ تو خود اندر سے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ ثموز کی آنکھوں میں اتری بدلحاظی اور مزاج میں در آنے والی سرکشی اور اجنبیت نے ان کی رہی سہی ہمت بھی توڑ کے رکھ دی تھی۔ وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ انہوں نے امریکہ سے اپنے کاروبار کو ہی سمیٹ لینے کی ٹھان لی تھی۔

"انجم' میں نے پاکستان واپسی کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس سلسلے میں میں نے طاہر سے بھی بات کرلی ہے۔ بہت جلد میں اور تم۔۔۔"

"میں اور آپ؟" انجم نے ایک جھٹکے سے آنکھوں پر دھرا بازو ہٹاتے ہوئے زخم خوردہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تھا۔ "ہم یہاں تین بندے آئے تھے ابراہیم اور اب واپس لوٹیں گے تو صرف میں اور آپ!" بھرائے ہوئے لہجے میں بولتی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "میں ماں ہوں اس نامراد کی۔ کیا کہہ کر اپنے دل کو تسلی دوں؟ اور کیا بتاؤں اپنی بہن کو اور اس بدنصیب لڑکی کو جس کا نصیب ہم نے بچپن میں ہی پھوڑ دیا تھا۔" بات کرتے کرتے ان کے آنسو تیزی سے ان کے چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔

"پانچ دن۔ پانچ دن ہوگئے ہیں مگر ہمارے بیٹے نے ہمیں ایک فون کرنے کی زحمت نہیں کی۔ مگر پھر میں سوچتی ہوں کہ آج جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس میں کیا صرف ہماری اولاد قصوروار ہے؟" انہوں نے دکھ بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تو ابراہیم ملک اس سوال پہ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔

"نہیں اس میں آپ کی خواہشات بھی شامل ہیں۔ کیا سوچا تھا آپ نے کہ امریکہ آئیں گے' یہاں کی ہر اچھی چیز سے فائدہ اٹھائیں گے اور ہنسی خوشی رہیں گے؟ نہیں ابراہیم صاحب! آپ کی بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ جب آپ نے یہاں پھلنے پھولنے کے ارادے باندھے تھے تاتو یہاں کی برائیاں اور کمزوریاں بھی آپ کو کامپلمنٹری (تحفتاً) ملی تھیں۔" ان کی اس بات پر ساکت بیٹھے ابراہیم ملک کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"کتنا کہا تھا میں نے آپ سے کہ ابراہیم یہاں کا ماحول ٹھیک نہیں۔ مگر آپ نے میری ایک نہ سنی۔ کیونکہ تب تو آپ کے سامنے آپ کا دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہوا کاروبار تھا۔ پھر اب اگر اس ترقی کے بدلے میں بیٹا گنوانا پڑگیا ہے تو کیوں واپسی کے ارادے باندھ رہے ہیں؟ جائیے اپنا کاروبار کیجیے۔ جو نقصان ہونا تھا ہوگیا۔ اب اس بڑھاپے میں ہم کہیں بھی رہیں، کیا فرق پڑتا ہے؟" اور ابراہیم صاحب کے لیے مزید ان کٹھلی سچائیوں کو سہنا مشکل ہوگیا تھا۔ ان کا دل پھٹنے کو آگیا تھا۔

"میں مانتا ہوں سب قصور میرا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں میں اس اہم ترین نقطے کو بھول گیا کہ جو فضائیں میرے کاروبار کے لیے بہت سازگار تھیں۔ وہ میری اولاد' میری نسل کے لیے بہت ضرر رساں تھیں۔ مگر بہ خدا انجم میں نے یہ نہیں چاہا تھا۔"

احساس زیاں سے مغلوب ہو کے ان کی آواز بھر آئی تھی۔ اور ابراہیم صاحب کے ذہن میں پتا نہیں کہاں سے' لیکن اچانک ہی ان کی اپنی آواز دستک دینے لگی تھی۔

"ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگاہی کھلتا ہے۔۔۔"

اک سنسناہٹ سی انہیں اپنے پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی تھی۔

"یا اللہ میری غلطیوں کو معاف فرمادے۔ ان کی درستی کے اسباب پیدا فرمادے۔ بے شک تو ہر چیز پہ قادر ہے۔" بہتے اشکوں کے ساتھ انہوں نے دل کی گہرائی سے اپنے رب سے اپنے غلط فیصلوں کی معافی طلب کی تھی۔

☼ ☼ ☼

سیم کو اپنی کہی کسی بھی بات کا پچھتاوا نہ تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے حوصلے پہ خود حیران تھا کہ اس نے کیسے ابراہیم صاحب کا ہاتھ اٹھانا' وہ بھی سوزی کے سامنے برداشت کرلیا تھا ورنہ اس کے نزدیک اگر کوئی اور اولاد ہوتی تو

اس زیادتی پہ کب کا اپنے باپ کو حوالات کی سیر کروا چکی ہوتی۔

اسے ابراہیم صاحب کی دھمکی کی بھی رتی برابر پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرنے والے تھے۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے ماں باپ کی اس میں جان تھی اور وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ اس کے بابا اگر غصے میں یہ فیصلہ کر بھی لیتے تب بھی اس کی ماں انہیں اس درجہ زیادتی کی اجازت کبھی نہیں دینے والی تھی اور اس بات کی اسے امید نہیں بلکہ یقین تھا۔ تب ہی اس نے بے حد اطمینان سے انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصے کی بات تھی' سب کچھ خود ہی ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اس بات کو سمجھتے کہ وہ اب ایک سمجھدار اور بالغ شخص تھا' جس کی زندگی کو وہ لوگ اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتے تھے۔ کم از کم اس مہذب معاشرے میں تو بالکل بھی نہیں۔

اس روز سیم نے واپس آکر سوزی کو ہونے والی تلخ کلامی کے ساتھ ساتھ اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ جس پہ سوزی نے اسے مکمل طور پہ سپورٹ کیا تھا۔ اس کے نزدیک سیم کے باپ کا رویہ نہایت غیر مناسب تھا۔ اور وہ اس سلسلے میں کسی نرمی کے مستحق نہ تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" تیار کھڑی سوزی نے سیم کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تھی۔ وہ دونوں ماہانہ گروسری کی خریداری کے لیے قریبی سپر مارکیٹ تک جا رہے تھے۔ سیم اپنی ان سوچوں کے تانے بانے جھٹکتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

گھر بند کر کے وہ گاڑی میں سوار جلد ہی مطلوبہ مارکیٹ آپہنچے تھے۔ جہاں گھنٹہ لگا کے سیم نے بہت تسلی اور فراخ دلی سے سوزی کو گھر کے سامان کے ساتھ ساتھ اس کی ذاتی اشیاء کی بھی شاپنگ کروائی تھی۔

اپنی باری آنے پہ وہ دو دو ٹرالیاں گھسیٹے کاؤنٹر پہ آ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں موجود لڑکی نے ان کی چیزیں اٹھا اٹھا کر بل بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران سیم اور سوزی کاؤنٹر کے ایک جانب سجائی ہوئی چاکلیٹس میں سے اپنی پسند کی خریداری کرنے لگے تھے۔

"چھ سو پچاس ڈالرز سر۔" کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی نے سکرین پہ جگمگاتا ٹوٹل بہ آواز بلند سیم کے گوش گزار کیا تو اس نے والٹ نکال کر اس میں موجود کریڈٹ کارڈ بے نیازی سے لڑکی کے حوالے کیا تھا اور خود ایک بار پھر سوزی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی سر! آپ کا اکاؤنٹ' کارڈ کو سپورٹ نہیں کر رہا۔" لڑکی نے سیم کو مخاطب کیا تو سیم کے ساتھ ساتھ سوزی کی بھی ساری بے نیازی ہوا ہو گئی۔

"کیا؟" وہ سرعت سے پلٹ کر کاؤنٹر کی جانب آیا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں تو ٹھیک ٹھاک رقم تھی۔

"پھر کوشش کریں۔" اس کے کہنے پہ لڑکی نے دوبارہ سارا عمل دہرایا تھا۔

"سوری سر۔" اس نے کارڈ نکال کر سیم کے حوالے کیا تھا اور اس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا تھا۔ سوزی الگ اپنی جگہ پہ حق دق سی کھڑی تھی۔ سیم نے فوراً سے پیشتر والٹ نکال کر اس میں رکھا کیش لڑکی کے حوالے کیا تھا۔ اور خود الجھا سا لب بھینچے باہر چلا آیا تھا۔ سوزی اس دوران عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل خاموش رہی تھی۔

وہاں سے گاڑی نکال کر سیم کا رخ اپنے متعلقہ بینک کی جانب ہو گیا تھا۔ جس کی پارکنگ میں اس نے گاڑی کھڑی کی تو سوزی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟"

"نہیں۔" وہ ایک لفظ میں بات ختم کر کے اکیلا ہی اندر چلا آیا تھا۔

"مجھے اپنے اکاؤنٹ کا اسٹیٹس چیک کرنا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اکاؤنٹ نمبر ہیلپ ڈیسک پر بیٹھے شخص کے حوالے کر دیا تھا۔

"سوری سر! آپ کا اکاؤنٹ فریز کروا دیا گیا ہے۔" اس شخص کی نظریں اسکرین سے ہٹ کر سیم کے چہرے پہ آٹھہری تھیں اور سیم کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔

☼ ☼ ☼

اس رات کے واقعے کے بعد حنان نے مہر سے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس کی راہ میں آیا تھا۔ یہ رد عمل مہر کو پر سکون کر گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کاش اس نے پہلے ہی یہ دو ٹوک اور سخت رویہ اپنا لیا ہوتا تو آج اس کی عزت نفس اور جذبات حنان کے ہاتھوں مجروح نہ ہوتے۔

لیکن مہر جیسی سادہ اور بے ریا بندی ابھی یہ تلخ حقیقت نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ اپنے سامنے آپ کا جھکا ہوا سر دیکھنے کے عادی ہوں ان کے لیے آپ کی اٹھی ہوئی گردن کو دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔ دشمن کی خاموشی ہمیشہ اس کی پسپائی کا اعلان نہیں کرتی۔ یہ کبھی کبھار اس کے اندر چھپے نئے طوفان کی بھی علامت ہوتی ہے۔ وہ طوفان جسے برپا کرنے کے لیے وہ کسی گھاگ شکاری کی طرح مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں ہوتا ہے اور ان ہی کی حنان کو بھی تلاش تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔" مہر نے اپنی کنپٹی دباتے ہوئے تھکی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ چاروں صغیر صاحب کے ساتھ ان کے عزیز دوست کی بیٹی کی شادی میں آئی ہوئی تھیں۔ مہر کی طبیعت شام سے ہی گری گری سی تھی۔ مگر چونکہ دلہن سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ اس لیے وہ دوا کھا کر سب کے ساتھ تقریب میں چلی آئی تھی۔ اب اس کو حرارت بھی ہو گئی تھی۔

"مگر بیٹا! ابھی تو نکاح بھی نہیں ہوا۔" زیب نے اس کی بوجھل آنکھوں کو تشویش سے دیکھا تھا۔

"کوئی بات نہیں امی! میں حنا سے معذرت کر لوں گی۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔ اور پھر وہ ڈرائیور کے ہمراہ گھر واپس آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

حنان جس وقت گھر لوٹا' رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

آج آفس میں ایک پارٹی کے ساتھ ان کی اہم میٹنگ اور پھر ڈنر تھا۔ صغیر صاحب کی چونکہ شادی میں شرکت بھی ضروری تھی۔ اس لیے انہوں نے حنان کو یہ میٹنگ اور ڈنر سنبھالنے کے لیے کہا تھا۔ حنان فارغ ہو کر سیدھا گھر چلا آیا تھا۔

پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے اس نے چوکیدار کو داخلی دروازے کا لاک کھولنے کے لیے کہا تھا۔ جسے وہ سب گھر والے اپنی غیر موجودگی میں بند کر کے جاتے تھے۔

"دروازہ کھلا ہے صاحب جی! وہ مہر بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ واپس آ گئی ہیں۔" چوکیدار کی بات پہ حنان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"کب واپس آئی ہے؟" اس کے اندر کا شکاری چوکس ہو گیا تھا۔ شاید وہ موقع آ گیا تھا۔ جس کا اسے اتنے دنوں سے انتظار تھا۔

"ابھی دس' پندرہ منٹ پہلے ہی آئی ہیں۔" اور وہ اثبات میں سر ہلاتا اندر چلا آیا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس کی آنکھیں مارے خباثت کے چمک اٹھی تھیں۔

وہ دروازے کو لاک لگا کر اوپر چلا آیا تھا۔ احتیاطاً اس نے سب ہی کے کمرے کھول کے چیک کیے تھے۔ پورا گھر خالی پا کے اس پہ سرشاری سی چھا گئی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا مہر کے کمرے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ لاک نہ پا کر اس نے دروازہ دھکیلا۔ اور اندر داخل ہو گیا تھا۔

مہر اندر کمرے میں کہیں نہ تھی۔ لیکن باتھ روم سے پانی کی آواز سن کر اس کے لب بے اختیار مسکرا دیے تھے۔ اس نے پلٹ کر دروازے کو لاک کیا تھا اور

خود ایک طرف رکھی راکنگ چیئر پہ آ کے بیٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسے کر سکتے ہیں وہ ایسا؟" آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا انہیں گھر لوٹے۔ مگر سیم کا شاک' اس کا غصہ جوں کا توں برقرار تھا۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس روز جو بھی کہہ کر گئے تھے اس میں سے کچھ بھی بے معنی یا اسے محض ڈرانے دھمکانے کے لیے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے مکمل طور پہ عاق کر چکے تھے۔ اور صرف وہ ہی نہیں بلکہ اس کی ماں بھی اس سے لاتعلقی اختیار کر چکی تھی اور یہ دھچکا اس کی بہت سی خوش فہمیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اسے غصے کے ساتھ ساتھ شدید قسم کی پریشانی بھی لاحق ہو گئی تھی۔ امریکہ جیسے ملک میں رہ کر بھی اس نے آج تک شہزادوں کی سی زندگی گزاری تھی۔ مشقت کسے کہتے ہیں اور کن کن کر پیسہ خرچ کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ ایسی ہر کڑوی حقیقت سے نابلد تھا۔

"مجھے، مجھے کچھ کرنا ہو گا۔" ڈوبتے دل کے ساتھ یہاں وہاں چکراتے وہ بے اختیار بڑبڑایا تھا۔

"کیا کرو گے؟" سوزی نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مجھے انہیں منانا ہو گا۔ انہیں کسی بھی قیمت پہ راضی کرنا ہو گا۔"

"اور اگر ان کی قیمت ہماری علیحدگی ہوئی تو؟" سوزی کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ آنکھرے تھے۔

"تو میں یہ بھی کر گزروں گا۔" لمحے کے توقف کے بعد اس نے اطمینان سے جواب دیا تو سوزی کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ سی گئی تھیں۔

"کیا؟"

"ہاں! میں یہ بھی کر گزروں گا۔ مگر۔۔۔" وہ لحظہ بھر کو رکا تھا اور پھر بے اختیار مسکرا دیا تھا۔" مگر صرف عارضی طور پہ۔" اور ساکت بیٹھی سوزی اسے بے یقین نظروں سے دیکھے چلی گئی تھی۔ اس کے تاثرات پہ سیم نے اک گہری سانس لی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

"دیکھو سوزی! ہم دونوں جانتے ہیں کہ اگر میں اپنی فیملی میں واپس جانا چاہتا ہوں تو ان کی یہی شرط ہو گی۔ لیکن دہرانا چاہوں گا۔ میں اس بار جوش سے نہیں ہوش سے کام لوں گا۔ اور اس میں مجھے تمہارے صبر اور تمہارے ساتھ دونوں کی ضرورت ہو گی۔ تمہیں ہر حال میں مجھ پہ یقین کرنا ہو گا۔ کیونکہ میں تمہیں آج ایک بات بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اس دولت اور اس اسٹیٹس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم اسے میری خود غرضی کہہ لو یا کچھ بھی لیکن مجھے یہ سب ہر صورت دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ سو اگر تم یہ سب نہیں کر سکتیں تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں اپنا سامان اٹھاؤں گا اور اپنے ماں باپ کو منانے چل پڑوں گا۔" اور سوزی اس کے منہ سے اتنی واضح اور قطعی بات سن کر بے اختیار خاموش ہو گئی تھی۔ صورت حال بالکل کلیئر تھی یا تو وہ اس کے ساتھ تھی یا پھر نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن مجھے دھوکا مت دینا سیم!" اس نے انگلی اٹھائے تنبیہی انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھا تو سیم نے مسکراتے ہوئے اسے خود میں سمیٹ لیا۔

"کبھی نہیں۔ مر کے بھی نہیں۔" اور سوزی اس یقین دہانی پہ مطمئن سی مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

مہر تولیے سے منہ خشک کرتی اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر سامنے راکنگ چیئر پہ جھولتے حنان سے ٹکرائی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"آپ؟" اس نے فقط اتنا ہی کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ کر بیڈ پہ پڑا دوپٹا اٹھایا اور اپنے شانوں پہ پھیلا لیا۔ حنان اس دوران اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھے گیا تھا۔

"یہ کیا طریقہ ہے حنان بھائی؟ آپ یوں بنا اجازت

میرے کمرے میں کیوں آئے ہیں؟" اس نے سخت لہجے میں استفسار کیا تھا۔ حنان کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

"بنا اجازت... " میرا کمرہ... کیا استحقاق آ گیا ہے تمہارے لہجے میں۔" حنان اس کا چہرہ دیکھتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اس دن بھی کیا کہا تھا تم نے مجھ سے؟" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "ہاں میرے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ اسے عجیب آرپار ہوتی نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔

"آپ' آپ یہاں سے جائیں حنان بھائی۔" اور حنان کا بھاری قہقہہ مہر کی آنکھوں میں سراسیمگی پھیلا گیا۔

"بھائی ہی تو نہیں ہوں میں تمہارا۔" اس کی ہرنی سی خوفزدہ آنکھوں میں تکتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو مہر کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ یہ کون سا حشر برپا ہونے چلا تھا؟ مارے وحشت کے وہ کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"تم تو بہت بہادر ہو میری جان۔ اتنی سی حقیقت سن کے ڈر گئیں۔" اس کے حسین چہرے کا خوف حنان کے اندر کے شیطان کو سکون پہنچا گیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

"خدا کا واسطہ ہے حنان بھائی۔ مجھے میرے عزیز رشتوں کے وہ روپ نہ دکھائیں کہ میں زندگی بھر کسی پر اعتبار کرنے کے لائق نہ رہوں۔" اس کے سامنے ہاتھ جوڑے مہر کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا تھا۔ عزتوں کے محافظ ہی جب لٹیرے بن جائیں تو کوئی کسے مدد کے لیے پکارے؟ کون سی جائے پناہ تلاش کرے؟

"تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں مہر احمد۔ ہم دونوں صرف ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری برداشت کو تمہارا یہ چمکتا وجود بہت عرصے سے آزما رہا ہے سو میں نے سوچا کیوں نہ اس کی یہ آزمائش آج ختم کر دی جائے۔" اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے وہ ایک قدم آگے آیا تو مہر سہم کر دیوانہ وار پیچھے ہٹی اور دیوار سے جا لگی۔ چشم زدن میں چند سال پہلے کا وہ منظر اس کے ذہن میں گھوم گیا جب رات کی تاریکی میں حنان نے اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا۔ اس کے پورے وجود میں اس یاد نے چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔ یہ شخص تو نجانے کب سے اس پہ اپنی گندی نظر رکھے ہوئے تھا۔ مہر کو سامنے کھڑے حنان سے یک لخت گھن محسوس ہوئی تھی۔

"تمہارا اندر اتنا گندہ ہو گا حنان قاضی! میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ تم سا غلیظ اور بدکردار انسان..." اور اس کے ساتھ ہی حنان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس نے غراتے ہوئے درمیانی فاصلہ ایک ہی جست میں طے کیا تھا اور مہر کو اپنی جانب گھسیٹ لیا تھا۔

"چھوڑو۔ چھوڑو مجھے ذلیل آدمی!" مہر خود کو چھڑانے کی کوشش میں پاگل ہونے لگی تھی۔

"کیوں؟ جب اس کمینے کے ساتھ پہاڑ پہ موج اڑا سکتی ہو تو میرے ساتھ کیوں نہیں؟" دانت پیستے ہوئے حنان نے ایک جھٹکے سے اس کی دونوں کلائیاں قابو میں کی تھیں اور اسے پیچھے دیوار سے لگا دیا تھا۔

"مجھے ہاتھ مت لگانا حنان! میں تمہارا گھناؤنا روپ سب کو دکھا دوں گی۔" مہر وحشت زدہ سی چلائی تھی۔

"تم کیا بتاؤ گی۔ میں خود بتاؤں گا سب کو کہ تم کسی لڑکے کے ساتھ پچھلے لان میں..."

وہ دھیرے سے ہنسا تھا اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی ہو۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں حنان کے چہرے پہ جم سی گئی تھیں۔ اور اگلے ہی لمحے آنسو قطروں کی صورت اس کی خوب صورت آنکھوں سے پھسلنے لگے تھے۔ یہ منظر اتنا کومل اتنا دلفریب تھا کہ حنان کا دل بیچ میں ڈول گیا تھا۔ وہ ان ساحر آنکھوں کا حسن پہلی بار اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا اور ان کی تاب لانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"اُوف جان حنان! یہ ظلم نہ کرو مجھ پہ۔" خمار آلود لہجے میں کہتے وہ اس کی طرف جھکا تو مہر نے تڑپ کے اپنا رخ ایک طرف کر لیا۔ اس کی ریشمی زلفیں حنان کے چہرے کو مس کرتی اس پہ خوشبو سی بکھیر گئی

تھیں۔ بے اختیار حنان کو اپنا دل موم کی طرح پگھلتا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں حنان' مجھے چھوڑ دو۔" پھوٹ پھوٹ کے روتی مہر نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلی تھیں۔

اس کی آواز' اس کی استدعا اچانک جیسے حنان کے دل کو چھونے لگی تھی۔ اس پہ اثر کرنے لگی تھی۔ مہر کی کلائیوں پہ اس کی گرفت میں خود بہ خود نرمی آگئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اس سحر انگیز خوشبو کو اپنے اندر اتارا تھا اور قدرے پیچھے ہٹ کر پہلی بار دل کی پوری آمادگی کے ساتھ' سسکتی ہوئی مہر کے ایک ایک نقش کو اپنے اندر اترنے دیا تھا۔

اس کے ریشمی بال کھل کے بکھر چکے تھے۔ عارضوں پہ جھکی بھیگی گھنیری پلکیں اور دانتوں تلے دبے یاقوتی ہونٹ۔ حنان کے پورے وجود پہ کمندیں سی ڈالنے لگے تھے۔

"یہ سانچے میں ڈھلا مومی وجود تمہاری نفرت کے تو لائق نہیں حنان قاضی۔" اس کے دل نے دھیرے سے سرگوشی کی تو وہ دل کی اس سرگوشی پہ ایمان لے آیا۔ اس نے مہر کی کلائی پہ سے اپنا دایاں ہاتھ ہٹاتے ہوئے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کے چہرے پہ بکھر آنے والے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے اس کے گال کو سہلایا تو مہر کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ حنان کو خود میں واپس لے آئی۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے مہر کی دوسری کلائی بھی چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اس حرکت نے روتی ہوئی مہر پہ جادوئی اثر دکھایا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ اور حنان کو خود سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دیکھ کے اس کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھیل گئی تھیں۔ وہ دم سادھے چند سیکنڈ اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اور پھر بھاگ کر اس کے قریب سے گزرتی کارپٹ پہ گرے اپنے دوپٹے کی جانب لپکی تھی۔

"میرا یہ احسان یاد رکھنا مہر احمد۔" دوپٹہ اٹھائے وہ دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ حنان کی آواز نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر حنان کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اسی جگہ پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھٹ رخ موڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور تیر کی سی تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے حنان کو ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے اردگرد بکھرا فسوں غائب ہو گیا تھا۔

"یہ اچانک مجھے کیا ہوا تھا؟" اپنی کایا پلٹ پہ وہ حیران تھا۔

"حنان قاضی اور مہر احمد پہ مہربان؟" وہ بے یقینی کے عالم میں بڑبڑایا تو اس کا دل بے اختیار قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"مہربان نہیں قربان کہو۔ گھائل تو تم بہت پہلے ہی ہو گئے تھے' آج تو صرف آخری کیل ٹھکی ہے حنان قاضی۔" اور حنان اس انکشاف پہ حیرت زدہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بخار کا زور کچھ ٹوٹا؟" زیب بیگم نے تسبیح ختم کر کے مہر پہ پھونکتے ہوئے جاشی کی طرف دیکھا تھا جو بے سدھ پڑی مہر کے ماتھے پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بخار کی حدت کی وجہ سے سرخ ہو رہا اور پپوٹے بے حد سوجے ہوئے تھے۔

"یہ اس کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی کیوں ہیں؟" زیب نے تشویش سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

"پتا نہیں امی! مجھے تو خود اتنی پریشانی ہو رہی ہے۔" جاشی کی نظریں بھی مہر کی آنکھوں پہ جا ٹھہری تھیں۔

کل رات بڑی عجیب سی بات ہوئی تھی۔ وہ لوگ ایک بجے کے قریب واپس آئے تھے اور جس وقت جاشی نے اپنا کمرہ کھولنا چاہا تھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے باہر موجود گھر کی چابیوں سے دروازہ کھولا تھا اور اندر

چلی آئی تھی۔ لیکن بیڈ پہ سکڑی سمٹی مہر کو سوتا دیکھ کے وہ ایک پل کے لیے حیران رہ گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے اس کی پیشانی چھوئی تھی۔ جو اچھی خاصی گرم ہو رہی تھی اور پھر وہ اس پہ کمبل ڈال کے اپنے کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی تھی۔

لیکن صبح جب زیب بیگم، جائشہ کو کالج کے لیے اٹھانے آئی تھیں۔ تو مہر کو بے سدھ پڑا دیکھ کے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں حنان کو چھوڑ کے سب ہی گھر والے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ صغیر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کو لینے ان کے گھر بھاگے تھے۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد اسے انجکشن لگا کر دوائیاں دی تھیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی تاکید بھی کی تھی۔

ان کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے جاشی فوراً سے پیشتر پٹیاں لے کر مہر کے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور پریشان حال زیب تسبیح لیے اس پر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگی تھیں۔ اس دوران جاشی کے کالج کا ٹائم بھی نکل گیا تھا۔

"جاؤ بیٹا جا کر حنان کو اٹھاؤ ورنہ اسے بھی دیر ہو جائے گی۔" زیب کی بات پہ جاشی اثبات میں سر ہلاتی اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ لیکن حنان کو اپنے کمرے سے نکلتا دیکھ کے وہ بیچ راہداری میں ہی رک گئی تھی۔

"تم کالج نہیں گئیں؟"

"نہیں بھائی! مہر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ شدید بخار کی حالت میں بے ہوش پڑی ہے۔ ڈیڈی ابھی ڈاکٹر عثمان کو واپس چھوڑنے گئے ہیں۔"

"کیا؟" حنان اس اطلاع پہ ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔ پہلی بار اسے مہر احمد سے کی گئی اپنی کسی زیادتی کا بہت شدت سے احساس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام تک مہر کا بخار کم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پہ لگے خاموشی کے قفل اور چہرے پہ چھائی عجیب سی ویرانی نے زیب بیگم کو پریشان کر دیا تھا۔

"مہو میری جان۔ اتنی چپ کیوں ہو بیٹا؟" انہوں نے اس کے بال سہلاتے ہوئے اس کا چہرہ نرمی سے اپنی طرف کیا تو مہر کی خالی آنکھیں ان کے پر شفقت چہرے پہ آٹھہریں۔ بے اختیار اس کا دل کل رات خود پہ گزرنے والی قیامت کا ایک ایک پل ماں کو بتانے کے لیے تڑپ اٹھا۔ لیکن حنان کا خوف اتنا شدید تھا کہ وہ اس تڑپ کے باوجود ایک لفظ انہیں نہ بتا پائی۔

ان کے چہرے پہ نظریں جمائے وہ یکایک مارے بے بسی کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو زیب نے بری طرح گھبرا کے اسے خود میں سمیٹ لیا۔

"کیا ہوا ہے مہر؟ کچھ تو بولو بیٹا؟" مگر ماں کے سینے سے لگتے ہی اس کے آنسوؤں میں مزید شدت آگئی تھی۔

"امی... امی! مجھے چھوڑ کے مت جایئے گا۔ میں مر... مر جاؤں گی آپ کے بغیر۔" وہ آنسوؤں کے درمیان اٹکتے ہوئے بولی تو زیب کا متوحش دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"کیا بات ہے مہر؟ حنان نے کچھ کہا ہے تمہیں؟" اس سے الگ ہوتے ہوئے انہوں نے یونہی حنان کا نام لیا تو مہر رونا بھول کر خوف زدہ نظروں سے ان کا چہرہ تکنے لگی۔ اسی وقت زیب بیگم کی نظریں مہر کی کلائی سے ٹکرائی تھیں اور ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"یہ، یہ کیا ہوا ہے؟" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے بغور اس کی کلائی پر موجود انگلیوں کے نشان کو دیکھا تھا۔ کسی انہونی کے احساس نے ان کے اندر بہت شدت سے خطرے کی گھنٹی بجانی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کی دوسری کلائی پکڑی تھی اور وہاں بھی ویسا ہی نشان دیکھ کے ان کی وحشت کے مارے پھیلی آنکھیں مہر کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔ جس کی آنکھوں سے ایک بار پھر سیل رواں جاری ہو گیا تھا۔

"امی امی! کل رات حنان میرے کمرے میں..." ان کی گود میں منہ چھپائے مہر فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی اور

زیب بیگم نے تڑپ کر اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔ انہیں "قاضی ولا" کے در و دیوار دھڑ دھڑاتے ہوئے خود پہ گرتے محسوس ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

صبح کاذب کا وقت تھا۔ جب فون کی متواتر بیل سے انجم کی آنکھ کھلی تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سیل اٹھایا تھا۔ اور اسکرین پہ اس وقت زیب کا نمبر دیکھ کے وہ بے اختیار گھبرا گئی تھیں۔ سرعت سے فون کان سے لگائے وہ اٹھ بیٹھی تھیں۔

"ہیلو زیب! خیر تو ہے؟" انہوں نے چھوٹتے ہی ان کی خیریت دریافت کی تھی۔

"آپا! اگر آپ میرا مرا ہوا منہ نہیں دیکھنا چاہتیں تو آ کر اپنی امانت لے جائیں۔" دوسری طرف سے زیب کی بھاری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو انجم پریشان ہو گئیں۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" لیکن زیب کی اچانک بلند ہونے والی سسکیوں نے ان کا دل بند کر دیا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر ایک نظر سوئے ہوئے ابراہیم صاحب پر ڈالی تھی۔ اور اٹھ کر تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔

"زیبی! کچھ تو بولو؟ آخر ہوا کیا ہے؟" اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے ان کا حوصلہ جواب دینے کو تھا۔

"آپا' آپا حنان نے مہر کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی ہے۔" اور انجم کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھٹنے کو آ گئی تھیں۔

"کیا؟" انہوں نے اپنے کانپتے وجود کو سنبھالنے کے لیے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔

"ہاں آپا۔" زیب نے بے اختیار سسکی لی تھی۔ اور پھر یونہی روتے ہوئے وہ مہر کی زبانی سنی گئی ساری تفصیل ان کے گوش گزار کرنے لگی تھیں۔ جسے سنتے ہوئے انجم اپنا سر تھامے وہیں راہداری میں بیٹھ گئی تھیں۔

"آپا! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے۔ اگر آپ کو میری اور میری بچی کی ذرا سی بھی پرواہ ہے تو جتنی جلدی ہو سکے یہاں آ کر مہر کو لے جائیں۔ چاہے تموز مانے یا نہ مانے۔ وہ آپ کے ساتھ آئے یا نہ آئے۔ آپ بس مہر کو یہاں سے لے جائیں۔ پلیز آپا میری بچی کو یہاں سے لے جائیں۔" بات کرتے کرتے وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو انجم کے اپنے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنی مصیبت کی ماری، بہن پہ تموز کی حقیقت کا پہاڑ کیسے توڑتیں بھلا؟

"تم نے صغیر کو یہ بات بتائی؟" انہوں نے لرزتے لہجے میں سوال کیا تو زیب کی آواز میں سراسیمگی پھیل گئی۔

"نہیں آپا! میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی آپ بھائی جان سے اس بھیانک واقعہ کا ذکر کیجیے گا۔۔۔ یہ تو وہ طوفان ہے کہ اگر اٹھ کھڑا ہوا تو پھر کسی چیز' کسی رشتے کو نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ حنان نے تو باپ کے سامنے ہر حال میں مکر جانا ہے اور میری بچی ہو کر بھی ہر سُو رسوا ہو جائے گی۔ صغیر کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ لیکن اتنا بڑا الزام اپنے بیٹے پہ کسی طور برداشت نہیں کریں گے۔ وہ تو مہر کی دوبارہ بھی شکل نہیں دیکھیں گے۔ پھر عائشہ' نویرہ' حنان ان کا بھائی ہے۔ میرا تو پورا گھرانہ بکھر جائے گا آپا!" اور انجم کا دل بہن کی بات سن کر کانپ اٹھا تھا۔

"صحیح کہہ رہی ہو۔ بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔" انہوں نے خوفزدہ ہو کر آنسو پونچھے تھے۔ "میں کچھ کرتی ہوں۔ تم پریشان مت ہونا اور مہر کو ایک لمحے کے لیے بھی اکیلے مت چھوڑنا۔ سنا تم نے؟"

"میں ہر لمحہ اس کے ساتھ ہوں آپا۔" زیب کی یقین دہانی پر انہوں نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی تھی۔

"میں ابراہیم سے صبح بات کرتی ہوں۔ تم میرے فون کا انتظار کرنا۔"

"آپا! جو بھی کیجیے گا۔ بس جلدی کیجیے گا۔" زیب کی آواز پھر بھیگنے لگی تھی۔

"تم تم فکر مت کرو۔" اور زیب نے رابطہ منقطع

کر دیا تھا۔
انجم نے ہاتھ میں پکڑے فون کو بے جان نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک طرف ڈال دیا تھا اور نڈھال سے انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ اس مسئلے کو کیسے حل کریں؟ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☼ ☼ ☼

زیب حاجت کے نفل پڑھ کر اٹھیں تو اپنے پیچھے حنان کو کھڑا دیکھ کے بے اختیار چونک گئیں۔ اس کی صورت ان کے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی مگر انہوں نے کمال حوصلے سے خود پہ قابو پاتے ہوئے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔
"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" ان کے چہرے پہ نگاہ جمائے حنان ایک پل کے لیے رکا تھا۔
"میں مہر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ان کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے پرسکون اور دو ٹوک الفاظ میں بولا تو زیب اس کی دیدہ دلیری پہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔
"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" ان کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا تھا۔
"کیوں آپ کو اس کی شادی نہیں کرنی کیا؟" ان کی ناگواری کی پروا کیے بنا وہ اسی سکون سے بولا تو زیب کو اپنا ضبط چھوٹتا محسوس ہوا۔
"مجھے اس کی شادی کرنی ہے یا نہیں۔ لیکن تمہارا میری بیٹی سے کوئی رشتہ نہیں جڑ سکتا۔" وہ انگلی اٹھائے غصے سے بولیں تو حنان کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔
"کیوں؟"
"کیا تم وہ سب کچھ بھول گئے ہو جو آج تک اس کے ساتھ کرتے رہے ہو؟ اور آج تم میرے سامنے کھڑے ہو گئے ہو اس سے شادی کا ارادہ لے کے۔ کیا سوچ کر تم نے مجھ سے یہ بات کی ہے۔ ہاں....؟" زیب کا غصہ سے برا حال تھا۔
"سیدھی سی بات ہے۔ اچھی لگنے لگی ہے وہ مجھے۔" ان کی اتنی کھری کھری کے باوجود وہ بے نیازی سے کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا تو زیب کو اس کی اس درجہ ڈھٹائی اور جرات گنگ کر گئی۔
"تمہیں احساس بھی ہے کہ تم کس سے اور کیا بات کر رہے ہو؟" اس کی طرف دیکھتی وہ بے یقین لہجے میں بولی تھیں۔
"لڑکی کی ماں سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا؟" وہ دوبدو بولا۔
"ٹھیک ہے۔ لڑکی کی ماں ہوں نا میں تو مجھے تمہارا رشتہ قبول نہیں حنان قاضی۔" اس کی طرف دیکھتی وہ سرد لہجے میں بولیں تو حنان کی آنکھوں میں غصہ پھیل گیا۔
"تو آپ مجھ سے پرانے بدلے نکالیں گی؟"
"میں تمہیں اس لائق بھی نہیں سمجھتی حنان!" زیب نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ان کی یہ کاری ضرب حنان کے پورے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئی۔
"بہت بڑی بات کہہ گئی ہیں آپ۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا مسز صغیر۔ میں اپنی ضد کا بہت پکا ہوں۔ جب وہ مجھے بری لگتی تھی تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے وجود کو مجھ سے نہیں منوا سکتی تھی۔ آپ تو خود بھی اس تجربے سے گزری ہیں نا ساری عمر۔" وہ یک لخت کاٹ دار انداز میں مسکرایا تو زیب بیگم کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "اور اب جبکہ وہ حیرت انگیز طور پہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ تو یقین مانیں دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے دور نہیں کر سکتی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے مسز صغیر اس لڑکی کو میری ضد مت بنائیں۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حنان نے سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔ زیب کے لبوں پہ عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"دنیا کی کوئی طاقت نہ سہی، لیکن اوپر والے کی طاقت تو تمہیں روک ہی سکتی ہے نا۔ مہر تمہارا نصیب نہیں بن سکتی۔"
"آپ مجھے چیلنج کر رہی ہیں؟" ان کی مسکراہٹ، ان کا پرسکون انداز حنان کو کھولا گیا تھا۔

"نہیں! سمجھا رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر۔ آپ بھی ایک بات سمجھ لیں۔ مہر اگر میرا نصیب نہیں بن سکتی، تو پھر، کبھی کسی اور کا نصیب بھی نہیں بنے گی۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا یک لخت ٹھہرے ہوئے لیکن سرد لہجے میں کہتا، وہ باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور پیچھے کھڑی زیب کی آنکھوں میں پہلی بار اپنے ہاتھوں کے پالے اس لڑکے کے لیے نفرت پھیل گئی تھی۔ انہوں نے مہر سے اس گفتگو کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اسے مزید خوف زدہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆
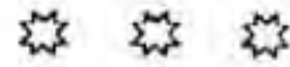
ناشتے کی میز پہ انجم کتنی ہی دیر سے یونہی چپ چپ سی بیٹھی تھیں۔ انہیں یوں خاموشی سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا دیکھ کر ابراہیم صاحب نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے ہم ناشتہ کیوں نہیں کر رہیں؟"

"آپ کو پتا ہے ابراہیم۔ آج صبح ساڑھے چار بجے کے قریب زیب کا فون آیا تھا۔" انہوں نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر تو تھی؟" ابراہیم صاحب کے چہرے پہ پریشانی پھیل گئی۔

"اس نے مجھ سے فوری طور پہ مہر کی رخصتی کے لیے کہا ہے۔" انجم نے دھیرے سے بتایا تو ابراہیم ملک حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"اس نے ساڑھے چار بجے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا؟"

"جی۔ وہ بہت زیادہ رو بھی رہی تھی۔ شاید اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔" انجم نے ڈھکے چھپے لہجے میں بتایا۔

"تم نے پوچھا نہیں اس سے کیا ہوا ہے؟" ابراہیم صاحب نے پریشانی سے سوال کیا۔

"بہت پوچھا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ صغیر سے بھی اس معاملے میں کوئی بھی بات کرنے سے اس نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"پھر اب؟" اور انجم، ابراہیم صاحب کا اشارہ سمجھ کے ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں ابراہیم! کہ اب ہم کیا کریں گے؟"

"تمہیں زیب کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے انجم۔ ہم مہر کی زندگی تباہ نہیں کر سکتے۔" ابراہیم ملک دو ٹوک لہجے میں بولے تو انجم کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ اپنی بہن سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ اسے صاف صاف بتا دوں گی کہ ہنی ہماری مہر کے لائق نہیں۔ وہ مہر کا یہ بے معنی رشتہ توڑ کر اس کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ لے۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا ابراہیم۔ وہ بہت پریشان ہے۔ وہ تو یہ تک کہہ رہی تھی کہ چاہے ہنی آئے یا نہ آئے۔ مانے یا نہ مانے۔ ہم خود آ کر مہر کو وہاں سے لے جائیں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے انجم؟ ہم یہ سب کیسے کر سکتے ہیں بھلا؟" ان کی بات سن کے ابراہیم صاحب تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تب ہی ملازمہ معذرت کے ساتھ اندر چلی آئی تھی۔

"سر ایسیم سر آئے ہیں۔" اور ابراہیم ملک کی آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔

"اس کی اتنی جرات!" وہ آندھی طوفان کی طرح اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھے تھے اور انجم ہراساں سی ان کے پیچھے لپکی تھیں۔ ان کی منتوں کے باوجود ابراہیم صاحب نے لاؤنج میں کھڑے سیم کو جا کر اس کے گریبان سے جکڑ لیا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی؟" کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے انہوں نے اسے زوردار جھٹکا دیا تھا اور انجم نے دہل کر اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں بابا!" ان کے چہرے کو تکتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا تو ابراہیم ملک کا غصہ دوچند ہو گیا۔

"معاف؟ اور وہ بھی ایک زانی کو؟ نو نیور۔" انہوں نے اسے دور دھکیلا تو سیم پیچھے گرتے گرتے بچا۔ "اور تمہیں یہ معافی یاد آئی کیسے؟ اکاؤنٹ بند ہو گیا اس لیے؟"

انہوں نے استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس انکشاف نے دروازے میں کھڑی انجم کو حیران کر دیا۔ وہ اتنا بڑا قدم اٹھا چکے تھے اور انہیں بتایا تک نہ تھا۔

"آپ نے میرا اکاؤنٹ بند کروا دیا ہے؟" سیم نے انجان بننے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

"یہ ڈرامہ کسی اور کے سامنے جا کر رچاؤ۔" ابراہیم ملک نے کان پہ سے مکھی اڑائی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں بابا! مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔" اس کی دہائی پہ ابراہیم صاحب کی تیز نظریں اس کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔

"تو ٹھیک ہے اب جان لو۔ میں تمہیں اپنی ساری دولت اور جائیداد سے عاق کرنے والا ہوں اور اسی لیے میں نے تمہارا اکاؤنٹ بند کروا دیا ہے۔" اور سیم کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔ مگر اس نے اپنے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں آنے دی تھی۔

"وہ آپ کی ملکیت' آپ کی چیز ہے۔ آپ جو چاہیں' وہ فیصلہ لیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر پلیز' پلیز ایک بار مجھے معاف کر دیں بابا! میں اتنی راتوں سے سو نہیں سکا ہوں!"

ان کی طرف دیکھا وہ دھیرے سے آگے بڑھا تھا اور انجم نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو لبوں پر تیزی سے دوپٹہ رکھ لیا تھا۔ یہ ان کی اکلوتی اولاد انہیں کس دوراہے پر لے آئی تھی؟

"میں اپنے مجرم کو تو معاف کر سکتا ہوں۔ مگر اپنے اللہ کے مجرم کو معاف کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ سیم۔" بات کرتے کرتے ابراہیم صاحب اس کی طرف سے رخ موڑ گئے تھے۔ سیم تیزی سے ان کے قدموں میں آگرا۔

"پلیز بابا! یوں مت کہیں۔ میں آپ لوگوں کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں سیم نہیں آپ کا تموز ہوں۔ مجھے معاف کر دیں بابا۔ میں ... میں پھر دوبارہ یہ حرکت کبھی نہیں کروں گا۔" ان کی ٹانگوں سے لپٹے اس کی اداکاری عروج پہ تھی اور انجم کے آنسو تھے کہ رکنے میں نہیں آرہے تھے۔ وہ بے تابی سے شوہر کی جانب بڑھی تھیں۔

"پلیز ابراہیم! معاف کر دیں نا۔" ان کے بازو پہ ہاتھ رکھے وہ لجاجت سے گویا ہوئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے ایک نظر ان کی برستی آنکھوں کو دیکھا تھا اور نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"ایک شرط پہ۔" وہ بے تاثر آواز میں بولے تو سیم کو لگا جیسے اس کی مشکل آسان ہو گئی ہو۔ وہ خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے آپ کی ہر شرط قبول ہے بابا۔" زیادہ سے زیادہ وہ سوزی کو چھوڑنے کی بات کرنے والے تھے۔ اور یہ تو وہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

"ہم تینوں اگلی کسی بھی فلائٹ سے پاکستان جا رہے ہیں۔" اس کی طرف رخ موڑتے ہوئے انہوں نے قطعی لہجے میں سیم کے سامنے وہ شرط رکھی تھی جس کے بارے میں اس نے گمان بھی نہ کیا تھا۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ کسی اگر مگر کی گنجائش بچی ہی نہ تھی اس کے پاس۔

"ٹھیک ہے۔" ہتھیار ڈالنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا اور ساکت کھڑی انجم کو لگا تھا جیسے کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہو۔ جس نے لمحوں میں ان کی ہر اذیت' ہر پریشانی کا مداوا کر دیا تھا۔ ان کا بیٹا' ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک گمراہی کے راستے سے لوٹ آیا تھا۔ وہ اپنی بہن اور بھابی کے سامنے رسوائی اور جگ ہنسائی سے بچ گئی تھیں' انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

"انجم ..." سیم کے اپنے کمرے میں جاتے ہی ابراہیم ملک نے بیگم کو پکارا تھا۔

"ہم جب تک پاکستان نہیں پہنچ جاتے تم تموز

سے رخصتی یا میرے یہاں سے کاروبار سمیٹنے کا ذکر بالکل مت کرنا۔" اور انجم نے انہیں دیکھتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا تھا۔ تموز اگر ان کا بیٹا تھا تو وہ اس کے باپ تھے۔ اسے راہ راست پہ کیسے لانا تھا' وہ اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔

حنان والے واقعے کو گزرے محض تین دن ہی ہوئے تھے۔ جب انجم نے فون کرکے زیب کو اپنی آمد کی خوش خبری سنادی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ ہنی کی آمد کا سن کے زیب بے اختیار سجدۂ شکر میں گر گئی تھیں۔ ان دو سوا دو سالوں میں ہنی کی ذات سے پیدا ہونے والا ہر خدشہ' ہر گلہ خود بہ خود دور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ان کی بیٹی کو عزت کے ساتھ رخصت کروانے کے لیے آرہا تھا۔ انہیں اور کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔

انہوں نے یہ خوش خبری مہر کو سناتے ہوئے فی الوقت رخصتی کی بات کو خود تک محدود رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ اس چھپے ہوئے نکاح کو آخری وقت حنان کے علم میں نہیں لانا چاہتی تھیں۔

☼ ☼ ☼
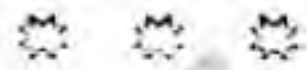
نجانے کتنی بے خواب اور سہمی ہوئی راتوں کے بعد مہر کو آج سکون کی نیند نصیب ہوئی تھی۔ ورنہ جاشی کے برابر میں ہوتے ہوئے بھی وہ ساری ساری رات ڈر کے مارے جاگتی رہتی تھی۔ ان تین دنوں میں اس کی ماں نے اس کے گرد یوں حصار باندھا تھا کہ حنان کی صورت بھی اسے دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔ بخار ٹوٹ جانے کے بعد بھی وہ جاشی کے کمرے کی چار دیواری سے نکلنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا اپنا کمرہ اس دن سے خالی پڑا تھا۔ مہر کو وہاں جانے کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ لیکن اب جب سے اس نے ہنی کی آمد کا سنا تھا۔ اس کے وجود پہ چھایا جمود ٹوٹ سا گیا تھا۔ رات شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد اس نے اتنے دنوں میں پہلی بار رغبت سے کھانا کھایا تھا اور پھر اس کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ مگر خلاف معمول نہ وہ ڈری تھی اور نہ خالی الذہنی کے عالم میں در و دیوار کو تکتی ہولتی رہی تھی۔ بلکہ وہ چند ہی لمحوں میں بڑی گہری اور پرسکون نیند سو گئی تھی۔ نتیجتاً" اس کی آنکھ اپنے پرانے معمول کے مطابق فجر کے وقت کھل گئی تھی۔ اس نے بڑی دل جمی سے اٹھ کر نماز فجر ادا کی تھی۔

نماز پڑھ کے اس کے دل کو بے حد سکون ملا تھا اور اسی سکون بھری کیفیت میں اس کا دل اوس میں بھیگی نرم گھاس پہ چہل قدمی کے لیے مچل اٹھا تھا۔ وہ بلا ارادہ ہی اٹھی تھی اور دروازہ کھول کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

باہر ہر سو مکمل خاموشی تھی۔ زیب بیگم کے کمرے کی لائٹ بھی بند ہو چکی تھی۔ شاید وہ نماز پڑھ کے دوبارہ لیٹ گئی تھیں۔ رہا حنان تو وہ تو اس وقت اٹھنے کا عادی ہی نہیں تھا۔ سو مہر اطمینان سے قدم اٹھاتی نیچے چلی آئی تھی اور داخلی دروازہ کھول کے باہر لان میں نکل آئی تھی۔

وہ پاؤں میں پہنی چپل اتار کے نرم ٹھنڈی گھاس پہ ٹہلنے لگی تھی اور اسی وقت حنان اپنے کمرے میں کھڑکی کے پردے برابر کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تھا۔

رات ہنی کی آمد کا سن کے وہ اتنا بدمزہ ہوا تھا کہ کھانا چھوڑ کر اپنے دوستوں کی طرف نکل گیا تھا اور پھر وہیں ان کے درمیان ساری رات گزار کے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر لوٹا تھا۔ وہ سونے کے ارادے سے کھڑکی کے پردے برابر کرنے کو آگے آیا تھا۔ اور تبھی اس کی نظر لان میں ٹہلتی مہر پہ پڑی تھی۔ اس کی اتنے دنوں کی فرسٹریشن عود کر آئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے پردہ چھوڑ کر پلٹا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا تھا۔

"اچھا وقت ہے اپنی پناہ گاہ سے نکلنے کا۔" اور اپنے دھیان میں ٹہلتی مہر کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی روح قبض کر لی ہو۔ وہ اتنی وحشت زدہ ہوئی تھی کہ اس میں

پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔
"تم نے سوچا ہوگا کہ حنان تو سو رہا ہوگا مگر.... بیچ بیچ
۔ ادھر مہر صاحبہ نے قدم باہر نکالا اور ادھر...." وہ
قصداً" بات ادھوری چھوڑ کے ہنسا۔ مہر نے بھاگ کر
وہاں سے اندر جانے کی کوشش میں جونہی قدم
بڑھائے ' حنان نے تیزی سے آگے بڑھ کے اس کا
راستہ روک لیا۔
"اوں ہوں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" مہر کے فق
ہوتے چہرے پہ نگاہ جمائے وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔
"پتا ہے تمہارے اس خوب صورت چہرے پہ
کبھی یہ خوف دیکھنے کی میں نے بڑی تمنا کی تھی۔ مگر
آج جب یہ پھیلا ہے تو یقین مانو ذرا اچھا نہیں لگ رہا۔
جانتی ہو کیوں؟" وہ ایک قدم آگے آیا تو مہر کتنے ہی قدم
پیچھے ہٹ گئی۔
"کیونکہ تمہارے معاملے میں یہ دل اچانک ہی
میرے مقابل ڈٹ گیا ہے۔ محبت ہو گئی ہے مجھے تم
سے مہر احمد!" اس پر نظریں جمائے وہ گمبھیر لہجے میں
بولا۔ مہر کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھیل سی
گئیں۔
"یقین نہیں آرہا نا۔ کوئی بات نہیں.... اپنی ماں
سے جاکے پوچھو۔ ہاتھ مانگا ہے میں نے تمہارا۔" اور
مہر کو لگا تھا جیسے اس کے اعصاب پہ کوئی بم آگرا ہو۔
"تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" اتنی دیر میں پہلی بار
اس کے ہونٹوں نے جنبش کی تھی۔
"یہی سوال اس دن تمہاری ماں نے بھی پوچھا تھا۔
خاصا تفصیل سے جواب دیا تھا میں نے انہیں
'تمہارے لیے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ اس روز کے بعد
سے بھا گئی ہو تم مجھے 'اور جو چیز حنان قاضی کو بھا جائے
وہ بھلا کہیں اور کیسے جا سکتی ہے؟" اس کی طرف دیکھتا
وہ دھیرے سے مسکرایا تو مہر کی آنکھوں میں پھیلی بے
یقینی نفرت میں ڈوب گئی۔
"میں کوئی چیز نہیں ہوں حنان قاضی! جو تم جیسا
گندہ آدمی مجھے اٹھا کر اپنے کمرے میں سجالے گا۔ میں
تم سے نفرت کرتی ہوں شدید نفرت! اپنے اندر کی
ہوس کو محبت کا نام دے رہے ہو۔ تمہیں تو ڈوب کر مر
جانا چاہیے۔"
"تمہیں پتا ہے مہر احمد۔ تمہارا یہ گریز' یہ نفرت۔
میری ضدی طبیعت کو اور بھی تمہاری جانب مائل کر
رہا ہے۔ اب تو اگر تم سے محبت نہیں بھی ہے۔ تب
بھی شادی تو تم سے ہی کرنی ہے مجھے۔" وہ عجیب
سے سرد اور قطعی لہجے میں گویا ہوا تھا۔
اس کے انداز نے بے اختیار مہر کو اس بات کا
احساس دلایا تھا کہ کیوں زیب اس کے نکاح کی خبر کو
آخری وقت تک حنان سے چھپانا چاہتی تھیں۔ وہ اتنی
کمینگی پہ اترا ہوا تھا کہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔
"بھول ہے تمہاری۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" مہر
دوبدو بولی تھی۔
"آج تو بہت ہمت آگئی ہے۔ کس کا زعم ہے جان
حنان! کہیں ڈیئر ہنی کا تو نہیں؟" اس کی آنکھوں میں
دیکھتا وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو مہر بے اختیار
خاموش ہو گئی۔ اس کا سہا ہوا دل اندر ہی اندر مزید سہم
گیا۔
"ایک بات یاد رکھنا مہر۔ اس بار اگر تم مجھے اس
شخص کے ارد گرد نظر آئیں۔ تو میں تمہارا تو نہیں'
البتہ اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دوں گا!" انگلی اٹھائے وہ
اچانک تنبیہی انداز میں بولا تو مہر کی سانس ایک پل کو
رک سی گئی۔
"تم مجھے پابند نہیں کر سکتے۔" اپنے گرتے حوصلے کو
سنبھالے اس نے ہمت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
"پابند تو تمہارا باپ بھی ہوگا۔ یقین نہ آئے تو آزما
کر دیکھ لینا۔" اور مہر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتی
' دوسری طرف سے نکل کے تیز قدموں سے اندر کی
جانب بڑھ گئی تھی۔ صد شکر تھا کہ اس نے مہر کو جانے
دیا تھا۔
کمرے کی محفوظ چار دیواری میں پہنچ کر اس نے
اپنے پیچھے دروازہ مضبوطی سے بند کیا تھا اور اپنے
لرزتے وجود کو سنبھالے وہیں کارپٹ پہ بیٹھ گئی تھی۔
"کہاں ہیں آپ ہنی! پلیز جلدی گھر آجائیں۔" گھٹنے

پہ پیشانی ٹکائے وہ بے آواز سسک اٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے چار' پانچ دن بڑی تیزی سے گزرے تھے اور ثموز ابراہیم پورے سوا دو سال بعد ایک بار پھر وہیں آ پہنچا تھا۔ جہاں کے نام سے بھی اسے چڑ تھی۔ یہاں تک آنے کے لیے اس نے سوزی کو کیسے قائل کیا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ مگر اس کا اپنا دل' اپنے باپ کی طرف سے بری طرح کھٹک گیا تھا۔ ان کا یوں اسے پاکستان لانا ہرگز بے مقصد نہ تھا۔

زیب کے گھر میں اس کا پہلے کی طرح بھرپور استقبال ہوا تھا۔ وہ اس سے اتنی ہی بھرپور محبت سے پیش آئی تھیں۔ جس طرح ہمیشہ آتی رہی تھیں۔ رہی مہر تو اس کی نظریں پہلے بھی اس کے سامنے جھکی رہتی تھیں اور اب بھی جھکی ہوئی ہی تھیں۔ مگر اس کا چہرہ اس کی اندرونی خوشی کی عکاسی' آئینہ بن کے کر رہا تھا۔ وہ اس تمام عرصے میں پہلے سے بڑھ کر پیاری ہو گئی تھی۔ اتنی جاذب نظر کہ ایک پل کو تو سیم بھی ٹھٹک کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز نے مہر کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا برپا کر دیا تھا۔ ہنی کی ذات سے جڑے اس کے سارے شکوے' ساری منفی سوچیں اپنے آپ مٹ گئی تھیں اور اس کی ذات پہ ان دو سالوں سے چھائے یاسیت کے بادل چھٹ کر کہیں دور چلے گئے تھے۔ وہ انجم کے بازو کے گھیرے میں کتنی ہی دیر شاداں اور پرسکون بیٹھی مسکراتی رہی تھی۔

کھانے کے بعد جس وقت کافی کا دور چلا تھا۔ تب حنان نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی انجم کی بھنویں تن گئی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھری محفل میں اس کے چہرے پر سے شرافت کا یہ نقاب نوچ لیں۔ اس کے بددلی سے کیے گئے سلام کا جواب انہوں نے اس سے بڑھ کر سرد مہری سے دیا تھا۔ جبکہ ثمرینہ سے اس نے اس تکلف کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ اسے مکمل طور پہ نظرانداز کیے اس کے عین مقابل ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی یہ بدتمیزی ثمرینہ کا خون کھولا گئی تھی۔ دونوں کی نگاہیں پل بھر کو ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں۔ اور دونوں پہ ہی ان کی ناگواری اور بے زاری واضح ہو گئی تھی۔

"اچھا تو زیب اور صغیر' میرے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے۔ جب ہمیں اپنے بچوں کے رشتے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دینا چاہیے۔"

ابراہیم ملک کی آواز پر ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ہٹ کر ان کی طرف اٹھی تھیں۔ مگر ان کی بات کے اختتام تک دونوں کے ہی رنگ بدل گئے تھے۔ ثمرینہ کی رنگت فق۔ جبکہ حنان کے چہرے پہ نا سمجھی بھری الجھن آٹھہری تھی۔

"میں اس جمعے کو مہر کی رخصتی چاہتا ہوں۔" اور حنان کو لگا تھا جیسے گھر کی چھت اس کے سر پہ آ گری ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے طے ہوتی ضروری باتوں کو سن رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں کمرہ مبارک سلامت کی خوشیوں بھری پکار سے بھر گیا تھا۔ مہر احمد بچپن سے ثموز ابراہیم کے نکاح میں تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ نویرہ' جانشہ کی بے یقینی بھی عروج پہ تھی۔ سب بے تحاشا خوش تھے۔ سوائے ان دونوں لڑکوں کے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہو کے بھی اس پل ایک ہی صدمے سے دوچار تھے۔ اچانک ملنے والی ہار کا صدمہ۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ایک مہر احمد کو کھو کر ہارا تھا۔ اور دوسرا اسے پا کر ہارا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" اپنے کمرے میں تنہائی ملتے ہی ثموز ماں باپ پہ پھٹ پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اپنے ہی لالچ کے ہاتھوں بندھے تھے۔ وہ اس لمحے مکمل طور پر بے بس تھا۔

"کیوں تمہاری شادی نہیں کرنی ہمیں؟" اس کے برعکس ابراہیم ملک بالکل پرسکون تھے۔

"آپ لوگ جانتے ہیں۔ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پہلی بار اپنی اس آنکھ مچولی کو زبان دی تھی۔

"ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ تم نے آج سے پہلے تو یہ بات کبھی ہم سے نہیں کہی۔" ابراہیم صاحب کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"انجان مت بنیں بابا! آپ دونوں جانتے ہیں کہ میں نے کبھی مہر میں کوئی انٹرسٹ شو نہیں کیا۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ تمہارا انٹرسٹ تو اور بہت سی چیزوں میں رہا ہے۔" پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے چوٹ کی تو تیمور کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"مگر کیا ہے تیمور صاحب! آپ کو اپنی فیملی میں دوبارہ قبول کرنے کے لیے میری یہی شرط ہے۔" وہ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے انتہائی پرسکون لہجے میں گویا ہوئے تھے۔ ان کا بے لچک انداز تیمور کے اندر بے یقینی بھر گیا تھا۔

"آپ' آپ اس تھرڈ کلاس لڑکی کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں؟"

"وہ تھرڈ کلاس ہے یا فرسٹ کلاس۔ ہماری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ ابھی جاؤ۔ ٹکٹ کٹاؤ اور امریکہ پہنچ جاؤ۔ ہم میں سے تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔" وہ رسان سے کہتے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو تیمور کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ نکلیں

"یہ زور زبردستی ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں دے پائے گی بابا!" وہ باپ کی طرف دیکھتا سرد لہجے میں بولا تو خاموش تماشائی بنی بیٹھی انجم کا دل ڈوب سا گیا۔ واقعی اگر وہ زبردستی ہنی اور مہر کو اس رشتے میں باندھ بھی دیتے' تب بھی وہ ہنی کو اسے بہ خوبی نبھانے پہ مجبور تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اگر دوسری طرف وہ ابراہیم ملک کو اس زبردستی سے روک دیتیں۔ تو اپنی بہن کو کیا جواب دیتیں۔ وہ مہر کو حنان نامی عفریت سے کیسے بچاتیں؟

"میری یہی شرط ہے تیمور۔" اس کے چہرے پہ نگاہ جمائے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات دہرائی تو تیمور کی مٹھیاں مارے اشتعال کے سختی سے بھینچ گئیں۔ وہ چند لمحے انہیں سلگتی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔

اس کے تیور ابراہیم صاحب کو رتی برابر متاثر نہ کر پائے تھے۔ لیکن انجم بیگم کے لیے اس پریشانی سے نکلنا ناممکن تھا۔ وہ بے بسی سے اپنا سر تھام کے بیٹھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

مہر' جاشی کی فرمائش پہ اپنا اور اس کا چائے کا مگ ٹرے میں رکھے چھت پہ آئی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر جاشی کے ساتھ کھڑے تیمور سے ٹکرائی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"لیجیے آگئیں آپ کی منکوحہ صاحبہ!" ایک نظر مہر پہ ڈالتی وہ تیمور کی طرف دیکھ کے شرارت سے مسکرائی تھی۔ "اب آپ دونوں جتنی چاہیں باتیں کریں۔ میں چلتی ہوں۔" وہ پلٹ کر مہر کو دیکھتی معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ اور چھپاک سے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔

اس کے یوں دغا دے جانے پر' مہر نے پلٹ کر سامنے دیکھا تھا اور تیمور کو اپنی جانب پوری طرح متوجہ پا کے اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ نگاہیں چرائے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"چائے۔" اس نے ٹرے آگے بڑھائی تو تیمور نے خاموشی سے مگ تھام لیا تھا۔ اس کی نظریں مہر سے ہٹ کر دور تک پھیلی روشنیوں پہ جا ٹھہری تھیں۔ وہ اپنا مگ لیے اس سے قدرے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

"مہر!" اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کی پوری جان اس ایک لفظ میں سمٹ آئی ہو۔ تیمور کے منہ سے اپنا نام' اسے کچھ ایسا ہی معتبر کر گیا تھا۔

"تم یہ روشنیاں دیکھ رہی ہو۔" اس نے مہر کی

طرف دیکھے بنا انگلی سے اشارہ کیا تو مہر بے اختیار اپنے سامنے پھیلی ان روشنیوں کو دیکھنے لگی۔

"جی۔"

"کیسی لگ رہی ہیں یہ؟" اس نے رسان سے سوال کیا تو مہر ایک پل کو الجھ سی گئی۔

"اچھی لگ رہی ہیں۔" اس نے گردن موڑ کر ایک نظر ثموز پہ ڈالی جواب بھی نظریں سامنے جمائے ہوئے تھا۔

"اب اگر تمہیں کہا جائے کہ انہیں چھوڑ کر ایک اندھیری بند گلی میں جا کھڑی ہو تو؟" اس نے اچانک رخ موڑتے ہوئے مہر کی آنکھوں میں جھانکا تو حیرت زدہ سی مہر خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"تمہارا ساتھ میرے لیے ایک ایسی ہی اندھیری گلی ہے مہر۔ جس میں 'میں خود کو ساری عمر کے لیے بند نہیں کر سکتا۔" اس کے چہرے پہ نظریں جمائے وہ سکون سے بولا تھا۔ اور مہر کو لگا تھا جیسے کوئی سنسناتا ہوا تیر اس کے سینے میں اتر گیا ہو۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں کھڑی اسے دیکھنے لگی تھی۔

یہ 'یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"اتنے سالوں میں 'میں نے اپنے ماں باپ' تمہارے ماں باپ۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی اپنے ہر ہر عمل سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مجھے تم میں یا اس رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں مگر کوئی یہ بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔" اس نے کندھوں کو اچکاتے ہوئے ساکت کھڑی مہر کو دیکھا تھا۔ "اب تم ہی بتاؤ محبت کے بغیر کیا ہم اس شادی کو۔۔۔"

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں ہنی۔" اس پہ نگاہیں جمائے وہ بہت اچانک اور بہت دھیرے سے بولی تھی۔ اتنی اچانک کہ سامنے کھڑا ثموز اپنی بات مکمل کرنا بھول گیا تھا۔

"میں آپ کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" اور ثموز کو لگا تھا جیسے اس کی گردن میں پڑا پھندا کسی نے مزید کس دیا ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

"سوری ٹو سے مہر۔ لیکن یہ میرا ہیڈیک (درد سر) نہیں۔" بے چینی سے سامنے تکتے ہوئے وہ دھیمے لیکن سرد لہجے میں بولا تو مہر کے بے وزن وجود کو ایک دھچکا سا لگا۔

"ہیڈیک! تو کیا وہ ہیڈیک تھی؟" اس کی خالی نگاہیں ثموز کے چہرے پر آٹھہری تھیں۔ ثموز نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے بے اختیار اک گہری سانس لی۔

"دیکھو مہر! تم ایک پڑھی لکھی 'خوب صورت لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے تمہارے لیے اچھے لڑکوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔" وہ اس کی طرف پلٹا تو مہر کی بے جان آنکھیں اس کے بے تاثر چہرے کو ٹٹولنے لگیں۔۔۔ کہیں کوئی ملال 'کوئی رحم 'کوئی احساس۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"وہ اچھا لڑکا آپ کیوں نہیں ہو سکتے ہنی؟" اس نے دل گرفتی سے سوال کیا تو سیم جھنجلا سا گیا۔

"نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکا میں نہیں ہو سکتا مہر!" وہ چڑ کر غصے سے بولا۔ مہر اپنے سائیں سائیں کرتے وجود کے ساتھ خاموش ہو گئی۔

"پلیز مہر! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بابا اس رشتے کی وجہ سے ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ تم پلیز میرے ساتھ چل کر یہ کہہ دو کہ تمہیں بھی یہ رشتہ قبول نہیں۔ پلیز مہر!"

ملتجی انداز میں کہتے ہوئے اس نے مہر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کا لمس مہر کے اندر حشر برپا کرنے لگا تھا۔ کوئی اتنا ظالم 'اتنا شقی کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ مہر احمد کی جان اپنے ہاتھوں میں سمیٹے کھڑا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا کہ اپنی مٹھی کھول دے؟

"اور۔۔۔ اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟" مہر کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ جن کے عکس میں ثموز ابراہیم کے گال کا وہ دلفریب تل بھی ڈولنے لگا تھا۔

"تو یاد رکھنا تمہیں بھی میری ذات سے کبھی کوئی

خوشی نہیں ملے گی!" اس نے مہر کا ہاتھ جھٹکنے میں لمحہ نہیں لگایا تھا۔ بے اختیار مہر کی نظریں اپنے خالی ہاتھ پر آٹھہری تھیں۔ وہ اتنی بے وقعت نہ تھی۔ اس درجہ تحقیر کے بعد تو وہ اپنی محبت کا خود آگے بڑھ کر گلا گھونٹ دیتی مگر تموز ابراہیم کے گلے کا طوق کبھی نہ بنتی۔ مگر وہ اس ذلت کا کیا کرتی جو حنان قاضی اس کے ماتھے پہ سجانے کے لیے بے چین تھا۔

"ٹھیک ہے۔ نہ دیجئے گا کوئی خوشی۔" دھیرے سے بولتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں تموز کے چہرے پہ جما دی تھیں۔ جو اس کا فیصلہ سن کے ایک پل کے لیے ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ لیکن محض ایک پل کے لیے۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ مارے اشتعال کے تیزی سے سرخ ہو گیا تھا۔

"میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں مہر احمد! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو میں تمہاری ذات کو تماشا بنا کے رکھ دوں گا!" اس کے لہجے کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی نفرت اس بات کی گواہ تھی کہ وہ ایسا ہی کرنے والا تھا۔ مگر۔۔۔

"آپ کی راہ میں کھڑی رہوں یا راستے سے ہٹ جاؤں۔

دونوں صورتوں میں میرا ہی تماشا بننے والا ہے۔ سو کوئی بات نہیں۔" مہر زخم خوردہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بوجھل لہجے میں بولی تو تموز نے اسے گھورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا مگ پوری طاقت سے زمین پہ دے مارا۔ گرم چائے مہر کے پیروں کو جلاتی اس کے کپڑوں کو داغ دار کرتی چلی گئی تھی۔ وہ سہمی سی بے اختیار کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔ مگر تموز کی بے رحم گرفت نے اسے ایک ہی جھٹکے میں اس کے بے حد قریب کر دیا تھا۔

"تم دیکھنا مہر احمد! اب تمہارا میں کیا حشر کروں گا!" اس کی متوحش آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اس بے دردی سے مہر کا بازو جھٹکا تھا کہ وہ بے اختیار کراہ اٹھی تھی۔ مگر وہ اس پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا، کرچیوں کو اپنے جوتوں تلے روندتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی مہر کی ہمت، اس کا حوصلہ دونوں جواب دے گئے تھے۔ وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ سالوں کی محبت، برسوں کا انتظار سب ایک ہی جھٹکے میں خاک ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دنوں میں ابراہیم صاحب کی خواہش پر ان کی فیملی صغیر قاضی کے دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ وقت کی کمی کے باعث سبھی مل کر شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مہر پہ کیا گزری تھی اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے انکار کے بعد سیم کی گلو خلاصی کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن یا تو گھر سے باہر گزارتا یا پھر اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا۔ اس نے ماں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اسے کسی بھی معاملے میں شامل نہ کیا جائے۔ وہ مارک سے مسلسل رابطے میں تھا مگر سوزی کو اس نے اس ساری بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

دوسری طرف حنان کے لیے مہر کو کسی اور کا ہوتا دیکھنا ناممکن تھا۔ اس نے مہر کی صورت میں اپنی محبت نہیں بلکہ اپنی ضد ہاری تھی اور اس احساس نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس حد تک کہ وہ شادی سے تین دن پہلے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنے دوستوں کے ساتھ اسلام آباد نکل گیا تھا۔

اس کی اس حرکت نے صغیر صاحب کو شدید غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اس اہم موقعے پہ حنان کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے فون پر اسے بے نقط سنائی تھیں۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا تھا۔ اس نے نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا تھا۔ البتہ زیب اس کے جانے سے یک لخت ہر فکر، ہر غم سے آزاد ہو گئی تھیں۔ وہ بھرپور خوشی اور مکمل یکسوئی سے اپنی بچی کی رخصتی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

حنان کے جانے کے اگلے روز سب نے مل کر مہر کو مایوں بٹھا دیا تھا۔ اس کے آنسو، اس کی اداسی کو سب

ہی نے آنے والے وقت سے منسوب کرتے ہوئے نظرانداز کر دیا تھا۔ اور بالآخر وہ وقت بھی آ پہنچا تھا۔ جس کا سب ہی کو بے چینی سے انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

"ثموز تیار ہو گیا؟" ابراہیم صاحب نے ہینگر پر سے کوٹ اتارتے ہوئے ایک نظر گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ جو رات کے پونے سات بجا رہی تھی۔ مہمانوں کو آٹھ ساڑھے آٹھ کا ٹائم دیا گیا تھا۔ سارے خاندان والے ان کے ہاں جمع ہونے والے تھے۔ جس کے بعد سب نے سہرا بندی کی رسم ادا کر کے دولہا کے ہمراہ بارات کی صورت ہوٹل پہنچنا تھا۔ جہاں صغیر قاضی نے بہت بڑے فنکشن کا اہتمام کر رکھا تھا۔

"مجھے نہیں پتا آپ جا کے دیکھ لیں۔" انجم نے اپنا گلوبند پہنتے ہوئے مصروف سے انداز میں جواب دیا تھا۔ ابراہیم صاحب اپنا کوٹ پہن کر کمرے سے باہر نکلے تھے۔ ان کا رخ ثموز کے کمرے کی طرف تھا۔ لیکن جونہی وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئے بے اختیار چونک گئے تھے۔

ثموز بنا کسی تیاری کے 'راکنگ چیئر' پہ بیٹھا اسموکنگ میں مصروف تھا۔ بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کا حلیہ خاصا رف ہو رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے رخ موڑ کے ایک نظر آنے والے پر ڈالی تھی اور پھر بے نیازی سے اپنے شغل میں مصروف ہو گیا تھا۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئے؟" اس کی یہ بدتمیزی ابراہیم صاحب کو سلگانے کے لیے کافی تھی۔

"کس لیے؟" اس نے سیدھے ہونے کی زحمت کیے بغیر باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"ثموز!" ان کی پیشانی پہ بل نمودار ہو گئے تھے۔

"آج نہیں بابا! آج یہ رعب نہیں چلے گا آپ کا" وہ پرسکون انداز میں کہتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "آج آپ کو وہی کرنا پڑے گا جو میں چاہوں گا۔"

"اور تم کیا چاہتے ہو؟" ابراہیم ملک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"آج میں آپ کی لاڈلی کی بارات لے کر تب ہی جاؤں گا' جب آپ تین دن کے اندر اندر یہ دولت' جائیداد سب کچھ میرے نام کر دیں گے۔" ان پر نگاہ جمائے وہ بولا تو ابراہیم صاحب کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ! بڑی جلدی قلعی اتار دی بیٹا۔"

"اب تو اتر گئی بابا۔ اب کیا' کیا جا سکتا ہے۔" انہیں دیکھتے ہوئے اس نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی تھی۔ کمرے میں لحظہ بھر کو خاموشی چھا گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تین دن کے اندر اندر تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ رسان سے بولے تو ثموز ان کے یوں آسانی سے مان جانے پر متعجب سا ہو گیا۔

"اس کی گارنٹی کیا ہے؟" اس کی آنکھوں میں پھیلا شک ابراہیم ملک کے لبوں پہ زخم خوردہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"یہ ابراہیم ملک کی زبان ہے بیٹا! کسی دغاباز سیم کی نہیں۔" اور ثموز اس چوٹ پہ لب بھینچ گیا تھا۔

"اب تیاری پکڑو۔ مہمان پہنچنے والے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتے باہر نکل گئے تھے اور ثموز کی آنکھوں کے سامنے مہر کا چہرہ آ ٹھہرا تھا۔

"مہر احمد! تم بھی اب تیاری پکڑو۔ میں پہنچنے والا ہوں۔" وہ تصور میں مہر کو لا کر وہ زہرخند سا بڑبڑایا تھا۔

☼ ☼ ☼

بارات کا استقبال بڑی خوشیوں سے کیا گیا تھا۔ ثموز آف وائٹ شیروانی اور ہلکے سنہری صافے میں اتنا وجیہہ لگ رہا تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار مہر کی قسمت پہ رشک کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب بڑوں کی خواہش پر نکاح کی سنت کو ایک بار پھر ادا کیا گیا تھا اور ایجاب و قبول کے مرحلے کے بعد ہلکے سنہری

شرارے میں ملبوس مہر کو تموز کے پہلو میں لا بٹھایا گیا تھا۔ دونوں کی جوڑی نے صحیح معنوں میں اسٹیج پر سنہری روشنی بکھیر دی تھی۔ اس موقعے پہ اپنی مرحومہ والدہ کو یاد کر کے انجم اور زیب کی آنکھیں بے اختیار بھر آئی تھیں۔

بالآخر یہ خوب صورت تقریب بھی اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔ آنسوؤں' دعاؤں اور قرآن پاک کے سائے تلے مہر رخصت ہو کے ایک ایسی منزل کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ جہاں کوئی روپہلا خواب اس کے ہمراہ نہ تھا۔

رسموں کی ادائیگی کے بعد انجم 'مہر کو اس کمرے میں لے کر آئی تھیں' جو انہوں نے ڈیکوریٹر سے خاص طور پہ سیٹ کروایا تھا۔ وگرنہ جو کمرہ تموز کے زیر استعمال تھا۔ اسے تو اس نے کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہ دیا تھا۔ کمرے کی آرائش تازہ پھولوں' ربن اور موم بتیوں سے کی گئی تھی' جو سارے ماحول کو بے حد فسوں خیز بنا رہی تھی۔ اتنی محنت' اتنی خوب صورتی مہر کے دل کو مزید رنجیدہ کر گئی تھی۔

"مہو میری جان! تم اس گھر میں بہو نہیں بیٹی بن کر آئی ہو۔ آج سے ہم تمہارے ماں باپ پہلے ہیں اور ہنی کے بعد میں۔ تمہارے حق میں اگر اس سے ذرا سی بھی کوتاہی ہو تو تم بلا جھجک ہم سے کہہ سکتی ہو۔ خود کو یہاں کبھی اکیلا مت تصور کرنا میری جان!" آنے والے لمحوں کا خوف انجم کے دل میں گرہیں سی باندھ رہا تھا۔ انہوں نے بے اختیار مہر کو خود سے لپٹا لیا تھا۔

"پتا نہیں یہ لڑکا اس معصوم کے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہے؟" پریشانی سے سوچتے ہوئے انہوں نے مہر کے بہتے اشک صاف کیے تھے اور اندیشوں میں ڈوبی باہر نکل آئی تھیں۔ لیکن لاؤنج میں سیم کو جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ٹی وی کے آگے بیٹھا کر وہ اپنی جگہ پہ رک گئی تھیں۔

"تم نے چینج کیوں کر لیا ہنی؟" ان کی آواز پہ سیم نے اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ فارغ ہو گئیں؟" ان کی بات کا جواب دیے بنا اس نے بے تاثر لہجے میں سوال کیا تو انجم ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

"ہاں۔ لیکن تم..." انجم بیگم کی بات ابھی منہ میں تھی کہ وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے جاتا دیکھ کر وہ بے چین سی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔

"ہنی! بات سنو بیٹا۔" اور تموز کی بدلحاظی عود کر آئی تھی۔

"کیا بات ہے مام! کیوں پریشان کر رہی ہیں مجھے؟" وہ انتہائی بدتمیزی سے بولا تھا۔ مگر انجم اس کی اس بدتمیزی کو مکمل طور پہ نظر انداز کیے بے حد نرمی سے بولی تھیں۔

"دیکھو بیٹا۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں مہر کا کوئی قصور۔"

"بس!" اس کے اچانک ہاتھ اٹھا کر ٹوکنے پہ انجم ساکت رہ گئی تھیں۔ "آپ کا کام یہیں تک تھا مام! اب میں جانوں اور میری بیوی۔ گڈ نائٹ!"

سپاٹ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا وہ پلٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اور انجم اس کی پشت کو بے یقین نظروں سے دیکھتی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

انجم بیگم کے کمرے سے نکلنے پہ مہر نے اپنے آنسو صاف کیے تھے اور پھر ہنی کی آمد سے پہلے وہ کپڑے تبدیل کرنے کے ارادے سے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جب اسے مہر کی ذات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی تو اس ہار سنگھار کو قائم رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ابھی دو پنیں بھی نہیں اتاری تھیں کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور اگلے ہی لمحے تموز اندر داخل ہوا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں' اور مہر کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا تھا' اسے گھر کے حلیے میں دیکھ کر مہر کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ تموز نے پلٹ کر دروازہ بند کیا تھا اور مہر کی جانب رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی

نگاہیں مہر کو اپنے آرپار ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ جھجک کر نظریں چراتی چہرہ جھکا گئی تھی۔ دلہن کے روپ میں اس کا حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔ مگر افسوس دیکھنے والی کی نگاہ میں دور تک ستائش نہ تھی۔

"آپ میری طرف سے آزاد ہیں ہنی۔ آپ جب چاہیں اپنی محبت کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتے ہیں۔" اس کی بوجھل آواز کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑنے کا سبب بنی تھی۔ سیم نے چونک کر استہزائیہ نظروں سے سرتاپا اسے دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے؟ ہم دونوں وہاں ساتھ رہتے ہیں مہر احمد!" اور مہر کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے یقین نظروں سے ثموز کی جانب دیکھا تھا جو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟ ارے بھئی محبت ہوں تمہاری۔ بلکہ صرف محبت ہی نہیں شوہر بھی ہوں تمہارا۔ کیا ہوا جو عورتوں کا شوق ہے مجھے۔ اور کیا ہوا جو میں — پیے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ.... آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" مہر کی کانپتی آواز اس کے جذبات کی عکاسی کر رہی تھی۔ سیم نے ایک مسکراتی نظر اس کی اڑی ہوئی رنگت پہ ڈالی تھی اور اپنی جیب میں رکھا موبائل نکال کر اس میں موجود تصویریں کھولنے لگا تھا۔

"لو دیکھو۔" اس نے موبائل مہر کی جانب اچھال دیا تھا۔

لرزتے ہاتھوں سے موبائل تھامے مہر نے اسکرین کی طرف دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ وہ سیم اور سوزی کی ساحل سمندر کی تصویر تھی۔ بے اختیار ہی مہر کی انگلی اسکرین پہ پھری تھی اور ساتھ ہی منظر بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ سیم اور سوزی کی نائٹ کلب میں لی گئی تصویر تھی۔ جس میں دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے مشروب کے گلاس صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے تصویریں بدلتی گئی تھیں۔ اور مہر مارے وحشت کے پلکیں تک جھپکنا بھول گئی تھی۔ یہاں تک کہ مزید کچھ دیکھنے کا یارا نہ رہا اور موبائل اس کے بے جان ہاتھوں سے چھوٹ کر کارپٹ پہ جا گرا تھا۔

"ہو گئی تسلی؟" سیم کے مسکرا کر پوچھنے پہ مہر کی روئی ہوئی آنکھیں اس کے وجیہہ چہرے پر موجود دل پہ آٹھہری تھیں۔

"میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا ہنی اور آپ کیا نکلے؟" اپنے حنائی ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ سسک اٹھی تھی۔

"اوں ہوں مہر احمد! رات کا مزہ مت خراب کرو۔ مجھے روتی ہوئی عورتیں بالکل پسند نہیں۔" ثموز نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا اور مہر کے پورے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی تھی۔

"پلیز ہنی! میرے قریب آنے کی کوشش مت کیجئے گا!" اس کی برستی آنکھوں میں درد اپنے عروج پر تھا۔

"کیوں نہ آؤں قریب؟ بیوی ہو تم میری اور بیوی بھی وہ جو میری محبت کا دم بھرتی ہے۔ یہ خوابناک رات، مہکتا ماحول سب کچھ تمہارے خوابوں کے عین مطابق تو ہے۔" وہ سرد مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس کی طرف بڑھا تھا۔ بے اختیار روتی ہوئی مہر نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔ کون سا وقت تھا جب وہ اس شخص سے اظہار محبت کر بیٹھی تھی۔

"پلیز ہنی! میں آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گی۔ مجھے صرف آپ کا نام چاہیے۔" ملتجی انداز میں کہتے ہوئے اس نے سیم کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"نہیں مہر احمد اب نہیں!" سیم کی آنکھوں سے مارے نفرت کے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے

اس نے اس کے پہلو سے نکل جانا چاہا۔ سیم بجلی کی سی تیزی سے پلٹا تھا اور پلک جھپکنے میں مہر کی کلائی سیم کی مضبوط گرفت میں آگئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے مہر کو بیڈ پہ دھکا دیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا تم سے۔ میری ذات سے تمہیں کوئی خوشی نہیں ملے گی۔" سیم نے بے رحمی سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

سنو!

تم جانتے ہو کیا

رات بہت چپکے سے وہ دم توڑ گیا

جو اعتبار مجھے تم پر تھا!

کمرے کی ساکت فضا میں اس کی سسکیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ مگر انہیں سننے والا واحد انسان بیڈ پہ بہت گہری اور پرسکون نیند سو رہا تھا۔

اسے کوئی چیز تڑپا رہی تھی تو وہ اس اعتبار کا بکھرنا تھا جو اس نے آنکھیں بند کر کے سالہا سال ثموز ابراہیم پہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ثموز کے ساتھ زبردستی رشتہ جوڑ کے وہ اپنے حق میں ایک برا فیصلہ لے چکی تھی۔ اسے ثموز سے کسی اچھائی کی امید نہ تھی۔ لیکن وہ اس کے ساتھ حنان سے بھی بدتر سلوک کرنے والا تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

عورتوں کے ساتھ اس کی بدکرداری کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مہر کو لگا تھا۔ جیسے اس کا اپنا کردار بے مول ہو گیا ہو۔ وہ صحیح معنوں میں آج تہی دامن ہو گئی تھی۔ اس کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔

اس کا دل شدت سے خود کو ختم کرنے لینے کا خواہش مند تھا۔ ہر دور میں دوغلی زندگی جیتے جیتے وہ اپنے وجود سے بے زار آگئی تھی۔ اب ایک بار پھر بہت سی مشکلیں اس کا دامن تھامے کھڑی تھیں۔۔۔ ماں کا اطمینان، ساس سسر کی خوشی، پیچھے حنان، آگے ثموز کی نفرت سے بھری زندگی۔ وہ جاتی تو کہاں جاتی؟ کسے پکارتی؟ دور تک کوئی راستہ نہ تھا۔ سوائے اپنے فیصلے کو نبھانے کے اور مہر احمد نے ایک بار پھر خود کو خاموشی کی سولی پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی میز پہ بے حد رونق تھی۔ جاشی اور نوریہ بہن بہنوئی کا ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ ایسے میں زیب اور صغیر قاضی کو انجم نے بے حد اصرار کر کے خود مدعو کیا تھا۔

مہر کے لبوں کی مسکراہٹ اور چہرے کے اطمینان نے انجم کے دل سے ہر خدشے کو دور کر دیا تھا۔ اس پہ مستزاد سیم کا مطمئن انداز انجم نے اس ایک ہفتے میں پہلی بار کھل کر سانس لیا تھا۔ زیب کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ وہ بیٹی اور داماد کو ایک ساتھ دیکھ کر اندر تک سرشار ہو گئی تھیں۔

ناشتے کے بعد مہر نے قصداً "بہنوں کو روک لیا تھا۔ ثموز بھی اس ڈرامے سے اکتا کر گاڑی لے کر نکل گیا تھا۔ ولیمہ کی تقریب چونکہ شام کی تھی۔ اس لیے تین بجے کے قریب مہر، جاشی اور نوریہ کے ہمراہ پارلر چلی گئی تھی۔ جہاں سے اس کی واپسی سیدھا ہال میں ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مارک نے مسلسل سیم کی فون پہ جان کھائی ہوئی تھی۔ اس کے اصرار پہ بالآخر سیم نے اسٹیج پہ دلہن بنی بیٹھی مہر کی کتنی ہی تصویریں کھینچ کے اسے بھیج دی تھیں۔

"واہ یار، یہ لڑکی ہے یا کوئی پری؟" مارک کا تبصرہ پڑھ کے سیم مسکرا دیا تھا۔

"ہاں پری۔۔۔ جو میری جان کا عذاب بن گئی ہے۔"

"اف! کتنے بدذوق آدمی ہو یار۔ میں تو کہتا ہوں گولی مارو اس سوزی کو اور اس حسین مورت کے ساتھ عیش کی زندگی گزارو۔" مارک کا جواب سیم کے چہرے پہ استہزائیہ رنگ بکھیر گیا تھا۔

"کاش کہ میں تمہاری طرح سوچ سکتا۔"

"پلیز سیم! میں تمہیں صحیح اور مکمل سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں۔ جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ ایسا

نہ ہو کہ کل کو تمہیں پچھتانا پڑے۔" اس کا میسج پڑھ کے سیم بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"سیم اپنے فیصلوں پہ کبھی نہیں پچھتاتا۔ یہ بات یاد رکھنا تم!" اور مارک "جیسے تمہاری مرضی" کہہ کے خاموش ہو گیا تھا۔

ولیمہ کے اختتام پہ زیب' رسم کے مطابق مہر کو "قاضی ولا" لے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اچھا آپا! اب ہمیں اجازت دیں۔" وہ بہن کے پاس چلی آئی تھیں۔ انجم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے' مہر کو آگے بڑھ کے خود سے لگا لیا تھا۔

"خیر سے جاؤ۔" ان کی بات نے صغیر صاحب کے ساتھ بات کرتے سیم کے کان کھڑے کر دیے تھے۔ وہ ان سے معذرت کرتا ماں کی طرف چلا آیا تھا۔

"یہ کہاں جا رہی ہے؟" اس نے مہر کو دیکھا تو وہ بے اختیار نظریں جھکا گئی تھی۔

"یہ آج رات زیب کی طرف رہے گی۔ پھر ہم کل اسے لینے جائیں گے۔" انجم نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"سوری خالہ! میں اپنی دلہن کو کہیں نہیں جانے دینے والا۔" وہ مسکراتا ہوا مہر کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تو دونوں خواتین اس کی اس بے باکی پہ بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ جبکہ مہر کا بے جان دل اس مصنوعی اظہار محبت پہ نئے سرے سے لرز گیا تھا۔ غیر ارادی طور پہ ہی اس نے ذرا سا کھسک کر دور ہٹنا چاہا تھا۔ مگر سیم نے اچانک اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ مہر کی ٹانگیں مارے خوف کے کانپنے لگی تھیں۔

"ہنی! یہ رسم ہوتی ہے بیٹا۔" زیب مسکرا کر گویا ہوئی تھیں۔

"اچھی بے ہودہ رسم ہے کہ نئے کپل کو الگ کر دینا۔" اور زیب خفت زدہ سی ہنس پڑی تھیں۔

"اف توبہ۔ یہ لڑکا تو بالکل ہی امریکن ہو گیا ہے۔" انہوں نے بہن کی طرف دیکھا تو انجم' جو خود بھی تموز کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کے اندر ہی اندر بے حد حیران تھیں۔ خوشی سے مسکرا دیں۔

"چلو رہنے دو زیب۔" اور زیب مزید کیا کہتیں انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹی اور بھانجے کو گلے سے لگایا تھا اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازتی واپس ہو لی تھیں۔ سب کے ادھر ادھر ہوتے ہی سیم نے ایک جھٹکے سے مہر کا رخ اپنی جانب کیا تھا۔

"کیوں ڈارلنگ! ابھی سے فرار کی خواہش مند ہونے لگیں؟" اور مہر کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

"آئندہ اگر میری اجازت کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانے کی جرات کی نا تو ٹانگیں توڑ کے رکھ دوں گا مہر احمد!"

اس کی سنہری آنکھوں سے نکلتے شعلے مہر کے پورے وجود کو جلا کر خاکستر کر گئے تھے۔ اس جلن آمیز اذیت نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتی اس کے ہمراہ اپنی مقتل گاہ کی طرف چل پڑی تھی۔ جہاں ایک اور سیاہ رات اس کا مقدر بننے کو تیار کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

تین دن صرف تین دن گزرے تھے۔ مہر احمد کو اپنے ارمانوں کی اس قبر میں دفن ہوئے اور اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس دوغلی زندگی نے محض بہتر گھنٹوں میں اس کے اندر سے یوں جان نچوڑی تھی کہ وہ نڈھال ہی بستر سے جا لگی تھی۔ اس کی طبیعت کی خرابی نے انجم کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ صدقہ خیرات' دعائیں' دوائیں کیا کچھ نہ کر ڈالا تھا انہوں نے تب کہیں جا کر مہر کی طبیعت سنبھلی تھی۔ اس کے منع کرنے پر انجم نے زیب سے مہر کی طبیعت خرابی کا ذکر نہ کیا تھا۔

اس وقت بھی وہ مہر کے سرہانے بیٹھی اپنے ہاتھوں سے اسے یخنی پلا رہی تھیں۔ جب لاؤنج سے اچانک تموز کے اونچا اونچا بولنے کی آواز نے دونوں کو گھبرا کے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

انجم نے سرعت سے ہاتھ میں پکڑا پیالہ ایک طرف رکھا تھا اور اٹھ کر دروازے کی جانب بھاگی

تھیں۔ مہر بھی بے اختیاری کے عالم میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تموز کی آواز بتدریج اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ جسے سن کر گھبرائی ہوئی مہر کے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔ وہ راہداری عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن جونہی اس کی نظر ابراہیم ملک کے مقابل انگارے کی طرح دہکتا چہرہ لیے کھڑے تموز پہ پڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ تموز اس لب و لہجے میں ابراہیم صاحب سے مخاطب تھا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔ انجم الگ حواس باختہ سی باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھیں۔

"آپ میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کریں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔" تموز نے ہاتھ میں پکڑی فائل صوفے پہ پٹخ دی تھی۔ اس فائل میں کیا تھا؟ تموز کس دھوکے کی بات کر رہا تھا؟ وہ دونوں خالہ بھانجی قطعی انجان تھیں۔ "بکواس بند کرو اپنی میں نے تم سے کہا تھا کہ تین دن کے بعد تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ سو میں نے اپنی بات پوری کی۔ قانونی کارروائی البتہ اب امریکہ میں ہی جا کر ہوگی۔"

"کون سا حصہ؟" تموز بنا کسی لحاظ کے دھاڑا تو ساکت کھڑی مہر نے بے اختیار انجم بیگم کا بازو تھام لیا۔ جن کی اپنی رنگت اڑ گئی تھی۔

"ہر چیز کا آدھا ہے یہ!" اس نے فائل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "باقی کا آدھا کس اولاد کو بانٹ آئے ہیں آپ؟" وہ انتہائی گستاخانہ انداز میں بولا تو مہر کا ہاتھ اپنے نیم وا لبوں پر آن ٹھہرا۔ یہ تموز ابراہیم کا کون سا روپ تھا؟

"اپنی بیٹی کو دیا ہے میں نے باقی کا حصہ، تاکہ وہ تم سے ذلیل آدمی کے ساتھ گزارا کر سکے!" ابراہیم صاحب اس سے بھی بلند آواز میں دھاڑے تو لاؤنج میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ ساکت کھڑی انجم اور مہر کو بھی معاملے کی تھوڑی بہت سمجھ میں آچکی تھی۔ سو یوں اچانک اپنا حوالہ، وہ بھی جائیداد کے معاملے میں مہر کا چہرہ فق کر گیا تھا۔

"مہر۔ اس مہر احمد کے نام کر دی ہے آپ نے اپنی آدھی جائیداد؟" سیم شاکڈ سا بڑبڑایا تھا۔

"وہ مہر احمد نہیں۔ مہر تموز ہے اب۔" ابراہیم صاحب نے سخت لہجے میں تصحیح کی تھی۔

"مہر تموز۔ مائی فٹ!" اور انجم اپنے لاڈلے کے چہرے پہ چھائی نفرت دیکھ کے حیران پریشان کھڑی رہ گئی تھیں۔ اگر حقیقت یہ تھی تو گزشتہ تین دن سے کیا ہو رہا تھا؟ جبکہ مہر کی اپنا بھرم ٹوٹ جانے پر "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والی کیفیت ہو گئی تھی۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ کہ اسے میرے مقابل کھڑا کر کے آپ نے اس کا مستقبل محفوظ کر لیا ہے؟" وہ زہر خند سا ایک قدم آگے آیا تھا۔ "یہ آپ کی بھول ہے مسٹر ملک۔ آپ نے میرا حق اس لاوارث لڑکی کی جھولی میں ڈال کے اس کے مستقبل کا نقشہ بگاڑ دیا ہے۔"

"کیا کرو گے ہاں؟ بولو کیا کرو گے تم؟" ابراہیم ملک نے طیش میں آکر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس ہولناک منظر نے مہر کی چیخ نکال دی تھی۔ جبکہ انجم دیوانہ وار ان دونوں کی جانب لپکی تھیں۔

"خدا کا واسطہ ہے ابراہیم! یہ نہ کریں۔ یہ نہ کریں ابراہیم!" انہوں نے بیٹے کا گریبان باپ کے ہاتھ سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا!" وہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، بنا کسی خوف کے بولا تو جہاں مہر کا وجود اس درجہ نفرت کا احساس پا کے نیلا پڑ گیا تھا، وہیں ابراہیم ملک کا ہاتھ اپنی پانچوں انگلیوں کا نشان اس کے چہرے پر ثبت کر گیا تھا۔

"نکلو ابھی نکلو میرے گھر سے خبیث آدمی!" سیم کو دھکیلتے ہوئے ابراہیم صاحب پہ جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ انہیں روکنے کی کوشش میں انجم پھپھک کے رو پڑی تھیں۔ "اور طلاق دے کر جاؤ اسے۔ ابھی اسی وقت طلاق دو!" ان کی دھاڑ نے مہر کی ٹانگوں میں سے جان نکال لی تھی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند دو زانو زمین پہ آگری تھی۔

"طلاق نووے۔" سیم زہریلی مسکراہٹ لیے پھنکارا تھا۔ "آپ کی اس لاڈلی کو میں کسی صورت طلاق نہیں دوں گا۔ اسے میں تب تک اپنے نام کے ساتھ باندھ کے گھسیٹوں گا۔ جب تک کہ اس کی ہڈیاں گل نہیں جاتیں۔" وہ سفاکی کی انتہا پہ تھا۔

"خدا کا خوف کرو تموز۔ اس کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔" انجم روتے ہوئے حلق کے بل چلائی تھیں۔

"آپ لوگوں نے کیا تھا خدا کا خوف' جو میں کروں وہ پلٹ کر ماں پہ گرجا تھا۔ "یہ آپ کی سگی ہے۔ رہیں اب اس کے ساتھ۔ میری شکل اب آپ لوگ کبھی نہیں دیکھیں گے۔" قطعیت سے کہتا وہ صوفے کی طرف بڑھا تھا۔ فائل اٹھا کر' وہ زمین پہ گری پھوٹ پھوٹ کے روتی ہوئی مہر پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا اور اگلے پندرہ منٹ میں وہ اپنا سامان اٹھائے باہر نکل آیا تھا۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ ہے تموز! یہ ظلم مت کرو بیٹا! اس معصوم کو اتنی بڑی سزا نہ دو۔" انجم بلکتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔ مگر اس نے تو جیسے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ اپنی ماں کی ہر فریاد' ہر پکار ان سنی کیے تیز قدموں سے دروازہ عبور کر گیا تھا۔ اور پیچھے سسکتی ہوئی انجم دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین پہ گرتی چلی گئی تھیں۔

★★★

تموز کا جانا ابراہیم ملک کے خاندان کو بے موت مار گیا تھا۔

مہر اور انجم نے کتنے ہی واسطے دے کر ابراہیم صاحب کو ساری حقیقت "قاضی ولا" کے مکینوں پہ کھولنے سے روکا تھا۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود ان دونوں کو تموز کی واپسی کا یقین تھا۔

مہر نے زیب تک کو خود پر گزرنے والی قیامت کی ہوا نہ لگنے دی تھی۔ سب کو تموز کی اچانک واپسی کی وجہ یونیورسٹی سے ضروری کال بتائی گئی تھی۔ اس واقعے کے محض ایک ہفتے بعد ہی ابراہیم صاحب بھی امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ مگر تب تک سیم اپنے ہاتھ لگنے والے آدھے حصے کے لیے قانونی کارروائی شروع کروا چکا تھا۔

اس آڑے وقت میں ابراہیم ملک کے دوست اور پارٹنر' طاہر' نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ بذات خود تموز کو سمجھانے اس کے پاس گئے تھے۔ مگر اس نے ان کی بھی ایک نہ سنی تھی۔ چند دنوں کے اندر اندر وہ اپنا حصہ لے کر سوزی کے پاس نیو ہیون چلا گیا تھا۔ جو تموز کو اس کے وعدے کے مطابق اپنے پاس پا کے اس کی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔

اگلے ایک ماہ میں ابراہیم ملک اپنی باقی ماندہ محنت سمیٹ کے پاکستان چلے آئے تھے۔ ان کی واپسی کے فیصلے کو حالات سے بے خبر "قاضی ولا" کے مکینوں نے بے حد سراہا تھا۔ ان سب کی بے خبری ابراہیم صاحب کو مزید پریشان کر گئی تھی۔ وہ بیوی اور بہو کی اس نادانی بھری روش سے شدید نالاں تھے۔ ان کے نزدیک ان دونوں کا انتظار قطعی لاحاصل تھا۔ لیکن وہ دونوں اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھیں۔

دن' ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے تھے۔ ابراہیم صاحب نے پاکستان میں اپنا کاروبار نئے سرے سے شروع کیا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنا گھر بھی خرید لیا تھا۔ اس دوران تموز کی طرف سے مسلسل خاموشی نے زیب کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کے استفسار' پہ ابراہیم صاحب نے مہر کی ایک نہ چلنے دی تھی اور ساری سچائی زیب کے گوش گزار کر دی تھی۔ حقیقت سن کر زیب تڑپ اٹھی تھیں۔ ان کی بچی پر اتنا کچھ گزر گیا تھا اور انہیں پتا بھی نہ چلا تھا! مہر نے "قاضی ولا" میں اپنی واپسی کے لیے ماں کو صاف منع کر دیا تھا۔ وہ تموز کی بیوی ہو کر اس کا گھر چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مماجان اور بابا نے اس کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے سے منہ موڑ لیا تھا۔ سو وہ ان کی خدمت میں اپنی پوری عمر گزارنے کے لیے تیار تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا۔ ابراہیم صاحب کی زور زبردستی پہ مہر نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جوڑنے کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اس عجیب و غریب

صورت حال نے حنان جیسے زیرک انسان کو بھی چونکا دیا تھا۔ وہ باپ کے ذریعے بالآخربات کی تہہ تک جا پہنچا تھا۔ یوں مہر احمد کی ناکام ازدواجی زندگی کا بھید سب پہ کھل گیا تھا۔ ثموز ابراہیم امریکہ میں کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ کوئی کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر اس نے اپنے کہے کے مطابق مہر احمد کا تماشا بنا کے رکھ دیا تھا۔ اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد مہر نے ایک کالج میں بطور لیکچرار جاب کرلی تھی۔

اس دوران ابراہیم صاحب نے کتنی ہی بار اسے خلع لے کر نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خود کو مہر کی اس بربادی کے لیے قصور وار سمجھتے تھے۔ مگر مہر نے اس معاملے میں انہیں صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔ اس کا دل ثموز کی نفرت کا دکھ جھیل کر اب کسی سے بھی محبت کرنے کے لائق نہ رہا تھا۔ ادھر حنان 'مہر کو ایک بار پھر تنہا پا کے میدان میں اتر آیا تھا۔ مگر چونکہ اس بار مہر کے ساتھ زیب اور انجم بھی تھیں۔ اس لیے یہ سب اب حنان کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ بالآخر اپنا مقصد پانے کے لیے اس نے جائشہ کی منگنی کے بعد معاملے کو کچھ اس طور سے ہوا دی تھی کہ مہر کی زندگی کا فیصلہ خود بہ خود حنان کی مرضی کے مطابق ہونے چلا تھا۔ ساتھ ہی اس نے وقت ضائع کیے بغیر صغیر صاحب کے سامنے مہر کے لیے اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

مگر مہر احمد کی سنگین بے ہوشی نے اس کی اور ثموز ابراہیم کی علیحدگی کے معاملے کو ایک بار پھر کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ اور حنان سوائے سر پٹخنے کے اور کچھ نہ کرسکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی سر! آپ کو ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔" نرس کے پکارنے پہ راہداری میں بیٹھے ابراہیم صاحب اپنے اندر کھلے سو دو زیاں کے ڈھیروں کھاتوں کو سمیٹتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مہر کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اس کی حالت کی طرف سے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر لے جانے کی اجازت دی تھی۔

اس کی چھٹی کا سن کے صغیر صاحب بھی جاشی اور نوریہ کے ہمراہ اسپتال پہنچ گئے تھے۔ حنان البتہ جھنجلاہٹ کے باعث دوبارہ اسپتال نہیں آیا تھا۔ اسے اس بنے بنائے کھیل کے بگڑ جانے پر شدید غصہ تھا۔ وہ سب مہر کو لے کر ابراہیم صاحب کی طرف چلے آئے تھے۔

"صاحب جی! آپ سے ملنے کے لیے کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں۔" دل شیر کی اطلاع پر ابراہیم ملک نے کلائی پہ بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

"اس وقت؟"

"نہیں جی۔ وہ تو کافی دیر کے آئے ہوئے ہیں۔" اس کی بات پہ انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس لی تھی۔

"کیا نام ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ عجیب مشکل سا نام ہے۔" دل شیر کے جواب پہ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

مہر کو چاروں خواتین احتیاط سے پکڑے آگے بڑھ رہی تھیں لیکن اچانک چلتے چلتے اس کا دل اس تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا کہ اس کے لیے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔

"ہمت کرو میری جان۔" انجم بیگم کی نرم آواز پہ مہر نے اپنا لب کاٹتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ یہ کیسی بے چینی اس کی رگ و جاں میں سمائی جارہی تھی؟ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ پریشانی سے سوچتے ہوئے اس نے اک گہری سانس لی تھی۔ اور پھر ڈوبتے ابھرتے دل کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

"ٹھہرو 'میں دروازہ کھولتی ہوں۔" زیب بیگم نے سرعت سے آگے بڑھتے ہوئے داخلی دروازہ وا کر دیا تھا۔ جس کے کھلتے ہی وہ سب گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔ حیرت کا پہاڑ ٹوٹنا کسے کہتے ہیں۔ یہ ان سب کے چہروں پہ لکھا تھا جو بت بنے 'ایک پل کو پلکیں جھپکنا

بھول گئے تھے۔ جبکہ مہر کا ڈوبتا ابھرتا دل یک لخت ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے روم روم میں سما جانے والی بے چینی کا تعلق ثموز ابراہیم سے تھا' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ان سب کی نگاہیں بیک وقت اس ایک شخص پہ جمی تھیں۔ اور ثموز کی بے قرار نظروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس چہرے کو اپنی پیاس مٹانے کا ذریعہ بنائے۔ آیا اس ماں کے چہرے کو جو آخری لمحے تک اس کے پیچھے لپکی تھی۔ یا اس باپ کی صورت کو جس کی عزت کو اس نے اپنوں اور غیروں کے درمیان روند کے رکھ دیا تھا۔ یا پھر اس لڑکی کی' جسے تین دن کی سہاگن بنا کے اس نے تین سال کے لیے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ اور وہ نجانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اب تک اس جیسے شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک پل کو بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے تو دور انسانیت تک سے نہ دیا تھا۔ جس نے اپنی ہی بیوی کی عزت کو کسی لٹیرے کی طرح پامال کیا تھا۔ اور وہ بدلے میں اس کی عزت کو سنبھالے ناحال اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔

کیا قصور تھا ان تین انسانوں کا؟ یہ کہ وہ اس جیسے خود غرض کی محبت میں مشترکہ طور پر گرفتار تھے۔ اور بس! اور جواباً" اس نے انہیں کیا دیا تھا؟ اس نے ان تینوں کو جوتے کی نوک پہ رکھا تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی ماں کی پکار ہوا میں اڑا گیا تھا کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ مگر جب لورین کے جوتے کی نوک نے اس کی پسلیوں میں ضرب لگائی تھی۔ تب اسے درد نہیں بلکہ اس ضرب سے جڑی ذلت کا احساس ہوا تھا۔ اس خدائی پکڑ کا احساس ہوا تھا' جو بنا کسی پیشگی اطلاع کے اس پہ مسلط کر دی گئی تھی۔

مائیکل سے ہونے والی ملاقات نے اس پر اس کی سب سے بڑی غلطی آشکار کر دی تھی۔ اسے سمجھا دیا تھا کہ اپنے پیاروں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں اس نے منہ کی کھائی تھی۔ تب وہ خوفزدہ ہو کے دیوانہ وار بازار کی جانب دوڑا تھا۔ لیپ ٹاپ خرید کے لایا تھا کہ کہیں تو کسی طور وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے نتیجے کو غلط ثابت کر سکے۔ خود کو یہ باور کروا سکے کہ اس نے اپنے ماں باپ اور مہر احمد کو چھوڑ کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے خود پہ کھلنے والے کسی مدد کے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے بند نہیں کیا تھا۔

گھر پہنچ کے اس نے لیپ ٹاپ پر اپنا فیس بک اکاؤنٹ سائن ان کیا تھا۔ اور مہر احمد نامی ہر لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ مگر کوئی بھی چہرہ نہیں تھا۔ پھر ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے زندگی میں پہلی بار مہر کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑا تھا۔

"مہر ثموز۔" لکھ کر اینٹر کرتے ہوئے اس کے دل نے شدت سے دعا کی تھی کہ ایسا کوئی رزلٹ سامنے نہ آئے۔ وہ اسے اگر تین دن کے اندر اندر چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ تو مہر احمد کی محبت کو ہوا ہونے میں زیادہ سے زیادہ تین ہفتے لگے ہوں گے تاکہ اسے اس بات کا تو سکون مل سکے کہ خواب میں دیکھے جانا والا اور کم از کم مہر احمد کا ورنہ تھا۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے جیت کی نوید نہیں مل تھی۔ مہر ثموز کے نام سے چند ایک ہی اکاؤنٹ سامنے آئے تھے۔ اور ان میں سب سے اوپر اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ تحیر کے عالم میں وہ کتنی ہی دیر ساکت نظروں سے اپنے سامنے موجود چہرے اور اس کے ساتھ لکھے نام کو دیکھتا رہا تھا۔ اور کتنی ہی دیر بعد اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس نام کو کلک کر دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے اسکرین مہر کی چھوٹی سی تصویر کے ساتھ ساتھ انجم بیگم' ابراہیم صاحب' زیب اور صغیر قاضی کی گروپ فوٹو سے بھی روشن ہو گئی تھی۔ ان چاروں کی یہ تصویر اس نے CoverPhoto کے طور پہ سیٹ کر رکھی تھی۔ مارے اذیت کے ثموز نے بے اختیار اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ۔ اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا!" اس کی اپنی ہی آواز بازگشت بن کر اس کا غرور پاش پاش کر گئی تھی۔ ایک معمولی انسان ہو

کراس نے اتنا بڑا بول کیسے بولا تھا؟ اپنی جرات پہ وہ سچ میں دنگ تھا۔ اس نے اس سختی سے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا کہ خون چھلکنے کو بے تاب ہو گیا تھا۔

"اسے میں تب تک اپنے نام کے ساتھ باندھ کے گھسیٹوں گا۔ جب تک کہ اس کی ہڈیاں گل نہیں جاتیں۔" سنسناتا ہوا ایک اور چابک اس کے وجود پہ پڑا تھا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا تھا۔

اس نے اسی وقت اپنی غلطی سدھارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مارک نے بھی اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔ اگلے دن وہ ابراہیم صاحب کے دوست' طاہر چوہدری کے پاس چلا آیا تھا۔ ان سے مل کے اسے باپ کے کاروبار کی پاکستان منتقلی سے لے کر وہاں ان کے نئے گھر کے پتے تک ہربات پتا چل گئی تھی۔ وہ ساری معلومات لیے اپنے دفتر آیا تھا۔ جہاں اس نے اپنے چند اہم ترین کام نبٹائے تھے۔ اور آنے والے چند ہی دنوں میں وہ مارک اور جوزی کی ڈھیروں نیک تمنائیں سمیٹے پاکستان کے لیے فلائی کر گیا تھا۔

اس دوران اس کے قدم کہیں نہ ڈگمگائے تھے۔

اس کا حوصلہ کہیں نہ ٹوٹا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر اس پل ان سب کو اپنے روبرو پاکے اس کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

"تم؟؟" ابراہیم ملک ہوش میں میں آنے والے سب سے پہلے فرد تھے۔ وہ چیل کی طرح اڑ کے ثموز پر جھپٹے تھے اشتعال نے ان کا چہرہ انگارے کی طرح دہکا دیا تھا۔ بے اختیار صغیر قاضی انہیں پکڑنے ان کے پیچھے لپکے تھے۔

"بھائی جان۔! سنبھالیں خود کو۔" انہوں نے بامشکل تمام ابراہیم صاحب کو ثموز پر ہاتھ اٹھانے سے روکا تھا۔ جو باپ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے سر جھکا گیا تھا۔ مگر خود کو ان کی پہنچ سے دور رکھنے کے لیے ایک انچ نہ پیچھے ہٹا تھا۔

"چھوڑو مجھے صغیر۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی ہمیں اپنی منحوس صورت دکھانے کی!" ابراہیم صاحب کف اڑاتے' خود کو چھڑانے کی کوشش میں دیوانے ہوئے جارہے تھے۔ جبکہ انجم' بے یقینی سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے' بیٹے کو سامنے پاکے بے اختیار رو پڑی تھیں۔ کچھ یہی کیفیت زینب کی بھی تھی۔ وہ حق دق کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔ مگر مہر کے بکھرے ہوئے اعصاب کے لیے اس بار کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ بے اختیار لڑکھڑائی تھی اور قریبی صوفے پہ ڈھے سی گئی تھی۔

"حوصلے سے کام لیں بھائی جان۔" صغیر صاحب انہیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ آوازیں سن کر ملازمین بھی داخلی دروازے کے باہر اکٹھے ہو گئے تھے۔

"نہیں ہے میرا حوصلہ۔ کھا لیا ہے اس نے مجھے۔ ختم کر دیا ہے اس نے میرا سب کچھ!" جذبات کی شدت کے باعث ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ان کی تڑپ اور اپنی خطاؤں نے ثموز کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے تھے۔

"بابا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔" وہ ہاتھ جوڑے آگے آیا تھا۔

"مت دو مجھے یہ "بابا" نام کی گالی۔" اس کا انہیں "بابا" پکارنا ابراہیم ملک پہ غضب ڈھا گیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا تھا۔ اور آن واحد میں ثموز کو اس کے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

"مسٹر ملک ہوں میں۔ سنا تم نے مسٹر ملک ہوں میں!" پے درپے انہوں نے تین چار تھپڑ ثموز کے منہ پر مارے تھے۔ ان کی انگوٹھی کی ضرب نے اس کا ہونٹ پھاڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے پہ خون ابلتا دیکھ کے سب خواتین کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ انجم تو چکرا کے بہن کے کندھے پہ آرہی تھیں۔ جبکہ مہر نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔ اس کے چہرے پہ آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ اس دشمن

جاں کا یہ حال دیکھنا بھی اس کے لیے کہاں ممکن تھا۔ اس کی جان تو دہری اذیت میں آپھنسی تھی۔

"تم ہمارے لیے مر گئے ہو!" اسے کالر سے گھسیٹتے ابراہیم ملک باہر کی طرف بڑھے تھے۔

"خدا کا واسطہ ہے چھوڑ دیں بھائی جان۔" نورہ اور جائشہ نے تیزی سے انجم بیگم کو سنبھالا تھا اور زیب تڑپ کر بہنوئی کی طرف بھاگی تھیں۔

"بھائی جان! یوں نہ کریں۔" صغیر قاضی نے بھی ان کی راہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ابراہیم صاحب پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے داخلی دروازے تک لائے تھے۔ اور پوری طاقت سے اسے باہر دھکا دے دیا تھا۔ وہ ملازمین کے سامنے منہ کے بل فرش پہ جا گرا تھا۔

دھاڑیں مار مار کر روتی زیب دیوانہ وار تموز کی جانب بڑھی تھیں۔ مگر ابراہیم صاحب کی دھاڑ ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

"کسی نے بھی اگر اسے ہاتھ لگایا تو وہ میرے لیے مر گیا!" ان کی اس تنبیہہ کے بعد ہر کوئی اپنی جگہ پر جامد ہو گیا تھا۔

تموز اپنے منہ اور ناک سے بہتے خون کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتا اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا موبائل جیب سے نکل کے زمین پر گر گیا تھا۔ مگر اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے اپنا بے وزن وجود لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں بابا!" اس کی سسکیاں اذیت سے پُر تھیں۔

"دل شیر' ریاض اسے لے جا کر گھر سے باہر پھینک دو۔ اور دوبارہ اس شخص کے لیے دروازہ مت کھولنا!" اس کی ہر التجا نظر انداز کیے۔ وہ کڑے لہجے میں ملازمین سے مخاطب ہوئے تھے۔ جو گھبرا کے سر ہلاتے آگے بڑھے تھے اور تموز کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی کی طرف کھینچنے لگے تھے۔

"کہیں نہیں جاؤں گا میں۔ چاہے مجھے باہر پھکوا دیں۔ میں اس در سے کہیں نہیں جاؤں گا۔!" ملازمین کے ساتھ گھسٹتے ہوئے اس کی آہ و فغاں بلند ہوئی تھی۔ مہر نے بے اختیار اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔ اس کے آنسو' اس کی تڑپ زیب کی برداشت سے بھی باہر ہو گئی تھی۔ وہ دوپٹے میں منہ دیئے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔ مگر ابراہیم ملک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔ وہ تب تک دروازے میں کھڑے رہے تھے' جب تک ملازموں نے تموز کو باہر دھکیل کے گیٹ بند نہ کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کے دس بجنے کو تھے۔ مگر ہر ایک صدمے کی کیفیت میں تھا۔ تموز کو گھر سے نکال کے ابراہیم صاحب اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

انجم' غنودگی کی کیفیت میں مہر کے بستر پہ پڑی تھیں۔ لیکن اس حال میں بھی آنسو ان کی بند آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی کنپٹیوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اور مہر متورم چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔ زیب' صغیر صاحب' جاشی' نورہ سب ہی اس کے پاس موجود تھے۔ مگر اس ہجوم میں بھی وہ بالکل اکیلی تھی۔ تنہا اور بے کراں۔

کتنے ہی منظر' کتنی ہی باتیں ذہن کے پردے پر ابھر اور مٹ رہی تھیں۔ کیا کچھ نہ سہا تھا اس نے۔ کیا کچھ نہ سنا تھا اس نے۔ اپنے شوہر کی بدکرداری۔ اس کی نفرت۔ اس کے ہاتھوں اپنے وجود کی تذلیل' اپنی ذات کی تذلیل۔ اور یہ سب اس نے تنہا برداشت کیا تھا۔ حتیٰ کہ آج تک اس نے اپنے یہ زخم اپنی ماں کو بھی نہیں دکھائے تھے۔ اس نے اپنے ساس سسر سے بھی تموز کی بدکرداری کا کبھی گلہ نہ کیا تھا۔ مگر آج جب وہ لوٹ آیا تھا تو دل نیم جاں پر لگا ہر زخم لو دینے لگا تھا۔

کیوں؟ کس لیے؟

اس کی حدوں کو چھوتی نفرت بھلا یوں اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی۔؟ یا پھر یہ تموز ابراہیم کا کوئی نیا سوانگ تھا۔ دولت کے لیے۔ یا اپنی کسی اور غرض کے

لیے۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی بھلا؟ اس نے تو ہمیشہ کی طرح مہر کو کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

"آپ کو پتا ہے بھائی! ثموز بھائی واپس آگئے ہیں۔" جاشی حنان کو مطلع کرنے کی غرض سے اپنا فون لیے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اور لائن کے دوسری طرف ڈرائیو کرتے حنان پہ پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"کیا؟" گاڑی کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ اس نے سرعت سے اپنے ذہن کو حاضر رکھتے ہوئے گاڑی کو سنبھالا تھا۔

"مگر کب؟ کیسے؟" اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں ونڈ اسکرین پہ مرکوز تھیں۔

جواب میں جاشی نے سارا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بھائی کے گوش گزار کردیا تھا۔ جس نے پریشانی کے عالم میں بے اختیار اپنا سر تھام لیا تھا۔

"یہ کیا ہوگیا حنان قاضی؟" اس نے اضطراب کی کیفیت میں خود سے سوال کیا تھا۔

"اب کہاں ہے وہ؟" بامشکل تمام خود کو ٹریفک کے دھارے سے الگ کرتے ہوئے اس نے گاڑی ایک طرف روکی تھی۔

"باہر ہی بیٹھے ہیں۔" اور حنان نے ناقابل یقین انداز میں اک گہری سانس لیتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"آپ آئیں گے یہاں؟" جاشی کے سوال پہ وہ بھنّا اٹھا تھا۔

"میرا کیا کام ہے وہاں۔ جو مرضی کریں یہ لوگ۔" اس کے تلخ لہجے پہ جاشی نے مزید کچھ کہے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

حنان نے ہاتھ میں پکڑا فون ایک طرف پٹختے ہوئے بے اختیار اسٹیرنگ پر ہاتھ دے مارا تھا۔ "او گاڈ!!" با آواز بلند اپنا غصہ نکالتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جکڑ لیے تھے۔ یہ کیا ہوگیا تھا؟ یہ ثموز ابراہیم کیسے لوٹ آیا تھا؟ وحشت سے سوچتے ہوئے اس نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی تھی۔

"کیا کروں؟ کیا کروں؟" اضطراب کے عالم میں بند مٹھی لبوں پہ جمائے اس نے جلد از جلد ثموز ابراہیم سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ سوچنا چاہا تھا۔ اور تب ہی بالکل اچانک ایک بہت عجیب حل اسے سوجھ گیا تھا۔

"ہاں! زبردست۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔" خود کلامی کرتے ہوئے اس نے دوسری سیٹ پہ پڑا فون جلدی سے اٹھایا تھا۔ اس کے پاس وقت بے حد کم تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی انگلیاں اپنے خاص دوست کا نمبر ملانے لگی تھیں۔ جو کہ ایک بااثر سیاسی شخصیت تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو فیض!" دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی وہ بے چینی سے بولا تھا۔

"ہاں حنان! کیسے یاد کیا؟" اس کی بھاری آواز خوشگوار تھی۔

"مجھے تیری مدد کی اشد ضرورت ہے فیض!" وہ سیدھا مدعا پہ آیا تھا۔

"ہاں بول۔"

"ایک بندے کو اٹھوانا ہے۔ ابھی اسی وقت!" اس کی بات پہ ایک لمحے کو دوسری طرف خاموشی چھاگئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہوجائے گا۔" اور حنان کا پریشانی میں ڈوبا چہرہ بے اختیار کھل اٹھا تھا۔ "کون ہے وہ؟" اس کے استفسار پہ حنان اسے ثموز ابراہیم کے بارے میں آگاہ کرنے لگا تھا۔ ساری بات سن کے فیض نے ہنکارا بھرا تھا۔

"ہوں۔ تو ایسا کر ان کے گھر کے باہر پہنچ کر بندے کی صحیح پوزیشن سے مجھے آگاہ کر۔ میں یہاں سے بندے روانہ کرتا ہوں۔"

"ٹھیک۔ بہت بہت شکریہ فیض! اس کام کے بدلے میں تو جان بھی مانگے گا ناں۔ تو دے دوں گا۔" حنان کی بات پر فیض بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو وہاں پہنچ۔" اور

حنان نے فون بند کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔

"میں اس بار تمہیں کسی قیمت پر نہیں جیتنے دوں گا شموز ابراہیم!" نفرت اور رقابت کی آگ نے اسے سچ میں بالکل اندھا کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا ایک بج رہا تھا۔ جب صغیر قاضی گھر جانے کے ارادے سے تنہا پورچ میں آئے تھے۔ انہیں باہر آتا دیکھ کے دل شیر تیزی سے ان کی جانب لپکا تھا۔

"صاحب جی! یہ فون شاید اس لڑکے کا ہے۔ یہاں گملے کے پیچھے گرا پتا نہیں کب سے بج رہا تھا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل صغیر صاحب کی طرف بڑھایا تو ان کی نظریں فون پہ آٹھہریں۔ جس کی اسکرین چیخ چکی تھی۔

"جا کر اسے دے آؤ۔"

"گیا تھا۔ مگر وہ اب باہر نہیں ہے۔" دل شیر کی بات پہ انہوں نے فون پکڑ لیا تھا۔ تب ہی اچانک وہ پھر سے بجنے لگا تھا۔ اسکرین پہ کسی مارک کا نام دیکھ کر انہوں نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد کال ریسیو کرلی تھی۔

"ہیلو۔ ہیلو سیم!" کب سے کال کرتے مارک نے بے چینی سے اسے پکارا تھا۔

"سوری۔ وہ یہاں نہیں ہے۔" صغیر صاحب نے انگلش میں جواب دیا تھا۔ ان کی بات پہ مارک بے اختیار تھم گیا تھا۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں۔" صغیر صاحب ایک پل کو رکے تھے۔ "میں اس کا انکل بات کررہا ہوں۔" ان کے تعارف نے مارک پہ شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری کردی تھی۔

"او گاڈ! تو کیا آپ لوگوں نے اسے معاف کردیا۔ آپ لوگوں کی صلح ہوگئی انکل؟" اور صغیر صاحب اس کی بات پہ ساکت ہوگئے تھے۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں اس کا بیسٹ فرینڈ اور پارٹنر مارک بول رہا ہوں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ آپ لوگوں کی صلح۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا مسٹر مارک! اس کے والد نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے تو مارک کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا!" اور پھر چند لمحوں کے لیے لائن پہ خاموشی چھا گئی۔

"پلیز انکل۔ میری آپ سے ریکویسٹ ہے۔ اس کے والد کو سمجھائیں کہ اس کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔ وہ بہت کڑے اور بُرے حالات سے لوٹ کر آپ لوگوں تک آیا ہے۔" چند لمحوں کے بعد مارک کی بوجھل آواز صغیر صاحب کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ بری طرح چونک گئے۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھے کھل کر بتائیں گے مسٹر مارک!" ان کی بات پہ مارک نے اک گہری سانس لی تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے وہ ساری بات صغیر قاضی کو بتاتا چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شموز کی جس وقت آنکھ کھلی' ارد گرد گھپ اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ ایک پل کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا۔ کہ آیا وہ اٹھ چکا ہے یا اب بھی سو رہا ہے۔ اس اندھیرے نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے بے چینی سے اپنے وجود کو جنبش دینا چاہی تھی۔ مگر اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اس کی گھبراہٹ یک لخت دوچند ہوگئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہی کسی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ اور تب ایک جھماکے کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ منظر تازہ ہوگیا تھا۔ جب گھر کے باہر بیٹھے ہوئے اس کے عین سامنے ایک گاڑی آکر رکی تھی۔ اور اچانک اس میں سے چند آدمی نکل کر اس کے سر پہ

آکھڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا ان میں سے کسی نے ایک کپڑا اس کی ناک اور منہ پہ جما دیا تھا۔ جس کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے' مجھے اغوا کرلیا گیا ہے او نو۔"

ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے متوحش نظروں سے اپنے اردگرد چھائے اندھیرے کو دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس کی مدد کے لیے چیخ و پکار عروج پہ پہنچ گئی تھی۔ ایسے میں اچانک کسی انجانی سمت سے کنڈی کی آواز اسے بے اختیار خاموش کروا گئی تھی۔ وہ دم سادھے آنے والی آہٹ پہ کان جما گیا تھا۔ تب ہی اس کے داہنی طرف سے دروازہ کھلا تھا اور سوئچ کی آواز کے ساتھ ہی کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ روشنی کی چبھن نے ثمروز کو آنکھیں بند کرنے پہ مجبور کردیا تھا۔

"تشریف لائیں سرکار۔" قدموں کی دھمک کے درمیان اسے فرش پہ کرسی گھسیٹنے کی آواز آئی تھی۔ ثمروز نے زبردستی اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے عین سامنے رکھی گئی کرسی پر ایک شخص بڑے کروفر سے ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی کرسی کے اردگرد تین اسلحہ بردار آدمی کھڑے تھے۔ وہ چاروں افراد ثمروز کے لیے بالکل انجان تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس کی خوف زدہ آنکھیں کرسی پہ بیٹھے فیض کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔ جس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ہم تمہاری بیوی کے باراتی ہیں ثمروز ابراہیم!" اور ثمروز کو زندگی میں پہلی بار مہر کا حوالہ کسی دوسرے مرد کے منہ سے سن کر' شدید ناگوار گزرا تھا۔

"کیا بک رہے ہو۔" اس کی آنکھوں میں موجود خوف یکایک غصے میں ڈھل گیا تھا۔

"بک نہیں رہا' صحیح کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ تم ابھی اسی وقت اسے طلاق دینے والے ہو۔ یہی تمہاری رہائی کی قیمت ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے فیض نے مونچھوں کو تاؤ دیا تھا اور ثمروز اپنی جگہ پہ ساکت ہو گیا تھا۔

"کس نے رکھی ہے یہ قیمت؟ میرے۔ میرے بابا نے؟" اس کی آواز شدید بے یقینی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ثمروز کی بات فیض کو چونکا گئی تھی۔

"تو کیا تمہارا باپ بھی تمہاری بیوی کی تم سے گلو خلاصی چاہتا ہے؟" وہ محظوظ سا بولا تو ثمروز کے سینے میں اٹکی سانس بحال ہوگئی۔ وگرنہ ابراہیم ملک کی اس درجہ نفرت کا سوچ کر تو اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔

"ارے یار' اتنے برے شوہر ہو تو جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے اس بے چاری کی؟" فیض کا مسکرا کر کسا گیا جملہ ثمروز کے تن بدن میں آگ لگا گیا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ اور کان کھول کر سن لو' میں کسی بھی قیمت پر اپنی بیوی کو طلاق نہیں دوں گا۔"

"چاہے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں؟" فیض کے چہرے پہ یک لخت سرد مہری پھیل گئی تھی۔

"بالکل!" ثمروز نے قطعیت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں چند ثانیے کے لیے ایک دوسرے سے بندھی رہی تھیں۔ اور پھر فیض نے رخ اپنے بندوں کی جانب موڑ لیا تھا۔

"چلو پھر تو اصلح کرو صاحب کی۔" اس کے حکم پہ دو بندے ثمروز کی طرف بڑھے تھے۔ اور اگلے ہی لمحے اس کا وجود ان دونوں آدمیوں کے رحم و کرم پہ آگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مارک سے ثمروز پہ گزرنے والے حالات کی پوری روداد سن کے صغیر صاحب شل ہو گئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر ماؤف ذہن کے ساتھ باہر ٹہلتے رہے تھے۔ اور پھر ایک نتیجے پہ پہنچ کے تیز قدموں سے اندر چلے آئے تھے۔ ان کا رخ سیدھا ابراہیم صاحب کے کمرے کی طرف تھا۔ کتنی ہی منتوں کے بعد وہ ابراہیم ملک کو ان کے کمرے سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

انہیں اپنے ساتھ لیے وہ مہر کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ جہاں ساری خواتین موجود تھیں۔ سب کی حیرت بھری نظروں کے جواب میں انہوں نے

صرف تموز کے موبائل کے ملنے اور اس کے دوست مارک کی کال کے آنے کا ذکر کیا تھا۔ اور پھر انہوں نے مارک کو کال کر کے اسے تموز کی فیملی کی اپنے ساتھ موجودگی کے بارے میں بتایا تھا۔ مارک کا نام سن کر ابراہیم ملک چونک گئے تھے۔ وہ اسے Yale کے حوالے سے جانتے تھے۔ صغیر صاحب نے اس سے ساری بات نئے سرے سے دہرانے کی درخواست کرتے ہوئے، موبائل کا اسپیکر کھول دیا تھا۔

مارک نے دھیرے دھیرے گزرے تین سالوں کو لفظوں میں ڈھالنا شروع کیا تھا۔ سوزی سے اس کی شادی کا سن کے مہر کی آنکھوں سے آنسو قطروں کی صورت گرنے لگے تھے۔ کچھ یہی کیفیت انجم بیگم کے دل کی بھی تھی۔ انہیں یہاں سولی پہ لٹکا کے اس نے کتنے آرام سے وہاں اپنی من چاہی دنیا بسالی تھی۔ اس وقت جب مہر یہاں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنی ماں تک سے نجانے کون کون سے جھوٹ بولتی پھر رہی تھی۔ تب وہ وہاں خوشیوں کے ہنڈولے میں اپنی محبت کے ہمراہ جھول رہا تھا۔ تموز نے واقعی اپنا کہا نبھایا تھا۔ اس نے دورہ کر بھی اپنی ذات سے مہر کو کوئی خوشی نہیں ملنے دی تھی۔

لیکن جوں جوں مارک کی گفتگو لورین کی طرف پیش رفت کرتی گئی تھی۔ سب سننے والوں کے رنگ بدلتے چلے گئے تھے۔ اس کا تموز کو لوٹنا اور نیم مردہ حالت میں کچرے کے ڈھیر پہ پھینک جانا، سب ہی کی سانس روک گیا تھا۔ یہ احساس کہ وہ رات بھر انتہائی زخمی حالت میں، لاوارثوں کی طرح کوڑے پر پڑا رہا تھا، سب کا دل نچوڑ گیا تھا۔ حتی کہ ابراہیم ملک کا چہرہ بھی مارے ضبط کے سرخ ہو گیا تھا۔ مارک کی اپنی آواز بھی اس وقت کو یاد کر کے بھر آئی تھی۔

اور پھر تموز کا خوف، اس کی تڑپ اور اس کا پچھتاوا سن کر تو وہ سب ہی دنگ رہ گئے تھے۔ کیا اس جیسے سنگ دل اور خود پرست آدمی کی کایا پلٹ بھی ممکن تھی؟ یہ اذیت ناک حادثہ تموز ابراہیم کے لیے سزا تھی یا رحمت، وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بے شک اللہ کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ وہ کب کسی فاسق کے دل کے بدلنے کا سامان پیدا کر دے، کوئی نہیں جانتا۔

"پلیز سر! میری آپ سے درخواست ہے کہ اسے مزید مت آزمائیں۔ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے اپنے کیے کی سزا بھگت لی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے اسے معاف نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ اپنا بیٹا ہمیشہ کے لیے نہ کھو دیں۔" مارک کی بات پہ انجم تڑپ اٹھی تھیں۔

"اللہ نہ کرے۔ خدا نہ کرے!" وہ دوپٹے میں منہ چھپائے زور زور سے رونے لگی تھیں۔ ان کے رونے کی آواز مارک نے بھی سن لی تھی۔ دل گرفتی سے الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

بے اختیار ایک گہری سانس لیتے ہوئے صغیر صاحب نے ایک نظر حاضرین محفل پہ ڈالی تھی۔ اور

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
"میں ثموز کو لے کر آتا ہوں۔" ان کی بات پر سب نے انہیں دیکھا تھا۔ مگر کہا کچھ نہ تھا۔ اور ان کے اطمینان کو یہ خاموشی بہت تھی۔
وہ تیز قدموں سے چلتے باہر آئے تھے۔ اور گیٹ کھول کر انہوں نے ثموز کی تلاش میں اردگرد دیکھا تھا۔ مگر اسے کہیں نہ پا کے وہ ایک بار پھر اندر چلے آئے تھے۔ اس کی غیر موجودگی کی اطلاع نے سب کو نئی پریشانی میں گرفتار کر دیا تھا۔
صغیر صاحب نے ایک بار پھر مارک سے رابطہ کیا تھا۔ اور اس سے ہوٹل کا نام پوچھا تھا۔ جہاں ثموز نے قیام کیا تھا۔
ہوٹل کا پتا لے کر صغیر قاضی' دل شیر کو لے کر نکل گئے تھے۔ اس دوران ابراہیم صاحب نجانے کن سوچوں میں ڈوبے بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ مہر بھی بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے گم صم سی ہو گئی تھی۔
سب کچھ اتنا اچانک اور اتنا عجب تھا کہ اس کا ذہن یک لخت ایک خالی سلیٹ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اسے آنے والے وقت کے حوالے سے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
ادھر رات کے اس پہر صغیر صاحب کو بہت مشکل سے ہوٹل کے اندر جانے کی اجازت ملی تھی۔ مگر ثموز کو وہاں بھی نہ پا کے صغیر صاحب بری طرح پریشان ہو گئے تھے۔ اسی پریشانی میں وہ واپس ملک صاحب کی طرف آئے تھے۔ ثموز کی ہوٹل سے بھی غیر موجودگی کی خبر نے گھر والوں کو متوحش کر دیا تھا۔ انہوں نے اردگرد کا سارا علاقہ چھان مارا تھا' مگر ثموز کا کہیں پتا نہیں چلا تھا۔ اسی پریشانی میں رات تمام ہوئی تھی اور اگلا دن نکل آیا تھا۔ مگر یہ دن بھی شدید مایوسی کی نذر ہوا تھا۔ ثموز اچانک کہاں چلا گیا تھا' کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ گھر میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ رات تک ابراہیم ملک کا حوصلہ بھی جواب دے گیا تھا۔ اور بالآخر انہوں نے پولیس سے رابطہ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆
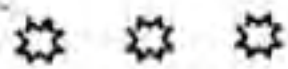
حنان ابھی ابھی صغیر قاضی کے ساتھ ابراہیم صاحب کی طرف سے لوٹا تھا۔ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلے جانے سے وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے صغیر صاحب کے اپنے کمرے میں جانے کا بے چینی سے انتظار کیا تھا۔ اور جب ان کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی —— تب وہ لاؤنج سے اٹھ کر دبے قدموں ٹیرس پہ چلا آیا تھا۔
اب اسے اس کی بدقسمتی کہیں یا کچھ اور کہ صغیر صاحب کپڑے تبدیل کر کے' کچھ دیر لان میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے ارادے سے کمرے سے دوبارہ باہر چلے آئے تھے۔ ان کا رخ نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ لیکن اچانک انہیں اردگرد چھائی خاموشی میں ٹیرس کا دروازہ کھلنے اور آہستگی سے بند ہونے کی آواز نے اپنی جگہ پہ رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے ٹھٹک کر اوپر جاتے زینے کی طرف دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے چیک کرنے کے ارادے سے تیزی سے اوپر کو بڑھ گئے تھے۔
احتیاط سے چھت کا دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے ٹیرس پہ جھانکا تھا۔ جو اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے اوپر داخل ہوئے تھے۔ ان کا ہاتھ دروازے کے ساتھ ہی دیوار میں لگے سوئچ کی طرف بڑھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ لائٹ جلاتے انہیں پانی کی ٹنکی کے دوسری طرف سے حنان کے بولنے کی آواز آئی تھی اور وہ بری طرح چونک گئے تھے۔
حنان اس وقت یہاں اندھیرے میں کیا کر رہا ہے؟
دل میں سوچتے ہوئے وہ اسے دیکھنے کی نیت سے چاند کی روشنی میں ہی آگے بڑھے تھے۔ وہ ٹنکی کے قریب پہنچے تھے کہ دوسری طرف سے حنان کی آواز نے انہیں اپنی جگہ پہ ساکت کر دیا تھا۔
"دیکھ فیض! معاملے میں پولیس انوالو ہو گئی ہے۔ تجھے جلد از جلد اس سے دستخط لینے ہوں گے۔" اور صغیر قاضی کی مارے بے یقینی کے سانس رک گئی تھی۔
"کیا حنان ثموز کے بارے میں بات کر رہا تھا؟"

ڈوبتے دل کے ساتھ انہوں نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔ جبکہ حنان لحظہ بھر کو رک کے دوسری طرف کی بات سننے لگا تھا۔

"کیا کہا۔ اب بھی نہیں مان رہا؟ اتنی مار پیٹ کے باوجود بھی؟" ثموز کا تا حال اپنی بات پہ ڈٹے رہنے کی اطلاع نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ "ٹھیک ہے' پھر مارو اس کی ٹانگ میں ایک گولی تاکہ یہ اس طلاق نامے پر دستخط کرے۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا تھا اور صغیر صاحب کی آنکھوں کے سامنے زمین آسمان گھوم گئے تھے۔

یہ کیسا بھیانک انکشاف تھا۔ ثموز کے غائب ہونے میں ان کے بیٹے کا ہاتھ تھا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ بے اختیار ان کے کانوں میں حنان کی آواز گونجنے لگی تھی۔

"میں مہر کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ۔ میں مہر سے محبت کرنے لگا ہوں۔" اور صغیر صاحب نے اپنا چکراتا سر تھام لیا تھا۔

"او خدایا! تو اس لڑکے نے یہ ذلیل حرکت مہر کو حاصل کرنے کے لیے کی ہے؟ یہ ان دونوں میں زبردستی طلاق کروانا چاہتا ہے؟" ان کی رگوں میں خون کی جگہ یکایک لاوا دوڑنے لگا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ اور تیز قدموں سے آگے بڑھے تھے۔

ان کی آمد سے بے خبر حنان' فیض کو ہر حال میں یہ معاملہ کل شام تک نبٹانے کی تاکید کر رہا تھا۔ مگر اپنے پیچھے اچانک قدموں کی دھمک سن کے وہ سرعت سے پلٹا تھا۔ اور باپ کو اپنے روبرو پا کے اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"ذلیل! کمینے!" ان کا ہاتھ اٹھا تھا اور وہ یکے بعد دیگرے دو تین تھپڑ حنان کے منہ پر مارتے چلے گئے۔

"تو میرا بیٹا ہو کر اتنی گری ہوئی حرکت کرے گا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔" حلق کے بل چلاتے ہوئے ان کی آنکھیں مارے غضب کے ابل پڑی تھیں۔ حنان کا چہرہ بالکل فق ہو گیا تھا۔

صغیر صاحب نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے موبائل پکڑتے ہوئے کان سے لگایا تھا۔ مگر دوسری طرف بھی شاید ان کی آواز سن لی گئی تھی۔ تب ہی کال کاٹ دی گئی تھی۔ انہوں نے ایک خون آشام نگاہ بت بنے حنان پہ ڈالی تھی۔ اور پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ انہیں جاتا دیکھ کر حنان کو جیسے ہوش آگیا تھا۔ وہ متوحش سا ان کے پیچھے لپکا تھا۔

"ڈیڈی! پلیز ڈیڈی میری بات سنیں!" مگر وہ اس کی پکار نظرانداز کیے قدم اٹھاتے جا رہے تھے۔ بالآخر حنان کو ہی بھاگ کر ان کی راہ میں آنا پڑا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیرس کی لائٹ جلادی تھی۔ روشنی میں اس کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی صغیر صاحب کی مٹھیاں سختی سے بھینچ گئی تھیں۔

"حنان میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گا۔" ان کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔

"پلیز ڈیڈی ایک بار۔ صرف ایک بار میری بات تو سنیں۔" اس کی آواز میں التجا ہی التجا تھی۔

"تمہاری اور میری بات اب صرف اور صرف پولیس کے سامنے ہوگی۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ قطعیت سے بولے تو حنان کی روح فنا ہو گئی۔

"پلیز ڈیڈ یہ نہ کیجیے گا۔ میری۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

"تو تمہیں ثموز اور مہر کی زندگی تباہ کرتے شرم نہیں آئی خبیث انسان؟" یک لخت دھاڑتے ہوئے انہوں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ ان کے سوال نے حنان کو نظریں جھکانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"ساری زندگی تم اس بھلی عورت کے صبر کو آزماتے رہے۔ مگر اس نے اپنی ماں کا ہاتھ تمہارے سر سے نہیں اٹھنے دیا۔ اس معصوم اور یتیم بچی کو اپنی نفرت کی آگ میں جھونکتے رہے مگر اس نے کبھی تمہارے رویے کی مجھ سے شکایت نہیں کی۔ اور آج تم اس سادہ دل لڑکی کا گھر' اپنی نام نہاد محبت کے نام پہ

اجاڑنے چلے ہو؟ ارے تم میں خدا کا خوف ہے یا نہیں؟ انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"میں اس سے محبت کرتا ہوں ڈیڈی۔ میں مہر کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اس نے شکستگی سے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"محبت؟ محبت کے مفہوم سے آشنا بھی ہو تم؟" ان کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ پھیل گئے تھے۔

"محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے حنان۔ یہ بہت سی خاموش قربانیوں کا نام بھی ہے۔ مہر ایک شادی شدہ لڑکی ہے پھر تم نے اپنے جذبات اس سے منسوب کیوں کیے؟ کیوں اس گناہ کا ارتکاب کیا؟"

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں اسے تب سے چاہتا ہوں جب مجھے اس کے نکاح کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔" اس انکشاف پہ صغیر صاحب ایک پل کو خاموش ہو گئے تھے۔

"لیکن جب علم ہو گیا تھا۔ تب تمہیں اپنے قدم روک لینے چاہیے تھے۔" ان کا لہجہ بوجھل ہوا۔

"کیوں روک لیتا؟ اس تموز نے مہر کو دیا ہی کیا ہے؟" حنان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

"تموز نے مہر کو کچھ دیا ہے یا نہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہارے لیے غور طلب بات صرف یہ ہونی چاہیے کہ کیوں ہم سب کی ہر طرح کی زور زبردستی کے باوجود مہر کبھی اپنے شوہر کا نام 'اپنے نام سے الگ کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئی۔ کیا تموز بہت چاہنے والا اور قدر دان شوہر تھا؟ نہیں۔ وہ مہر کی محبت تھا اس لیے۔" اور حنان باپ کی طرف دیکھتا تھم سا گیا تھا۔

"مہر کے دل و دماغ پہ صرف ایک ہی شخص کا راج ہے اور آج سے نہیں سالہا سال سے ہے۔ وہ اس کی کم عمری کا اولین خواب ہے۔ وہ اس سے لڑ سکتی ہے۔ منہ موڑ سکتی ہے مگر اس تعلق کو فنا نہیں کر سکتی۔ ایسی صورت حال میں تم اگر اسے حاصل کر بھی لو گے تو کیا اس کے دل پہ اپنا نام لکھ پاؤ گے؟ کیا اسے سرتاپا اپنا بنا پاؤ گے کبھی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تو حنان کے اندر حقیقت کی تلخ گرد اڑنے لگی۔

"نہیں حنان! تم ایسا کبھی نہیں کر پاتے۔ مہر کی زندگی میں اگر تموز ابراہیم سرے سے موجود ہی نہ ہوتا۔ تب بھی تم کم از کم مہر احمد کے دل پہ اپنا نقش نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے گھر کی عزت کو' جسے تمہارے باپ نے اپنی بیٹی کا درجہ دے رکھا تھا۔ اسے وہ چوٹ پہنچائی جسے وہ کبھی چاہے بھی تو بھلا نہ سکے گی۔ پھر تم اب کس بل بوتے پہ یہ تماشا کر رہے ہو؟ تمہیں تمہاری انتہا پسندی نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تم اس کھیل میں اس دن ہی ہار گئے تھے جب تم نے اس نوعمر لڑکی کے وجود پہ پہلی آلودہ نگاہ ڈالی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ تم نے اپنی اس شکست کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔" پہلی بار زندگی میں پہلی بار اس کے ضمیر نے اس کا احتساب کیا تھا اور اس پہلی ہی کوشش میں وہ لاجواب ہو گیا تھا۔ اس خود احتسابی نے اس کی آنکھوں میں شکستگی کی نمی بکھیر دی تھی۔ جو مقابل کھڑے صغیر صاحب سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھائے اس کے قریب چلے آئے تھے۔

"مہر نے اپنی زندگی میں بہت تکلیفیں دیکھی ہیں حنان۔ خدارا تم تو اسے مزید تکلیف نہ دو۔" بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اس کا فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ حنان کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ آج صحیح معنوں میں اس کے ظرف اور اس کی محبت کا امتحان تھا۔ جس میں وہ پہلی بار یا تو باظرف ٹھہرنے والا تھا یا ہمیشہ کی طرح کم ظرف۔

یک ٹک فون کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں تیرتی نمی کو حلق میں اتارا تھا اور اگلے ہی لمحے ہاتھ بڑھا کر فون پکڑ لیا تھا۔ فیض کا نمبر ملاتے ہوئے اس کے دل میں درد اٹھا تھا۔ ٹیسیں مار رہا تھا مگر آج اس جیسے ضدی اور اکھڑ نے اپنی آرزوؤں کے جام کو توڑ کر مہر احمد سے وفا کی ٹھان لی تھی۔

لو آج سے ہم بھی رسم وفا کے اسیر ٹھہرے
لو آج ہم نے تمہیں آزاد کردیا

☼ ☼ ☼
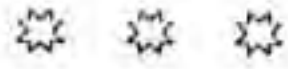
قطرہ قطرہ زندگی ثمروز ابراہیم کے زخموں اور نیلوں سے چور وجود میں اتاری جارہی تھی۔ جو دواؤں کے زیر اثر اسپتال کے بستر پہ بے سدھ سو رہا تھا۔

وہ اذیت ناک راتوں کے بعد نکلنے والا دن' ان کی پریشانی کو سمیٹ لے گیا تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب ایک نامعلوم گاڑی ثمروز کے بے ہوش وجود کو ابراہیم صاحب کے گھر کے باہر پھینک گئی تھی۔ جسے کوئی گھنٹے بھر بعد باہر نکلنے والے دل شیر نے پہچان کر شور مچا دیا تھا۔ آن واحد میں وہ سب بے قرار سے دوڑے چلے آئے تھے۔ اس کی حالت نے ہر غم' ہر درد بھلا دیا تھا۔ ابراہیم ملک بیٹے کو گاڑی میں ڈال کر دیوانہ وار اسپتال کی جانب بھاگے تھے۔ پیچھے ہی دوسری گاڑی میں مہر' ماں' بہنوں اور ساس کو لے کر بھاگی تھی۔

ثمروز کی حالت بے حد خراب تھی۔ اسے دو دنوں سے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ مسلسل ذہنی اور جسمانی اذیت کی وجہ سے اس کا نروس سسٹم اچھا خاصا متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے "فوراً" سے پیشتر آئی سی یو میں منتقل کردیا تھا۔ اس کی واپسی کی خبر پاکے صغیر صاحب بھی اسپتال دوڑے چلے آئے تھے۔ حنان میں چونکہ مہر کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اس لیے وہ باپ کے ساتھ نہ آیا تھا۔ پولیس بھی ثمروز ابراہیم کے مل جانے کی اطلاع پر وہاں پہنچ گئی تھی۔ اسے لے جانے والے کون تھے' ان کا کیا مقصد تھا؟ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا اور جو جانتا تھا وہ دل میں اپنے اللہ کے حضور اپنے بیٹے کے لیے معافی کا خواستگار تھا۔

مہر جی بھر کے آنسو بہانے کے بعد' دیوار سے سر ٹکائے' غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ ثمروز کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے خوف نے ان دو دنوں میں اس کی حالت غیر کرڈالی تھی اور اب جبکہ وہ مل گیا تھا تو اس کے دل پہ وہی جمود ایک بار پھر چھانے لگا تھا' کیا چاہتی تھی وہ؟ کیا کر رہی تھی وہ؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی گزشتہ دنوں کی تڑپ پہ وہ خود کو شاباش دے یا اپنی ذات پہ نفرین بھیجے۔ اپنی تضحیک' اپنا روندے جانا اور سب سے بڑھ کر سالہا سال ثمروز کے ہاتھوں بے وقوف بننا' وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی مگر جب بات ثمروز کی جان پر آئی تھی تو وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ کیا سچی محبت کرنے والے سب ہی اتنے بے حمیت اور بے وقعت ہوا کرتے ہیں یا صرف وہی تھی' جس میں انا یا خودداری نام کی کوئی چیز نہ تھی؟ حد تو یہ تھی کہ اب بھی وہ یہ سب باتیں سوچ ضرور رہی تھی مگر خود میں اتنی ہمت نہ پاتی تھی کہ اسے یہاں چھوڑ کر واپس لوٹ جاتی۔ کتنی عجیب بات تھی وہ اندر بے ہوش پڑا بھی مہر احمد کو خود سے باندھے رکھنے کی طاقت رکھتا تھا اور وہ باہر ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے بھی اسے دھتکارنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

"ایکسکیوزمی... آپ میں سے مہر کون ہیں؟" ڈاکٹر کی بات پہ وہ جیسے خود میں لوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر کے منہ سے اس کا نام نہ صرف اسے بلکہ سب ہی کو حیران کرگیا تھا۔

"میں ہوں ڈاکٹر صاحب..." وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو ڈاکٹر کی نظریں پل بھر کو اس کے چہرے پر آٹھہریں۔

"سر! آپ انہیں لے کر میرے روم میں آجائیں۔" ابراہیم صاحب کو مخاطب کرتے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ مہر' بابا کے ساتھ تیز قدموں سے چلتی ڈاکٹر کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ان کے نشست سنبھالنے پر ڈاکٹر نے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"سر! یہ آپ کی بہو ہیں؟"

"جی..." ابراہیم صاحب کی الجھن تاحال برقرار تھی۔

"معذرت کے ساتھ... لیکن کیا آپ کے بیٹے اور بہو میں علیحدگی کا کوئی مسئلہ چل رہا ہے؟" انہوں نے رسان سے سوال کیا تو ابراہیم ملک کے ساتھ ساتھ مہر بھی بری طرح چونک گئی۔

"تھوڑی چپقلش ضرور ہے لیکن علیحدگی کی تو کوئی

بات نہیں ہوئی۔" ابراہیم صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ "مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"اس لیے کہ آپ کا بیٹا... نیند کی دواؤں کے زیر اثر بھی اپنی وائف کا نام لے رہا ہے اور کسی طلاق کے کاغذ پر دستخط سے انکار کر رہا ہے۔" ڈاکٹر کی بات پہ ابراہیم صاحب تو ساکت ہوئے ہی تھے لیکن مہر کا پورا جسم سن ہو گیا تھا۔

"تموز ابراہیم اور اس کے لیے بے چین...." بے اختیار اس کے کانوں میں وہ کاٹ دار الفاظ گونجنے لگے تھے، جنہوں نے اس کے دل کو یوں زخمی کیا تھا کہ لہو آج بھی رستا تھا۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ... اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا۔" مگر اس کے اللہ نے نہ صرف اسے پلٹنے پر بلکہ مہر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ وہ اسے کھلی آنکھوں سے دوبارہ دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ اللہ نے اس کی بند آنکھوں میں بھی مہر کے چھن جانے کا خوف منجمد کر دیا تھا۔ کیا اس سے بہتر بھی بھلا کوئی انصاف ہو سکتا ہے؟

☆ ☆ ☆

ابراہیم صاحب کے گھر میں رونق اپنے عروج پہ تھی۔ آج پورے پانچ دن بعد تموز کی اسپتال سے گھر واپسی ہوئی تھی۔

ہوش میں آجانے کے بعد تموز نے رو، رو کے اپنے ماں باپ سے معافی مانگی تھی اور انہوں نے اسے کیا کہنا تھا بھلا۔ وہ تو اسے پہلے ہی معاف کر چکے تھے۔ مہر البتہ اس کے ہوش میں آنے کا سن کر گھر لوٹ گئی تھی۔ سب نے اسے جاتے دیکھا تھا مگر کسی نے اسے کچھ نہ کہا تھا۔ اس کی واپسی کا سن کے تموز کو چپ لگ گئی تھی۔ آنے والے چار دن وہ اسپتال میں رہا تھا لیکن اس کا انتظار، انتظار رہا تھا۔ مہر دوبارہ نہیں لوٹی تھی۔ تموز کے اغوا کاروں کا کیا مطالبہ تھا اور اس پہ وہاں کیا گزری تھی۔ اس نے بتانے سے انکار کر دیا

تھا۔ وہ جو بھی تھے اور جس کے بھی بندے تھے۔ اس کے حق میں تو بھلا ہی کر گئے تھے۔ اس کے گھر والوں' خاندان والوں کے دل اس کے حق میں نرم ہو گئے تھے۔ اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ مارک کا بھی بے حد شکر گزار تھا۔ جس نے ایک بار پھر خود کو ایک بہترین انسان اور اس کا بہترین دوست ثابت کیا تھا۔ البتہ میر کی ذات اب تک اس کے لیے ایک سوالیہ نشان تھی۔ وہ کیا ٹھانے بیٹھی تھی' شمروز کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے تو اسے ان اولین لمحوں کے بعد اب تک دیکھا بھی نہ تھا۔ گھر آکر بھی اس کی نظریں بے قراری سے اسے تلاشتی رہی تھیں مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دی تھی اور کسی سے پوچھنے کا اس کا منہ نہیں پڑ رہا تھا۔

"بابا! میں تھک گیا ہوں۔ مجھے کسی کمرے میں لے چلیں۔" دل اور روح پہ بڑھتے بوجھ نے اس کے کمزور اعصاب کو بہت جلد تھکا دیا تھا۔ یہ گھر اگر اس کے لیے نیا تھا تو اس میں بھی وہ بھلا حق ملکیت جتانے کا حوصلہ کہاں رہا تھا۔

"چلو آؤ۔" ابراہیم صاحب نے آگے بڑھ کے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا اور اپنے ساتھ لیے لاؤنج سے باہر چلے آئے تھے۔ اسے زیادہ دقت نہ ہو اسی لیے انجم نے اس کے لیے نچلی منزل پہ ہی کمرہ سیٹ کیا تھا۔ کمرہ اس کی پسند کے عین مطابق تھا۔ روشن اور کشادہ۔

"فی الحال تمہاری ماں نے تمہارے لیے یہی کمرہ سیٹ کیا ہے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گے تو اپنی مرضی کا کمرہ دیکھ لینا۔" اور باپ کی بات پہ شمروز دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی یہ سوال نہ کر سکا تھا کہ اس کی بیوی کہاں اور کس کمرے میں ہے؟ آیا اس گھر میں موجود بھی ہے یا چھوڑ کر جا چکی ہے۔

"کچھ چاہیے کیا؟" اسے پریشان حال بیٹھا دیکھ کر ابراہیم ملک چونک گئے تھے۔

"چائے کا کہہ دیں بابا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتے کچن میں چلے آئے تھے لیکن وہاں ملازمہ کے ساتھ مہر کو دیکھ کر جھجک گئے تھے۔

"جی بابا؟" اس نے بریانی کی ڈش خالی کرتے ہوئے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"ہنی کے لیے اس کے کمرے میں چائے بھجوا دو بیٹا۔" اور وہ دھیرے سے "جی" کہتی پلٹ کر کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کی پشت کو بوجھل نظروں سے دیکھتے ہوئے ابراہیم صاحب ایک گہری سانس لے کر رہ گئے تھے۔ وہ انجم بیگم کے کہنے کے مطابق مہر کی زندگی کے ہر فیصلہ کا اختیار اسے سونپ چکے تھے۔ اب وہ اپنے حق میں کیا فیصلہ کرنے والی تھی یا کر چکی تھی' وہ نہیں جانتے تھے مگر سب کے ساتھ ساتھ ان کی بھی یہی دعا تھی کہ چاہے جو بھی فیصلہ ہو۔ ان کے بچوں کے حق میں باعث خیر ہو۔

دروازے پہ دستک کی آواز پر شمروز نے بنا آنکھوں سے بازو ہٹائے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔

"چائے۔" فقط ایک ہی لفظ گونجا تھا اور شمروز کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی روح کھینچ لی ہو۔ اس نے ایک جھٹکے سے بازو ہٹاتے ہوئے اپنی دائیں جانب دیکھا تھا اور حقیقتاً" پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

"مہر!" اس کی سرگوشی میں برسوں کی پیاس تھی۔ وہ بنا آنکھوں کا طلسم توڑے دھیرے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا یک ٹک خود کو دیکھے جانا مہر کو جھجک کر نگاہیں جھکانے پہ مجبور کر گیا تھا اور یہ منظر شمروز کو اس وقت کی یاد دلایا گیا تھا جب پہلی بار وہ اور مہر ائیرپورٹ پہ روبرو ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بے اختیار جھلملا اٹھی تھیں۔

"میری دعا ہے' اگر یہ کوئی خواب ہے تو میں ہمیشہ کے لیے سو جاؤں اور اگر یہ حقیقت ہے تو خدا میری آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بے خواب کر دے۔" اس کی آواز میں گھلی نمی مہر کے لبوں پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

"آپ بھول رہے ہیں شاید' میں وہی مہر ہوں۔ جس کی طرف آپ نے کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھنا تھا۔"

"صحیح کہہ رہی ہو مگر وہ ایک گرے ہوئے انسان کا گرا ہوا فیصلہ تھا اور تمہارا اسیر ہو کر لوٹایا جانا اور پروا لے کا فیصلہ ہے۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے سکون سے بولا۔ تو مہر کی حیرت نے اسے پلکیں اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

"اتنی گہری باتیں کہاں سے سیکھ لیں آپ نے؟"

"جب سے آگاہی نے در وا کیے ہیں اور جب سے ان بے لگام، بے حساب خواہشوں سے نجات پائی ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرایا تو مہر کی نظریں، آنسوؤں میں ڈوبے ان سنہری کانچ کے ٹکڑوں سے ہٹ کے اس تل پہ آٹھہری تھیں۔ جو اس کے مسکراتے ہی مہر کو ہمیشہ کی طرح کھلکھلا کے ہنستا محسوس ہوا تھا۔

"یہ تل..... بہت پسند ہے مجھے۔" اور شمروز کے لیے حیرت پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ کیسی فرشتہ صفت لڑکی تھی، نہ کوئی حرفِ ملامت، نہ بدلے میں تحقیر کا تحفہ، وہ ایک قدم اس کی جانب بڑھا تھا تو وہ دو قدم آگے چلی آئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس نرمی سے گویا وہ کانچ کی بنی ہو۔

"اور مجھے یہ ہاتھ....." نرمی سے اس کے موی ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے اگلے ہی لمحے انتہائی محبت سے انہیں ہونٹوں سے لگا لیا تو مہر کی پوری جان اس کے ہاتھوں میں سمٹ آئی۔

"یہ آنکھیں....." اس نے ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کو نرمی سے چوما تھا۔ مہر کی سانس اس کے سینے میں اٹک گئی تھی۔ "یہ چمکتی پیشانی" اس کے لبوں نے عقیدت سے اس کی پیشانی کو چھوا تھا اور مہر کا صبر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے بہتے اشک شمروز کو بری طرح نادم کر گئے تھے۔

"میں نے جس طرح تمہاری ذات اور تمہاری محبت کی تذلیل کی، جس طرح ہر آن تمہیں دھوکا دیا، اس کے لیے میں معافی کے لائق تو نہیں لیکن پھر بھی میری درخواست ہے تم مجھے معاف کر دو مہر!" اس کے آنسوؤں کو کرب سے دیکھتے ہوئے وہ ندامت سے چور لہجے میں بولا تو مہر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ شمروز کے لیے اس کی تڑپ کو مزید برداشت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کے سینے سے لگتے ہی وہ بچوں کی طرح بہ آواز بلند رونے لگی تھی۔

شمروز نے اسے کھل کر رونے دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے آنسو رکتے رکتے سسکیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

"اگر میں نے اپنے فیس بک پہ تصویریں نہ دی ہوتیں تو آپ مجھ تک کیسے پہنچتے ہنی؟" اس کے سینے سے سر اٹھاتے ہوئے مہر نے تشویش سے سوال کیا تو اس سادگی پہ شمروز بے اختیار ہنس پڑا۔

"تو اللہ تعالیٰ وہ کوئی اور راستہ نکال دیتا کیونکہ ایک بات تو طے تھی۔ اس نے مجھے تم تک لوٹانا ہی تھا۔ جانتی ہو کیوں؟" اس کے نفی میں سر ہلانے پر شمروز مسکرا دیا تھا۔

"کیونکہ تم میری پہلی اور آخری پناہ گاہ ہو..... آئی لو یو مہر شمروز!" اسے سینے سے لگاتے ہوئے اس نے اپنا پہلا اقرارِ محبت اس کے دامن میں ڈالا تھا۔ مہر نے آسودگی سے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔

"آئی لو یو تو شمروز ابراہیم!" اس کے رب نے اس کا گلہ دور کر دیا تھا۔ اس کا صبر رنگ لایا تھا اور اسے مکمل خوشیوں کی نوید سنا دی گئی تھی۔ مکمل اور بھرپور، بے اختیار مہر کے ذہن میں دو جملوں پر مبنی وہ تحریر گھوم گئی تھی جو آج صبح اسے حنان قاضی کی جانب سے موصول ہوئی تھی۔

"اپنی ضد میں، بہت شدت سے نفرت کی ہے تم سے اور پھر اسی ضد میں، بہت چاہا بھی ہے تمہیں۔ ہو سکے تو اس شدت پسندی کے لیے معاف کر دینا مجھے۔" یہ کیسے ممکن ہوا تھا۔ مہر نہیں جانتی تھی مگر خواہشوں کے اس کھیل میں فتح ہر طرف سے بہت خاموشی سے اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

یہی ہوتا ہے بے غرض اور بے لوث لوگوں کا انجام اور یہی ہے بجام آرزو کا اختتام۔

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

عبداللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی

ناولٹ

ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔
عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوادیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔
اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔
شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو

کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے۔ جو کسی مرد کی ہے۔

ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کرلے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

نویں قسط

ٹرین ایک دفعہ پھر رات کے سناٹے میں بھاگتی جارہی تھی۔ اکانومی کلاس کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے بختاور اور ہاشم کے چہروں پر محسوس کی جانے والی پریشانی اور افسردگی تھی۔ اسپتال میں ڈاکٹر ظہیر کے پہچاننے کے بعد ہاشم نے فوراً" ہی کراچی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا کیونکہ انہیں علم تھا کہ ڈاکٹر ظہیر کے ذریعے بختاور کے والدین کا وہاں تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ اگلے تین گھنٹوں میں اپنے سازوسامان کے ساتھ ایک دفعہ پھر ریلوے پر موجود تھے۔ ان کے اس طرح جانے پر صفدر کی بیوی کی خوشی دیدنی تھی اور اسی وجہ سے اس نے ساتھ لے جانے کے لیے کھانا بھی ٹفن میں باندھ دیا تھا۔

"ہم لوگ کہاں جائیں گے آخر؟" بختاور کو ہاشم کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر خوف سا محسوس ہوا۔

"لاہور۔"

"لیکن لاہور میں تو ہمیں تلاش کرنا ان کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔" بختاور نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" وہ پرسکون تھا۔ "وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہم لوگ کراچی میں ہی کہیں چھپ گئے ہیں۔"

"یہ آنکھ مچولی آخر کب تک چلے گی ہاشم۔" وہ بے

زار ہوئی' ویسے بھی آج کل اسے اپنی طبیعت عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

"میرا نہیں خیال' وہ لوگ مجھے ڈھونڈیں گے۔" بختاور نے کہا تو وہ چونکا۔ "تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو ؟"

"تم میرے باپ کو نہیں جانتے" وہ مجھے ڈھونڈنے سے زیادہ اس بات کا اعلان کرنے میں خوشی محسوس کریں گے کہ اچانک حادثے میں' میرا انتقال ہو گیا ہے۔" بختاور کے لہجے میں تلخی تھی۔

"اللہ نہ کرے۔" ہاشم نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا تو بختاور بے ساختہ مسکرا دی۔

"تمہیں پتا ہے لاہور میں ہم کہاں رہیں گے۔؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد ہاشم نے پراسرار انداز میں اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ٹلبرٹی میں میرے نام پر دو تین شاپس ہیں' ان کے اوپر ایک چھوٹا سا چوبارہ بنا ہوا ہے۔" ہاشم کی بات پر بختاور کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔

"ہم لوگ اپنے گھر میں رہیں گے۔؟" بختاور حیران لہجے میں بولی۔

"ہاں۔" وہ کھل کر مسکرایا۔

"لیکن وہاں تو کوئی بھی ہم تک پہنچ سکتا ہے۔" بختاور پریشان ہوئی۔

"نہیں۔" ہاشم مطمئن تھا۔ "یہ دنیا کی واحد جگہ ہے' جس کے بارے میں تمہارے اور میرے خاندان والے یہی سوچیں گے کہ ہم لوگ یہاں کبھی نہیں رہ سکتے۔"

"وہ کیسے۔؟" بختاور کی آنکھوں میں تعجب ابھرا۔

"اپنی ناک کے نیچے کون دیکھتا ہے یار۔" ہاشم اب مطمئن تھا۔ "میں نے کرایہ داروں سے کہہ دیا ہے کہ ایک ہفتے میں اسے خالی کر دیں۔"

"لیکن ایک ہفتہ ہم لوگ کہاں رہیں گے؟" اس کی پریشانی کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

"میرے ایک فرینڈ کے گھر۔" ہاشم کی بات نے اسے ایک دفعہ پھر خوف زدہ کیا' وہ تو ابھی تک صفدر کی بیوی کی تلخ باتوں کو نہیں بھولی تھی۔ ہاشم نے پھر سرعت سے اس کے ذہن میں ابھرتی سوچوں کو پڑھا۔

"ڈونٹ ٹیک ٹینشن' میرا فرینڈ بہت اسٹیبلش ہے اور ماڈل ٹاؤن میں خاصی بڑی کوٹھی ہے اس کی۔" ہاشم کی بات پر وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

"معاشی مسائل' بہت سے خوب صورت رشتوں کا حسن خراب کر دیتے ہیں' اگر صفدر کے حالات ٹھیک ہوتے تو اس کی بیوی کا رویہ بالکل بھی ایسا نہ ہوتا۔" ہاشم نے مسز صفدر کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔

"وہ خاتون تب بھی ایسی ہی ہوتیں۔" بختاور کو رخسانہ بھابھی کی طرف سے کوئی ایسی خوش فہمی نہیں تھی۔ "انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اوں ہوں۔ بری بات' ایسے نہیں کہتے۔" ہاشم کی مجبوری تھی کہ وہ کسی کے بارے میں بھی غلط گمان نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کا اپنا دل ریا اور کھوٹ سے پاک تھا' اس لیے وہ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا' اور اس کی آنکھوں پر ہمیشہ سے خوش گمانی کی پٹی بندھی رہتی تھی۔ بختاور نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ اسٹیشن پر گاڑی آچکی تھی اور ایک افرا تفری کا عالم تھا۔

☼ ☼ ☼

آپا صالحہ نے عدینہ اور مونا کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا اور دونوں کی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں' کیونکہ انہیں علم تھا کہ آپا کی لغت میں یہ ایک ناقابل معافی جرم تھا' لیکن دونوں کو ہی یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ آپا نے محض ایک نظر ان دونوں پر ڈالی' اس ایک نظر میں کیا نہیں تھا' شکوہ' گلہ' ناراضی اور صدمہ۔

"آئی ایم سوری آپا۔" عدینہ کے منہ سے لفظ ٹوٹ کر نکلے۔ آپا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ خاموشی سے جھکیں اور اپنے قدموں میں گرا ہوا نکاح نامہ اٹھایا اور صدمے بھرے انداز سے چلتی ہوئی ٹرنک کے پاس آکر رک گئیں۔ انہوں نے آس پاس گری ہوئی چیزیں خاموشی سے اٹھائیں اور صندوق میں ڈال دیں۔ اس کے بعد پاس رکھا ہوا تالا اٹھا کر صندوق کو لگایا اور جس خاموشی سے اندر داخل ہوئی تھیں' اسی طرح اسٹور سے نکل گئیں۔ عدینہ اور مونا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔

"عدینہ باجی! اب کیا ہوگا؟" مونا کی آنکھوں میں یہ پریشان کن سوال ابھرا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔" عدینہ کا اپنا دل اندیشوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس نے پھر بھی مونا کو تسلی دی۔

"میرا خیال ہے' ہمیں آپا کی کھوج سے باہر نکل آنا چاہیے۔" اپنے کمرے میں آتے ہی مونا نے اپنے خیالات کا اظہار بے فکری سے کیا۔ عدینہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا' اس کا ذہن ابھی تک اس نکاح نامے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہی تھی کہ کاش اس نے اسے ایک نظر دیکھ لیا ہوتا۔ اس واقعے کے بعد عدینہ اور آپا صالحہ کے درمیان ایک دفعہ پھر اجنبیت کی خلیج حائل ہوگئی تھی۔ آپا صالحہ نے ایک دفعہ پھر اسے مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب کہ عدینہ کچھ دن تو پریشان رہی اور پھر سر جھٹک کر قرآن پاک حفظ کرنے میں مگن ہوگئی' جس دن اس کی ختم القرآن کی تقریب تھی' اس سے اگلے دن اس کا میڈیکل کا دوبارا سے انٹری ٹیسٹ تھا۔

"آپا! میرے لیے دعا کیجیے گا۔" دو مہینے کے بعد عدینہ نے ڈرتے ڈرتے ان سے کہا۔

"اچھا۔" آپا نے ایک لفظ میں قصہ نبٹایا۔

"آپ مجھ سے خفا ہیں ناں؟" عدینہ نے اس دن ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔

"تم سے خفا نہیں ہوں عدینہ! لیکن تم نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔" ان کا رنجیدہ انداز عدینہ کا دل دکھا گیا۔

"آئی ایم سوری آپا۔" وہ دل سے شرمندہ ہوئی۔

"تمہیں اپنی ماں پر اعتبار نہیں ہے شاید۔ تمہیں لگتا ہے کہ تمہاری ماں کے ماضی میں کوئی ایسا راز چھپا ہوا ہے جسے جاننا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ ہے ناں؟"

"ایسی بات نہیں ہے آپا۔" عدینہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آپا کی شکوہ کناں نگاہوں سے دور جاکر کہیں چھپ جائے۔

"یقین مانو' میں نے زندگی میں صرف ایک قدم غلط اٹھایا تھا اور انجانے میں اٹھائے گئے اس قدم کا خمیازہ ساری زندگی بھگتا ہے۔ پچھتاووں کی دھوپ نے میرے سارے وجود کو جھلسا کر رکھ دیا تھا' لیکن جب تم پیدا ہوئیں تو مجھے یقین آگیا' اللہ مجھ سے اتنا بھی خفا نہیں ہے' ورنہ وہ مجھے اپنی رحمت سے کیوں نوازتا۔"

آپا صالحہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ عدینہ کو رنجیدہ کررہے تھے۔

"پوچھ لو آج' تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟" آپا صالحہ نے سپاٹ نگاہوں سے اپنی اکلوتی اولاد کی طرف دیکھا۔

"مجھے کچھ نہیں پوچھنا آپا۔" عدینہ کے منہ سے پھسلا۔

"سوچ لو۔" آپا نے اسے ایک اور موقع دیا۔ تھوڑے فاصلے پر بیٹھی مونا نے اسے ہاتھ سے کئی اشارے کیے' لیکن عدینہ آج کسی اور ہی رنگ میں تھی۔

"ایک بات کی تسلی رکھو' تم کسی بدکردار عورت کی بیٹی نہیں ہو۔" آپا نے اس کی پیٹھ میں ایک گرم سلاخ گھونپی۔

"میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"پھر اپنی ماں کی کھوج لگانا چھوڑ دو' اسلام بھی خوامخواہ کے تجسس اور ٹوہ لگانے کے عمل کو پسند نہیں کرتا۔" آپا صالحہ کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی در آئی۔

"مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دیں۔" عدینہ نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"ہاں پوچھو" وہ مطمئن تھیں۔

"میرا باپ کون تھا۔؟"

"مولوی رفیق احمد۔" آپا صالحہ کے حلق سے ایک پر سکون سانس خارج ہوئی۔ "بس یہی پوچھنا تھا۔؟"

"ہاں۔" عدینہ اب اطمینان بھرے انداز میں کھڑی ہو گئی' اسے اب واقعی ان سے کوئی سوال نہیں کرنا تھا۔ اسے اس سوال کے بعد اپنی ماں کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ "آپ فرید چچا سے کہہ دیں کہ کل مجھے بس پر بٹھادیں۔؟"

"میں خود چلوں گی تمہارے ساتھ ٹیسٹ دلوانے۔"

آپا صالحہ کی بات پر وہ بری طرح چونکی۔ "آپ ؟"

"ہاں' میں۔" آپا صالحہ نے پر اعتماد انداز میں جواب دیا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" عدینہ نے سنجیدگی سے سرہلایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ آئی۔

"افوہ عدینہ باجی! اس کتبے کے بارے میں تو پوچھتیں۔" مونا نے اسے دیکھتے ہی جھنجلا کر کہا۔

"میں اپنی وجہ سے آپا کو کسی مشکل یا اذیت میں نہیں ڈالنا چاہتی مونا۔ بہتر ہو گا کہ تم بھی ان ساری باتوں کو بھلا دو۔" عدینہ کی صاف گوئی مونا کو اچھی نہیں لگی۔

"کم از کم یہ تجسس تو ختم ہو جاتا۔" مونا برا سامنہ بنا کر بولی۔

"مجھے اب کوئی سسپینس نہیں رہا' تم بھی اب صرف اپنی اسٹڈی کی طرف توجہ دو۔" عدینہ نے سنجیدہ انداز میں مونا کو مشورہ دیا تو وہ بس سرہلا کر رہ گئی' کیونکہ اسے علم تھا کہ اب عدینہ کے ساتھ بحث کرنا فضول ہے' کیونکہ وہ جس بات کا ارادہ کر لیتی تھی' پھر اس پر ڈٹ جاتی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ تم آرمی میڈیکل کالج میں جاؤ۔" انٹری ٹیسٹ والے دن آپا صالحہ نے عجیب سی فرمائش کی۔

"وہ کیوں آپا ؟"

"میں تمہیں ان کے مخصوص یونیفارم میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" ان کے لہجے میں ہزاروں حسرتیں پنہاں تھیں۔

"آپ کو خاکی رنگ کی ساڑھی اچھی لگتی ہے کیا ؟" عدینہ مسکرائی۔ آرمی میڈیکل کالج کی طالبات کا ساڑھی مخصوص یونیفارم تھا۔

"ہاں۔ اس یونیفارم نے بہت دن تک کسی کی نیندیں اڑائے رکھی تھیں' مجھے ان نیندوں کا قرض اتارنا ہے۔" وہ بینچ سے ٹیک لگا کر افسردگی سے گویا ہوئیں۔

"آپا' انشاء اللہ میں وہاں کا ٹیسٹ بھی ضرور دوں گی۔" عدینہ نے اب ان سے سوال جواب کرنا چھوڑ دیے تھے۔ اس کی تسلی پر ایک مبہم سی مسکراہٹ آپا صالحہ کے ہونٹوں پر آئی اور پھر معدوم ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ جون کی ایک تپتی دوپہر تھی جب سورج' آسمان سے آگ برسا رہا تھا۔ چرند پرند ہر کوئی اپنے اپنے ٹھکانے میں دبکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر حماد کے پورشن میں آج صبح سے ہر چیز پر سوگواریت طاری تھی کیونکہ آج بینش کی والدہ کی پانچویں برسی تھی۔ بینش اپنی والدہ کی تصویر ہاتھ میں پکڑے افسردگی کا اشتہار بنی ہوئی تھی' جب آغا جی نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ صبح سے خاصی رنجیدہ ہے اور وقفے وقفے سے رونے کا سلسلہ بھی جاری تھا' لیکن آغا جی اس معاملے میں بالکل بے بس تھے کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ بینش اپنی والدہ کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے۔

"بیا' ذرا باہر آؤ بیٹا' دیکھو تو کون آیا ہے۔" انہوں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور سنجیدگی سے بینش کو پکارا۔

"آغا جی! میرا دل نہیں کر رہا ہے۔" وہ حد درجہ سوگوار تھی اور کچھ صبح صبح اس کی اپنے منگیتر تیمور سے بھی ہلکی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس لڑائی کے بعد بھی اسے شدت سے اپنے اکلوتے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ دوسرے پورشن میں اس کے تایا کی فیملی تھی اور تایا کی دو بیٹیاں ’ڈیزی‘ طیبہ اور اکلوتا بیٹا تیمور تھا۔ وہ تینوں کسی بھی لڑائی کے موقعے پر متحد ہو جاتے اور بینش کو اکیلا چھوڑ دیتے۔

"تم ہمیشہ اپنے اکلوتے ہونے کا گلہ کرتی تھیں ناں۔" آغا جی کی بات پر وہ ہلکا سا چونکی۔

"دیکھو، میں نے تمہاری تنہائی دور کرنے کے لیے کسے بلوایا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" آغا جی کی بات پر وہ بادل نخواستہ اٹھی۔

"آغا جی! آخر کون آیا ہے؟" بینش کا اس وقت کسی سے بھی ملنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"تم دیکھو گی تو پتا چل جائے گا۔" آغا جی مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئے، بینش کو اندر داخل ہوتے ہی خوشگوار حیرت ہوئی۔ سامنے ان کی زمینوں کا حساب کتاب کرنے والے منشی چچا بیٹھے تھے، ان کے ساتھ بینش کی ہم عمر ایک دلکش خدوخال کی حامل لڑکی بیٹھی تھی، جس کے چہرے پر اسے دیکھتے ہی ایک دوستانہ مسکراہٹ ابھری۔

"یہ بندیا ہے، تمہارے منشی چچا کی منجھلی بیٹی۔" آغا جی نے مسکرا کر اس لڑکی کا تعارف کروایا۔

"السلام علیکم۔" بینش نے سنجیدگی سے سلام کیا تو اس لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں چمک در آئی۔ وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ماشاء اللہ بیٹا رانی تو خوب بڑی ہو گئیں۔" منشی چچا نے اٹھ کر بینش کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"الحمد للہ، میڈیکل کے پہلے سال میں ہے۔" آغا جی نے فخریہ لہجے میں اطلاع دی۔

"تو بیٹا اس بے وقوف کو بھی کچھ عقل دو، مر مر کر ایف اے کیا ہے اس نے۔" منشی چچا کی بات پر بینش نے ان کے ساتھ بیٹھی اس بے وقوف کو دیکھا، جس کی شہابی رنگت، سیاہ لان کے عام سے سوٹ میں بھی دمک رہی تھی۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں اور ہونٹوں کا خوب صورت کٹاؤ اور ہونٹ کے اوپر دائیں طرف ایک چھوٹا سا تل تھا۔ وہ اچھی خاصی حسین لڑکی تھی۔

"بندیا، اب تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔" آغا جی کی بات پر بینش کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

"وہ کیسے؟" بینش کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وہ اس طرح کہ اس نالائق کا یہاں کالج میں ایڈمیشن کروانا ہے۔" منشی چچا نے ہلکے پھلکے انداز میں بتایا۔

"بینش! تم بندیا بیٹی کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔" آغا جی کے کہنے پر وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

"تمہاری امی نے تمہیں آنے کی اجازت دے دی؟" بینش نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

"ہاں، انہوں نے تو باقاعدہ شکرانے کے نفل ادا کیے تھے۔" بندیا کا بے تکلف انداز بینش کو اچھا لگا۔

"وہ کیوں بھلا؟" اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"ان کی پانچوں بیٹیوں میں، میں سب سے نکمی، کام چور، پھوہڑ اور سست جو تھی۔" بندیا نے اپنی خامیاں بڑے فخریہ انداز میں اس طرح سے بتائیں کہ بینش کو ہنسی آگئی، جبکہ بندیا بڑے مزے سے اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"بابا، مجھے بھجوانے کے حق میں نہیں تھے لیکن ڈاکٹر صاحب اور اماں کے کہنے پر مان ہی گئے۔" وہ اب بڑے آرام سے اپنی چوٹی کے بل کھول رہی تھی۔

"کیا آغا جی نے منشی چچا سے کہا تھا۔" بینش کی سمجھ میں آگیا تھا۔

"جی۔۔۔ وہ بتا رہے تھے کہ آپ اپنی والدہ کی وفات کے بعد بہت تنہائی محسوس کرتی ہیں۔" بندیا کی بات پر

تو وہ افسردہ ہوئی۔

"بس بابا نے جب میری گریجویشن کا ذکر کیا تھا' تو آپ کے والد نے فوراً" کہا کہ میں ہوسٹل کے بجائے ان کے گھر رہ لوں۔" بندیا نے تفصیلاً" بتایا۔

"ہیئر برش ہو گا آپ کے پاس۔۔۔" اس کی اگلی فرمائش پر بینش حیران رہ گئی۔

"اصل میں گرمی سے بال گردن سے چپک کر رہ گئے ہیں' بہت الجھن ہو رہی ہے مجھے۔" بینش نے آرام سے اٹھ کر اسے ہیئر برش پکڑا دیا' وہ اب بڑے لاپروا انداز سے اپنے بال کھول رہی تھی' جبکہ بینش کی توصیفی نگاہیں اس کے سلکی ریشمی بالوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا لگاتی ہو تم اپنے بالوں میں۔۔۔" بینش کے لہجے میں تجسس محسوس کر کے بندیا مسکرائی اور اس نے بینش کی طرف غور سے دیکھا' اس کے اپنے بال خاصے ہلکے اور بمشکل کندھوں تک ہی آتے تھے۔

"میں کہاں لگاتی ہوں' سارے اماں کے ہی شوق ہیں' ہر ہفتے آملہ' ریٹھا' سیکا کائی بھگو کر ساری بہنوں کو زبردستی لگاتی تھیں۔" بندیا بے زاری سے اپنے بالوں میں برش کرتے ہوئے بینش کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔

"آپ اتنے بڑے گھر میں اکیلی کیسے رہ لیتی ہیں؟" بندیا نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے حیرت سے دریافت کیا۔

"اکیلی تو نہیں ہوں' ساتھ والے پورشن میں میرے تایا کی فیملی رہتی ہے۔" بینش نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن آپ کا پورشن بھی تو اچھا خاصا بڑا ہے' اس میں تو آپ تنہا ہی رہتی ہوں گی۔" بندیا نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔

"ظاہر ہے کہ میں آغا جی کی اکلوتی بیٹی جو ہوں۔" بینش کے لہجے میں ایک محسوس کی جانے والی افسردگی در آئی۔

"ہائے کتنا مزہ آتا ہو گا آپ کو۔" بندیا کے حسرت بھرے انداز پر وہ حیران ہوئی۔ "اپنی مرضی سے سارے کام کرتی ہوں گی' نہ کوئی روک ٹوک' نہ کوئی پابندی۔۔۔ ہمارے گھر میں تو اماں ہر وقت کسی جیلر کی طرح ہم سب بہنوں پر نظر رکھتی ہیں' مجال ہے بندہ کوئی کام اپنی مرضی سے کر لے۔" بندیا کے اپنے ہی خود ساختہ دکھ تھے۔

"لیکن میں تو اکیلی رہ کر بہت بور ہوتی ہوں' اصل میں میری اپنی تایا زاد کزنز سے کوئی خاص دوستی نہیں۔" بینش نے منہ بنا کر اسے بتایا۔

"چلیں اب تو میں آگئی ہوں' دونوں بہنیں مل کر موجیں کریں گے۔" بندیا کے منہ سے نکلنے والے لفظ "بہن" پر بینش کو خوش گوار سا جھٹکا لگا۔ اس نے بندیا کو کھلے دل سے اس گھر میں خوش آمدید کہا اور شام کو وہ اسے اپنی فخریہ پیش کش کے طور پر اپنے ساتھ لے کر بڑے ابا کے ہاں پہنچ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ارے یہ اتنی خوب صورت لڑکی کون ہے بیا کے ساتھ۔" ڈیزی آپی نے ٹی وی لاؤنج کی گلاس وال سے دیکھا۔ وہ لان میں بندیا کے ساتھ کھڑی کسی بات پر بے ساختہ ہنس رہی تھی۔ اس وقت وہ تینوں بہن بھائی اپنی والدہ کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ جہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

"اس کے ساتھ تو جو بھی کھڑی ہو گی خوب صورت ہی لگے گی۔" بڑی اماں نے گھریلو سامان کی لسٹ بناتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ انہیں اپنے میاں کی عام سی شکل و صورت کی حامل بھتیجی سے اچھی خاصی چڑ تھی' کچھ ان کے اپنے تینوں بچے گورے چٹے اور خوب صورت نقوش کے حامل تھے۔ ان تینوں میں تو بینش واقعی بہت عام سی لگتی تھی لیکن اس عام سی شکل و صورت کے ساتھ بھی اس نے سب کو اپنے آگے لگا رکھا تھا۔

"امی! آہستہ بولیں' بینش نے سن لیا تو جا کر ابا سے

شکایت لگادے گی۔" طیبہ نے اپنے جرنل سے نظریں ہٹا کر پریشان لہجے میں کہا۔ وہ ویسے بھی تینوں بہن بھائیوں میں خاصی ڈرپوک تھی۔

"تمہارے باپ کی تو چہیتی ہے۔ سارا دن تم لوگوں کی جھوٹی سچی شکایتیں جو لگاتی ہے۔" بڑی اماں نے ناک چڑھا کر اپنی لسٹ پر نظر دوڑائی۔

"آپ لوگوں کے ساتھ پرابلم کیا ہے، کیوں اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔" تیمور جو اسپورٹس چینل پر نظریں جمائے بیٹھا تھا ایک دم چڑ کر بولا۔

"دیکھ لیں امی، جب سے اس کی منگنی ہوئی ہے نا اس بیا سے، زیادہ ہی طرف داری کرنے لگا ہے اس کی۔" ڈیزی نے جھٹ سے ماں سے شکایت لگائی۔

"میں کوئی طرف داری نہیں کر رہا لیکن اس طرح کسی کی کم صورتی کا مذاق تھوڑی اڑاتے ہیں۔" بڑی بہن کے سامنے وہ اکثر دھیما پڑ جاتا۔

"تمہیں خود بھی کون سا بینش پسند ہے، صرف بڑے ابا کے کہنے پر ہی تو منگنی کی ہے۔" ڈیزی نے اسے یاد دلایا۔

"تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں اس کی شکل و صورت اور رنگت کا مذاق اڑانے لگوں۔" تیمور نے بے زاری سے کہا۔

"اس کی بدصورتی کی وجہ سے نہیں، اس کے مزاج کی وجہ سے چڑتے ہیں ہم۔ یاد نہیں ابا کو کیسے جا جا کر بھڑکاتی ہے ہمارے خلاف۔" ڈیزی نے یاد دلایا۔

"اور وہ بھی صرف اسی کی مانتے ہیں۔" طیبہ نے بھی لقمہ دیا۔

"ظاہر ہے تم تینوں نے تو اپنے باپ کو اچھا خاصا مایوس کیا ہے، کتنا شوق تھا انہیں اپنی ساری اولاد کو ڈاکٹر بنانے کا۔" بڑی اماں کو بھی اپنی اولاد کی نالائقی یاد آگئی۔

"بھئی مجھے تو سخت نفرت ہے میڈیکل سے۔" تیمور نے ٹی وی کا چینل تبدیل کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اور مجھے تو خون دیکھ کر ہی ابکائی آنے لگتی ہے۔" ڈیزی نے بھی عجیب سی شکل بنائی۔

"اسی لیے تو وہ بھتیجی پر فدا ہیں، وہ ان کا خواب جو پورا کر رہی ہے۔" بڑی اماں نے بے زاری سے کہا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں اماں! میرا تو مکمل ارادہ ہے میڈیکل میں جانے کا۔" طیبہ نے پرجوش انداز میں انہیں یاد دلایا۔

"ہاں... اسی لیے تو تمہاری کچھ سن لیتے ہیں وہ۔"

"میری طرف تو دیکھتے ہی ان کے ماتھے کی تیوریوں میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔" تیمور افسردہ ہوا۔

"تم نے بھی تو پورے دو سال انہیں دھوکا دیا، وہ سمجھتے رہے کہ تم ایف ایس سی پری میڈیکل میں ہو اور تم کالج میں اکنامکس، میتھس اور اسٹیٹس پڑھتے رہے۔" ڈیزی نے ہنستے ہوئے یاد دلایا۔

"اور جس دن پتا چلا تھا انہیں، یاد ہے کتنا بڑا طوفان آیا تھا۔" سی اے کا اسٹوڈنٹ تیمور اس دن کا واقعہ یاد کر کے مسکرایا۔

"میرے اتنے مہنگے فرانس کے ڈنر سیٹ کی پوری چار پلیٹیں توڑی تھیں انہوں نے، مجھ سے پوچھو۔" ان کی اماں جل کر بولیں۔

"اماں اتنے سال ہو گئے اور آپ کو ابھی تک وہ ڈنر سیٹ نہیں بھولا۔" ڈیزی کھلکھلا کر ہنسی تو اماں کو اس موقع پر اس کی ہنسی زہر لگی۔

"ظاہر ہے میرے جہیز کا ڈنر سیٹ تھا وہ، کیسے بھولتا مجھے۔ میرے والد فرانس سے خرید کر لائے تھے۔" اماں کے لہجے میں رنجیدگی در آئی۔

"اماں پلیز... آپ چھوڑیں ان پلیٹوں کو، آپ ابا سے بات کریں نا، میرا ایڈمیشن کروا دیں ایم ایس سی کیمسٹری میں..." ڈیزی فوراً" ہی ان کے پاس آن بیٹھی۔

"نا بابا نا... اپنی جنگ خود لڑو، وہ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ میں نے سارے بچوں کی بے جا طرف داری کر کے انہیں بگاڑ رکھا ہے۔" انہوں نے صاف انکار

کیا۔
"مجھ سے تو پچھلے دو سال سے خفا ہیں کہ میں نے اپنا میرٹ کیوں نہیں بنایا ایف ایس سی میں۔" ڈیزی نے منہ بنایا۔
"حالانکہ انہیں پتا نہیں میرٹ سے کم نمبر لینے کے لیے تم نے کتنی محنت کی تھی۔" تیمور نے اپنے سے ایک سال بڑی بہن کو چھیڑا۔ دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔
"قسم سے بیس بیس نمبر کے سوال چھوڑ کر آتی رہی ہوں پرچے میں۔" ڈیزی منہ پر رہاتھ رکھ کر شرارت سے ہنسی۔
"شرم تو نہیں آتی باپ کو دھوکا دیتے ہوئے۔" اماں کو غصہ آگیا۔
"تو کیا کرتی' سارا پرچا حل کر کے آتی تو آرام سے میرٹ بن جاتا۔" ڈیزی کو اپنے کارنامے پر ذرا بھی شرمندگی نہیں تھی۔
"چلو باپ تو خوش ہو جاتا نا' سب سے بڑی اولاد سے کتنی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں والدین کی۔" اماں کے رنجیدہ انداز پر ایک لمحے کو ڈیزی بھی خفت کا شکار ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ لاؤنج کے دروازے کی طرف متوجہ ہو گئی جہاں بینش اس کیوٹ سی لڑکی کے ساتھ اندر آچکی تھی۔

"السلام علیکم تائی اماں۔" بیانے بندیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑے جوش بھرے انداز سے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔ بھئی یہ کون ہے؟" بڑی اماں نے پاس رکھا اپنا چشمہ لگا کر پہچاننے کی کوشش کی۔
"یوں سمجھیں' چھوٹی بہن ہے میری۔" اس نے جتاتے ہوئے انداز سے ڈیزی کی طرف دیکھا جو طیبہ کے جرنل پر دانستہ جھکی ہوئی تھی۔ دونوں بہنوں میں تین سال کا فرق تھا لیکن کمال کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔
"پھر بھی کچھ پتا تو چلے۔" بڑی اماں سے تجسس برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔
"اپنی زمینوں کے منشی چچا غلام صابر کی بیٹی ہے بندیا۔" بینش نے جھٹ سے جتایا۔

"اوہ اچھا۔" بڑی اماں کا تجسس دور ہوا تو انہوں نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"کیا نام بتایا تم نے ان کا؟" تیمور کو شرارت سوجھی۔
"بندیا۔" بینش نے مسکرا کر جواب دیا۔
"کیا بندریا۔؟" تیمور نے شرارتی نظروں سے بندیا کو دیکھا' جس کا شہابی چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہوا۔ وہ اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں کو مزید پھیلا کر ناراضی سے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔
"بندریا نہیں' بندیا۔" بینش نے جھنجلا کر تصحیح کی۔
"بھائی۔ وہ بندیا جو لڑکیاں ماتھے پر لگاتی ہیں۔" طیبہ نے وضاحت کی تو تیمور کے لبوں پر ایک شوخ سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔
"کتنے دن کے لیے آئی ہے؟" بڑی اماں نے معلومات میں اضافے کے لیے پوچھا۔
"جب تک اس کی گریجویشن نہیں ہو جاتی۔" بینش آج خاصی خوش تھی۔
"چلو اچھا ہوا' تمہاری بھی تنہائی دور ہوئی' ورنہ سارا دن بولائی گھومتی ہو۔" بڑی اماں نے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔
ڈیزی نے بوا رحمت کو چائے لانے کا اشارہ کیا اور

خود کسی بہانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کی بینش سے بالکل نہیں بنتی تھی' دونوں ایف ایس سی میں کلاس فیلو تھیں لیکن بینش کے میڈیکل میں جانے کے بعد بابا اس سے خفا ہو گئے تھے اور انہوں نے پورے دو ماہ ڈیزی سے بات نہیں کی تھی اور اس کا ڈیزی کو بہت دکھ تھا اور کچھ بینش ہر تیسرے دن اپنے تایا ابا کو شہہ دلانے پہنچ جاتی اور اپنی میڈیکل کے شعبے کے واقعات سنا سنا کر وہ ان کی محرومیوں کو جگا دیتی جس کے نتیجے میں وہ تیمور اور ڈیزی کو خوامخواہ ہی اٹھتے بیٹھتے ڈانٹنے لگتے۔
"میری دونوں کزنز مجھ سے سخت جیلس ہیں۔"

بڑی اماں کے پورشن سے نکلتے ہوئے بینش نے سرگوشی میں اسے بتایا۔
"لیکن کیوں۔۔۔ آپ تو بہت اچھی ہیں۔" بندیا کو حیرانی ہوئی۔
"اصل میں دونوں بہنیں میری طرح ذہین جو نہیں ہیں اور پھر تایا ابا کو اپنے سارے بچوں میں سے سب سے زیادہ پیار جو مجھ سے ہے۔" بینش کے لہجے میں خود پسندی کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔
"ان کا بھائی تو مجھے بہت بدتمیز سا لگ رہا تھا۔" بندیا کو اچانک یاد آیا تو اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"نہیں۔۔۔ نہیں تیمور بالکل بھی ایسا نہیں ہے۔" بینش نے فوراً" تردید کی۔ "ہاں۔۔۔ کچھ شرارتی سا ہے۔" بندیا نے چونک کر تیمور کے نام پر بینش کے چہرے پر اترتی دھنک کو محسوس کیا اور خاموش رہ گئی۔
اگلے دن بینش کے کالج جانے کے بعد وہ تنہا تھی اور لان میں ایک بھنورے کے تعاقب میں وہ تیمور کے لان کی طرف نکل آئی۔
"ہائے بندیا' کیسی ہو۔۔۔؟" وہ جامن کے درخت سے چھلانگ لگا کر اچانک اترا تو وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"آپ نے کل مجھے بندریا کیوں کہا تھا؟" بندیا کو اچانک ہی یاد آیا تو وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی تو تیمور کو ہنسی آگئی۔
"آپ مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں کیا؟" وہ بری طرح تلملا اٹھی۔
"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میری یہ جرات۔۔۔" تیمور نے فوراً" کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"کسی کا نام بگاڑنے سے پہلے اگر بندہ یہ سوچ لے کہ اگر اس کا نام بگڑ جائے تو اسے کیسا لگے۔۔۔" وہ جل کر بولی۔
"اچھا تو تم بھی بگاڑ لو میرا نام۔۔۔" اس نے ہنستے ہوئے بندیا کو مزید چڑایا۔

"ہونہہ۔۔۔ تیمور لنگ۔۔۔" بندیا کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تو اس نے دلچسپ نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا' جس کی غزالی آنکھوں میں ہلکی سی ناراضی جھلک رہی تھی اور غصے کی زیادتی سے اس کے گال تپ کر کشمیری سیب لگ رہے تھے۔
"تیمور لنگ کے بارے میں کیا جانتی ہو؟" وہ اسے چڑانے کے لیے مسکرا کر بولا۔
"میں' ہسٹری کی پروفیسر نہیں ہوں جو لیکچر دینا شروع کر دوں۔" اس نے اپنی نالائقی کو چھپانے کے لیے الفاظ کا سہارا لیا۔
"تمہیں پتا ہے چودھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ اور بغداد و دمشق کے حکمرانوں کے لیے امیر تیمور کو جنگ میں شکست دینا تو مشکل تھا لیکن اس کے لنگڑے پن کا مذاق اڑانا زیادہ آسان تھا اور اسی لیے وہ اسے تیمور لنگ کہتے تھے۔" اس کی تاریخی معلومات قابل رشک تھیں۔
"تو۔۔۔ تم خود کو امیر تیمور سمجھتے ہو۔" بندیا نے مسکراتی نگاہوں سے اس ہینڈسم لڑکے کو دیکھا جو پہلی ہی نظر میں اس کے دل کے سومنات کو ڈھا گیا تھا۔
"میرا نام تیمور جلال الدین ہے اور میں خود کو یہی سمجھتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے دل کی دنیا میں تلاطم برپا کر گیا۔ بندیا غلام صابر کو لگا جیسے وقت تھم گیا ہو اور اس کی دھڑکنیں جمود کا شکار ہو گئی ہوں۔ وہ ایک دم گھبرا کر اپنے جوتے کی نوک سے لان کی مٹی کریدنے لگی۔ تیمور نے بہت دلچسپی سے اس کے بوکھلائے ہوئے روپ کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اندر کی طرف چل دیا۔

"کیا۔۔۔" بینش کا تعجب سے منہ کھلا اور بند ہونا بھول گیا۔
"اور یڈا کی بورڈ میں تیسری پوزیشن ہے۔" بینش کے ہاتھ سے اسٹرابریز سے بھرا باؤل گرتے گرتے بچا۔

وہ سخت حیرت اور بے یقینی سے آغا جی کی طرف دیکھ رہی تھی جو بڑے ابا کے گھر سے آ کر یہ نیوز بریک کر رہے تھے۔

"آپ اوریدا تیمور کی بات کر رہے ہیں نا۔" بینش نے ہاتھ میں پکڑا باؤل ڈائننگ ٹیبل پر رکھا اور گھر میں داخل ہوتے ارصم نے اوریدا کا نام بقائمی ہوش و حواس سنا تھا۔ وہ ایک لمحے کو دروازے میں ہی رک گیا۔

"ہاں نا... میں تیمور کی بیٹی کی بات کر رہا ہوں۔" آغا جی نے دانستہ اپنے لہجے کو ہلکا پھلکا رکھا اور باؤل سے اسٹرابری نکال کر کھانے لگے۔

"تیسری پوزیشن یا تھرڈ ڈویژن..." بینش کو اپنی سماعتوں پر شک گزرا۔

"اوفوہ بیٹا! کیا ہو گیا ہے' تیسری پوزیشن کی بات کر رہا ہوں میں۔" آغا جی کے دہرانے پر بھی بینش کو یقین نہیں آیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" ان کے منہ سے پھسلا۔

"لو ارصم آ گیا... بے شک اس سے پوچھ لو۔" آغا جی کی نظر دروازے میں کھڑے ارصم پر پڑی جس نے بوکھلاہٹ میں اپنی ماں اور نانا دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔

"کس چیز کی بات کر رہے ہیں آپ؟" ارصم سمجھنے سے قاصر تھا۔

"اوریدا کی بورڈ میں تیسری پوزیشن آئی ہے' تمہیں تو اس نے فون کر کے سب سے پہلے بتایا ہو گا۔" آغا جی کے منہ سے نکلنے والے اس بے ساختہ فقرے نے بینش کے چہرے کو تاریک کیا اور اسی لمحے آغا جی کو بھی احساس ہوا کہ وہ خاصا غلط بول گئے ہیں۔

"نہیں آغا جی... مجھے تو نہیں بتایا اس نے..." ارصم کو خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

"کیا... واقعی...؟" اس دفعہ حیران ہونے کی باری آغا جی کی تھی۔ "ہو سکتا ہے کوئی سرپرائز کا چکر ہو۔" انہوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

"کب آیا رزلٹ..." ارصم نے اپنا لہجہ میں حتی الامکان سرسری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کل..." آغا جی نے اسے مزید تعجب میں مبتلا کیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں نہ بتایا ہو۔" بینش نے اپنا غصہ ارصم پر اتارنے کی کوشش کی۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے' میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" خلاف توقع بینش کو ارصم کی بات کا یقین آ ہی گیا۔

"ہونہہ... تیسری پوزیشن لے کر دماغ تو عرش پر پہنچ گیا ہو گا اوریدا کا..." بینش نے بے زاری سے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "اور یہ بھی ممکن ہے باپ نے بورڈ میں پیسے دے کر نمبر لگوا لیے ہوں۔" بینش' اوریدا کی طرف سے ہمیشہ بدگمان ہی رہتی تھیں۔

"خیر' یہ پیسوں والا چکر تو میں نہیں مان سکتا۔" آغا جی نے فوراً ان کے الزام کی تردید کی۔ "ہاں اتنا پتا ہے مجھے کہ اس نے محنت خوب کی تھی۔"

"خاک محنت کی ہو گی' ماں کی طرح دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے اس کے' یاد نہیں اس کی ماں بی اے میں کتنے برے طریقے سے فیل ہوئی تھی۔" بینش نے زخموں کے ٹانکے ایک ساتھ ادھیڑے۔

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے بینش! ماضی کی باتوں کو بار بار مت دہرایا کرو۔" آغا جی ہلکا سا برامان گئے۔

"انسان چاہ کر بھی اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ تلخ یادیں' دل دکھاتے لمحے اور اپنوں کے دیے گئے فریب' کسی آسیب کی طرح انسان کا تعاقب کرتے ہیں اور ماضی کے یہ بھوت کبھی کبھی حال کی خوشیوں کے ساتھ چمٹ کر انہیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔" بینش کا چہرہ تاریک ہوا۔

"لیکن تم نے تو ایک بات کے پیچھے اپنی ساری ہی زندگی خراب کر ڈالی۔" آغا جی افسردہ ہوئے۔

"آغا جی! میں ذرا بڑے ابا سے مل کر آتا ہوں۔" ارصم کو اس افسردہ ماحول سے وحشت ہوئی۔

"ہونہہ صاف کہو نا کہ مبارک باد دینے جاتا ہے اس شہزادی کو۔" بینش اچھا خاصا چڑ گئیں۔

"تو ماما! اس میں حرج ہی کیا ہے۔" ارحم نے پُرسکون انداز سے ان کا ناراض چہرہ دیکھا' وہ ابھی تک اس جھٹکے سے باہر نہیں نکلی تھیں۔

"تم نے تو قسم کھا رکھی ہے اپنی ماں کا دل جلانے کی۔" وہ پاؤں پٹختی ہوئی لاؤنج سے نکل گئیں۔

"ان کو کیا ہوا؟" ارحم نے ناسمجھی سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

"تم جاؤ' کل تک خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" آغا جی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

بینش کا دل جلا کر جب وہ بڑے ابا کے ہاں پہنچا تو اسے علم نہیں تھا کہ یہاں اس کا بھی دل جلانے کا پورا سامان موجود ہے۔ اوریدا کی پھپھو طیبہ بڑی سی مٹھائی کی ٹوکری' کیک اور پھلوں کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ سرمد اور ماہیر دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اوریدا ان سب کو کیک سرو کر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوا' سب سے پہلے ماہیر کی اس پر نظر پڑی۔

"آؤ بھئی ارحم! دیکھو تمہاری نالائق اسٹوڈنٹ نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔" ماہیر نے خوش گوار لہجے میں اسے اطلاع دی۔

"اس دفعہ مجھے ارحم نے نہیں پڑھایا۔" اوریدا نے کیک کو نفاست سے کاٹتے ہوئے تردید کی۔ ارحم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' جس کے چہرے پر اجنبیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ارحم کو چبھن سے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"میں بڑے ابا سے مل کر آتا ہوں۔" وہ ایک دم سے اٹھا اور بڑے ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ماہیر اور سرمد نے حیرانی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

"لو! اس نے تو مبارک باد تک نہیں دی۔" بڑی اماں بُرا مان گئیں۔

"دے دے گا اماں! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" ماہیر نے لاپروائی سے کہہ کر کیک کا ٹکڑا اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالا۔

"بینش کی تو رات کی نیند حرام ہو گئی ہوگی۔" طیبہ پھپھو کے چہرے پر ایک لطف لیتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

"ایسی' ویسی' اسے تو مرگی کا دورہ پڑ گیا ہوگا۔ تمہارے آغا جی نے اب تک جا کر بتا ہی دیا ہوگا۔" بڑی اماں آج بہت خوش تھیں۔

"یہ تم کہاں جا رہی ہو اوریدا۔۔۔" طیبہ نے چونک کر اوریدا کی طرف دیکھا' وہ اچانک ہی افسردہ نظر آنے لگی تھی۔

"کہیں نہیں پھپھو! لان میں۔۔۔" اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں اور لاؤنج سے نکل گئی۔ ارحم کا دل دکھانا اسے تاسف میں مبتلا کر گیا تھا۔

"مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ خود سے لڑتے ہوئے لان میں اپنے پسندیدہ گوشے کی طرف نکل آئی۔

"ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا میں نے' اس دفعہ کب ارحم نے مجھے پڑھایا تھا۔" اس نے خود کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"انسان کم از کم دو حرف مبارک باد کے ہی دے دیتا ہے۔" وہ لان چیئر پر اکیلی بیٹھی خود سے الجھ رہی تھی اور اسے پتا ہی نہیں چلا کب سرمد اس کے سامنے رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو اوریدا؟" سرمد کی آنکھوں میں چمکتے جگنو' اوریدا کو الجھن میں مبتلا کرنے لگے۔

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ سنجیدہ انداز سے بولتی ہوئی سرمد کو کچھ پریشان سی لگی۔

"تمہیں اپنی پوزیشن کی خوشی نہیں ہوئی کیا؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اوریدا نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

"اچھا یہ لو تمہارا گفٹ۔۔۔" سرمد نے مسکراتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک مخملی ڈبیا نکال کر اوریدا کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" اوریدا حیران ہوئی۔

"کھول کر دیکھو گی تو پتا چلے گا نا۔۔۔"

اوریدا نے ہلکا سا جھجک کر ڈبیا کھولی تو سامنے ایک نازک اور اسٹائلش سا بریسلٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں

جگمگا اٹھیں۔ "واؤ... امیزنگ..."

"تمہیں اچھا لگا؟" سرمد کے بے تاب انداز پر وہ ٹھٹکی اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"ہاں اچھا ہے..." اس نے دانستہ سنجیدہ انداز اپنایا۔

"تھینکس گاڈ! تمہیں پسند آگیا' یقین مانو میں نے اور شانزے نے بہت مشکلوں سے چوز کیا تھا۔" وہ مزے سے اسے بتا رہا تھا۔

"کیسی ہے شانزے؟ آپ اسے دوبارہ نہیں لے کر آئے۔" اوریدا نے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔

"بہت اچھی ہے' کسی دن لے کر آؤں گا اسے۔" سرمد نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اسی وقت گھر کا داخلی دروازہ کھلا اور ارصم باہر نکلا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹکا اور اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔

"تمہاری ارصم کے ساتھ کوئی لڑائی ہے کیا؟" سرمد نے ارصم کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن بھرے انداز میں پوچھا۔

"نہیں تو..." اوریدا نے ہلکا سا گھبرا کر جواب دیا۔ "آپ کو کس نے کہا؟"

"پتا نہیں کیوں' مجھے ایسا فیل ہوا۔ ایکچوئیلی اس نے تمہاری کامیابی پر کوئی رسپانس جو نہیں دیا۔" سرمد کی بات پر اوریدا رنجیدہ تو ہوئی لیکن سرمد کے سامنے اس بات کا اظہار کچھ مناسب نہیں تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے' وہ مجھے فون پر مبارک باد دے چکا تھا۔" اوریدا نے جھوٹ بولا' جسے سن کر کم از کم سرمد کو ہلکی سی مایوسی ہوئی۔

"تب ہی..." وہ زبردستی مسکرایا تو اوریدا پرسکون ہوگئی۔

"میرے ساتھ ڈنر پر چلو گی' تم سے کچھ خاص بات کرنی ہے۔" سرمد کی اگلی بات نے اوریدا کا سکون غارت کیا۔

"ڈنر پہ..." وہ ہلکا سا گڑبڑائی... "ماہیر بھائی سے پوچھا آپ نے؟"

"میں ماہیر کی نہیں' تمہاری اور اپنی بات کر رہا ہوں۔" سرمد کا پُراعتماد انداز اوریدا کو الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

"بڑی اماں سے پوچھوں گی۔" اوریدا نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"ان سے میں پوچھ چکا ہوں۔" سرمد کا آج ہوم ورک مکمل تھا۔ وہ ہر طرف سے اسے گھیرنے کی کوشش میں تھا۔ اس وقت وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مچلتے جذبے' اوریدا کو پریشان کر رہے تھے۔

"ابھی نہیں... کچھ دن بعد چلیں گے۔" وہ سرمد کو مایوس کر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ سرمد کا چہرہ تاریک ہوا اور وہ مایوسی کے عالم میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو تم۔" بینش نے اس کے کمرے میں جھانکا' وہ کشن سینے پر رکھے یاسیت کے عالم میں بے نام سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے چونک کر بینش کا چہرہ دیکھا' لگتا تھا وہ خود کو سنبھال چکی تھیں' اس لیے ان کا چہرہ کچھ پرسکون تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" ارصم ان کے احترام میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"پانچ دن کے بعد تم گھر آتے ہو اور تب بھی ڈھنگ سے کھانا نہیں کھاتے۔" وہ اس کی بیڈ شیٹ کی نادیدہ سلوٹوں کو دور کرنے لگیں۔

"پتا نہیں کیوں' آج کل بھوک نہیں لگتی مجھے۔" ارصم نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مزید پریشان ہوگئیں۔

"تم بڑے ابا سے کہہ کر کوئی میڈیسن لو نا' معدہ تو ڈسٹرب نہیں ہے تمہارا..." وہ بالکل اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔

"معدہ نہیں' میری تو ساری زندگی ہی ڈسٹرب ہوگئی ہے۔" وہ چاہتے ہوئے بھی یہ جملہ ان کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔

"اچھا ڈائننگ ٹیبل پہ چلو' تھوڑا بہت چکھ لینا۔"
بینش کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو محسوس کر کے اس نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے ان کے ساتھ اٹھ کر ڈائننگ ہال میں آگیا' جہاں آغا جی پہلے سے موجود تھے۔
"کس میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہے اوریدا۔۔۔" آغا جی نے سلاد کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے سرسری پوچھا۔
"آغا جی! کھانے کی میز پر یہ باتیں کرنا ضروری ہے کیا۔" بینش جھنجلا گئیں۔
"میں نے تو یوں ہی پوچھا تھا۔" وہ ہلکی سی خفت کا شکار ہوئے اور ارصم کو ان کا شرمندہ ہونا اچھا نہیں لگا۔
"آغا جی! میں نے اس سے پوچھا نہیں۔" ارصم نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے اپنی پلیٹ میں کھیرے کے چند ٹکڑے ڈالے۔
"یہ فش چکھو' میں نے خود تمہارے لیے فرائی کی ہے۔" بینش نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر زبردستی ارصم کی پلیٹ میں ڈالا۔
"تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو بیٹا۔" آغا جی نے غور سے اپنے نواسے کا چہرہ دیکھا۔
"ایسا کچھ نہیں ہے آغا جی! کچھ تھکا ہوا ہوں' اس لیے آپ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔" ارصم نے بینش کی کھوجتی نگاہوں سے گھبرا کر نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑے سے فرائیڈ رائس اپنی پلیٹ میں نکالے۔
"میڈیکل کی تعلیم بھی تو آسان نہیں ہے' یہ تو اب پتا چلے گا تیمور کی صاحب زادی کو۔۔۔" بینش نے ناگواری سے لقمہ دیا۔
"بھئی! یہ اچھی زبردستی ہے' ہم لوگوں پر اس موضوع پر گفتگو کرنے پر بین ہے اور تم جب چاہو اظہار خیال کرنے لگتی ہو۔"
آغا جی کے منہ بنانے پر ارصم پھیکے سے انداز سے مسکرایا' اتنا تو اسے بھی علم تھا کہ بینش دوسروں پر بہت زیادہ حاوی ہونے والی شخصیت کی حامل تھیں اور ان کے اپنے لیے اصول الگ تھے اور دوسروں کے لیے

الگ' لیکن اس کے باوجود آغا جی اور ارصم دونوں ہی اسے ٹوکنے سے باز نہیں آتے تھے۔
"میں نے غلط تھوڑی کہا ہے' دیکھ لیجئے گا' میڈیکل کے پہلے ہی سال میں لڑھک جائے گی۔" بینش نے ان کے اعتراض کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔
"بیٹا! آج کل تمہاری آسٹرالوجی (علم نجوم) کچھ زیادہ اچھی نہیں جا رہی' اس لیے مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے سے پرہیز ہی کرو تو بہتر ہے۔" آغا جی کا دلچسپ انداز بینش کو سلگا گیا۔
"ضروری نہیں کہ میرے سارے اندازے غلط ہوں۔"
"اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تمہارے سارے اندازے درست ہوں۔" آغا جی نے کھانا کھاتے ہوئے ان کا مزید دل جلایا۔
"تم ڈھنگ سے کھا کیوں نہیں رہے۔" انہوں نے حسب عادت اپنی جھنجلاہٹ ارصم پر اتارنے کی کوشش کی۔ آغا جی کو تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ لیکن ارصم ان کے لحاظ میں اکثر چپ ہی رہتا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا ناکہ مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ ناراض انداز سے اٹھا' ڈائننگ میز کی کرسی پیچھے کی اور کمرے سے نکل گیا۔
"مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے' وہ اوریدا آج کل اسے لفٹ نہیں کروا رہی' تب ہی اتنا اکتایا ہوا پھر رہا ہے۔" ارصم نے ڈائننگ ہال سے نکلتے ہوئے بینش کا یہ تلخ جملہ سنا اور ایک لمحے کو اس کے قدم ساکت ہوئے۔
"ارصم اور اوریدا کی کبھی لڑائی ہو ہی نہیں سکتی۔" آغا جی نے مسکرا کر بینش کو جواب دیا۔
"ارے خود غرض ماں کی بیٹی ہے وہ' اپنا مطلب نکال کر آنکھیں ماتھے پر رکھنا خوب جانتی ہے۔" بینش کا استہزائیہ انداز ارصم کا دل جلا کر خاک کر گیا۔ وہ ناراضی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
"یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو اوریدا!" ارصم نے بیڈ

پر رکھا کشن غصے سے زمین پر مارا۔ اس کے اندر اشتعال کی ایک لہر نمودار ہوئی' وہ بری طرح سے تپ چکا تھا۔ بینش کی باتوں نے اس کے پورے وجود کو سلگا کر رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں خود تمہارے لیے ایک ایڈ بناؤں گا' تمہیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آرہا۔" ماہیر نے ناراض نظروں سے سامنے بیٹھی شانزے کو دیکھا' جس کا دماغ ابھی بھی یاور صاحب کے لان کے اشتہار میں اٹکا ہوا تھا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" شانزے کو یقین نہیں آیا۔

"نہیں جھوٹ بول رہا ہوں۔" وہ جھنجلا گیا۔

"کب بنائیں گے؟" شانزے اس کے موڈ سے بے پروا اپنی ہی ہانک رہی تھی۔

"ابھی چلتے ہیں' سیٹ لگواؤں کیا؟" ماہیر کے طنزیہ انداز پر وہ ہلکا سا چونکی اور مدھم سی شرمندگی کی لہر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

"میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔" شانزے نے خفت زدہ انداز میں کہا۔

"میں بھی بائی داوے ہی تمہیں بتا رہا ہوں۔" ماہیر کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔

"آپ ہر وقت مجھے ڈانٹتے ہی کیوں رہتے ہیں۔" شانزے کی بے نیازی پر نہ چاہتے ہوئے بھی ماہیر کو ہنسی آگئی اور وہ پھیل کر بیٹھ گئی۔

"تم اگلے بندے کو آخری حد تک زچ جو کر دیتی ہو۔" ماہیر نے سائیڈ میز پر رکھے پانی کے جگ سے گلاس بھرا اور فوراً" ہی پی گیا۔

"آپ کو علم نہیں ہے' میں اس شوق کے ہاتھوں کتنا خوار ہوئی ہوں۔" شانزے نے منہ بنایا۔

"جو چیز آپ کو تھکا دے اور خواری کے سوا کچھ نہ دے' اس کا نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔" ماہیر نے اس ناداں لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"بس پہلی اور آخری دفعہ اسکرین پر آؤں گی۔" شانزے کی بات پر وہ حیران ہوا۔

"اچھا ٹھیک ہے' اس کاغذ پر لکھ کر دو۔" ماہیر کو شرارت سوجھی۔

"کیا۔" اس نے تعجب سے ماہیر کو دیکھا جو ایک خالی کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہی کہ تم پہلا اور آخری ایڈ کرو گی۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" شانزے کو اس کی پُراسرار مسکراہٹ کے پیچھے چھپی منطق سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"میں کل ہی ایک بسکٹ کے اشتہار کا شوٹ اسٹارٹ کرواؤں گا' اس کا پیپر ورک مکمل ہے۔" ماہیر کی بات پر وہ پُرجوش ہوئی۔

"ارے کیا واقعی؟" اس نے جلدی سے خالی کاغذ پر چند لائن تیزی سے تحریر کیں اور نیچے اپنے سائن کیے۔

"اب اپنی بات پر قائم رہنا شانزے۔" ماہیر نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی۔

"بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہو گا۔" شانزے پُراعتماد تھی۔

"چاہے کوئی کتنی بھی اچھی آفر کرے۔" ماہیر نے جانچتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چاہے کوئی دس کروڑ کی ہی آفر کیوں نہ کرے۔" وہ بھی مزے سے بولتی ہوئی ماہیر کو حیران کر گئی۔

"او کے ڈن۔" ماہیر نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ جسے شانزے نے بغیر سوچے سمجھے تھام لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے ہاتھ کی مضبوطی سے بوکھلا گئی۔ وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا اچھا خاصا پزل کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ تینوں بہن بھائی شرمندگی سے سر جھکائے بڑے ابا کے اسٹڈی روم میں ان کے سامنے کھڑے تھے۔

بڑے ابا کے ہاتھ میں ان کے پروفیشن سے متعلق ایک بھاری سی ۔۔۔ کتاب تھی اور چہرے پر ہلکی سی برہمی صاف چھلک رہی تھی۔ ان کے برابر میں بینش گردن اکڑائے بڑے غرور سے بیٹھی ان تینوں کا دل جلا رہی تھی۔ بینش کے انگ انگ سے خودپسندی جھلک رہی تھی۔

"تم تینوں نے تو مجھے مایوس کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔" وہ ناراض انداز سے گویا ہوئے۔ ڈیزی اور تیمور کے سر مزید جھک گئے۔

"یہ بھی تو تم لوگوں کی بہن ہے' رزلٹ دیکھا ہے تم لوگوں نے اس کا۔" بڑے ابا نے بینش کا رزلٹ کارڈ ان کے سامنے لہرایا۔

"صبح سے یہی تو دیکھ رہے ہیں۔" بڑی اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"لیکن عقل پھر بھی نہیں آئی ہوگی تمہاری اولاد کو۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب غصے سے میز پر پٹخی۔

"یہ بینش کا میڈیکل کا رزلٹ ہے جبکہ تیمور اور ڈیزی میں سے کوئی بھی میڈیکل کا اسٹوڈنٹ نہیں۔" بڑی اماں نے انہیں یاد دلایا۔

"تو اپنے سبجیکٹس میں کون سے انہوں نے تیر مار لیے ہیں۔" انہوں نے طنزیہ انداز سے اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔

"سب بچوں کا ذہن ایک جیسا تھوڑی ہوتا ہے۔" انہوں نے قدرے محتاط انداز اپنایا' ویسے بھی بینش کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ ان کو تپا رہی تھی۔ لیکن اس وقت اسے کچھ کہنا' بڑے ابا کے جلال کو آواز دینے کے مترادف تھا۔

"کتنا شوق تھا مجھے' میرا اکلوتا بیٹا میڈیکل میں آئے اور یہ دو جمع دو بائیس کرنے چل پڑا۔ ساری عمر اکاؤنٹس کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے گزر جائے گی اس کی۔" بڑے ابا ایک دفعہ پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔

"طیبہ پڑھ تو رہی ہے بری میڈیکل۔۔۔" بڑی اماں نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہونہہ۔۔۔ یہ بھی تو ان ہی کی بہن ہے' ان ہی کے نقش قدم پر چلے گی۔" آج تو وہ طیبہ سے بھی مایوس دکھائی دے رہے تھے۔ طیبہ کا رنگ زرد ہوا۔

"تم لوگ جاؤ' بوا رحمت نے کھانا لگا دیا ہے۔" بڑی اماں کی اس بات پر تینوں نے ممنون نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا' جو اکثر ہی ان کی ڈھال بن جاتی تھیں۔ ان تینوں کے باہر نکلتے ہی بینش کو اچھی خاصی مایوسی ہوئی' اس کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔

"بڑے ابا! میں بھی چلتی ہوں' آغا جی آگئے ہوں گے۔" بینش اکتاہٹ بھرے انداز سے کھڑی ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بیٹا کیوں نہیں' میری طرف سے حماد کو مبارک باد دینا' خوش قسمت ہے وہ جس کی ایک ہی اولاد ہے اور وہ بھی اتنی لائق۔" بڑے ابا کی بات پر ان کی بیگم نے بے چینی سے پہلو بدلا' لیکن بینش کو اس دفعہ ان کے اس فقرے نے وہ لطف نہیں دیا تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے کزنز کی درگت بنتے دیکھ کر اسے حاصل ہوا تھا۔

"یہ اپنا رزلٹ کارڈ بھی لے جاؤ۔" بڑی اماں نے پیچھے سے اسے کوفت بھرے انداز سے پکارا۔ انہیں پتا تھا جتنی دیر یہ رزلٹ کارڈ ان کے میاں کے سامنے رہے گا' ان کا مزاج یوں ہی برہم رہے گا۔

✿ ✿ ✿

"میرا بس نہیں چلتا کہ میں اس بیبا کی بچی کو جامن کے درخت پر الٹا لٹکا دوں۔" ڈیزی لان میں ٹہل ٹہل کر اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں بہنیں وہاں موجود تھیں جبکہ تیمور غصے سے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے' ایسا کر کے ملتا کیا ہے۔" آج تو طیبہ کو بھی اپنی اس کزن پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

"شروع سے فسادی طبیعت پائی ہے اس نے۔۔۔" ڈیزی نے منہ بنا کر اپنی بہن کو یاد دلایا۔

"ہاں بچپن میں بھی ہماری جھوٹی شکایتیں لگا کر بابا سے ڈانٹ پڑوائی تھی۔" طیبہ نے مزید اضافہ کیا۔

"بتایا تو ہے کہ یہ فطرتاً خود غرض، جھوٹی اور مکار لڑکی ہے۔" ڈیزی کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"اوپر سے تیمور بھائی نے اس کے ساتھ منگنی کرلی ہے۔" طیبہ کو اچانک یاد آیا۔

"اس بے چارے نے تو بابا کو خوش کرنے کے چکر میں یہ کڑوا گھونٹ پیا تھا مگر افسوس۔۔۔" ڈیزی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ابا پھر بھی خوش نہیں ہوئے۔۔۔" طیبہ کے لہجے میں رنجیدگی در آئی۔

"وہ تو ساری زندگی ہی ہم سے خوش نہیں ہوں گے۔" ڈیزی کو آج بابا کے رویے سے بہت مایوسی ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔" طیبہ نے بھی تاسف بھرے انداز میں کہا۔ وہ دونوں بہنیں لان کی گھاس پر بیٹھ گئیں۔ دونوں کا ہی غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف بینش اپنے گھر میں پہنچ کر بندیا کے سامنے قہقہے لگا رہی تھی اور وہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"یقین مانو، ان تینوں بہن بھائیوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آ رہی تھی۔" بینش نے اپنا کارنامہ کھل کر بتایا۔

"لیکن یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔۔۔" بندیا کو اس کی یہ حرکت بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔

"تمہیں نہیں معلوم، تینوں مل کر کیسے میرا دل جلاتے رہے ہیں۔" بینش نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی صفائی دی۔

"کیا وہ بھی آغا جی سے آپ کو ایسے ہی ڈانٹ پڑواتے ہیں۔" بندیا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آغا جی کیوں مجھے ان کے کہنے پر ڈانٹیں گے بھلا۔۔" بینش کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ "وہ تو مجھ سے پیار کرتے ہیں، ظاہر ہے میں ان کی اکلوتی اولاد جو ہوئی۔"

"تو کیا آپ کے بڑے ابا کو اپنے بچوں سے پیار نہیں۔۔۔" بندیا کے منہ سے پھسلا۔

"نہیں۔۔۔ ان کو سب سے زیادہ محبت مجھ سے ہے۔" بینش نے اترا کر جواب دیا تو بندیا الجھ سی گئی۔

"میں نے بڑے ابا کی وہ ساری امیدیں پوری کی ہیں جو انہیں اپنی اولاد سے تھیں۔" بینش نے وضاحت کی۔

"لیکن ان کے بچے بھی تو اچھے خاصے لائق ہیں، کیا ہوا جو وہ میڈیکل میں نہیں گئے۔" اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"بڑے ابا میڈیکل کے علاوہ کسی فیلڈ کو اہم نہیں گردانتے۔" بینش نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"لو ان کے کہنے سے باقی پروفیشن غیر اہم تھوڑی ہو جائیں گے۔" بندیا کو ان کی منطق بالکل پسند نہیں آئی۔

"تم چھوڑو نا انہیں، یہ بتاؤ کالج کا فارم فل کرلیا۔۔۔" اسے بندیا کی بحث پسند نہیں آ رہی تھی اس لیے اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

"ہاں، بہت آسان مضامین رکھے ہیں میں نے۔۔" بندیا نے اسے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

ان دونوں کے درمیان اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی لیکن بندیا کو چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ بینش کے ساتھ گزارا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ حد درجہ مغرور اور ضدی تھی۔ ذہانت کی دولت سے مالا مال تھی لیکن اپنے سامنے کسی کو کچھ بھی نہیں گردانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اپنی فرسٹ کزنز میں سے کسی سے بھی نہیں بنتی تھی اور ان کے ساتھ مقابلہ بازی کا میدان بھی اکثر سجا ہی رہتا۔ جس میں جیت بھی ہمیشہ بینش کی ہی ہوتی تھی۔

☆ ☆ ☆

بختاور اور ہاشم کا اس کے دوست کے گھر میں استقبال خاصی خوش دلی سے ہوا تھا۔ ہاشم کا یہ دوست

خاصا خوش حال تھا اور ماڈل ٹاؤن میں بنی اس کی کوٹھی اور اس کا رہن سہن اس بات کا ثبوت تھا۔ ان دونوں کے لیے گیسٹ روم میں ارینج منٹ کر دیا گیا تھا۔ ہاشم کے دوست کی بیوی فائزہ خاصی دوستانہ مزاج کی حامل ایک ہنس مکھ لڑکی تھی' اس کی شادی کو دو سال ہوئے تھے اور ان کا ایک کیوٹ سا بیٹا تھا۔

"ان دونوں کی بھی لو میرج ہے۔" ہاشم نے اپنے کمرے میں آکر اسے بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔

"فائزہ کے گھر والے مان گئے تھے کیا؟" بختاور نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

"یہاں معاملہ الٹ تھا' فائزہ کے گھر والے تو مان گئے تھے لیکن سرفراز کے گھر والے اس کی شادی فیملی میں کرنا چاہتے تھے۔" ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر ان دونوں کی شادی کیسے ہوئی۔۔۔؟"

سرفراز نے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر والوں کو منا ہی لیا' پورے تین سال لگے تھے اسے۔" ہاشم نے اپیچی کیس کھول کر اپنا نائٹ ڈریس نکالا۔ "بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی ان دونوں کی شادی۔"

"اچھا۔۔۔" بختاور کو نہ جانے کیوں سن کر مایوسی ہوئی۔

"تمہارا منہ کیوں لٹک گیا۔۔۔؟" ہاشم اس کا مزاج آشنا تھا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ کاش ہم لوگ بھی تھوڑا انتظار کر لیتے تو شاید۔۔۔" بختاور نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"میں تو ساری زندگی انتظار کر سکتا تھا لیکن تمہارے پیرنٹس کبھی نہ کرتے' بھول گئیں کہ ہمارا نکاح کن حالات میں ہوا تھا۔" ہاشم نے اس کا بازو پکڑ کر بیڈ پر بیٹھایا۔ وہ خاصی دل گرفتہ سی لگ رہی تھی۔

"ہاں اب تک تو میری فیصل کے ساتھ رخصتی بھی ہو چکی ہوتی۔۔۔" بختاور جلد ہی حقیقت کی دنیا میں آگئی۔

"جی جناب' اور آپ اس وقت میرے ساتھ نہیں بلکہ فیصل صاحب کے ساتھ ہوتیں۔" ہاشم نے اسے چھیڑا۔

"اللہ نہ کرے۔" بختاور نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھے تو وہ مسکرا دیا۔

"تم کسی دن بیٹھ کر ضروری چیزوں کی لسٹ بنا لینا' جن کی ہمیں فوری طور پر اپنے گھر میں ضرورت پڑے گی۔" ہاشم نے واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے لاپروائی سے کہا اور بختاور اپنے گھر جانے کے معاملے میں اتنی پرجوش ہوئی کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ہاشم کے واش روم میں جاتے ہی اپنی ڈائری اٹھائی اور لسٹ بنانا شروع کر دی۔

"ارے' یہ تم ڈائری میں کیا لکھ رہی ہو؟" ہاشم ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر باہر نکلا تو اسے بڑی توجہ سے ڈائری پر جھکے دیکھ کر حیران ہوا۔

"گھریلو سامان کی لسٹ بنا رہی ہوں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"اچھا' دکھاؤ تو سہی۔۔۔" وہ مسکراتا ہوا بیڈ پر اس کے برابر آن بیٹھا اور لسٹ میں پہلی ہی لائن پڑھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" بختاور نے اس کا چونکنا فوراً" محسوس کیا۔

"یہ ضروری اشیاء کی لسٹ ہے کیا۔۔۔؟" ہاشم نے حیرانی سے بختاور کا سادہ اور ریا سے پاک چہرہ دیکھا۔

"ہاں ناں۔۔۔" اس نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"اے سی' ٹی وی' فریج' مائیکرو ویو اوون' ٹوسٹر' سینڈوچ میکر' واشنگ مشین' بیڈ' صوفہ' ڈائننگ ٹیبل۔۔۔" ہاشم بلند آواز میں پڑھتے ہوئے رکا۔

"کیا ہوا؟ رک کیوں گئے۔۔۔؟" بختاور پریشان ہوئی۔

"یہ ساری ضروری اشیاء کیا تمہیں ابھی چاہئیں؟" ہاشم سنجیدہ ہوا۔

"ہاں ناں' ان کے بغیر کیسے گزارا ہو سکتا ہے۔" بختاور کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"کچھ اندازہ ہے کہ ان سب چیزوں پر کتنا پیسہ خرچ ہو گا۔" ہاشم نے محتاط انداز میں پوچھا تو اس نے نفی

میں سرہلا دیا۔
"لاکھوں لگ سکتے ہیں اور میرے اکاؤنٹ میں صرف پچیس ہزار روپے ہیں۔" ہاشم کی بات نے بختاور کو پریشان کیا۔
"پھر ہم کیا کریں گے۔۔۔؟"
"صبر۔" ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا۔
"لیکن۔۔۔؟" بختاور کے چہرے پر تفکر کے رنگ نمایاں ہوئے۔
"دیکھو بختاور! تم جتنی جلدی یہ بات بھول جاؤ گی کہ تم کس باپ کی بیٹی تھیں اور اب کس شخص کی بیوی ہو' تمہاری زندگی آسان ہو جائے گی۔" ہاشم نے صاف گوئی سے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔
"میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔۔۔" بختاور نے ناسمجھ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔
"بھئی' صاف بات ہے کہ میں تمہارے بابا کی طرح کروڑپتی نہیں ہوں' تم آئندہ جو بھی کام کرو تو یہ ذہن میں رکھنا کہ تمہارے شوہر کی آمدنی بہت محدود ہے۔" ہاشم کی بات پر وہ خفت کا شکار ہوئی۔
"آئی ایم سوری۔۔۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔ وہ جس لائف اسٹائل کی عادی تھی' اسے وہاں سے نکلنے میں ابھی کافی عرصہ درکار تھا۔ معاشی مسائل کیا ہوتے ہیں اور ان سے کس طرح سے نکلا جاتا ہے' اس کی زندگی ان تجربوں سے ناآشنا تھی۔
"آپ کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے۔۔۔؟" بختاور نے ہلکا سا جھجک کر مشورہ دیا۔
"ظاہر ہے وہ تو کرنی پڑے گی' کیونکہ اس کے بغیر گزارہ نہیں۔۔۔" ہاشم نے ایک سرد آہ بھر کر بختاور کا معصوم چہرہ دیکھا' اسے افسوس ہوا کہ وہ محبت کے اس کانٹوں بھرے سفر میں اسے اپنے ساتھ خوار کرنے کے لیے کیوں لے آیا۔ اس نے اداس نظروں سے بختاور کی طرف دیکھا' جو اپنی بنائی ہوئی لسٹ میں سے اشیاء کو بے دردی سے کاٹ رہی تھی' ہاشم کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا دل کاٹ کر ایک طرف پھینک رہا ہو۔
"اب دیکھیں۔۔۔" بختاور نے افسردہ سے انداز سے ڈائری کا وہ صفحہ اس کے سامنے کیا۔ اب اس لسٹ میں واشنگ مشین اور استری کے علاوہ سب چیزیں کٹ چکی تھیں۔
"واشنگ مشین ضروری ہے کیا۔۔۔؟" ہاشم نے کچھ لمحے سوچ کر جھجک کر پوچھا۔
"مجھے ہاتھ سے کپڑے دھونے نہیں آتے۔۔۔" بختاور نے اس طرح شرمندگی سے اعتراف کیا جیسے کوئی مجرم کمرۂ عدالت میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے۔ ہاشم اس کی سادگی پر مسکرایا۔ اس نے غور سے بختاور کے دودھیا سپید رنگت والے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھا اور بے اختیار تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی اس چیز کی گواہ تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔
"آئی ایم سوری یار۔۔۔" اب شرمندہ ہونے کی باری ہاشم کی تھی۔ بختاور خاموش رہی' وہ جانتی تھی کہ وہ کس پس منظر میں اس سے معذرت کا خواہاں ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک محسوس کی جانے والی خاموشی کا وقفہ آ گیا تھا۔ دونوں کو ہی احساس ہو رہا تھا کہ زمانے کی تلخ حقیقتیں ان کی محبت سے زیادہ طاقت رکھتی تھیں اور وہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

عدینہ کی اس دفعہ میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ میں دوسری پوزیشن تھی اور اس نے اسے اگلے دو دن تک افسردہ رکھا تھا۔ آرمی میڈیکل کالج کی لسٹ میں اس کا نام آ چکا تھا اور اسے نہ جانے کیوں خوشی نہیں ہو رہی تھی' البتہ آپا صالحہ بہت خوش تھیں۔ دونوں کے درمیان تعلقات ایک دفعہ پھر نارمل ہو گئے تھے۔ عدینہ اپنا نام میرٹ لسٹ میں دیکھتے ہی آپا صالحہ کے ساتھ فیس جمع کروانے پہنچ گئی۔ وہ ان کے ساتھ ایڈمن بلاک سے باہر نکلی تو سامنے سے آتے ارصم سے ٹکراتے ٹکراتے بچی' وہ اسے دیکھ کر چونکا اور اگلے ہی لمحے خوش گوار حیرت کا شکار ہوا۔
"آپ۔۔۔؟ یہاں۔۔۔" ارصم کے منہ سے بے

اختیار پھسلا۔

"جی میرا ایڈمیشن ہو گیا ہے یہاں۔" عدینہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ویری نائس۔۔۔" وہ ایک دم خوش ہوا۔

"کیسے ہو بیٹا؟" آپا صالحہ کو نہ جانے کیوں اس سے اپنائیت سی محسوس ہوتی تھی۔

"فائن۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ٹیسٹ تو کروالیے ہوں گے آپ نے، کیا رپورٹس آئی تھیں؟" وہ بڑے مؤدبانہ انداز سے بولا۔

"انہوں نے میرے بار بار کہنے کے باوجود بھی ٹیسٹ نہیں کروائے۔" عدینہ کے لہجے میں شکایت کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ ایک دم تشویش میں مبتلا ہوا۔

"یہ تو بہت غلط بات ہے آنٹی! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس کے لہجے میں موجود فکرمندی آپا صالحہ کو اچھی لگی۔

"ایسے ہی چھوٹا موٹا انفیکشن ہو گا بیٹا! خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" آپا صالحہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"کیسی ڈاکٹر ہیں آپ، آپ کو زبردستی ان کے ٹیسٹ کروانے چاہیے تھے۔" وہ اب عدینہ پر خفا ہوا۔

"ان کے ساتھ زبردستی نہیں کی جا سکتی۔" عدینہ ہلکا سا مسکرائی۔

"آپ بھی اسی کالج میں پڑھتے ہیں۔" آپا صالحہ نے اسے کیڈٹ یونیفارم میں دیکھ کر اندازہ لگایا۔

"جی آنٹی۔ آئیں ناں، آپ کو کیفے ٹیریا سے چائے پلواتا ہوں۔" اس کو آداب مہمانی کا خیال آیا۔

"نو بیٹا، تھینک یو۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہہ کر عدینہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"اوکے ارصم! ہم لوگ چلتے ہیں۔" عدینہ نے الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"بیسٹ آف لک عدینہ! میں اسی کالج میں آپ کا سینئر ہوں، جب بھی کوئی پرابلم ہو، آپ مجھ سے کانٹیکٹ کر سکتی ہیں۔" ارصم کی بات پر عدینہ نے سر ہلایا جبکہ آپا صالحہ ہلکی سی اضطراری کیفیت کا شکار ہوئیں۔ وہ ایڈمن بلاک کے اندر جا چکا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں اس سے رابطہ کرنے کی، لڑکیوں کو اپنے مسائل خود حل کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔" اس کے جاتے ہی انہوں نے جھٹ سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو عدینہ جھنجلا سی گئی۔

"آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں اپنے کام خود کرنے کی عادی ہوں۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن پھر بھی تمہیں سمجھانا میرا فرض ہے۔۔۔" وہ دونوں آہستگی سے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا۔۔۔؟" عدینہ چلتے چلتے رکی۔

"تمہیں معلوم نہیں صنف مخالف کے پاس لڑکیوں کو متاثر کرنے کے کتنے ہتھکنڈے ہوتے ہیں اور لڑکیاں بے چاری نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے خوب صورت لفظوں کے طلسم میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔" آپا صالحہ کے لہجے میں کوئی ان کہا دکھ بول رہا تھا۔

"میرا شمار ایسی لڑکیوں میں نہیں ہوتا، ویسے بھی میری زندگی میں اب کسی اور کی گنجائش نہیں نکلتی۔" عدینہ کی صاف گوئی آپا صالحہ کی دکھتی رگ کو چھیڑ گئی۔

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ عبداللہ کو بھول جاؤ۔۔۔" وہ ناراض ہوئیں۔

"اور لاکھ دفعہ میں نے بتایا ہے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں۔" وہ بھی تو ان ہی کی بیٹی تھی۔

"مجھے جب بھی کوئی اچھا رشتہ ملے گا میں تمہاری شادی کر دوں گی۔" انہوں نے آرمی میڈیکل کالج کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے عدینہ کو پریشان کیا۔

"آپ مجھے میڈیکل کی تعلیم کے دوران ڈسٹرب نہیں کریں گی۔" عدینہ ضدی انداز میں سڑک پر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے اپنی زندگی کا بھروسا نہیں ہے بیٹا۔۔۔" آپا صالحہ اب اس کی ضد کے سامنے ہار ماننے لگی تھیں۔

"مجھے اللہ کی ذات پر پورا یقین ہے، آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔" عدینہ نے پر اعتماد انداز میں کہا تو ایک

پھیکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر دوڑ گئی۔
"لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ مجھے پڑھائی کے دوران مجبور نہیں کریں گی۔" عابد مجید روڈ جیسی مصروف شاہراہ پر کھڑے ہو کر عدینہ نے اپنی ماں سے وعدہ لینا چاہا' آپا صالحہ ایک دم پریشان سی ہو گئیں۔
"امی پلیز..." عدینہ نے دائیں بائیں کھڑے لوگوں کی پرواہ کیے بغیر آپا صالحہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔
"اچھا' اچھا ٹھیک ہے..." انہوں نے ایک دم ہی ہتھیار ڈال دیے... وہ دونوں کسی رکشے اور ٹیکسی کی تلاش میں ایس ڈی تک پہنچ گئی تھیں۔
"یہاں تو بہت ہی رش ہے..." عدینہ نے منہ بنا کر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا۔
"اسی روڈ پر ملٹری ہاسپٹل جو ہے۔" آپا صالحہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔
"آپ رہی ہیں اس شہر میں...؟" عدینہ نے یونہی پوچھا۔
"میری تو پیدائش ہی اس شہر کی ہے...؟" ان کے منہ سے پھسلا تو عدینہ چونک گئی۔
"آپ آزاد کشمیر میں پیدا نہیں ہوئیں...؟"
"نہیں... تمہارے نانا فوج میں تھے تو ان کی ان دنوں یہیں پوسٹنگ تھی۔" انہوں نے قدرے محتاط انداز میں جواب دیتے ہوئے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کیا۔
"اوہ' اچھا...!" عدینہ مطمئن ہو گئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن موڑ کی طرف چل پڑیں' جہاں سے انہیں اپنے شہر کی کوسٹر ملتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اوریدا' بڑی اماں کے ساتھ پچھلے صحن میں موجود تھی اور بڑی اماں' بوا رحمت اور ان کی بہو سے سردیوں کی آمد پر لحاف باہر نکلوا رہی تھیں تاکہ ان کو دھوپ لگوائی جا سکے۔ آج تو بڑے ابا بھی خلاف معمول وہاں موجود تھے اور کرسی پر اخبار پڑھتے ہوئے موسم سرما کی دھوپ سینک رہے تھے۔ جب کہ اوریدا نے اپنا لکڑی کا جھولا بھی باہر نکلوا رکھا تھا اور اس پر بیٹھی بڑے مزے سے مونگ پھلیاں کھا رہی تھی۔
"تمیز نہیں ہے تمہیں' یہ چھلکے زمین پر کیوں پھینک رہی ہو۔" وہاں سے گزرتے ہوئے بڑی اماں کی نظر کچھ چھلکوں پر پڑی تو انہوں نے ناراضی سے گھور کر اوریدا کو دیکھا جو کسی سوچ میں گم تھی۔
"سوری بڑی اماں..." وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور بوکھلا کر زمین پر گرے مونگ پھلی کے چھلکے اٹھانے لگی۔
"اوریدا بی بی آپ رہنے دیں' میں اٹھا لیتی ہوں..." بوا رحمت کی بہو فوراً" ہی اس کی مدد کو آئی۔
"السلام علیکم بڑی اماں! کیسی ہیں آپ..." ماہیر بڑی تیزی سے ہاتھ میں کچھ داخلہ فارم لیے وہاں پہنچا تھا' اچانک ہی اس کی نظر بڑے ابا پر پڑی۔ "السلام علیکم بڑے ابا! کیسے ہیں۔"
"فائن..." انہوں نے اخبار سے سر اٹھائے بغیر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
"لو بھئی اوریدا! تمہارے میڈیکل کالج کے فارم لے آیا ہوں۔ خیر سے تم نے دونوں کالجز کے ایڈمیشن ٹیسٹ پاس کر لیے ہیں۔" ماہیر بہت خوش تھا۔
"اب کہاں ایڈمیشن لو گی تم؟" وہ اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔
"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ ارحم سے ناراضی کی وجہ سے آرمی میڈیکل کالج میں نہیں جانا چاہتی تھی۔
"میرا خیال ہے' راولپنڈی میڈیکل کالج میں لے لیتی ہوں۔" وہ منہ بنا کر لاپروائی سے گویا ہوئی۔
"کوئی ضرورت نہیں۔" بڑے ابا ناراض سے انداز میں گویا ہوئے' اوریدا کے ساتھ ساتھ بڑی اماں نے بھی چونک کر ان کی طرف دیکھا' جو اپنی بے ساختگی پر کچھ خفت کا شکار ہوئے تھے اور اب اسے چھپانے کے لیے اخبار پر جھک گئے۔
"بڑے ابا! آپ بتائیں ناں..." ماہیر ان کے بالکل

سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے کیا پتا' اپنے باپ سے پوچھ لو جا کر۔" انہوں نے بے رخی کے سارے ریکارڈ توڑے۔

"میرے نزدیک میرے باپ کے والد کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہے' کیونکہ وہ اسی پروفیشن سے تعلق رکھتے ہیں۔" ماہیر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"جہاں یہ کہے' کروا دو وہاں۔" انہوں نے لاپروا انداز سے کہا اور ذوق و شوق سے اخبار پڑھنے لگے۔

"لیکن مجھے تو آپ کی پسند کے مطابق ایڈمیشن لینا ہے۔" اوریدا نے بھی آج ہمت کر ہی لی تھی۔ ماہیر اس کی جرأت پر مسکرایا اور چونکے تو بڑے ابا بھی تھے لیکن خاموش رہے اور ان کی یہ خاموشی قدرے فاصلے پر کھڑی بڑی اماں کو سخت ناگوار گزری تھی۔

"اب بچے بار بار پوچھ رہے ہیں تو بتا دیں انہیں۔ آپ بھی بعض دفعہ حد ہی کر دیتے ہیں۔" بڑی اماں چڑ کر بولیں۔

"ہاں تو ارحم کے کالج میں ایڈمیشن لینے میں کیا حرج ہے۔" وہ جھنجلا کر اٹھے' اخبار کرسی پر رکھا اور بیزاری سے اندر چلے گئے۔

"دیکھو ذرا' رائے بھی ایسے دے کر گئے ہیں جیسے سر پر ڈنڈا مار کر گئے ہوں۔" بڑی اماں سخت برا مان گئیں۔

"ارے اماں! بتا تو دیا ہے انہوں نے' بس فیصلہ ہو گیا۔" ماہیر کی مسلسل مسکراہٹ انہیں مزید تپا گئی۔

"ایسے بتاتے ہیں بھلا' ارحم کی دفعہ تو کئی کئی گھنٹے بحث و مباحثہ چلتا تھا' جگہ جگہ فون کھڑکائے جاتے تھے اور ہماری دفعہ۔" وہ چپ ہوئیں۔

"چلیں' کوئی بات نہیں' اس دفعہ انہیں علم ہے ناں کہ ارحم ہے وہاں۔" ماہیر نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"رہنے دو میاں! میں سب جانتی ہوں۔ اصل میں تو انہیں تم لوگوں سے کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں۔" بڑی اماں کا انداز خاصا دل دکھانے والا تھا' ایک لمحے کو تو دونوں بہن بھائی چپ کے چپ رہ گئے۔

"یہ سارا فساد اس بینش کا ڈالا ہوا ہے' بھلا اتنے سالوں کی بدگمانی کی گرد اتنی جلدی تھوڑا چھٹتی ہے۔" بڑی اماں تلخ انداز میں کہتے ہوئے' وہاں رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"اچھا' آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں' ٹھیک ہو جائیں گے ناں وہ۔" ماہیر نے ان کے کندھوں کو پیچھے سے آ کر نرمی سے دبایا جبکہ اوریدا کے سیل فون پر تیمور کی کال آ گئی تھی۔ وہ فون اٹینڈ کرنے پھولوں کی باڑ کی طرف آ گئی۔

"آپ کے بڑے ابا تو بہت خوش ہوئے ہوں گے' آپ کے رزلٹ سے۔" سات سمندر پار بیٹھے تیمور کی خوش فہمیاں عروج پر تھیں۔

"جی پاپا۔" اوریدا نے مختصراً" جواب دیا۔

"اسی لیے میں چاہتا تھا کہ تم ان کے پسندیدہ پروفیشن میں آؤ۔" وہ پرجوش انداز میں بولے تو اوریدا مسکرا دی۔ اب اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ بچوں کو ہر قسم کی آزادی دینے والے تیمور اگر کسی بات پر اڑ گئے تھے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی بڑی وجہ یا جواز ضرور تھا۔

"اب تم بڑے ابا کے پاس بیٹھ کر روزانہ پڑھا کرنا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

"نہیں پاپا! میں ہاسٹل میں رہوں گی۔" اوریدا نے انہیں حیران کیا۔

"ایک ہی شہر میں رہ کر ہاسٹل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟" انہوں نے فوراً" اعتراض کیا۔

"ماہیر کا کہنا ہے کہ میں اس طرح اپنی تمام تر توجہ اسٹڈی پر مرکوز رکھوں گی اور ویسے بھی ہر ویک اینڈ پر وہ مجھے آ کر لے جایا کریں گے۔" اوریدا نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"چلو' جو تم لوگ مناسب سمجھو۔" وہ فوراً" ہی متفق ہو گئے پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولے۔ "بیٹا! تمہاری بینش آنٹی کا تمہارے رزلٹ پر کیا رسپانس تھا؟"

"ٹھیک تھا پاپا۔" وہ اتنی دور بیٹھے اپنے باپ کو

پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"انہوں نے تمہیں مبارک باد دی....؟" تیمور نے اگلا سوال بڑی بے تابی سے کیا۔

"نہیں...." اوریدا مزید جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ وہ ایک دم ہی چپ سے ہو گئے۔

"طیبہ پھپھو بہت خوش تھیں اور انہوں نے میری اس کامیابی کو باقاعدہ سیلیبریٹ بھی کیا تھا۔" اس نے اپنے باپ کو خوش کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں' وہ آپ سے پیار بھی تو بہت کرتی ہیں...." انہوں نے کہا پھر بولے۔

"ماہیر کہاں ہے؟ میری بات کرواؤ ذرا اس سے۔" وہ جلدی سے سیل فون ماہیر کو پکڑا کر خود لان کی طرف چلی آئی۔ اس کا دل افسردگی کی گہری تہ میں لپٹا ہوا تھا۔

"اچھا تو ارصم جاوید! اب تمہارے پاس میرے لیے چند مبارک باد کے الفاظ بھی نہیں۔" لاشعوری طور پر چلتے ہوئے ارصم کے پورشن کی طرف چلی آئی۔ آغا جی' بینش اور ارصم تینوں لان میں موجود تھے اور چائے پی رہے تھے۔ آغا جی نے اسے دیکھ کر محبت سے ہاتھ ہلایا' وہ شش و پنج کا شکار ہو گئی کہ ان کی طرف جائے یا نہ جائے' پھر کچھ سوچ کر وہ ان کی طرف بڑھ آئی اور سب کو مشترکہ سلام کیا۔ ارصم نے بغور اس کا افسردہ سا انداز دیکھا اور پھر لاپروائی سے چائے پینے لگا۔

"ہاں بھئی اوریدا! کیسی ہو بیٹا...." آغا جی ہمیشہ اس سے محبت سے ملتے تھے' البتہ بینش کے اعصاب کچھ تن سے گئے تھے لیکن خیریت رہی۔ انہوں نے سامنے میز پر رکھا انگلش اخبار اٹھایا اور بے نیازی سے پڑھنے لگیں۔

"ٹھیک ہوں آغا جی...." اس نے ست سے انداز میں جواب دیا۔

"کھڑی کیوں ہو' بیٹھو ناں...." آغا جی کے اصرار بھرے انداز پر وہ بیٹھ گئی' جبکہ ارصم کی لاتعلقی اسے تکلیف میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کہاں ایڈمیشن لے رہی ہو تم۔" آغا جی نے کباب سے بھری پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے یونہی پوچھا۔

"میرا ارادہ تو راولپنڈی میڈیکل کالج میں لینے کا تھا لیکن...." اوریدا کی بات پر ارصم کو دھچکا سا پہنچا۔

"لیکن کیا....؟" آغا جی حیران ہوئے۔

"لیکن بڑے ابا کہتے ہیں کہ میں AMC (آرمی میڈیکل کالج) میں جاؤں...." اوریدا کی بات پر بینش کو شاک سا لگا' انہوں نے ناگواری سی بے چینی کے تحت پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ہاتھ میں پکڑا اخبار باقاعدہ غصے سے میز پر پٹخا اور اپنا چائے کا کپ اٹھا کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ آغا جی اور ارصم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر خفت کا شکار ہوئے' جبکہ اوریدا خوف زدہ سی نگاہوں سے بینش کو اندر جاتا دیکھنے لگی۔

"بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں' تمہیں اسی کالج میں ایڈمیشن لینا چاہیے۔" آغا جی نے ماحول کو بدلنے کے لیے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا' اوریدا خاموش رہی۔ آغا جی نے چونک کر دونوں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔

"تم دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا چل رہا ہے کیا؟" آغا جی کے اچانک پوچھنے پر وہ دونوں ہی بوکھلا گئے۔

"نن نہیں۔ آغا جی...." ارصم نے گھبرا کر جواب دیا۔

"تم نے اوریدا کو اس کی کامیابی پر کیا گفٹ دیا ہے پھر؟" انہوں نے کھوجتی نگاہوں سے ارصم کا پریشان چہرہ جانچتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے تو مجھے مبارک باد تک نہیں دی...." اوریدا کا انداز شکایتی تھا' جب کہ ارصم کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح آغا جی کے سامنے کہہ دے گی اس لیے وہ ایک لمحے کو سٹپٹا سا گیا۔

"پوچھ سکتا ہوں میاں' اس قدر غیر اخلاقی حرکت کیوں کی آپ نے....؟" آغا جی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"اس نے بھی تو کون سا خود مجھے فون کر کے اپنے رزلٹ کا بتایا تھا۔" اس کے پاس بھی ایک مضبوط جواز تھا اب بوکھلانے کی باری اوریدا کی تھی۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ ارصم کی طرف سے یہ اعتراض آئے گا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے بیٹا۔۔۔" آغا جی نے تاسف بھرے انداز میں اوریدا کی طرف دیکھا۔

"آئی ایم سوری آغا جی۔۔۔" اوریدا بہت جلدی اپنی غلطی مان لیتی تھی، اس لیے شرمندگی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"سوری مجھ سے نہیں، ارصم سے کریں۔ آپ دونوں کے درمیان جو غلط فہمیاں ہیں، وہ دور کرلیں، میں ذرا جلال بھائی سے مل کر آتا ہوں۔" آغا جی نے دانستہ دونوں کو تنہائی فراہم کی تھی۔

"مبارک ہو تمہیں بہت بہت۔۔۔" آغا جی کے دور جاتے ہی ارصم نے سنجیدگی سے اوریدا کو مخاطب کیا۔

"تھینک یو۔۔۔" وہ ابھی تک بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔

"پوچھ سکتا ہوں کہ محترمہ، میرے ساتھ کچھ عرصے سے ایسا کیوں کر رہی ہیں۔" ارصم کا طنزیہ انداز اوریدا کو برہم کر گیا۔

"جب آپ کو یہ تک نہیں پتا تو کیا فائدہ بات کرنے کا۔۔۔"

وہ تپ کر کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی ارصم جھنجلا کر اٹھا۔ اس نے غصے سے اوریدا کا بازو پکڑا اور ناراض لہجے میں کہا۔

"خاموشی سے بیٹھ جاؤ یہاں، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"آپ سے برا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا میرے لیے۔۔۔" اوریدا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"ایک آنسو بھی نکلا تو جان نکال دوں گا تمہاری۔۔۔" اس نے انگلی اٹھا کر ہمیشہ کی طرح اسے وارننگ دی۔

"اتنی فالتو نہیں ہے میری جان۔۔۔" اس کے چڑنے پر ارصم کو ہنسی آ گئی۔ جب کہ اس کے مسکرانے پر اوریدا کو بے تحاشا غصہ آیا اور اس کے پاس اب رونے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

"چلو میرے ساتھ۔۔۔" وہ سنجیدگی سے کھڑا ہوا، اس نے اسے چپ نہیں کروایا تھا۔ اوریدا اس کی بات پر حیران ہوئی۔

"فکر مت کرو، جہنم میں نہیں لے جا رہا تمہیں۔" اس نے زبردستی اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور گاڑی میں لا بٹھایا۔ دس منٹ کے بعد وہ دونوں ایف نائن سیکٹر میں واقع پارک میں تھے۔

"یہاں بیٹھ کر جتنا رونا ہے، رولو، اور مجھے بتاؤ کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ۔" ارصم نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھتے ہوئے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا، جس کی آنکھیں آنسوؤں کے بہنے کی وجہ سے سرخ تھیں، اور یہ سرخی ارصم کے دل کو تکلیف پہنچا رہی تھی۔

"میں کیوں روؤں۔۔۔" اس نے بے دردی سے اپنے بازو۔۔۔ سے آنسو صاف کیے۔

"پھر بولو، کیوں کر رہی ہو تم ایسا۔۔۔؟" وہ اب سنجیدگی سے بولا۔

"اس لیے کہ تم نے میرے ساتھ چیٹنگ کی ہے اور تم مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔" وہ پھٹ پڑی۔

"اچھا، کب جھوٹ بولا میں نے۔۔۔؟" وہ پر اعتماد انداز میں گویا ہوا۔

"تم نے اس دن مجھ سے کہا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جا رہا ہوں اور کچھ دیر بعد تم پی سی میں زرش کے ساتھ ڈنر کر رہے تھے۔" اوریدا کی بات پر اسے زوردار جھٹکا لگا تھا۔

"اس میں جھوٹ بولنے والی کیا بات تھی اوریدا! میں اپنے فرینڈز کے ساتھ ہی گیا تھا صدر اور مجھے اچانک زرش مل گئی، وہ لاہور سے آئی ہوئی تھی اور اس نے مجھے ڈنر کی آفر کر دی اور مجھے مناسب نہیں لگا کہ میں اسے انکار کروں۔" اس کے لہجے سے بھی ناراضی چھلکی۔

"تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا، تم اس سے ملنے جا رہے ہو۔" اس کے پاس پوری چارج شیٹ تیار تھی۔

"اوہ مائی گاڈ! بے وقوف لڑکی بتایا تو ہے' وہ مجھے اچانک مل گئی تھی' تم مجھ سے پوچھتیں تو سہی۔" ارصم کو اس پر بے تحاشا غصہ آیا۔

"اور تم نے مجھے' میرے رزلٹ کی مبارک باد تک نہیں دی۔" اس نے اگلی فرد جرم عائد کی۔

"جب تم سرمد بھائی کے ساتھ بیٹھ کر ہنس ہنس کر مجھے جلاؤ گی تو مجھ سے اس چیز کی توقع کیوں رکھتی ہو کہ میں تمہیں وش کروں گا۔" اس کے پاس بھی اپنی ناراضی کی کئی وجوہات تھیں۔

"وہ میرے فرسٹ کزن ہیں۔۔۔" اس نے جھنجلا کر یاد دلایا۔

"تو پھر زرش بھی میری بچپن کی فرینڈ اور کلاس فیلو ہے۔۔۔" اس نے بھی جوابی وار کیا۔

"تم اب زرش کو سرمد بھائی کے ساتھ ملاؤ گے۔۔۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر غصے سے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"جب تم میری ذرا سی بات پر ہرٹ ہو سکتی ہو تو میرے سینے میں بھی دل کی جگہ کوئی سیمنٹ کی تختی نہیں لگی ہوئی۔" وہ منہ بنا کر ناراضی سے بولا۔ "کتنی دفعہ تم سے پوچھا کہ تم مجھ سے اتنی خفا کیوں ہو' کتنی منتیں کیں' لیکن تم نے تو کچھ بھی نہ بتانے کی قسم کھا رکھی تھی۔"

"ہاں تو کیوں بتاتی۔۔۔" وہ ہلکا سا چڑ کر سامنے رکھے بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

"دوبارہ ایسی حرکت کرو گی تو تمہارا حشر نشر کر دوں گا میں۔۔۔" وہ تپ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اوریدا خاموش رہی۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں اس پارک کے درختوں سے نہیں۔" وہ دھپ کر کے اس کے برابر جا بیٹھا۔ اوریدا نے اس دفعہ بھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"اب کیا میں کسی تھرڈ کلاس فلم کے ہیرو کی طرح پارک میں چھلانگیں لگا لگا کر بتاؤں کہ تم میرے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہو۔" اس کے بری طرح جھنجلانے پر اوریدا کو ہنسی آگئی۔

"جن کو ہم سے بے تحاشا محبت ہو' انہیں ایسے تنگ کرتے ہیں بھلا۔۔۔" اس نے کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ موڑا اور نرم لہجے میں پوچھا۔ اوریدا کو اپنی بے وقوفی کا پوری شدت سے احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر ارصم کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں محبت' نرمی اور شکوؤں کا ایک جہان آباد تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

"اب کیوں کھڑی ہو گئی ہو' بیٹھ کر میری بات سنو ناں۔" اس کی بوکھلاہٹ ارصم کو لطف دے گئی۔

"گھر جا کر سن لوں گی۔" وہ تھوڑا سا رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"اب دوبارہ کبھی مجھ سے بدگمان ہو کر جھگڑا کرو گی؟" وہ بہت آرام اور سکون سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔" اوریدا نے صرف نفی میں سر ہلایا۔

"اب زبان کو کیوں تالا لگ گیا ہے' پہلے تو بہت بڑھ چڑھ کر الزام تراشی کر رہی تھیں مجھ پر۔۔۔" وہ دونوں آہستگی سے چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے اور سامنے مارگلہ کی پہاڑیوں پر سورج غروب ہو رہا تھا لیکن ان دونوں کے اندر ایک روشن دن کے طلوع ہونے کی شروعات ہو چکی تھیں۔

"دوبارہ اس چپٹی ناک والی زرش کے ساتھ نظر آؤ گے تو چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔" اوریدا نے ناک چڑھا کر اسے دھمکی دی۔

"یہی تو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے مت چھوڑو۔۔۔"

وہ شرارتی انداز سے اس کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔

"اب ایسے بھی ہینڈسم نہیں ہو تم۔۔۔" اوریدا جھینپی۔

"اچھا' یقین نہیں آتا تو آکر میری کلاس فیلوز سے پوچھ لو' پورے کالج میں سب سے زیادہ ڈیشنگ ایم سی (ملٹری کیڈٹ) کون ہے؟" ارصم نے اسے چڑانے کی بھرپور کوشش کی۔

"میں کیوں پوچھوں۔۔۔" اوریدا مسکرائی۔ "مجھے معلوم ہے تم سے اچھا وہاں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

اوریدا کا برا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ ارصم نے بہت دن کے بعد کھل کر سانس لی۔ دونوں مسکراتے ہوئے اب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"تم منہ اٹھا کر ارصم کے ساتھ چل دیں اور یہاں میں نے تمہاری تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے۔" وہ جیسے ہی گھر پہنچی' بڑی اماں کا پارہ ہائی تھا۔

اوریدا کو فوراً" ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"سوری بڑی اماں! میں ہی لے کر گیا تھا اسے۔۔۔" ارصم نے کان کھجاتے ہوئے شرمندگی سے وضاحت کی۔

"تو میاں! اپنے ساتھ جاتے ہوئے اس کا باجا بھی لے جاتے۔" وہ بیزار لہجے میں بولیں۔

"باجا۔۔۔؟" اوریدا اور ارصم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پریشانی سے دیکھا۔

"ارے وہ ہی موبائل فون اور کیا کہہ دیا ہے میں نے فارسی میں ایسا' جو ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے ہو۔" بڑی اماں کی بات پر دونوں ہی بے اختیار ہنس پڑے کہ وہ سیل فون کو "باجا" کہہ رہی تھیں۔

"جاؤ۔ میرے لیے سبز قہوہ بنا کر لاؤ' سر میں درد کر دیا میرے۔" انہوں نے بے زاری سے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"اللہ معاف کرے' میرا تو خون خشک کر دیا اس لڑکی نے' سارا گھر چھان مارا اس کی تلاش میں۔" وہ اب ارصم کے ساتھ بیٹھیں اپنا دکھڑا بیان کر رہی تھیں۔

"سوری بڑی اماں! مجھے خیال ہی نہیں رہا۔۔۔" ارصم کو حقیقتاً" شرمندگی ہو رہی تھی' وہ بڑی اماں کی پریشانی کا اندازہ کر سکتا تھا۔

"تمہاری ارصم کے ساتھ صلح ہو گئی کیا۔۔۔؟" وہ جو کچن میں قہوہ دم پر رکھ کر کھڑی تھی۔ ماہیر کی بات پر حیران رہ گئی' وہ اچانک ہی اندر آیا تھا اور اب فریج میں سر دیے کوئی کھانے کی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔

"میری ارصم کے ساتھ لڑائی ہی کب تھی۔" وہ صاف مکر گئی۔

"بیٹا! اپنے بڑے بھائی کے ساتھ زیادہ استادی کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ فریج سے سیب نکال کر لے آیا اور اب شرارت سے اوریدا کے دوپٹے سے صاف کرنے لگا' اوریدا نے گھور کر اسے دیکھا۔

"اس میں استادی کی کیا بات ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہہ کر بڑی اماں کی پیالی کیبنٹ سے نکالی۔

"یہ جو پچھلے کچھ عرصے سے تم دونوں منہ لٹکائے گھوم رہے تھے' وہ کیا تھا۔" وہ اب مزے سے سیب کھاتے ہوئے بولا۔

"وہ تو میں اپنی اسٹڈی میں مگن تھی۔۔۔" اوریدا نے بھی آج نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"اچھا پھر نظریں چرا کر کیوں بات کر رہی ہو' میری طرف دیکھ کر کہو ناں۔" ماہیر کی ہنسی اسے تپا گئی۔

"ہاں بتائیں' کیا پرابلم ہے۔۔۔" اس نے چڑ کر اپنے بھائی کا شرارتی چہرہ دیکھا۔

"کیا مسئلہ چل رہا تھا ویسے تم دونوں کے بیچ۔۔۔" وہ شیلف سے ٹیک لگا کر مزے سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ ہم دونوں کے درمیان کچھ چل رہا تھا۔" اوریدا نے بھی اطمینان سے دریافت کیا۔

"تم دونوں کی شکلیں چیخ چیخ کر بتا رہی تھیں۔" ماہیر نے اسے چڑایا۔

"تو پھر اس وقت کیوں نہیں پوچھا آپ نے۔۔۔" اوریدا نے قہوے میں چینی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے' میں کسی کی ذاتیات میں نہیں گھستا۔" ماہیر اب لاپروائی سے سیب کھا رہا تھا۔

"تو اب کیوں گھس رہے ہیں؟" اوریدا نے جواباً" اسے تپانے کی کوشش کی۔

"ویسے ہی دل چاہ رہا تھا۔۔۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

"آپ کو کس نے بتایا کہ ہمارے درمیان صلح ہو گئی ہے۔۔۔" اوریدا نے الجھن بھرے انداز سے پوچھا۔

"لاؤنج میں بڑی اماں کے پاس بیٹھا ارسم جو آج بے وقوفوں کی طرح ہر بات پر ہنس رہا ہے۔ کچن میں آیا تو تم مسکرا رہی تھیں۔ میں نے سوچا' تم سے ہی پوچھ لوں کہ آخر کون ساز عفران کا کھیت دیکھ کر آئے ہو تم دونوں؟"

ماہیر کے مذاق اڑاتے انداز پر اورید امسکرائی۔

"ویسے' بہت تیز ہیں آپ..."

"اور بہت بے وقوف ہو تم دونوں' ناراض ہوتے ہو تب چہرے پر افسردگی کے بینر آویزاں کر کے گھومتے ہو اور خوش ہوتے ہو تو تب بھی ساری دنیا کو پتا چل جاتا ہے۔" ماہیر کچن سے نکلتے نکلتے اوریدا کو حیران کر گیا۔ وہ ہلکی سی خفت کا شکار ہوئی اور اگلے ہی لمحے مسکراتے ہوئے قہوے کی پیالی ٹرے میں رکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کس شہر سے تعلق ہے تمہارے سسرال والوں کا؟"

بختاور نے پریشانی سے سرفراز کی والدہ کا چہرہ دیکھا۔ انہیں وہاں رہتے ہوئے تیسرا دن تھا اور ہاشم کے دوست سرفراز کی والدہ رات ہی انگلینڈ سے پاکستان پہنچی تھیں بختاور کا رات تو ان سے سامنا نہیں ہوا' صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی تو وہ کچھ دیر کے بعد اس کے کمرے میں آن پہنچیں اور اب کسی سخت کمیشن کی طرح اس سے انٹرویو لے رہی تھیں۔

"کس شہر میں رہتے ہیں تمہارے سسرال والے۔" انہوں نے سنجیدگی سے اپنا سوال دہرایا۔

"جی ربوہ میں..." بختاور نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے میاں کے..." وہ چائے پیتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولیں۔

"شاید چار..." اس نے اندازہ لگا کر جواب دیا۔

"یہ شاید سے کیا مراد ہے تمہاری؟ تم ان سے ملی نہیں ہو کیا؟" ان کے انداز میں ہلکی سی ناگواری جھلکی۔

"نہیں۔" بختاور نے شرمندگی سے جواب دیا۔

"ہاں بتایا تھا مجھے سرفراز نے کہ تمہاری لو میرج ہے۔" انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "اللہ جانے یہ کیسی محبت کی وبا چل پڑی ہے زمانے میں' اپنے پیدا کرنے والے' پالنے پوسنے والے والدین ہی دشمن لگنے لگتے ہیں بچوں کو۔" ان کی اس بات پر بختاور کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"کل کو جب خود ماں بنو گی تو تمہیں اندازہ ہو گا' والدین کس اذیت سے گزرتے ہیں جب نادان اولاد منہ زور ہو کر ان کے سامنے آن کھڑی ہو۔" وہ نہ جانے کس بات کا غصہ بختاور پر اتار رہی تھیں' لیکن بختاور کی مجبوری تھی کہ وہ ان کے گھر میں موجود تھی اور یہ ساری باتیں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سننا تھیں۔

"کل کلاں کو اللہ نے بیٹی دے دی تو کیا بتاؤ گی اس کے سسرال والوں کو کہ اس کا ننھیال اور ددھیال کہاں ہے۔" وہ بہت دور کی کوڑی لائیں۔

"وہ لوگ مان جائیں گے..." بختاور نے شرمندگی سے سر جھکا کر جواب دیا۔

"برا مت ماننا بیٹا! وہ لوگ مان تو جائیں گے لیکن تمہاری اس غلطی کو کبھی نہیں بھلائیں گے' ساری زندگی تمہاری اولاد کو طعنے ملیں گے اس بات کے۔" سرفراز کی والدہ خطرناک حد تک صاف گو تھیں۔ بختاور کے پاس ان کی اس بات کا جواب نہیں تھا۔

"ویسے بھی جو مرد آج تمہارے لیے پیدا کرنے والے والدین اور محبت کرنے والے بہن بھائیوں کو چھوڑ دے' اس کا کیا بھروسا' کل کو کب کہاں تمہارا بھی ساتھ چھوڑ دے۔" انہوں نے بختاور کا دل دہلایا۔

"ہاشم ایسا نہیں ہے..." بختاور نے کمزور سی آواز میں اس کا دفاع کیا۔

"مرد کو اس کے ظاہر سے پہچاننا ناممکن ہے۔ وہ پیاز کی طرح پرت در پرت کھلتا ہے اور پھر ساری زندگی اس عورت کو رلاتا ہے جو محبت کے سفر میں اپنے والدین کی عزت کا سودا کر کے اس کا ساتھ نبھانے چل پڑتی ہے۔" وہ تلخ لہجے میں کہتے ہوئے بختاور کے دل پر

کئی چھریاں ایک ساتھ چلا گئیں۔

"آپ کے بیٹے نے بھی تو فائزہ بھابھی سے پسند کی شادی کی ہے۔" بختاور کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

"وہ اسے کورٹ کچہری سے گزار کر اپنے گھر نہیں لایا بیٹا! ساری دنیا کے سامنے بیاہ کر عزت سے لے کر آیا تھا اس گھر میں۔" بختاور کو لگا جیسے کسی نے ایک زور دار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کر دیا ہو۔

"مجھے تم کسی نیک ماں باپ کی اولاد لگتی ہو، لیکن یہ حرکت تم نے اچھی نہیں کی۔" انہوں نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اماں! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، اٹھیں، آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔" فائزہ بھابھی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی ساس کا زہر میں بجھا جملہ سنا تو ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

وہ اب شرمندگی سے بختاور کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھ رہی تھیں، جو آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں لال ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آنکھ، کان کھول کر رہنا ہوسٹل میں۔" بڑی اماں صبح سے اسے نصیحتیں کر رہی تھیں۔ اوریدا کا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا تھا اور ماہیر زبردستی اس کے ہوسٹل میں بھی ڈاکومنٹس جمع کروا آیا تھا اور اوریدا کو وہاں جانے کا سوچ کر ہی کوفت ہو رہی تھی، اوپر سے بڑی اماں اٹھتے بیٹھتے اسے سمجھانے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں جو اوریدا کے لیے اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

"سن لیا ناں تم نے میں نے کیا کہا ہے، ہوسٹل میں ہوشیاری سے رہنا۔"

"آپ تو یوں کہہ رہی ہیں، جیسے میں ہوسٹل میں نہیں، اپنے سسرال میں جا رہی ہوں۔" اوریدا نے پیکنگ کرتے ہوئے بےزاری سے جواب دیا۔

"ہوسٹل کون سا کسی سسرال سے کم ہوتا ہے۔ بھانت بھانت کی تو لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں۔" بڑی اماں نے اس کے ہاتھ سے کپڑے پکڑ کر خود تہہ کر کے اٹیچی کیس میں رکھنے شروع کر دیے۔

"تو مجھے کون سا شوق تھا وہاں جا کر رہنے کا، یہ تو ماہیر بھائی کی ضد تھی۔۔۔" اوریدا کا صبح سے موڈ خراب تھا۔

"ٹھیک کہتا ہے وہ، یہاں تو سارا دن تم ٹی وی کے سامنے منہ اٹھا کر بیٹھی رہتی ہو۔" بڑی اماں نے منہ بنا کر اسے یاد دلایا۔

"اب اتنا بھی ٹی وی نہیں دیکھتی ہوں میں، جتنا آپ شور مچا رہی ہیں۔" اسے غصہ آ ہی گیا۔

"رہنے دو، سب پتا ہے مجھے۔۔۔" انہوں نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"فرائی ڈے کو ڈرائیور یاد سے بھجوا دیجیے گا۔" اوریدا نے بیزاری سے اٹیچی کیس بند کرتے ہوئے یاد دلایا۔

"لو ابھی گئی ہی نہیں، اور آنے کی فکر پہلے سے پڑ گئی۔۔۔" بڑی اماں کو ہنسی آ گئی۔

"آپ کو کیا پتا، کتنا دل خراب ہو رہا ہے میرا۔۔۔" اوریدا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اچھا اچھا، اب آنسو بہانے کی ضرورت نہیں، دس پندرہ دن رہ کر دیکھو ہوسٹل میں، اگر دل نہ لگا تو واپس آ جانا۔" بڑی اماں کا دل پسیج گیا۔

"لیکن ماہیر بھائی۔۔۔" اوریدا نے دکھی انداز سے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"دیکھ لوں گی میں اس کو بھی، اب کیا زبردستی گھر سے نکالے گا بچی کو۔۔۔" اوریدا کو بڑی اماں کے محبت بھرے انداز پر ایک دم ہی پیار آیا اور وہ ان سے بے ساختہ لپٹ گئی۔ اس کا یہ انداز بڑی اماں کے دل پر کسی پرانی یاد کی دستک دے گیا۔

"قسم سے بڑی اماں! آپ دنیا کی سب سے عظیم گرینڈ مدر ہیں۔ آپ کی عظمت کو سلام۔" وہ ان سے لپٹی اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ بڑی اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

"یہ آپ کو کیا ہوا۔۔۔؟" اوریدا کو ان کے بوڑھے وجود میں لرزش کا احساس ہوا تو وہ فوراً پیچھے ہٹی، بڑی

اماں بے آواز رو رہی تھیں۔

"آپ کہتی ہیں تو میں نہیں جاتی۔" اوریدا نے اپنی سمجھ کے مطابق اندازہ لگایا کہ وہ شاید اس کے جانے پر دکھی ہو رہی ہیں۔

"ایسا تو میں نے نہیں کہا۔" انہوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

"چلو اپنا سامان سمیٹو' میں تمہارے بڑے ابا کو چائے بنا کر دے آؤں۔" وہ اپنی آنکھیں شال سے صاف کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

"کس نے کہا ہے اسے ہوسٹل بھجوانے کو۔۔۔؟" وہ چائے کا کپ ٹرے میں رکھے اسٹڈی روم میں داخل ہوئیں تو جلال صاحب کو برہم پایا۔

"کس کو۔۔۔؟" بڑی اماں اپنی ہی دھن میں تھیں' اس لیے بالکل نہیں سمجھیں۔

"میں تمہارے صاحبزادے کی اولاد کی بات کر رہا ہوں۔۔۔" وہ طنزیہ انداز سے گویا ہوئے۔

"ظاہر ہے اس کا باپ اور بھائی موجود ہے' وہی کہیں گے۔۔۔" بڑی اماں نے بھی روٹھا سا انداز اپنایا۔

"اس کے باپ کو کیا اب بھی عقل نہیں آئی' اسے سمجھاؤ کہ ماضی کے تلخ تجربات سے سبق سیکھے' کیوں اپنے گھر کو آگ لگانا چاہتا ہے وہ۔" بڑے ابا سخت جلالی موڈ میں تھے اور ان کی بات پر ایک تلخ سی مسکراہٹ بڑی اماں کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی۔

"ہر انسان اپنے ہی تجربے سے سیکھتا ہے۔" وہ پھیکے سے انداز سے مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"میری بلا سے' کل کو وہ بھی سر پکڑ کر روتا پھرے گا' اپنے باپ کی طرح۔" وہ پاؤں پٹختے ہوئے اسٹڈی روم سے نکلے اور اندر داخل ہوتی اوریدا سے ٹکرائے جو انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے عجلت بھرے انداز میں آ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری بڑے ابا۔۔۔" وہ ایک دم ڈر سی گئی۔ بڑے ابا نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی اور کچھ بھی کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

"بڑے ابا۔۔۔" اوریدا نے انہیں پیچھے سے ہلکا سا جھجک کر پکارا' وہ رکے' اوریدا ہمت کر کے ان کے پاس پہنچی' انہوں نے دیکھا وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے خوف زدہ ہرنی کی مانند کھڑی تھی۔

"میں جا رہی ہوں۔۔۔" اوریدا کے منہ سے اٹک اٹک کر نکلا۔

"خدا حافظ۔۔۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

اوریدا کا دل ایک دم ہی خراب ہوا اور اسے ماہیر کا فیصلہ درست محسوس ہونے لگا۔ بڑے ابا کا دل دکھاتا انداز اسے اگلے کئی گھنٹے افسردہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماہیر جب اسے ہوسٹل چھوڑنے جا رہا تھا' وہ بالکل خاموش تھی' ماہیر یہی سمجھتا رہا کہ وہ گھر سے دوری کی وجہ سے افسردہ ہے۔ اس لیے اس نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

عائشہ ہال میں اپنے کمرے تک پہنچنے کے عرصے کے دوران اس کے ہونٹوں پر تالا لگا رہا' اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا' اس کا مطلب تھا کہ اس کی روم میٹ آچکی تھی۔ اس نے دروازہ ہلکا سا ناک کیا۔ کمرے میں پہلے سے موجود لڑکی جو اس وقت اپنی الماری سیٹ کر رہی تھی' اس کی پشت اوریدا کی طرف تھی' دروازے پر دستک کی آواز پر وہ مڑی اور اوریدا کو دیکھتے ہی اسے جھٹکا لگا' وہ سخت حیرانی سے اوریدا کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"میں اوریدا ہوں' میری اس کمرے میں الاٹمنٹ ہوئی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے اپنا تعارف کروایا۔

"مجھے عدینہ کہتے ہیں۔۔۔ نائس ٹو میٹ یو۔۔۔" عدینہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ اوریدا کے چہرے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ اور عدینہ کے چہرے پر حیرت' بے یقینی اور پریشانی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نبیلہ عزیز

ماورا مرتضیٰ ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی ' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہوپاتی۔ رضا حیدر ' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بہ اصرار مدعو کرتی ہے۔

تیمور قدم بہ قدم چلتا ہوا عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

اور عزت کا سر مزید جھک گیا تھا۔ وہ حقیقتاً "خود کو اس سے نظریں ملانے کے بھی قابل نہیں پا رہی تھی۔ اور تیمور اس کی کیفیت کو بنا کہے ہی بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔

"ٹائم بہت ہو چکا ہے۔ جاؤ سو جاؤ۔" اس نے بے حد آہستگی اور تحمل سے کہتے ہوئے قدم واپسی کے لیے موڑ لیے تھے۔

اور عزت اس کی اس قدر لاتعلقی اور اس لاتعلقی میں چھپی ناراضی دیکھ کر تڑپ ہی تو گئی تھی۔

"بھائی۔۔۔!" اس نے بے ساختہ پکارا۔ تیمور کے آگے بڑھتے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اس کے سامنے آگئی۔

"آئم سوری بھائی۔ آئم رئیلی سوری۔" عزت کا لہجہ بے حد دھیما اور شرمندہ سا تھا۔

"میں نے کچھ کہا تم سے؟" تیمور کی لاتعلقی برقرار تھی۔

"لیکن۔۔۔ مجھے تو پتا ہے نا کہ میں نے غلطی کی ہے۔" عزت کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

"اگر تمہیں پتا ہے تو پھر آئندہ احتیاط کرنا۔ کچھ دیر پہلے بابا آئے تھے۔۔۔ تمہیں چیک کرنے کے لیے۔۔۔ میں نے ان کو دروازے میں ہی روک دیا کہ تم سو رہی ہو۔۔۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب تم جا کر سچ مچ سو جاؤ۔۔۔ ایک دو گھنٹے کی نیند بھی کافی ہو گی۔" تیمور کے انکشاف پہ عزت کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

"واٹ۔۔۔؟ بابا آئے تھے؟ اس وقت؟" اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔

"ہاں بابا۔۔۔ اس وقت۔" تیمور نے اسی کے الفاظ دہرائے تھے۔

اور تیمور کے جواب پہ عزت کی شرمندگی اور ندامت اور بھی کئی گنا بڑھ گئی۔

"بھائی! وہ۔۔۔ وہ ولید غصے میں تھا۔۔۔ ناراض تھا کہ میں نے اسے جانے کا نہیں بتایا۔۔۔ میں نے اس سے سوری بھی کیا مگر اس کی ضد تھی کہ میرے ساتھ کہیں چائے پینے۔۔۔"

"عزت۔۔۔! جاؤ سو جاؤ۔" تیمور نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن بھائی میں نے انکار کیا تھا کہ میں اس وقت نہیں آسکتی۔ مگر اس نے۔۔۔"

عزت بچوں کی طرح سر جھکائے منمناتی ہوئی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دیکھو عزت۔۔۔! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔۔۔ مجھے تم پہ یقین ہے۔ لیکن اس پہ تم سے بھی زیادہ یقین ہے۔۔۔ بھروسہ ہے اعتماد ہے۔۔۔ مجھے یہ غصہ نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ کیوں گئیں۔۔۔ بلکہ مجھے یہ غصہ ہے کہ تم نے جانے سے پہلے مجھے بھی نہیں بتایا۔۔۔ کم از کم میں بابا کو ہینڈل کرنے کے لیے تو ذہنی طور پہ تیار ہوتا نا۔۔۔؟ اگر خدانخواستہ وہ ڈائریکٹ تمہارے بیڈ روم میں آجاتے تو اس وقت سچویشن بالکل ڈفرنٹ ہوتی۔۔۔ پورے گھر میں اک ہنگامہ کھڑا ہو چکا ہوتا۔۔۔ اک قیامت منہ کھول چکی ہوتی۔۔۔ لیکن شکر ہے اللہ کا کہ میں اتفاقاً "ادھر چلا آیا۔۔۔ ورنہ مجھے بھی خبر نہ ہوتی۔۔۔" تیمور نے اسے صورت حال کی سنگینی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔۔۔

"آئم سوری بھائی۔۔۔! میں نے آپ کو بتانے کا سوچا۔۔۔ مگر پھر خیال آیا کہ آپ سو رہے ہوں گے اس لیے بتائے بغیر چلی گئی۔۔۔ آئی سوری بھائی۔" عزت کہتے کہتے چپ ہو گئی تھی کہ کیسے صفائی پیش کرے۔۔۔؟ اور کیسے اپنی ندامت دور کرے؟

"عزت! تم دونوں شاید معاملے کی سنگینی کو نہیں جانتے۔۔۔ بابا غصے اور ضد کی انتہا پر ہیں۔۔۔ اور ضد اور غصے کی انتہا پہ کھڑا انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے۔۔۔ اس لیے کہتا ہوں کہ اس چیز سے بچ کے رہنا ہو گا۔۔۔ کیونکہ اس سے ہمیں نقصان ہو یا نہ ہو۔۔۔ مگر ولید کو نقصان ضرور ہو گا۔۔۔ اس لیے تم دونوں کو فی الحال سنبھل کر چلنا ہو گا۔۔۔ وہاں

بھی جاؤ تو کانٹیکٹ میں ذرا احتیاط رکھنا۔ کیونکہ بابا آل ٹائم تمہارے ساتھ ہوں گے۔ یہ نہ ہو کہ تم ٹریس ہو جاؤ۔''
تیمور نے اسے ممکنہ خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ''ٹھیک ہے جیسا آپ کہہ رہے ہیں ویسا ہی ہو گا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''اوکے' جاؤ اب۔۔۔ اور آئندہ کوئی بھی حرکت کرنے سے پہلے مجھے بتا دینا۔۔۔ میں سب سنبھال لوں گا۔'' تیمور کہہ کر اس کا سر تھپکتے ہوئے پلٹ گیا۔
''بھائی۔۔۔!'' عزت نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔
''ہوں۔۔۔؟'' تیمور نے پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
''بھائی آپ۔۔۔ آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔ بہت اچھے۔ ایسا بھائی پوری دنیا میں نہیں ہو گا۔۔۔ میں خوش قسمت ہوں کہ آپ میرے بھائی ہیں۔۔۔ اور میں آپ کی بہن ہوں۔''
عزت نے اپنے ہاتھ میں پکڑا تیمور کا ہاتھ بے ساختہ بڑی محبت اور عقیدت سے چوم لیا اور تیمور اس کے اتنے معصوم انداز پہ مسکرا دیا۔
''بہنیں اور بیٹیاں اللہ کی طرف سے ایک بہت ہی خوب صورت اور نازک سا تحفہ ہوتی ہیں۔۔۔ انہیں پیار سے اور احتیاط سے سنبھال کر رکھنا چاہیے۔'' تیمور نے اسے کندھے سے لگا کر اس کا سر تھپکا۔

☼ ☼ ☼

ماورا بے حد گہری نیند سو رہی تھی کہ اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا موبائل فون بج اٹھا۔ اس نے کسمسا کر ٹائم دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔
''اوہ۔۔۔ میں ابھی تک سو رہی ہوں۔۔۔ اتنا ٹائم ہو چکا ہے۔۔۔؟'' وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی یکدم سیدھی ہوئی اور ہاتھ بڑھا کر جلدی سے موبائل اٹھا لیا۔ جواب دوبارہ بج رہا تھا۔
''ہیلو۔۔۔؟'' اب کی بار عجلت میں اس نے نمبر بھی نہیں دیکھا تھا۔
''گڈ مارننگ۔۔۔!'' دوسری طرف تیمور حیدر کی انتہائی فریش سی آواز اس کے اچھے موڈ کا پتا دے رہی تھی۔
''گڈ مارننگ۔۔۔!'' ماورا آہستگی سے کہتی اپنے بال پیچھے ہٹاتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی تھی۔
''لگتا ہے تیمور حیدر کی ہونے والی دلہن ابھی تک اپنی خواب گاہ میں محو خواب تھیں۔۔۔؟'' تیمور اس وقت فل موڈ میں تھا۔
''جی! سو رہی تھی۔ آج ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا۔'' ماورا نے اثبات میں جواب دیا۔
''اوہ! میں نے جگا دیا۔ کوئی خواب تو نہیں ٹوٹا۔۔۔؟'' تیمور کے انداز میں معنی خیزی تھی اور ماورا نے اس معنی خیزی کو کافی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔
''میں خواب نہیں دیکھتی۔۔۔'' ماورا نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔
''اچھا۔۔۔ مگر میں آج کل بہت خواب دیکھ رہا ہوں۔۔۔ دن میں بھی' رات میں بھی' سوتے میں' بھی جاگتے میں بھی' سہانے خواب۔ قریب آنے کے خواب۔۔۔'' تیمور نے بڑے سرشار سے انداز سے کہا۔
''قریب آنے والے خوابوں کی تعبیر بھی پوچھ لیتے کسی سے؟'' ماورا نے جیسے اک لمبی سانس کھینچی تھی۔
''میرے سارے خوابوں کی تعبیریں تمہارے پاس ہیں۔۔۔ تم بتاؤ کون سا خواب اچھا ہے؟ اور کون سا خواب برا ہے؟''
''مگر مجھے کیا معلوم کہ آپ کیسے خواب دیکھ رہے ہیں۔'' ماورا نے لاپروائی سے کہتے ہوئے بھنویں اچکائیں۔

یوں جیسے وہ اس کے سامنے کھڑا اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا ہو۔
"میں خواب چاہے جیسے بھی دیکھ رہا ہوں۔۔۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر خواب میں صرف تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"
تیمور کی بے قراری آج پہلی بار اس کے منہ سے لفظوں کی صورت باہر نکل رہی تھی۔۔۔ ورنہ وہ بہت ہی صبر اور ضبط سے رہنے والا آدمی تھا۔
"لوگ دولت کے خواب دیکھتے ہیں۔" ماورا نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔
"میں محبت کے خواب دیکھ رہا ہوں۔" وہ پرسکون تھا۔
"خواب صرف خواب ہی ہوتے ہیں' چاہے دولت کے ہوں۔۔۔ چاہے محبت کے اور تعبیریں ہمیشہ الٹ ہوتی ہیں' کیونکہ خواب کا متضاد ہی حقیقت ہے۔۔۔ خواب کچھ اور ہوتا ہے۔ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔۔۔" ماورا کے لفظوں میں گہرائی تھی مگر تیمور آج کل ان گہرائیوں کو سمجھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔۔۔ وہ بس اپنے دل کی سن رہا تھا۔
"خواب میرے جیسا ہوتا ہے۔۔۔ خوش فہم۔۔۔ اور حقیقت تم جیسی ہوتی ہے تلخ۔"
تیمور نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ایسی کوشش جو واقعی سچ تھی۔۔۔ ایک اٹل حقیقت۔۔۔ اور ماورا نے اس حقیقت سے بھرپور اتفاق کیا تھا۔
"آپ کی یہ بات تو ہنڈرڈ پرسینٹ درست ہے۔"
"کیا میں ہنڈرڈ پرسنٹ درست نہیں ہوں؟" تیمور کا سوالیہ جواب ماورا کو ایک بار پھر چپ ہونے پہ مجبور کر گیا تھا۔
"ہیلو۔۔۔ چپ کیوں ہو گئی ہو؟" تیمور آج اسے آپ کے بجائے تم کہہ رہا تھا اور ماورا کو اس کے منہ سے اتنے استحقاق سے برآمد ہوتا "تم" کا لفظ بہت ہی عجیب لگ رہا تھا۔
"آپ بتائیں' صبح صبح فون کیوں کیا؟" اس نے پھر بات بدلنے کی سعی کی۔۔۔
"بتایا تو ہے کہ میں آج کل خواب بہت دیکھ رہا ہوں۔۔۔ اور خواب سونے نہیں دیتے آج ساری رات تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھتا رہا۔۔۔ اس لیے سوچا کہ۔۔۔"
"پلیز تیمور! آپ اپنے خواب۔۔۔" ماورا نے یکدم اس کی بات کاٹ دی تھی۔۔۔
"اُفوہ' پہلے پوری بات تو سن لو۔" تیمور نے بھی اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔
"دلہن کے روپ میں بھی تم ایسی ہی خشک اور بور باتیں کر رہی تھیں۔" تیمور نے بڑے مزے سے کہتے ہوئے ماورا کو شرمندہ کر ڈالا۔
"میں ناشتا کرنے کے لیے اٹھ رہی ہوں' اس لیے فون بند کرتی ہوں۔" اس نے سلسلہ ہی منقطع کرنا چاہا۔
"اچھا۔۔۔ پھر مارکیٹ کب چلنا ہے؟"
"مارکیٹ۔۔۔؟" ماورا کال بند کرتے کرتے رک گئی۔
"ہاں۔۔۔! برائیڈل ڈریس پسند کرنے کے لیے۔۔۔ میں نے چند ڈریسز آرڈر کیے تھے' وہ کل شام آچکے ہیں۔۔۔ مجھے کال آئی تھی۔۔۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں۔۔۔ تھوڑی دیر تک تمہیں پک کرلوں گا۔۔۔ تم تیار ہو جاؤ تب تک۔" بالآخر وہ اصل مقصد کی طرف آہی گیا تھا۔
"برائیڈل ڈریس۔۔۔ مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟ سادگی سے نکاح ہی تو ہوگا صرف۔۔۔؟" ماورا کو برائیڈل ڈریس کا سن کر عجیب سا لگا تھا۔
"تمہیں ضرورت نہیں ہے۔۔۔ مگر مجھے تو ہے نا؟ میں اپنی بیوی کو فل سولہ سنگھار میں' دلہن بنے دیکھنا چاہتا

ہوں... کیونکہ چاہے شادی ہو چاہے نکاح' زندگی میں ایک ہی بار ہوتا ہے... بار بار موقع نہیں ملتا... اس لیے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے... میں یہ موقع مس نہیں کر سکتا۔ رات کو بیوٹیشن آئے گی فارہ کے ساتھ ہم نے جو سروسز لینی ہے وہ گھر پہ ہی لے لینا... نہیں تو پارلر بھی جا سکتی ہو۔"

تیمور نے اسے مزید آگاہ کیا اور ماورا مزید حیرت زدہ سی ہو گئی تھی کہ وہ اس حوالے سے کتنا پُرجوش اور باخبر نظر آ رہا تھا۔

"او کے! فون رکھتا ہوں... تھوڑی دیر بعد تمہیں پک کر لوں گا' بائے۔" اس نے فون بند کر دیا تھا اور ماورا کتنی ہی دیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم آنٹی...!" عافیہ بیگم نے دروازہ کھولا تو سامنے تیمور حیدر کھڑا تھا۔

"والسلام... اندر آ جاؤ۔" وہ نارمل سے لہجے میں کہتیں' سامنے سے ہٹ گئیں۔

"سوری آنٹی... میں بس ماورا کو لینے کے لیے آیا ہوں۔ دیر ہو رہی ہے' مجھے کچھ اور کام بھی ہیں۔" تیمور کھڑے کھڑے کام ختم کرنا چاہتا تھا۔

"اچھا... میں بھیجتی ہوں اسے۔" عافیہ بیگم کہہ کر چلی گئی تھیں۔

اور تھوڑی دیر بعد ہی ماورا اپنا بیگ لیے باہر نکل آئی تھی۔

"ہائے ہیلو پر کوئی پابندی ہے آج کل؟" تیمور اس کی خاموشی پہ چوٹ کرتا اس کے ساتھ ہی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔

"ہائے ہیلو اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔" ماورا کے لہجے میں اب بھی کوئی لچک نہیں تھی۔ اور تیمور اس کی بات پہ مسکرا دیا تھا۔

"مجھے صرف یہ بتا دیں مس ماورا مرتضیٰ اکہ زندگی میں ضروری کیا ہے؟" وہ اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"محبت کرنی ہے... محبت کا اظہار ضروری نہیں... ساتھ کام کرنا ہے... ساتھ آنا جانا ضروری نہیں... شادی کرنی ہے... دلہن بننا ضروری نہیں... ملنا ہے... مگر ہائے ہیلو ضروری نہیں۔ کل کو تو تم یہ بھی کہو گی کہ شادی کر لی ہے مگر بچے..."

تیمور نے روانی میں کہتے کہتے یکدم اپنی زبان کو بریک لگایا کہ کہیں وہ پھر بدک ہی نہ جائے۔

"سوری! یہ بات میں کل کمپلیٹ کروں گا۔ آج میرے پاس حق اور اختیار نہیں ہے۔"

تیمور نہایت شرافت سے معذرت کرتا' بلڈنگ سے نکلتے ہی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا اور ماورا کے لیے اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور بڑے مودبانہ طریقے سے کھول کر اسے بیٹھنے کی آفر کی تھی اور وہ گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی ایک لمحے کے لیے اسے دیکھ کے رہ گئی۔

وہ کتنی محبت اور کتنی چاہت سے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا... بالکل ایسے جیسے دل کا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور ماورا اس کھلے ہوئے دروازے کی سمت بڑھ رہی تھی۔

اور خود کو اس دروازے کی سمت بڑھتے دیکھ کر اس کے قدم چند انچ کے فاصلے پہ ہی تھم گئے تھے۔ یوں جیسے وہ اس کے دل کے دروازے کی سمت بڑھتے بڑھتے رک گئی ہو۔

"کیا بات ہے میڈم... رک کیوں گئیں؟ کیا کھلے دروازے میں داخل ہونا بھی ضروری نہیں؟" تیمور نے

بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا تھا اور وہ پلٹ کے اسے کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔
"آئیے! یہ دروازہ آپ کے لیے ہی کھلا ہے اور آپ کے ہی انتظار میں ہے۔" اس نے دوبارہ اسے چھیڑنے کے لیے کہا تھا اور مجبوراً" ماورا سر جھکتی ہوئی آگے بڑھ کے فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی اور تیمور نے اس کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر دیا جیسے دل کا دروازہ بند کر دیا ہو... اور جیسے ماورا کی واپسی کا بھی دروازہ بند ہو گیا ہو...!
وہ سوچ کر رہ گئی۔
تیمور دوسری طرف سے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا اور اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیمور نے دو لاکھ سے دس لاکھ کی رینج تک کے ڈریسز آرڈر کیے تھے اور وہ تمام ڈریسز ماورا کے سامنے بکھرے پڑے تھے' بوتیک کی انچارج اور سیلز گرل اسے ہر ڈریس کے بارے میں بتا رہی تھیں جبکہ ماورا کو کسی بھی ڈریس کی کوالٹی' ورائٹی یا پرائز سے کوئی غرض نہیں تھی' بلکہ وہ تو تیمور حیدر کا شوق اور اشتیاق دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں محبت اور رنگین و چمک دار جذبے ہر سوٹ پہ سجے موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔ ستاروں کی مانند ٹمٹما رہے تھے... چاند کی مانند مسرور کر رہے تھے اور سورج جیسی تپش دے رہے تھے۔
"یہ بلیک ڈریس بہت عمدہ ہے۔" تیمور نے بے اختیار اظہار کیا تو ماورا نے سیاہ سوٹ دیکھا... اس پہ ریڈ اور گرین دھاگے کا کام تھا۔ کلر اتنے برائٹ تھے کہ پہلی نظر میں ہی بہت بھلے لگ رہے تھے... ماورا نے پہلی بار لب کشائی کی...
"یہ پیک کر دیں..." ماورا نے اتنے سارے ڈریسز میں سے صرف تیمور کی پسند کو ترجیح دی تھی۔ جس پہ حقیقتاً" تیمور کو بے انتہا خوشی محسوس ہوئی تھی۔
"میں چاہتا ہوں کہ تمہارا برائیڈل ڈریس ہم دونوں کی پسند کا ہو... ہماری مشترکہ پسند۔"
تیمور کے لبوں پہ ایک اور خواہش کا وجود مچلا تھا اور ماورا نے بے اختیار پلکیں اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
"اور آپ کا ڈریس...؟" ماورا نے وہ سوال پوچھا جس کی تیمور کو توقع ہی نہیں تھی۔
"وہ صرف تمہاری پسند کا..." تیمور نے فوراً" جواب پیش کیا۔
اور ماورا چپ ہو گئی' پھر تیمور نے اس کی ایک ایک چیز اس کے ساتھ مل کر اپنی پسند سے خریدی تھی۔ جوتے... پرس... جیولری' کاسمیٹکس ہر چیز میں اس نے بھرپور تعاون بھی کیا تھا اور دخل اندازی بھی... ماورا اس کی اتنی خوشی دیکھ کر اندر سے مزید چپ ہوتی جا رہی تھی۔
"دونوں ہاتھوں اور کلائیوں پہ فل مہندی کا ڈیزائن ہونا چاہیے اور دونوں ہاتھوں پہ میرا نام بھی۔" واپسی پہ ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے اک نئی خواہش سامنے آئی تھی۔
"مجھے مہندی سے الجھن ہوتی ہے... الرجی ہے مجھے۔" اس نے بے ساختہ انکار کرنا چاہا۔
"آج نہیں ہو گی... کیونکہ آج کی مہندی میرے نام سے ہو گی... میرے نام کی ہو گی... اور صرف میری ہو گی۔" اس نے بڑے مطمئن اور پُریقین لہجے میں کہا تھا۔
"مگر..." ماورا نے پھر بولنا چاہا تھا۔
"اگر مگر کل کے لیے اٹھا رکھو... آج میری خواہشوں کا سلسلہ چلنے دو... بڑی مشکل سے تکمیل تک پہنچی ہیں۔" تیمور کا لہجہ گمبھیر ہو رہا تھا۔ ماورا نے نظریں جھکا کر پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا... تب ہی ماورا کا

موبائل بج اٹھا۔۔۔ کال گھر سے تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔!" ماورا نے جلدی سے کال اٹینڈ کی۔

"وعلیکم السلام بچہ۔۔۔ گھر کب آنا ہے؟" دوسری طرف بی گل تھیں۔

"بس بی گل۔۔۔ گھر ہی آ رہی ہوں۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ماورا نے تسلی دی۔

"ارے میں تو پریشان نہ ہوں۔۔۔ مگر گھر میں جو ایک اور پریشانی کی پوٹلی رکھی ہے' اسے دیکھ دیکھ کر مجھے بھی عجیب عجیب ہول اٹھنے لگتے ہیں۔" بی گل کا اشارہ عافیہ بیگم کی طرف تھا۔

"ان سے کہیں' آپ کی پریشانی ویسے ہی ختم ہونے والی ہے' اب ٹینشن نہ لیں۔ میں گھر آ رہی ہوں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

"آنٹی پریشان ہو رہی ہیں۔۔۔؟" تیمور اس کی باتوں سے اندازہ لگا چکا تھا۔

"جی۔۔۔" ماورا نے آہستگی سے سر ہلایا۔

"پھر کل تو زیادہ پریشان ہوں گی جب تم ہمیشہ کے لیے میرے ساتھ چلی آؤ گی؟" اس نے آئندہ کا سوچا۔

"ہاں۔۔۔! کل تو زیادہ ہی پریشان ہوں گی۔" اس نے تیمور کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"اور تم۔۔۔؟" تیمور نے جلدی سے سوال داغا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔۔ اب چلنا چاہیے۔" ماورا کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور تیمور مسکرا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام ہوتے ہی فارہ بھی آ گئی تھی اور اس کے ساتھ بیوٹیشن بھی۔

"مہندی سے پہلے یہ سوٹ پہن لو۔۔۔" وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں جب بی گل پیلا جوڑا لے آئی تھیں۔۔۔ اور ماورا گرین اور ییلو شیڈز کا سوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ یہ سوٹ کہاں سے آیا؟

"یہ سوٹ۔۔۔؟" اس کا سوال ادھورا تھا۔

"تمہاری ماں نے خریدا ہے۔ تمہارے پہلے' شگن پہلی رسم کے لیے۔" بی گل کے جواب پہ ماورا نے یکدم سر اٹھا کر عافیہ بیگم کی طرف دیکھا تھا جو فارہ سے بات کرنے میں مصروف تھیں لیکن پھر بھی دھیان بی گل اور ماورا کی طرف ہی تھا' اسی لیے بڑے غیر محسوس انداز سے نظروں کا اور چہرے کا زاویہ بدل لیا تھا۔

مگر ماورا کی تڑپتی ہوئی نظریں اب بھی ان کے چہرے کے گرد طواف کر رہی تھیں۔۔۔ جس سے جھلکتی ممتا کو ہمیشہ ہی انہوں نے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ صرف ماورا کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے۔۔۔

لیکن پھر بھی آج وہی سب ہونے جا رہا تھا جس سے وہ ہمیشہ ڈرتی ہی رہی تھیں۔۔۔

"ماورا بچہ۔۔۔!" بی گل نے اس کی محویت کو توڑا۔

"ج۔۔۔جی؟" وہ چونکی۔

"سوٹ۔۔۔!" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"جی۔۔۔! لائیے۔" اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر پیلا سوٹ اور اس کے ساتھ دیگر لوازمات تھام لیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ماشاء اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ آج سے پہلے تم کبھی اتنی خوب صورت نہیں لگیں۔" فارہ اسے مایوں کے سوٹ میں تیار دیکھ کر بے اختیار اظہار کیے بنا نہ رہ سکی۔۔۔ ستائش اس کی نظروں سے صاف جھلک رہی تھی۔

"امی کہاں ہیں۔۔۔؟" اس نے عافیہ بیگم کا پوچھا۔
"شاید کچن میں ہیں۔" قارہ نے باہر کی طرف دیکھا۔
"میں آتی ہوں۔۔۔" ماورا کہہ کر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی تھی لیکن راستے میں ہی بی گل سے ٹکراؤ ہو گیا۔
"ماشاءاللہ۔۔۔ ماں صدقے جائے۔۔۔ میرا بچہ 'میری جان۔۔۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہو۔۔۔"
بی گل نے بھی بے ساختہ ہی تعریفی کلمات ادا کیے۔ اور یہ ایک بے اختیاری عمل تھا۔۔۔
"کیا سچ میں پیاری لگ رہی ہوں۔۔۔؟" ماورا نے اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے بی گل سے استفسار کیا۔
"پگلی۔۔۔ تو کیا میں ایسے ہی واری صدقے ہو رہی ہوں؟" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"اچھا۔۔۔ تو پھر مجھے ایک بار تصدیق کروا لینے دیں کہ کیا میں واقعی پیاری لگ رہی ہوں۔۔۔؟" ماورا کہہ کر کچن کی سمت بڑھ گئی اور بی گل مسکرائیں۔
عافیہ بیگم دروازے کی جانب پشت کیے کوکنگ رینج کے سامنے کھڑی پتا نہیں کیا کر رہی تھیں جب ماورا کی آواز پہ ان کے ہاتھوں کی حرکت رک گئی۔
"امی۔۔۔!" ماورا نے بڑی محبت اور بڑی چاہ کے ساتھ ان کو پکارا۔ عافیہ بیگم کا دل مٹھی میں آگیا۔
"امی۔۔۔! ادھر دیکھیں ناں میری طرف۔" اس نے انہیں اپنی طرف پلٹنے پہ مجبور کیا۔۔۔
"آتی ہوں۔۔۔ تم جاؤ۔" ان کی آواز لرز رہی تھی۔
"کل چلی جاؤں گی۔۔۔ ابھی تو اپنے پاس رہنے دیں۔۔۔" ماورا کا لہجہ بھی بوجھل ہونے لگا تھا۔ وہ قدم بہ قدم چلتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔
"امی۔۔۔ ادھر دیکھیں ناں میری طرف۔۔۔ کتنی پیاری لگ رہی ہوں میں؟" ماورا نے ان کے ہاتھ پکڑ کر ان کا رخ اپنی سمت موڑا تھا۔۔۔ وہ رو رہی تھیں۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔
"امی۔۔۔! آئی لو یو۔۔۔ آئی لو یو سو مچ۔۔۔!" ماورا بے اختیار ان سے لپٹ گئی تھی اور اس کے اپنے آنسو بھی پھوٹ نکلے تھے۔۔۔ کیونکہ عافیہ بیگم نے اسے اپنی بانہوں میں بڑی شدت سے بھینچ لیا تھا۔ یوں جیسے کوئی ماورا کو ان سے چھین رہا ہو۔
"امی۔۔۔! مجھے تیمور حیدر سے نفرت ہو یا محبت 'میں پھر بھی آپ کی ہوں اور آپ کی ہی رہوں گی۔ کوئی مجھے آپ سے چھین نہیں سکتا۔۔۔ تیمور حیدر بھی نہیں۔" ماورا انہیں یقین دلا رہی تھی۔
"میں جانتی ہوں۔۔۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ تم تیمور حیدر سے بے وفائی کرو۔۔۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ وہ شیطان کے گھر میں فرشتے کی مانند پیدا ہوا ہے۔۔۔ تم اسے فرشتہ ہی رہنے دو۔۔۔ اور اپنا فیصلہ اللہ پہ چھوڑ دو۔"
عافیہ بیگم نے بالآخر ایک ماں ہونے کا ثبوت دیا تھا اور اسے آنسوؤں کے دوران ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"لیکن امی!" اس نے کچھ کہنا چاہا۔
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔۔۔ وہ تیرا ہے۔۔۔ تیرا ہی رہے گا۔۔۔ بس اس کی قدر کر۔۔۔ اسے سنبھال کے رکھ۔۔۔ وہ رضا حیدر کے بارے میں جان گیا تو خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا۔۔۔ پھر صرف تیرا بن کے رہے گا۔ دیکھ لینا ایک دن۔"

عافیہ بیگم اسے سمجھا رہی تھیں۔
اپنی زندگی کی شروعات اچھے طریقے سے کرو۔ بالکل ایسے جیسے ہر لڑکی کرتی ہے۔۔۔ خوشیوں اور خواہشوں کے ساتھ۔" انہوں نے روتے ہوئے اس کا چہرہ تھاما اور اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔
"بہت پیاری لگ رہی ہو۔۔۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔۔۔ آؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔۔۔ فارہ تمہیں تیل اور مہندی لگاتی ہے۔" عافیہ بیگم اسے پیار کرتے ہوئے اپنے ساتھ لپٹائے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھیں۔
ماورا ابھی صوفے پہ بیٹھی ہی تھی کہ ڈور بیل بجنے لگی تھی۔
"میں دیکھتی ہوں۔" عافیہ بیگم کہہ کر دروازے کی طرف آگئیں اور دروازہ کھول دیا۔۔۔ سامنے کوئی لڑکا کھڑا تھا وہ اسے نہیں پہچانتی تھیں۔
"السلام علیکم آنٹی۔۔۔!" اس نے ادب سے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔۔۔ !جی کہیے؟" عافیہ بیگم نے اسے سر تا پا دیکھا بلکہ نوٹ کیا تھا۔
"مس ماورا مرتضیٰ سے ملنا تھا۔۔۔ کیا ملاقات ہو سکتی ہے؟" وہ اجازت طلب کر رہا تھا۔
"آپ کا تعارف۔۔۔؟" عافیہ بیگم کے سوال پہ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا
"اوہ۔۔۔ میرا تعارف۔۔۔؟ یہ بھی ایک اہم مرحلہ ہے۔۔۔ طے کرنا ہی پڑے گا۔ تو ٹھیک ہے کہ ابھی کر لیتے ہیں۔ گھما پھرا کر تعارف کرواؤں تو ابھی مایوں کی رسم سے لے کر نکاح کی رسم تک تو ٹائم لگ ہی جائے گا اور اگر شارٹ کٹ استعمال کروں تو پھر مختصراً" الفاظ یہی ہیں کہ میں مس ماورا مرتضیٰ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔۔۔ اب وہ مجھے بھائی سمجھتی ہیں یا نہیں 'یہ ان ہی سے چل کر پوچھنا پڑے گا۔"
اس نے ایک ہی جواب میں عافیہ بیگم کو گھما کے رکھ دیا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سامنے سے ہٹ گئی تھیں۔

"تھینک یو۔۔۔!" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے سر خم کر کے بولا تھا۔ اور پھر ان کی ہمراہی میں سیدھا ڈرائنگ روم تک آیا تھا۔

"ماورا! کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔" عافیہ بیگم نے داخلی دروازے میں رکتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں اسے متوجہ کیا کیونکہ فارہ' گل اور ان کے ساتھ بیوٹیشن بھی اس وقت ڈرائنگ روم میں تھیں۔
ماورا نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ولید کھڑا تھا۔
"میں نے سوچا۔۔۔ بہن کی اس رسم میں کوئی اور بے شک نہ ہو لیکن ایک بھائی کا ہونا بہت ضروری ہے۔"
ولید نے بڑے بھرپور اور استحقاق آمیز طریقے سے خود کو اس کے بھائی کے رشتے میں پیش کیا تھا اور ماورا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔
"تھینک یو۔۔۔ تھینک یو سو مچ۔۔۔ آپ کو میرا اتنا احساس تو ہے کہ میرے پاس اس رشتے کی کمی ہے اور اس کمی کو آپ نے دور کر دیا۔" ماورا کی آنکھیں اور لہجہ بار بار بھرا رہے تھے۔
"ارے پلیز۔۔۔ ماحول کو زیادہ ایموشنل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ بس آپ لوگ رسم کریں میں ذرا بی گل سے گپ شپ کر لوں۔۔۔"
ولید نے بات کو ہلکے پھلکے ٹریک سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔۔۔ کیونکہ اسے پتا تھا بی گل اور عافیہ بیگم بھی اداس ہو جائیں گی۔
"ماورا۔۔۔! آفاق بھی آنا چاہ رہے ہیں۔" آفاق کا میسج ملتے ہی فارہ نے ماورا سے رجوع کیا تھا۔
"وائے ناٹ۔۔۔ اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے بھلا۔۔۔؟" ماورا کے بجائے یہ جواب ولید کی طرف سے آیا

تھا۔ سب نے بیک وقت ولید کی سمت ہی دیکھا تھا۔
"کیوں... ؟ کیا ہوا... ؟ یہی تو کہنا تھا ناں... میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا... ؟" ولید نے شرارت دباتے ہوئے بڑی معصومیت سے استفسار کیا تھا جس پہ ماورا بے ساختہ ہنس پڑی اور اس کی ہنسی پہ بی گل اور عافیہ بیگم کی آنکھیں روشن ہو گئیں... وہ مایوں کے سوٹ میں ملبوس لائٹ سے میک اپ کے ساتھ، سچے دل سے کھل کر ہنستی ہوئی 'حقیقتاً' بہت پیاری لگ رہی تھی۔
"اگر اس روپ میں وہ بھی دیکھ لیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا... ؟" ولید نے دبے لفظوں میں سرگوشی کی تو ماورا ہنستے ہنستے تھم گئی۔
"بھائی بن کے آئے ہیں تو بھائی بن کے رہیں ناں... کسی کا دوست بننے کی کوشش مت کریں۔" وہ ذرا خفگی سے بولی۔
"کسی کا دوست تھا تو کسی کا بھائی بنا ہوں نا؟ وجہ تو وہی ہے نا؟ سچ میں تو وہی ہے ناں... ؟ اور یہ سب کچھ بھی اسی کی وجہ سے ہے۔" ولید نے اس کے رنگ روپ اور سب کے ہنستے مسکراتے چہروں کی سمت اشارہ کیا۔
"وہ جو بھی ہے... جیسا بھی ہے... آپ کا ہے... آپ سے محبت کرتا ہے اور اس وجہ سے آپ میری نظر میں بے حد خوش قسمت ہیں... کیونکہ تیمور حیدر آپ کا شریک سفر بن رہا ہے۔" ولید نے پہلی بار یوں سنجیدگی سے کچھ کہا تھا' وہ بھی تیمور حیدر کے حوالے سے!
"میں خوش قسمت ہوں اور وہ... ؟" ماورا نے ذرا ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔
"وہ لکی ہے..." ولید نے بھی برجستہ جواب دیا تھا اور ان کی اسی نوک جھونک میں آفاق بھی آگیا تھا اور ماورا کی چھوٹی سی مایوں کی رسم بھی ادا ہو گئی تھی۔
رات گئے وہ سب واپس گئے تھے... ماورا نہ چاہتے ہوئے بھی خوش تھی اور اس بات پہ اسے اندر ہی اندر حیرت ہو رہی تھی... سب کے جانے کے بعد وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
"اگر اس روپ میں وہ بھی دیکھ لیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا... ؟" اسے ولید کی بات یاد آئی... اتنے میں باہر ڈور بیل بجی اور نجانے کیوں ماورا کا دل دھڑک اٹھا۔
بی گل اور عافیہ بیگم سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس لیے وہ خود ہی باہر نکل آئی تھی اور آگے بڑھ کے دروازہ کھول دیا تھا...
اور توقع کے عین مطابق سامنے تیمور حیدر کھڑا تھا۔ دونوں کی نظروں کا تصادم ایک دوسرے کے لیے جسم میں سنسنی دوڑنے سے کم نہیں تھا... وہ پہلی بار ماورا کو ایسے سجے سنورے حلیے میں دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا...
اور ماورا تھوڑی دیر پہلے والے اپنے خیال کو مجسم اپنے سامنے دیکھ کر اپنی جگہ پہ جم سی گئی تھی۔
"ماورا... باہر کون ہے بیٹا... ؟" عافیہ بیگم دروازہ کھلنے کی آواز سن کر باہر نکل آئی تھیں... اور ان کی آواز پہ وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔
"امی... ! وہ..." ماورا واپس پلٹی۔ اتنے میں وہ بھی قریب آگئی تھیں۔
"السلام علیکم آنٹی... آئم سوری میں نے آپ لوگوں کو ڈسٹرب کیا... لیکن ان فیکٹ مجھے کچھ پیپرز پہ ماورا کے سائن چاہیے تھے... صبح تک یہ پیپر ریڈی کرنے ہیں۔" تیمور نے ہاتھ میں پکڑی فائل کی طرف اشارہ کیا۔ اندر آجاؤ... ! عافیہ بیگم نے اسے راستہ دیا۔ ماورا پہلے ہی وہاں سے ہٹ چکی تھی۔
وہ اندر آگیا تھا۔
"تم بیٹھو... میں ماورا کو لاتی ہوں۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اور خود ماورا کے بیڈ روم میں

آئیں۔

"وہ کچھ پیپر سائن کروانے کے لیے آیا ہے... ڈرائنگ روم میں انتظار کر رہا ہے۔" عافیہ بیگم کی اطلاع پہ ماورا کی ہتھیلیوں میں ایک دم ہی پسینہ اتر آیا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ...!" انہوں نے اسے چلنے کو کہا۔

"مگر امی سائن کیسے...؟ میرے ہاتھوں میں تو مہندی۔" اس نے عذر پیش کرنا چاہا۔

"مہندی خشک ہو چکی ہے۔ آجاؤ پانچ منٹ کا تو کام ہے بس۔" وہ اسے ساتھ لے کر ہی نکلی تھیں۔

"السلام علیکم...!" ماورا کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔ تیمور اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔"

"تم سائن کرو... میں چائے بناتی ہوں۔" عافیہ بیگم واپس پلٹیں۔

"ارے نہیں آنٹی اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے... میں بس جا رہا ہوں۔" تیمور نے فوراً "روکا تھا۔

"لیکن..."

"لیکن کو چھوڑیں... آپ بس بیٹھیں یہاں۔" تیمور نے ان کو منع کیا تھا اور خود پیپرز لے کر ماورا کے برابر صوفے پہ آبیٹھا تھا لیکن اس کے برابر چند انچ کے فاصلے پہ بیٹھتے ہوئے بھی اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ ماورا کے وجود سے اٹھتی تیل، ابٹن اور مہندی کی خوشبو اس کے حواسوں پہ چھا رہی تھی... اور وہ اپنے دل کو "اے دل! جسٹ شٹ اپ" کہہ کر پیپرز کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"یہاں سائن کرنے ہیں... اس نے ماورا کو پین تھما کر پیپرز سامنے رکھے اور جیسے ہی ماورا سائن کرنے کے لیے جھکی، تیمور کی نظریں اس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو چھو گئیں جہاں مہندی بڑے دلکش نقش و نگار کی چھب دکھلا رہی تھی۔

"یہاں بھی..." اس نے دوسرے پیپر کی نشاندہی کی۔

"ایک اور... یہاں۔" وہ اس سے سائن کرواتا جا رہا تھا اور ماورا چپ چاپ سائن کرتی جا رہی تھی...

"تھینک یو" اس کے سائن کرتے ہی وہ پیپرز سمیٹ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"بیٹھو ناں بیٹا... چائے تو..."

"نو تھینکس آنٹی... پھر کبھی ان شاء اللہ۔ ابھی اجازت دیجئے۔" وہ شرافت سے کہہ کر وہاں سے نکل گیا تھا اور ماورا بیڈ روم میں آکر اپنا دل تھام کے رہ گئی تھی۔

"تم اس حلیے میں... اس روپ میں، بہت اچھی لگ رہی تھیں... اور مہندی تو سب سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی... میں زیادہ دیر رکتا تو یقیناً "ہوش گم کر بیٹھتا... اس لیے جلدی چلا آیا... اب تمہاری مہندی کو اور تمہارے حسن کو کل ہی خراج پیش کروں گا... ابھی گڈ نائٹ... صبح کے لیے کوئی اچھا سا خواب ہی دیکھ لو... میں حقیقت میں تیاری کرتا ہوں، صبح کے لیے... بائے۔"

ماورا بیڈ پہ لیٹی ہی تھی کہ تیمور کا لمبا چوڑا سا میسج موصول ہوا تھا، جس کو پڑھنے کے بعد اس نے پلکیں موند لی تھیں... اور پلکوں کے اس پار اسے تیمور کا ہی چہرہ نظر آیا تھا...

☼ ☼ ☼

"ایک کنوارہ... پھر گیا مارا..."

نکاح نامے پہ سائن ہوتے ہی ولید نے یکدم ایک نعرہ بلند کیا تھا اور تیمور کے ساتھ ساتھ باقی سب کے چہروں پہ

بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"تم باقی باتوں کو چھوڑو... یہ خبر لو کہ ابھی تک کھانا کیوں نہیں پہنچا؟ آٹھ بجے کا آرڈر تھا۔" بی گل نے ولید کو یہ کام سونپا ہوا تھا۔

"آٹھ بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں بی گل... پانچ منٹ انتظار کر لیں... کھانا نہ پہنچا تو میں پہنچ جاؤں گا..." ولید نے انہیں تسلی دی تھی۔ فارہ اور آفاق بھی اس کی نوک جھونک کو انجوائے کر رہے تھے۔ تیمور اپنے وکیل صاحب' مولوی صاحب اور نیجرز وغیرہ سے گفتگو میں مصروف تھا۔ ولید کی پوری فیملی انوائٹ تھی زبیدہ خاتون' نگو اور وحید بھی موجود تھے... تیمور کی پی اے سحرش بھی آئی ہوئی تھی اور ان سب کی موجودگی میں نکاح بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔

نو بجے کے قریب سب ہی کھانے سے فارغ ہو گئے تھے۔ ماورا نے نکاح کی رسم اور اس کا انتظام کہیں اور کرنے سے منع کر دیا تھا اس لیے سب کچھ اس کے فلیٹ پہ ہی ہوا تھا۔

کافی دیر بعد فارہ اور سحرش اندر گئیں اور ماورا کو دونوں طرف سے سہارا دیے باہر ڈرائنگ روم میں لے آئی تھیں۔ دلہن بنی ماورا کو دیکھ کر وہاں موجود سب ہی افراد اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے تھے... اور انہوں نے ماورا کو لا کر تیمور کے برابر میں بٹھا دیا تھا۔

"اس موقع پہ بھنگڑا تو بنتا ہے ناں...؟" ولید نے شرارت سے تیمور کو دیکھا۔

"ہاں بالکل بنتا ہے۔" آفاق نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ولید...!" تیمور نے اسے گھورا۔

"تو میں کون سا تیار بیٹھا ہوں؟ شادی تیری ہو رہی ہے... تو بھنگڑا ڈال۔" ولید نے کندھے اچکائے تھے... اس نے اتنی جلدی پینترا بدلا تھا کہ سب بے ساختہ قہقہہ لگانے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

اور ان سب کی اس چھوٹی سی محفل کا اختتام رات گیارہ بجے ہوا تھا۔

ماورا کی رخصتی کا وقت سر پہ پہنچا تو بی گل کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

وہ اسے خود سے بھینچ کر ایسا روئیں کہ سب کے دل بھر آئے تھے۔

اور یونہی عافیہ بیگم اور بی گل کے آنسوؤں کی چھاؤں میں رخصت ہو کر وہ تیمور حیدر کے ساتھ اس کی گاڑی تک آئی تھی۔ تیمور نے خود ہی اس کے لیے دروازہ کھولا تھا اور وہ اندر بیٹھ گئی تھی۔ مگر اس کے بیٹھنے میں تیمور نے اس کی بھرپور ہیلپ کی تھی۔ اس کا دوپٹہ اس کا لہنگا سنبھالا تھا۔ اور اس کے بیٹھتے ہی خود ڈرائیونگ سیٹ پہ آ گیا تھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

رفتہ رفتہ باقی سب بھی وہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔

اور ولید تو سب سے پہلے وہاں سے غائب ہوا تھا...!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مریم بنت ارشاد

"السلام علیکم خالہ رضیہ!" شبانہ کی سریلی آواز خالہ کی سماعت سے ٹکرائی۔

"وعلیکم السلام۔" خالہ نے چہرے کو پھیرتے ہوئے لمبے وقفے کے بعد کڑواہٹ سے جواب دیا۔

"کیسی ہو خالہ" شبانہ نے بے تکلفی سے خالہ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں۔" انداز میں ذرا بھی ڈھیلا پن نہ آیا تھا' یوں ناپ تول کر بول رہی تھیں جیسے زیادہ بولنے پر ان پر ٹیکس عائد ہو جائے گا۔

لیکن اصل بات یہ تھی کہ خالہ رضیہ کی لغت میں یہ شبانہ منحوس ماری 'جل مری... سارا دن لور لور پھرتی وقت بے وقت ان کے گھر گھسی رہتی تھی۔

اتنے مختصر جوابات سے بھی وہ یہ اخذ نہ کرپائی کہ خالہ اس سے کس قدر بے زار ہیں... اسے گھر آتے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں ہیں۔

خود تو وہ کہیں نہ جاتی تھیں اور اپنی بہو کو بھی انہوں نے اسی ڈگر پر رکھا تھا... ایک ہی بہو تھی نہ کم نہ زیادہ بس "ایک" بہو کو بھی وہ قابو میں کیے ہوئے تھیں... اور اس پر حاوی رہنے کے گر آزماتی رہتیں۔

اور بہو "خالدہ" بے چاری نگوڑ ماری 'سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ سارا دن ساس کی جی حضوری میں ہی گزار دیتی۔

وہ شبانہ کے آنے پر دل سے خوش ہوتی 'ایک ہی تو سہیلی بنی تھی اس کی شادی کے بعد اور محلے میں تو اس کی عمر کی کوئی لڑکی بالی ہی نہ تھی۔ اور خالہ رضیہ کو اس "شبانہ" سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

سارا دن چوٹی میں 'پراندہ' باندھ کر... رنگیلے چمکیلے کپڑے پہن کر... رخساروں پر لالی... اور لبوں پر سرخی تھوپے وہ محلے کے ہر ہر گھر میں گھنٹہ دو گھنٹہ جاتی... گپیں لڑاتی 'پھرتی... ارے خالہ رضیہ تو اتنے بناؤ سنگھار خالدہ کو نہ کرنے دیتیں کہ جو نئی نویلی دو ہٹی تھی' شادی کے تیسرے ہی دن نئے جوڑے انہوں نے ٹرنک میں ڈلوا دیے تھے کہ شادی بیاہ 'عید بقرعید' خوشی غمی کے موقعوں پر ان کپڑوں کو استعمال کرنا... ٹرنک پر تالا لگا کر چابی خود سنبھال لی تھی...

"اور ادھر یہ شبانہ پھٹانک بھر کی لڑکی کے کرتوت دیکھو... آئے ہئے بے شرمی کی بھی حد پار کر ڈالی' کنواری لڑکیوں کے یہ لچھن تو نہیں ہوتے... ایک ہمارا وقت تھا جب لال جوڑا صرف اپنے بیاہ پر ہی پہننا ہوتا... عید کی عید ایک جوڑا ماں باپ دلا دیتے تھے۔ اس کی خوشی میں ہم ساری ساری رات سو نہ پاتے تھے۔ اب تو دیکھو ان کڑیوں کو 'زرتار کپڑے گوٹے کناری سے سجے سوٹ پہلے ہی پہنے پھرتی ہیں... اتنی دیدہ دلیری ہائے ہائے حیا تو ہے ہی نہیں ان میں۔"

خالہ رضیہ ایسے بولتی جاتیں اور کپڑے لتے' زیور' میک اپ سب کو لاک اپ میں رکھ کر بڑبڑاتیں 'یوں کہ بی چاری بی بنو خاموشی سے سارا کھیل تماشا دیکھتی رہ گئی۔

کتنے ارمان تھے اسے زرتار جوڑے پہننے کا' اور یہ خالہ رضیہ وہ تو زبان بھی نہ کھولنے دیتی تھی۔ اگلی شام دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے وہ میاں سے کہہ بیٹھی۔ انہوں نے تو فوراً" ہی جھڑک دیا۔

"خبردار 'اگر اماں کے خلاف آج کے بعد کوئی بات کی تو... جیسا انہوں نے کہہ دیا ویسا ہی ہو گا۔ آئندہ

میں ان کی کوئی شکایت نہ سنوں تمہاری زبان سے۔"
کہتے ساتھ وہ غصے میں چپل اڑس کر باہر ہی نکل گیا۔
کھانا وہیں پڑا ٹھنڈا ہوتا رہا اور خالدہ نے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر، زار و زار روتے ہوئے خود سے عہد کیا۔ آئندہ وہ ایسی تلخ کلامی کی نوبت نہ آنے دے گی.... یہی زندگی ہے ایسے ہی گزارنی ہے۔ ایسے ہی موسم گزرتے رہے، بہاریں آتی رہیں، پتے جھڑتے رہے۔ خالدہ نے ساس کا حکم ماننا فرض عین سمجھ لیا۔
تو بات ہو رہی تھی شبانہ کی، وہ ایسی ہی نٹ کھٹ تھی۔ صبح سویرے کام کاج نبٹا کر سب سہیلیوں سے ملنے جاتی، اب تو خالہ رضیہ کی بہو کو بھی اس نے سہیلی کا درجہ دے دیا تھا۔
ہفتے میں دو، تین بار تو لازمی اس سے ملنے جاتی، خالہ رضیہ خوب ناک بھوں چڑھاتیں، کئی دفعہ کھری کھری بھی سنا دیتیں لیکن شبانہ تو ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ اب بھی وہ بنا اثر لیے خالہ رضیہ سے خالدہ کی بابت پوچھنے لگی۔
"خالہ! یہ بھابھی خالدہ نظر نہیں آ رہی؟ کہیں گئی ہے کیا؟" شبانہ نے یوں نارمل سے انداز میں بات کی جیسے اس کے اور خالہ کے تعلقات بہت ہی خوشگوار رہے ہوں۔
"اپنی ماں سے ملنے گئی ہے، شام تک لوٹ آئے گی۔" ترخت لہجے میں جواب آیا۔
"ارے شام تک آ بھی جائے گی، اتنی جلدی؟"
شبانہ کے چہرے پر حیرانی کم، پریشانی زیادہ تھی۔
"تو اور کیا وہاں ہفتہ رہ لے، ایک گھنٹہ رہنا بھی وہی بات ہوتی ہے دس دن رہنا بھی وہی.... مل ملا کے واپس آ جائے گی۔" خالہ نے مٹھار کے کہا۔
"لیکن خالہ! بے چاری چار مہینوں بعد گئی ہے، کچھ دنوں کے لیے تو بھیج دیتی۔" شبانہ نے فکر مندی سے کہا اور یہی برا ہوا تھا۔
"ارے چل کم بخت ماری، خود تو پھرتی رہتی ہے سارا سارا دن، اب سب کیا تیرے جیسے ہی ہو جائیں کیا ایک تو کم ہے کیا اور خبردار!" خبردار تو خالہ نے بالکل سپاہیوں جیسے کہا تھا۔ کڑک انداز سے۔
"خبردار، جو اگر میری بہو کو ورغلانے کی یا نئی نئی اسکیمیں دینے کی کوشش کی تو، دوبارہ گھسنے نہ دوں گی اپنے گھر۔" خالہ نے تو جذباتی ہونے کی حد ہی کر دی تھی۔ انہیں ایسا لگا بس اب بہو ہاتھ سے گئی۔
"خود تو کہیں جاتی نہیں ہو، بہو کو بھی اپنے جیسا بنا لیا۔ میں بھی مری نہیں جا رہی تیرے گھر آنے کے لیے، یہ لے جا رہی ہوں۔ کبھی نہیں آؤں گی، دیکھ لینا۔" شبانہ بھی کہاں کسی سے دبنے والی تھی، ٹھیک ٹھاک جواب دے کر پراندہ پیچھے پھینک کر غصے سے تن فن کرتی ہوئی یہ جا وہ جا....
"ہونہہ! خس کم جہاں پاک۔" خالہ رضیہ بڑبڑائی سمجھو شبانہ سے گلو خلاصی ہو ہی گئی تھی ان کی۔
لیکن شبانہ تو شبانہ تھی۔ چھپ چھپا کے، ادھر ادھر سے موقع تاڑ کے خالدہ سے ضرور ہی مل کر جاتی تھی، سہیلی جو تھی اس کی لیکن خالہ کے سامنے کبھی نہ گئی۔ وہ کوشش کرتی جب خالہ سوئی ہوں یا کہیں گئی ہوں تب

ہی جائے۔

خالہ رضیہ ویسے تو جیسی بھی تھیں سو تھیں، ملنے ملانے سے بہت گھبراتی تھیں۔ بس گوشہ نشین ہو رہتیں یا پھر سارا دن بہو پر حکم چلاتی رہتیں۔ کبھی کسی مرگ، کسی خوشی میں چلی جاتیں، وگرنہ انہوں نے یہ طریقہ رکھا ہوا تھا کہ اپنی نوکرانی کے ذریعے اپنا جوتا مرگ والے گھر میں باقی سب کے جوتوں کے درمیان رکھوا دیتیں۔ سب سمجھتے وہ آئی ہوئی ہیں۔ پرانے وقتوں میں موچی چمڑے سے جوتے بنایا کرتے تھے۔ اور کم از کم حق ہمسائے اتنا ضرور جان لیا کرتے تھے یہ فلاں کا جوتا ہے۔ خالہ رضیہ بھی یونہی کرتی تھیں بس اپنا جوتا رکھوا دیتیں اور خود گھر ہی میں رہتی تھیں۔

اس بات کا سب سے پہلے شبانہ کو علم ہوا۔ وہ ان سے خوب لڑی۔ طویل جنگ دونوں کے درمیان چھڑی تھی۔ جس میں تھک ہار کر شبانہ نے ہی ہار مان لی تھی۔ لڑائی کا لب لباب یہ تھا۔

"خالہ تیرے رشتے دار تو رہتے ہی ہندوستان میں ہیں، پتا نہیں بچے بھی ہیں یا نہیں، بندہ ہمسایوں سے تو ملتا ملاتا ہے نا، خوشی غمی میں شرکت کرتا ہے۔" لیکن خالہ پھر بھی نہ جاتیں۔

کیا خبر ان کے کچھ دیر گھر سے غائب رہنے سے ان کی بہو ان کی راجدھانی پر ہی نہ قبضہ جمالے... اور نہیں تو شاید کوئی ان کا گھر ہی اٹھا لے جائے... انہیں عجیب ہی خوف رہتے تھے... محفلوں میں جانے سے وہ ویسے ہی کتراتیں اگر کوئی آ ہی جاتا تو بس بے زار سی شکل بنائے بیٹھی رہتیں اس وجہ محلے والوں نے ان کے گھر آنا تقریباً" چھوڑ ہی دیا۔

پھر خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ ان کی ہاں پہلا پوتا ہوا اور وہ دو دن کے بعد فوت ہو گیا۔ کہتے ہیں "اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔" انہیں بھی تھا۔ ہزاروں دعائیں، منتیں، وظیفے، نوافل انہوں نے ادا کیے تھے اس موقع پر لیکن اس کی زندگی اتنی ہی تھی۔ وہ راہی عدم سدھار گیا۔ خالدہ تو جو روئی سو روئی، خالہ تو چیخیں مار مار کر بے ہوش ہو جاتیں۔ ہائے کتنے ارمان تھے ان کے اپنے پوتے کے بارے میں، سب سپرد خاک ہو گئے۔ چند گھنٹے گزر گئے پوتے کی وفات کو۔ ان کا تو غم سے برا حال رہا لیکن جب کچھ حواس کام کرنے لگے تو دیکھا ان کا صحن جوتوں سے بھرا پڑا ہے، محلے، ہمسائے والوں میں سے کوئی نہ آیا تھا۔ جیسا انہوں نے ہر ہر موقع پر کیا تھا ویسا آج بالکل ان کے ساتھ بھی ہو گیا تھا۔ وہ جو اپنا جوتا رکھوا دیا کرتی تھیں۔ آج لوگوں نے بھی وہی کچھ کیا۔ آنے کی بجائے سارے محلے کی جوتیاں وہاں موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ اور رو ئیں۔ روتی چلی گئیں۔ جب وہ کسی کی خوشی غمی میں شریک نہ ہوتیں تھیں تو لوگوں نے بھی وہی سلوک کیا تھا۔ خالہ رضیہ کو بے حد شرمندگی اور افسوس ہوا تھا۔ خالدہ کی نظریں جتاتی ہوئی تھیں۔ ان کا بیٹا بھی اس بات سے نالاں تھا۔ اب سب قصور صرف خالہ رضیہ کا تھا۔ سو انہوں نے جانا کہ اکیلا انسان کچھ نہیں ہوتا۔

اللہ نے رشتے، ناطے، ہمسایے، دوستیاں اسی لیے بنائے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی غمی، خوشی کو بانٹ سکیں ورنہ تو اللہ ہر انسان کو علیحدہ علیحدہ اتار دیتا۔ آخر کوئی تو ضرورت اور وجہ رہی ہو گی نا ایسے رشتے بنانے میں۔

پھر خالہ رضیہ اس واقعہ کے بعد بھاگم بھاگ سب سے ملتیں، بہو کو بھی ساتھ رکھتیں اب تو شبانہ بھی کم و بیش چار چار چکر ان کے گھر کے لگا لیتی۔ خالہ رضیہ کے منہ میں ایسی شیرینی ہوتی کہ الامان، اب تو خالہ کے سارے خوف ہوا ہو گئے تھے، بہو سے تعلقات بھی بہترین اور بے مثال ہو چکے تھے۔

پہلے محلے والے ان سے اور خالہ خود محلے والوں سے کتراتی تھیں لیکن پھر وہ ایسے ہو گئیں کہ سب ہی ان کے خون کے رشتے ہیں۔

"کیونکہ رشتے چاہے خون کے ہوں یا خلوص و چاہت کے انسان کے ساتھ شریک ہو کر خوشیاں کو بڑھا دیتے ہیں اور غموں کو بانٹنے میں مدد کرتے ہیں۔"

✡

اس کے غم کو غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا
زیست مشکل ہے اسے اور بھی مشکل نہ بنا

تو بھی محدود نہ ہو، مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو مری منزل نہ بنا

اور بڑھ جائے گی ویرانیٔ دل، جانِ جہاں
میری خلوت گہِ خاموش کو محفل نہ بنا

دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عشق کو عشق سمجھ مشغلۂ دل نہ بنا

پھر مری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصلِ غم کو خدارا غمِ حاصل نہ بنا

حمایت علی شاعر

ماں

بیٹیاں بھی تو ماؤں جیسی ہوتی ہیں
ضبط کے زرد آنچل میں اپنے
روتے روتے ہنس پڑتی ہیں
ہنستے ہنستے دل ہی دل میں رو لیتی ہیں
خوشی کی خواہش کرتے کرتے
خواب اور خاک میں اَٹ جاتی ہیں
سو حصوں میں بٹ جاتی ہیں
گھر کے دروازے پر بیٹھی
امیدوں کے ریشم بُنتے... ساری عمر گنوا
دیتی ہیں
میں جو گئے دنوں میں
ماں کی خوش فہمی پہ ہنس دیتی تھی
اب خود بھی تو
عمر کی گرتی دیواروں سے ٹیک لگائے
فصل خوشی کی بوتی ہوں
اور خوش فہمی کی کاٹ رہی ہوں
جانے کیسی رسم ہے یہ بھی
ماں کیوں بیٹی کو ورثے میں
اپنا مقدر دے دیتی ہے

نوشی گیلانی

سچی گواہی

عدالت میں وکیل نے معمر خاتون گواہ سے پوچھا۔
"آپ کی عمر کیا ہے محترمہ۔۔۔"
"میں اکتیس بہاریں دیکھ چکی ہوں۔" خاتون نے جواب دیا۔
وکیل نے نرمی سے پوچھا۔ "اور درمیان میں کتنے سال آپ نابینا رہیں۔"

کبریٰ عباسی

نئی دیوار

ایک شخص نے اپنی محبوبہ سے کہا۔ "تم سے ملنے کے لیے آج میں ایک نئی دیوار پھلانگ کر آیا ہوں۔"
محبوبہ نے تشویش سے پوچھا۔ "دیوار ٹوٹی تو نہیں، تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"
محبوب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں اینٹوں والی دیوار کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں تمہیں اپنی بیگم کے بارے میں بتا رہا ہوں، جس سے میری شادی چند روز قبل ہی ہوئی ہے۔"

فائزہ صدیقی۔۔۔ کمالیہ

جن پہ تکیہ تھا۔۔۔!

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اپنے ملک کا سب سے شریف آدمی کون ہے؟"
دوست نے کہا۔ "یہ بتا کر میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔"
"اچھا۔۔۔! تو سب سے زیادہ بے ایمان شخص کون ہے؟" اس شخص نے پھر پوچھا۔
"یہ بتا کر میں تم سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتا۔" دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ناہید امید علی۔۔۔ کراچی

چندہ

حفیظ جالندھری شیخ سر عبدالقادر کی صدارت میں انجمن جماعت اسلام کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے اپنی نظم سنا رہے تھے۔
"سنا نظم ایسی، ملے جس سے چندہ"
جلسے کے اختتام پر منتظم نے بتایا "آج پونے تین سو روپے چندہ جمع ہوا ہے۔" حفیظ نے کہا۔ "یہ سب میری نظم کا کمال ہے۔"
منتظم نے کہا۔ "مگر جناب۔۔۔ دو سو روپے ایک ایسے شخص نے دیے ہیں جو بہرہ تھا۔"

(فاکہہ سہیل۔۔۔ کراچی)

جھوٹ اور سچ

ایک پولیس والے نے ملزم سے پوچھا۔
"تمہیں معلوم ہے کہ اگر تم جھوٹ بولو گے تو کہاں جانا ہوگا؟"
ملزم نے جواب دیا۔
"جی ہاں۔۔۔ معلوم ہے، دوزخ میں جانا ہوگا۔"
پولیس آفیسر نے کہا۔ "اگر سچ بولو گے تو؟"
ملزم نے کہا۔ "جناب جیل میں۔"

(زناہ نور۔۔۔ کورنگی)

پاکستانی ہونے کی پہچان؟

☆ پاکستانی ہر کھانے میں لہسن پیاز کا استعمال کرتے ہیں۔

☆ گفٹ پیپرز کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں۔
☆ گیٹ پر رخصت ہونے سے پہلے آدھا گھنٹہ ضرور بات کرتے ہیں۔

☆ بغیر ڈاکٹر کی تجویز کے دوائیں استعمال کرتے ہیں۔
اقصیٰ ناصر۔ کراچی

نمک پارہ

☆ پاکستانی "جن" بھی اتنے ٹھرکی ہوتے ہیں کہ عاشق ہو کر چڑھتے بھی صرف عورتوں پر ہیں اور پھر جھاڑو کھانے سے بھی نہیں اترتے۔

(ماروی۔۔۔ سکھر)

ہدایات

شوہر صاحب بیوی کو ڈرائیونگ سکھا رہے تھے۔ سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک کو آتے دیکھ کر بیوی گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔
"اب کیا کروں؟"
"بس۔۔۔ تم یہ سمجھو کہ گاڑی میں چلا رہا ہوں۔ ایسے موقع پر تم جو ہدایات مجھے دیتی تھیں ان ہی پر عمل کرو۔"
شوہر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

(مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی)

خوشی اور غم

بیوی۔۔۔ "تم مجھ سے ایسی دو باتیں کہو کہ ایک سے میں خوش ہو جاؤں اور دوسری سے مجھے غصہ آجائے۔"
شوہر۔۔۔ "تم میری زندگی ہو اور لعنت ہے ایسی زندگی پر۔"

فوزیہ شکیل۔۔۔ لاہور

دعا

بچہ۔۔۔ "اللہ کرے باجی کی زبان کٹ جائے' روز ڈانٹتی ہیں۔" دوسرے دن زبان کٹ گئی۔
بچہ۔۔۔ "اللہ کرے بھائی کا ہاتھ ٹوٹ جائے' بہت مارتا ہے۔" دوسرے دن بھائی کا ہاتھ فریکچر۔۔۔
بچہ۔۔۔ "اللہ میرے باپ کو اٹھالے' بہت مارتا ہے۔"
دوسرے دن بچہ گھر آیا۔ ابا کو گھر میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کو کچھ نہیں ہوا؟"
ابا۔۔۔ "نہیں' کیوں؟"
بچہ۔۔۔ "اماں کہاں ہیں؟"
ابا۔۔۔! "پڑوس میں فراز انکل کا انتقال ہو گیا ہے' وہاں گئی ہیں۔"

سونیا شاہ۔۔۔ گوجرانوالہ

پریشانی

ایک آدمی اپنے دوست سے۔۔۔ "میری بیوی کا کل انتقال ہو گیا' میں نے رونے کی بہت کوشش کی لیکن آنسو پھر بھی نہیں نکلے' کیا کروں؟"
دوست۔۔۔! "کوئی مسئلہ نہیں' صرف اتنا تصور کرو کہ وہ واپس آرہی ہے۔"
اقصیٰ ناصر۔ کراچی

افسوس

ایک دکان دار ایک عورت کو کپڑے دکھا دکھا کر تھک گیا۔ آخر میں بولا۔
"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو کوئی کپڑا پسند نہیں آیا۔"
عورت۔۔۔ "کوئی بات نہیں میں ویسے بھی سبزی لینے نکلی تھی۔"

مسرت حسین

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	ایشا نور
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

شائستہ کنول جٹ ______ چیچہ وطنی

مجھے زندگی گر کبھی ملے میں پوچھ لوں اک بار اس سے
میری ہے اگر وہ تو خفا کیوں رہتی ہے مجھ سے

ناہید اصغر آرائیں ______ لالہ موسیٰ

وہ یاد آیا کچھ یوں کہ ٹوٹ آئے سب سلسلے
ٹھنڈی ہوا، بسنر پتے اور دسمبر کی یہ بارش

حرا قریشی ______ ملتان

مجھے تصویر اپنی دوسری دو
پرانی آنسوؤں میں ڈھل گئی ہے

نوال افضل گھمن ______ لاہور

غلاف پہن کے نکلی کتاب شیشے کا
حروف سنگ کے اور انتساب شیشے کا
جہاں جواب بھی کرچی، سوال بھی کرچی
بتاؤ دیکھنا چاہو گے خواب شیشے کا

تسنیم کوثر ______ کراچی

میرے ہاتھوں اور ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں
میں نے اسم محمدؐ کو لکھا بہت اور چوما بہت

سیدہ لوبا سجاد ______ کہروڑ پکا

کہاں آکے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا
وہ تیرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دل بے خبر میری بات سن، اسے بھول جا، اسے بھول جا

صباء شہناز ______ لکا نوالہ

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

نسرین علی ملک ______ میاں چنوں

اے درد جس کی آنکھ کھلی اس جہان میں
شبنم کی طرح جان کو اپنی وہ رو گیا

ربیعہ فاطمہ ______ قائم پور

کسی کے دل میں کیا چھپا ہے یہ تو رب ہی جانتا ہے
دل اگر بے نقاب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے
ان کی نظریں نہ جان پائیں اچھائیاں ہماری محسن
ہم جو سچ میں خراب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے

عینی سحر ______ ہری پور

میں چمکتا چاند تھا، وہ میرے ستارے تھے
میں تو اک پیاسی نگاہ تھا وہ میرے نظارے تھے
کہاں چلے گئے میرے پیارے مجھے تڑپتا چھوڑ کر
میں تو فقط اک بیل تھا، وہ میرے سہارے تھے

گڑیا شاہ ______ کہروڑ پکا

ہم تسلیم کرتے ہیں ہمیں فرصت نہیں ملتی
مگر جب یاد کرتے ہیں زمانہ بھول جاتے ہیں

سیدہ نسبت زہرا ______ کہروڑ پکا

گرداب کی مانند ہے زندگی
چاہوں تمہی سے، پہنچوں تمہی تک

گیلانی سسٹرز ______ کہروڑ پکا

اس سے بچھڑیں گے تو مر جائیں گے
کمال کا وہم تھا، ہوا کچھ بھی نہیں

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ______ کراچی

نہ سننے میں نہ کہیں دیکھنے میں آیا ہے
جو ہجر و وصل مرے تجربے میں آیا ہے
نئے سرے سے جل اٹھی ہے پھر پرانی آگ
عجب لطف تجھے بھول لینے میں آیا ہے

عالیہ نور ______ منڈوالہ یار

آنسو ہی مقدر ہیں تو کر لیں گے گزارا
کشکول لیے بھیک نہ مانگیں گے خوشی سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص گمراہی کے جھنڈے تلے جنگ کرتا ہے (لوگوں کو) عصبیت کی دعوت دیتا ہے۔ یا عصبیت کی بنیاد پر غصے میں آتا ہے تو اس کا قتل ہو جانا جاہلیت کی طرح ہے۔"

فوائد و مسائل۔
1۔ گمراہی کے جھنڈے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تحقیق کیے بغیر ایک فریق کا ساتھ دیتا ہے کہ وہ حق پر ہے یا نہیں۔ اس صورت میں اگر وہ حق پر بھی ہوا تو اس شخص کی نیت حق کا ساتھ دینے کی نہیں بلکہ اپنے خاندان، قبیلے، قوم، جماعت، پارٹی یا تنظیم کا ساتھ دینے کی ہے۔ اس لیے یہ وہ جنگ نہیں جس میں حصہ لینے سے ثواب ہو اور قتل ہونے سے شہادت کا درجہ ملے۔
2۔ حق و باطل کی پہچان کیے بغیر ہر دعوت اور ہر جنگ و جدل جاہلیت کے طریقے پر ہے۔

دوستی کا حق،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا۔
"دو دوستوں میں سے ایک کا دوسرے پر کیا حق ہے؟"
فرمایا۔ "ان میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ سیر ہو کر نہ کھائے کہ کہیں اس کا دوست بھوکا نہ رہ جائے۔ اپنی ذات کو اتنی توجہ نہ دے کہ دوست کا خیال نہ رہے۔ مشکل اور کٹھن حالات میں بھی دوست کا ساتھ نہ چھوڑے۔"
(بحوالہ۔ اقوال الصحابہ رض)

یقین،

ہارون الرشید نے بہلول سے کہا۔
"ہم چاہتے ہیں آپ کے روزینے کا بندوبست کر دیں۔"
بہلول نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔
"امیر المومنین! میں اور تم خدا ہی کے پروردہ ہیں تو پھر یہ نا ممکن ہے کہ وہ تم کو یاد کرے (تمہیں نوازے) اور مجھے بھول جائے۔"
اقصیٰ ناصر۔ کراچی

وقت وقت کی بات ہے،

عربی کا ایک مقولہ ہے۔ "لوگ اپنے حکمرانوں کے دین پر ہوتے ہیں۔" جیسا حکمران ہوتا ہے ویسی ہی عموماً اس کی رعایا ہوتی ہے۔
اب دیکھیں، ذرا کس خلیفہ کے دور میں کیا ہوتا رہا ہے۔
حجاج بن یوسف کا دور قتل و غارت اور فتنہ فساد کا دور تھا۔ کتنے ہی لوگ جیلوں میں ٹھونسے گئے۔ کتنے ہی قتل کر دیے گئے۔ صبح سویرے لوگوں میں اس قسم کی گفتگو ہوتی۔
"کل کس کو قتل کیا گیا۔ کون سولی پر چڑھایا گیا اور کس کو کوڑے مارے گئے؟"
اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک عمارتیں بنانے اور کارخانے لگانے کا شوقین تھا۔ لوگ اس کے دور میں ایک دوسرے سے بلڈنگیں بنانے، کارخانے لگانے،

نہریں کھودنے اور شجر کاری کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک کا دور آیا۔ وہ کھانے پینے کا شوقین تھا۔ گانے بجانے سے بھی دل لبھا لیتا تھا۔ لوگ قسم قسم کے کھانوں کی باتیں کرتے مغنیات اور لونڈیوں کا ذکر ہوتا اور مجالس میں شادی بیاہ اور تقریبات کے حوالے سے گفتگو ہوتی۔

اور جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا مبارک دور آیا تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے۔

"تم نے کتنے نوافل پڑھے ہیں۔ اس ماہ میں کتنے روزے رکھے ہیں، فلاں نے کتنا قرآن حفظ کر لیا ہے۔ اور فلاں کا کب ختم ہوگا؟"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

پرانی کہانی سے نکلتی ہے ایک نئی کہانی

اس نے اپنے باپ کو قتل کر کے قبیلے کی سرداری حاصل کی تھی اور بیٹھتے ہی اعلان کر دیا تھا۔

"جس کسی نے میرے خلاف بغاوت کی اس کو موت کی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

لیکن اس کے اعلان کے باوجود بھی باغی پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی کوئی اور نہیں اس کا اپنا اکلوتا اور سگا بیٹا۔ جب اسے گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔

"شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ تمہاری وجہ سے میں اپنے اعلان سے پھر جاؤں گا۔ اگر ایسا ہے تو تم غلط سوچ رہے ہو۔ سردار اپنی زبان سے کبھی پھرا نہیں کرتا۔ اس لیے تمہیں بھی وہی سزا ملے گی جو کسی اور باغی کو ملنا تھی، یعنی موت کی سزا۔ لیکن اس سزا سے پہلے دستور کے مطابق تم بھی اپنی آخری خواہش بیان کر سکتے ہو۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں اپنی بات جلاد کے کان میں کہنا چاہتا ہوں، اور میری آخری خواہش یہ ہے کہ جلاد میری بات میرے مارے جانے کے بعد آپ لوگوں کو بتلائے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے جلاد تمہاری بات تمہارے مرنے کے بعد ہمیں بتلائے گا۔"

یہ کہہ کر سردار نے جلاد کو اشارہ کیا تو وہ سردار کے بیٹے کے پاس چلا گیا۔ اور اس نے جونہی اس کے کان میں اپنی بات کہنا شروع کی تو جلاد کا رنگ فق سا ہوتا چلا گیا۔ اپنی بات ختم کر کے نوجوان نے بے خوفی سے اپنے سردار باپ کی طرف دیکھ کر مسکرانا شروع کر دیا۔

اقتدار اور طاقت کے رسیا سردار نے جلاد کو اشارہ کیا اور اس نے پلک جھپکتے میں تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔ پھر سردار نے جلاد سے پوچھا۔

"ہاں... اب بتاؤ اس نے کیا کہا تھا تمہارے کان میں؟"

جلاد نے سردار کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"سردار! آپ کے بیٹے نے کہا تھا کہ میرا خاندان اس قوم پر برسوں سے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا آرہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مستقبل میں بھی یہ قبیح سلسلہ جاری رہے، اسی لیے میں نے جان بوجھ کر اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی تاکہ وہ مجھے موت کی سزا دے اور میں جو کہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں، میرے مرنے کے بعد اس خاندان کی نسل ہی ختم ہو جائے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

آئینہ خیال

- زندگی وہ واحد چیز ہے جو ہمیں مکمل گارنٹی کے ساتھ ملتی ہے مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ گارنٹی کب، کیسے، کس لمحے ختم ہونی ہے۔
- آپ فرشتہ یا دیوتا نہیں بلکہ انسان ہیں اور مشکلات انسانوں کو ہی پیش آتی ہیں۔
- تنگ نظر وہ ہے جسے دو برائیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑتا ہے تو وہ دونوں کو اختیار

کرلیتا ہے۔

- میں نے دو طرح کے لوگوں سے دھوکا کھایا ہے ایک وہ جو میرے اپنے نہیں تھے اور ایک وہ جو میرے بہت اپنے تھے۔
- جب دعا سے بات نہ بنے تو فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
- سراب دراصل وہ خوبصورت دھوکا ہے جو دکھائی تو کچھ دیتا ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔
- گناہ کی معافی پر انسان تائب ہو کر پُرسکون بھی ہو جاتا ہے مگر کچھ گناہ گار اسے انعام سمجھتے ہوئے مزید گناہ کرتے ہیں۔
- زندگی کے سال تو یکساں گزارے جا سکتے ہیں۔ مگر حالات اور تقدیر کی مہربانیاں ہر صورت میں مختلف ہوں گی۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

قیمت،

ایک دیہاتی کو میں نے بصرہ کے جوہری بازار میں دیکھا۔ اس نے بتایا کہ ایک دن میں جنگل میں راستہ بھول گیا تھا اور میرے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی اور مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا کہ اچانک میں نے ایک تھیلی دیکھی جو موتیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں ہرگز اس خوشی کو نہیں بھول سکتا کہ میں نے سمجھا اس میں بھنے ہوئے گندم ہیں۔ پھر میں اس ناامیدی کو نہیں بھول سکتا جب مجھے معلوم ہوا کہ اس میں تو موتی ہیں۔

آمنہ اُجالا۔ ڈہرکی

انمول ہیرے،

- انسان ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا۔ تالا کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔
- انسان بزدل اتنا ہے کہ سوتے ہوئے خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور بے وقوف اتنا ہے کہ جاگتے ہوئے بھی اپنے رب سے نہیں ڈرتا۔
- دنیا نصیب سے متعلق ہے اور آخرت محنت سے جبکہ آج ہماری ساری محنت دنیا کے لیے ہے اور آخرت کو ہم نے نصیب پر چھوڑ دیا ہے۔
- زندگی ایک بار ملتی ہے اسے نیک کام کر کے آخرت کے لیے سنواریں ایسا نہ ہو کہ وقت چلا جائے اور اعمال میں کچھ بھی نہ ہو۔
- دل ٹوٹنا کیا ہوتا ہے۔ اس چڑیا سے پوچھو جس کا ایک ایک تنکے سے بنا ہوا گھونسلہ کسی سنگدل نے اس کی آنکھوں کے سامنے توڑ دیا ہو یا پھر اس ماں سے پوچھو جس کا جوان بیٹا کسی حادثے میں چل بسے۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

شکر،

شیخ سعدی کہتے ہیں۔

"میں نے ایک نیک شخص کو دریا کے کنارے دیکھا۔ جس کو ایک چیتے نے زخمی کر دیا تھا۔ اور اس کا زخم کسی دوا سے اچھا نہیں ہوتا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے اس تکلیف میں مبتلا تھا۔ مگر ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا۔

"تم شکر کس بات کا ادا کرتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"اس لیے کہ مصیبت میں مبتلا ہوں نہ کہ گناہ میں۔"

نوال افضل گھمن۔ لاہور

امۃ الصبور

ہندو مذہب

توارت بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے چلے تو ان کے ساتھ دوسری قوموں کے بھی بہت سے لوگ ہولیے تھے معلوم ہوتا ہے۔ "سامری" بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ سامری کسی آدمی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ہندی، پنجابی، بنگالی، دہلوی کی طرح کا ایک لفظ ہے۔ عراق میں "سمیری نام کی ایک قوم تھی۔ شاید سامری اسی قوم کا ایک شخص تھا" جو مصر سے اسرائیلیوں کے ساتھ نکل آیا تھا اور ضرور ہشیار کاریگر اور لائق آدمی تھا۔ ورنہ ایسا بچھڑا نہ بنا سکتا۔

"جا زندگی میں تیرے لیے یہ ہونا ہے کہ برابر کہتا رہے۔ مجھے نہ چھوؤ اور دیکھ جس بت کی پوجا پر تو جھکا رہا اور رچیا رہا ہے۔ اسے ہم جلا جلا کر راکھ کر ڈالیں گے اور اس کی راکھ کو سمندر میں اڑا کر بہا دیں گے۔"

مصریوں میں چھوت چھات تھی، بنی اسرائیل کو اچھوت کہا جاتا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ مصری گائے کو پوجتے تھے اور سامری نے بچھڑا اسی لیے بنایا تھا۔ مصر میں گائے کی پوجا کی اسے لت پڑ چکی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ بلکہ یقینی ہے کہ حضرت موسیٰ نے بچھڑا بنانے کے جرم پر سامری کو اپنی قوم سے نکال دیا ہوگا۔ سامری مصر واپس نہیں جاسکتا تھا، کیونکہ اسرائیلیوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے مصریوں کا باغی بن چکا تھا۔ ان حالات میں بالکل ممکن ہے کہ وہ ہندوستان بھاگ آیا ہو اور اپنے ہی جیسے بھگوڑوں سے مل کر اس نے ہندوستان میں مصریوں کی بہت سے رسمیں پھیلا دی ہوں۔

منوسمرتی یا میناس سمرتی

ہندوؤں کی شریعت کی کتاب "منوسمرتی" ہے کیا یہ ناممکن ہے کہ اس کتاب کا اصلی نام "میناس سامری" یا "مینا سمیری" ہو اور ہزاروں برس کے اندر آہستہ آہستہ بدلتا ہوا۔ "منوسمرتی" بن گیا ہو؟

پرانے ہندوؤں کی کوئی تاریخ کہیں موجود نہیں ہے۔ لیکن مصری کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں ایک، بہت بڑا بادشاہ میناس کے نام سے گزرا ہے۔ اسی بادشاہ کو تمام مورخ ابھی حال تک پورے مصر کا پہلا فرعون مانتے رہے۔ بہت ممکن ہے کہ سامری نے ہندوستان آکر اسی مصری فرعون کی طرف اپنی کتاب منسوب کردی ہو اور اپنی یاد بھی باقی رکھنے کے لیے اس کا نام "میناس سامری" رکھ دیا ہو۔

پرانے زمانے کا مصر تمدن و تہذیب میں تو بہت آگے بڑھا ہوا تھا، مگر مذہب و روحانیات میں بہت پیچھے تھا۔ مصریوں کے پاس نہ کوئی مذہبی کتاب تھی اور نہ لکھی ہوئی دینی شریعت تھی۔ فرعون اور مندروں کے منت جو کچھ کہتے تھے۔ اسی کو شریعت اور دینی حکم سمجھا جاتا تھا۔ جب تک فرعونوں میں زور رہا مصری انہی کو زمین پر دیوتاؤں کا مظہر یا اوتار مانتے رہے۔ فرعون امن دیوتا کا براہ راست سگا بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پوجا ہوتی تھی، جیتے جی بھی اور مرنے پر بھی فرعون کی اطاعت کرنا اور ہر ممکن طریقے سے اس کی خوشنودی حاصل کرنا فرض سمجھا جاتا ہے۔

مصری بت پرست تھے۔ بہت سے دیوتا پوجتے تھے۔ ہر شہر بلکہ ہر گاؤں کا دیوتا الگ تھا اور وہاں صرف اسی کو پوجا جاتا تھا۔ وہی آبادی کا بچانے والا مانا جاتا تھا۔ جب کوئی آدمی اپنے گاؤں یا شہر سے چلا جاتا تھا۔ تو اپنے دیوتا کو بھی چھوڑ جاتا تھا اور نئی جگہ کے دیوتا کی پوجا کرنے لگتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اب دوسرے

دیوتا کی عملداری میں آگیا ہے اور یہی دیوتا کام آسکتا ہے۔

مصریوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ دیوتا ان کی طرف سے لڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس جگہ کے مصری زیادہ لڑائیاں جیت لیتے تھے۔ وہاں کا دیوتا زیادہ مشہور ہوجاتا تھا۔ تھبس شہر کے شاہی خاندان نے مصر کو دوبارہ آزادی دلائی تھی اور بہت بڑی سلطنت کھڑی کردی تھی۔ اس لیے تھبس کا دیوتا امن سب سے بڑا دیوتا مان لیا گیا تھا' کیونکہ اس دیوتا جیسی فتوحات کسی اور دیوتا کو نصیب نہ ہوسکی تھیں پھر امن۔ فرعون کا خاص دیوتا بھی تھا۔ اور سگا باپ بھی تھا۔ اس لیے مصر میں سب سے اونچا نام اسی کا ہوگیا اور ہر جگہ پوجا جانے لگا۔ اگرچہ مقامی دیوتا بھی اپنی اپنی گدی پر بیٹھے رہے۔

امن کے عروج اور بڑائی کا اندازہ اس کے مندر کی آمدنی سے کیا جاسکتا ہے۔ راسس چہارم تقریباً 1000 ق م کے زمانے میں تمام بڑے بڑے مصری دیوتاؤں کے مندر ایک سو اکہتر گاؤں کے مالک تھے۔ جن میں سے نو شام اور ایتھوپیا (حبش) میں تھے۔ ایک لاکھ تیرہ ہزار چار سو سینتیس مرد' عورت ان کی غلامی میں تھے۔ چار لاکھ ترانوے ہزار سینتیس سو چھیاسی مویشیوں۔ دس لاکھ اکہتر ہزار سات سو اسی اروریا (زمین ناپنے کا کوئی مصری پیمانہ) کھیتوں پانچ سو چودہ تاکستانوں' اٹھاسی کشتیوں اور جہازوں' تین سو چھتیس کلوگرام سونے اور اسیس لاکھ ترانوے ہزار نو سو چونسٹھ کلوگرام چاندی کے وہ مالک تھے۔ اس کے علاوہ تانبے کے ڈھیر اور جواہرات ان کے قبضے میں تھے۔ سینکڑوں گودام بھی ان کے اپنے تھے۔ جن میں مہنتوں اور پجاریوں کے لیے اناج' تیل' شراب' شہد' سوکھا ہوا گوشت بھرا رہتا تھا۔ اسی قدر نہیں چھ لاکھ اسی ہزار سات سو چودہ زندہ بطخیں انہوں نے پال رکھی تھیں اور چار لاکھ چورانوے ہزار آٹھ سو نمک بھری مچھلیاں ہمیشہ ان کے قبضے میں رہتی تھیں۔

ان سب میں امن کا حصہ تین چوتھائی سے بھی زیادہ تھا۔ امن کے قبضے میں چھیاسی ہزار چار سو چھیاسی غلام' چار لاکھ اکیس ہزار تین سو باسٹھ مویشی' آٹھ لاکھ اٹھانوے ہزار ایک سو اڑسٹھ اروریا' کھیت چار سو تینتیس تاکستان اور چھپن مصری گاؤں تھے۔ شام اور حبش کے سب گاؤں بالکل امن ہی کے تھے۔ کوئی ان میں اس کا شریک نہ تھا۔ ایک شامی گاؤں میں امن کا مندر بھی تھا اور جب شام والے مصری وائسرائے کو خراج دینے آتے تھے تو انہیں فرعون کے امن دیوتا اور باپ کی پوجا بھی کرنی پڑتی تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ مصریوں کے خیال میں آدمیوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی دھوکا دینا آسان تھا۔ اس خیال کی تفصیل تو ہم آگے چل کردیں گے' مگر صاف ظاہر ہے کہ جو قوم خود اپنے معبودوں کو ایسا سمجھتی ہو اس کا چلن بہت اونچا نہیں ہوسکتا۔ یہ بات نہیں ہے کہ مصر کے تمام باشندے برائیوں اور بدکاریوں میں ڈوبے ہوئے تھے' لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ پرانے مصر میں اعلا اخلاق کی کمی تھی۔ لوگ اس بھروسے پر کہ مرنے کے بعد دیوتاؤں کو کسی نہ کسی طرح دھوکہ دے کر سزا سے بچ جائیں گے۔ برائیوں میں پڑجاتے تھے۔

مصری مہنتوں اور فرعونوں کے احکام پر چلتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ حکم ایک طرح کا اخلاقی ضابطہ یا قانون بن گئے تھے۔ جن میں اخلاقی مصنف اور معلم اپنی کتابوں میں لکھ کر قوم کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کتابوں کے کچھ کچھ ٹکڑے مل گئے ہیں' مگر ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مصر کے باشندوں کا اخلاق اونچا نہ تھا۔

ایک مصری مصنف کا نام ''انی'' تھا اس کا زمانہ معلوم نہیں ہوسکا' لیکن بہت پرانے وقتوں میں تھا۔ بہت بوڑھا بھی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے مکالمے کی صورت میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے ان حصوں سے بھی جو آج تک باقی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کی اخلاقی حالت اچھی نہ تھی۔ ''انی'' اپنے بیٹے کو مخاطب کرکے لکھتا ہے۔

"اس عورت سے ہوشیار رہو جو اپنے گھر سے چوری چھپے نکل کر شہر ماری ماری پھرتی ہے۔ نہ اس عورت کا پیچھا کر' نہ اس جیسی کسی اور عورت کا۔ ایسی عورتوں کا تجربہ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایسے سمندر میں جانے کا تجربہ کرے۔ جس کی گہرائی کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوا۔"

"وہ عورت' جس کا مرد گھر سے دور ہے۔ تجھے خط پر خط بھیجتی ہے اور روز اپنے پاس بلاتی ہے' مگر اسی وقت جب اکیلی ہوتی ہے۔ خبردار اگر وہ تجھے اپنے جال میں پھانس لے گی تو یاد رکھ' یہ ایک ایسا جرم ہے۔ جس کے کھلتے ہی موت کی سزا ہو جاتی ہے۔ چاہے آدمی نے بے وقوفی کا کام نہ بھی کیا ہو' اور یہ سزا اس لیے دی جاتی ہے کہ اکیلے میں ایسی ترغیب اور بوجھ کے ہوتے ہوئے آدمی ہر قسم کا گناہ اور جرم کر سکتا ہے۔"

"انی" کی ان سطروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے مصر میں مکاری کا دور تھا' عورتوں میں بے حیائی بڑھی ہوئی تھی۔ مردوں کو خود بلاتی تھیں! ساتھ ہی یہ مصری قانون بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اکیلے گھر میں عورت سے ملنا چاہے کسی ارادے سے ہو' بہت بڑا جرم تھا اور اس جرم پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ یہ سخت قانون اسی لیے بنایا ہو گا کہ ایسے جرم عام ہو چکے تھے۔ آگے چل کر بوڑھا "انی" اپنے بیٹے سے کہتا ہے۔

"شراب خانوں میں جھگڑا نہ کرنا' ورنہ تجھے ان لفظوں میں برا کہا جائے گا جو بے ہوشی کی حالت میں تیرے منہ سے نکل جائیں گے۔ بہت نشہ ہو جائے گا' تو گر پڑے گا۔ تیرے گھر والے بے سہارا ہو جائیں گے اور خود تجھے سنبھالنے کے لیے کوئی ہاتھ بھی نہ بڑھے گا۔ تیرے جانی دوست بھی جو تیرے ساتھ ہوں گے چلا اٹھیں گے۔" نکالو اس بدبخت شرابی کو' یاد رکھ تو پیدا ہوا ہے کچھ کام کرنے کے لیے' مگر تو پایا گیا ہے لڑھکتا ہوا زمین پر ننھے بچوں کی طرح۔

یہ نصیحت بھی ظاہر کرتی ہے کہ مصریوں کا اخلاق زیادہ اچھا نہ تھا۔ شراب خانوں میں بدمست ہو کر لڑتے تھے اور گہرے دوست بھی وقت پر ساتھ چھوڑ دیا کرتے تھے۔

حمایت

پچھلے دنوں ماہرہ خان کی ایک تصویر سے بھارت میں شیوسینا سمیت ماہرہ خان کے دشمنوں کو ان کے خلاف محاذ کھولنے کا موقع مل گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ کراچی میں ہوئی ایک ہیلوئن پارٹی (ایسی پارٹی جس میں سب لوگ مختلف بہروپ بھر کر شرکت کرتے ہیں) میں ماہرہ خان کیٹ وومن کا لبادہ اوڑھے مزاحیہ انداز اپنانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ان کے برابر میں مشہور ویڈیو ڈائریکٹر عاصم رضا آکر کھڑے ہو گئے۔ عاصم رضا نے شیوسینا کے کارکنوں کا سا لباس پہنا ہوا تھا اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ ان کے ہاتھ میں ایک پلے کارڈ تھا' جس میں لکھا تھا کہ "ماہرہ کو باہر نکالو۔" (بھئی ہیلوئن پارٹی کی آڑ میں سب اپنے دل کے ارمان پورے کر رہے تھے) سب نے اس کو بہت انجوائے کیا۔ بات ختم ہو گئی مگر

جب یہ تصویر سوشل میڈیا کے ذریعے بھارت پہنچی تو وہاں تو ہنگامہ ہو گیا اور اتنا بڑھا کہ بالآخر ماہرہ کو ٹوئٹر کے ذریعے یہ کہنا پڑا کہ یہ تصویر انجانے میں کھینچی گئی اور میرا مقصد کسی بھارتی شہری یا جماعت کی تضحیک کرنا نہیں تھا۔ ماہرہ نے اس معاملے پر معذرت بھی کی۔ ماہرہ نے مزید کہا کہ وہ فن کاروں کے سیاست میں پڑنے کے سخت خلاف ہیں اور اپنے فن کے ذریعے امن اور محبت بکھیرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ (جی ہاں بھارت میں کام جو کرنا ہے)

فتح

دہلی کی شاہی مسجد کے امام احمد بخاری کے بیٹے شعبان بخاری (جو کہ امام احمد بخاری کے جانشین بھی ہیں۔) نے ہزار مخالفتوں کے باوجود ایک ہندو لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ ایک بھارتی جریدے کے مطابق شعبان بخاری اور ان کی نو مسلم اہلیہ دو برس تک یونی ورسٹی میں ساتھ پڑھتے رہے۔ غازی آباد سے تعلق رکھنے والی یہ اعلا تعلیم یافتہ لڑکی ذات کے اعتبار سے برہمن ہے لیکن اس نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اب وہ دین اسلام کی تعلیمات اور قرآن سیکھنے میں مصروف ہے۔ جریدے کا دعوا ہے کہ ان کے نکاح کی تقریب آٹھ نومبر کو جامع مسجد دہلی کی تاریخی عمارت کے احاطے میں منعقد ہوئی' جس میں دونوں خاندانوں کے مخصوص لوگوں نے شرکت کی اور ولیمہ کی تقریب 14 نومبر کو منعقد ہوئی۔

اس شادی پر ہندو انتہا پسند شدید برہم ہیں۔ آر ایس ایس کے مقامی عہدیداروں نے شعبان بخاری کی جانب سے برہمن لڑکی کو مسلمان کرکے نکاح کے عمل کو "لو جہاد" قرار دے دیا ہے۔ بخاری خاندان کے

بڑے بھی پہلے اس شادی کے اس لیے مخالف تھے کہ وہ بھارت کے موجودہ منظرنامے میں کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن بالآخر اپنی ضد پر اڑے یہ دونوں پریمی جیت گئے۔

انکشاف

صنم سعید نے انکشاف کیا ہے کہ "رئیس" (شاہ رخ خان کی فلم) کی ہیروئن کے آڈیشن کے لیے پہلے انہیں بلایا گیا تھا مگر جن تاریخوں میں صنم سعید کو آڈیشن کے لیے ممبئی بلایا گیا تھا۔ ان ہی دنوں صنم کی شادی بھی تھی۔ (تاریخ آگے بھی تو بڑھائی جاسکتی تھی' بھئی شادی کی اور کس کی؟) جس کی وجہ سے صنم آڈیشن کی قربانی دینے پر مجبور ہوگئی۔ صنم نے مزید کہا کہ انہیں یہ موقع ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس اس لیے نہیں ہے کہ ان کی جگہ ایک اور پاکستانی اداکارہ (بھئی ماہرہ خان اور کون۔۔۔؟) کو یہ موقع مل گیا۔ (بھئی شاہ رخ کی ہیروئن بننے کا اور کس کا؟ ویسے صنم! آپس کی بات ہے اس راز کو کھولنے میں آپ نے اتنی دیر کردی کہ اب تو لگ رہا ہے کہ آپ ماہرہ خان سے۔۔۔؟)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ ریحام' عمران خان کی زندگی میں آنے والی باقی خواتین سے مختلف عورت ہے۔ ماضی کی تمام عورتیں گمنام اور رئیس تھیں۔ چنانچہ وہ جس طرح چپ چاپ آئیں' اسی طرح خاموشی کے ساتھ واپس چلی گئیں لیکن ریحام تین بچوں کی ماں' طلاق یافتہ اور غریب خاتون تھی۔ چنانچہ اب اپنے انٹرویوز بھی لاکھوں پاؤنڈز میں بیچے گی اور اپنی آپ بیتی' اپنی کتاب کے بھی ملینز آف پاؤنڈز وصول کرے گی۔ یہ غریب خاتون ہے' اس کا واحد اثاثہ عمران خان کے ساتھ گزارے ہوئے دس ماہ ہیں اور یہ اب خود کو اس اثاثے سے محروم نہیں ہونے دے گی۔

(جاوید چوہدری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

☆ جہاد افغانستان کے اصل ہیرو وہ غریب شہدا تھے جو 1979ء میں گھروں سے نہتے نکلے تھے اور روسی ٹینکوں کے سامنے کھڑے ہوگئے تھے۔ اس جہاد کے اصل ہیرو وہ طالبان تھے جو شہید ہوگئے جن کا اقتدار ختم ہوگیا' جو کنٹینروں میں سسک سسک کر شہید ہوگئے لیکن انہوں نے امریکہ کے سامنے ہتھیار نہیں پھینکے۔ انہوں نے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہیں کیا۔ انہوں نے ہماری طرح 800 عرب مجاہدین امریکہ کو نہیں بیچے۔

(جاوید چوہدری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

☆ وہ تین بھائی جو پیرس حملے کے ماسٹر مائنڈ تھے' وہ الجزائر سے خاندانی تعلق رکھتے تھے۔ صرف چند دہائیاں پہلے 1991ء میں جب الجزائر کے الیکشن کے دو مرحلوں پر اسلامک فرنٹ کو اکثریت حاصل ہوگئی تو فرانسیسی فوجیں الجزائر میں داخل ہوئیں۔ جنگی جہازوں نے بمباری کی اور الجزائر کو لاکھوں انسانوں کا مقتل بنادیا گیا۔

اب ملک تباہ کرکے معافی مانگنے کے زمانے لد گئے'
اب اپنے گھروں میں لگی آگ کو بجھاؤ۔

(اوریا مقبول جان۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

دستک دستک دستک

شاہین رشید

صنم چوہدری

"ہیلو صنم چوہدری' کیسی ہو؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آج ٹائم ہے' تھوڑی بات چیت ہو سکے گی۔"

"جی جی.... ضرور...."

"کیا مصروفیات ہیں؟"

"جی آپ کو پتا ہی ہے کہ ہم آرٹسٹوں کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں۔ کچھ پروجیکٹس پہ سائن کیا ہے۔ ریکارڈنگز بھی چل رہی ہیں' دیکھیں کہ کب آن ایئر ہوتے ہیں۔"

"کوئی خاص کردار ہیں؟"

"میں اپنے بارے میں تو سب کو یہی کہتی ہوں کہ میں اداکاری کے معاملے میں آل راؤنڈر بننا چاہتی ہوں اور ہر طرح کے کردار کرنا چاہتی ہوں۔ آپ آل راؤنڈر کہہ لیں یا ورسٹائل کہہ لیں۔ جو کردار مجھے اچھا لگتا ہے قبول کر لیتی ہوں۔"

"اچھا.... اگر مسلسل رونے دھونے والے کردار ملیں تو گھبرا نہیں جاؤ گی؟"

"مسلسل تو کوئی رول ملتا بھی نہیں ہے۔ ہر سیریل میں تھوڑا بہت چیلنج تو ہوتا ہی ہے' تو دیکھتی ہوں کہ کتنی ورائٹی ہے اس کردار میں اس حساب سے کرتی ہوں۔"

"سنا ہے کہ آپ کو رونے دھونے والے کردار پسند ہیں.... کیوں....؟" "کیوں کا جواب یہی ہے کہ بس مجھے رونے دھونے والے کردار کرنا آسان لگتا ہے اور اچھا بھی.... اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدانخواستہ میری زندگی میں کوئی پرابلم ہے' بس پسند پسند کی بات ہے۔"

"لاہور سے کراچی شفٹ ہو گئیں.... وجہ....؟"

"ہم آرٹسٹوں کے کراچی شفٹ ہونے کی خاص وجہ کام ہے' لاہور میں بھی کام ہے لیکن کراچی والوں کے کام کرنے کا طریقہ مجھے پسند ہے۔ بہت آرگنائزڈ طریقے سے کام کرتے ہیں۔ یہاں کا ماحول بہت پروفیشنل ہے۔ اس لیے کام کرنے کا بھی مزہ آتا ہے۔"

"یہ آج کل سازشوں والے' لڑائی جھگڑے والے' ایک دوسرے کی لگائی بجھائی کرنے والے کردار بھی تمہیں اچھے لگتے ہیں؟"

ہنستے ہوئے.... "اچھا لگتا ہے' انجوائے کرتی ہوں' ویسے ایسے کرداروں کا انجام بھی تو اچھا نہیں ہوتا' یہ بھی تو آپ دیکھیں۔"

"اپنے ڈرامے اچھے لگتے ہیں؟"

"اپنے کیا.... سب کے اچھے لگتے ہیں' کیونکہ اب

ہمارے ڈرامے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ ہر ڈرامے میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا ہے۔"

"فیلڈ میں اپنی بہن زیب چوہدری کی وجہ سے ہی آئی ہوں گی آپ؟"

"جی ان ہی کی وجہ سے۔۔۔ بلکہ ان سے متاثر ہو کر آئی ہوں۔ جب میں انہیں اداکاری کرتے ہوئے دیکھتی تھی تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں بھی اس فیلڈ میں آؤں۔"

"تو پھر کس نے آپ کو پہلی بار بک کیا؟"

"میری بہن نے ہی اپنی ڈائریکشن میں بننے والے ڈرامے "ادھوری فلم کی پوری کہانی" میں کام لیا' میں نے اپنے حساب سے تو اچھا کام کیا مگر بہن نے ڈانٹا کہ تم نے ٹھیک کام نہیں کیا۔ حالانکہ میں نے تو اداکاری کے شوق میں اپنی پڑھائی کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا۔"

"دل برداشتہ ہوئیں یا مزید اچھا کرنے کی ٹھان لی؟"

"چونکہ اس وقت صرف سولہ سال کی تھی' اس لیے دل بہت برا ہوا اور میں نے سوچ لیا کہ کچھ اور کر لوں گی مگر اداکاری نہیں کروں گی۔"

"ہوں۔۔۔ پھر واپسی کیسے ہوئی اور وقفے کے دوران کیا کیا؟ اپنی تعلیم مکمل کی ہوگی؟"

"نہیں۔۔۔ تعلیم تو بس پھر ادھوری ہی رہ گئی۔ البتہ اداکاری کے علاوہ اس فیلڈ میں دوسرے کام کیے۔ مثلاً "ماڈلنگ پر توجہ دی' کچھ میوزک ویڈیوز کیے۔ پی ٹی وی کے کچھ پروگراموں کی میزبانی کی' تاکہ کیمرے سے دوستی رہے اور سچ بتاؤں مجھے ان کاموں میں زیادہ مزہ آیا۔"

"اچھا تو پھر اداکاری کی طرف کیوں آئیں؟"

"کیونکہ اداکاری میں آگے بڑھنے کا بہت اسکوپ ہے اور اداکاری کی فیلڈ میں کیوں کہ کافی کام ہو رہا ہے تو اس لیے' پھر 2010ء میں' میں اس فیلڈ میں واپس آئی اور اللہ کا شکر ہے کہ تب سے اب تک مسلسل کام کر رہی ہوں۔"

"اب تک کیے گئے کاموں میں مقبولیت کس کو

ملی؟"

"مقبولیت تو اللہ کا شکر ہے کہ سب کو ملی' کیونکہ مجھے اب تک جتنے بھی کردار ملے' سب ہی اچھے تھے مگر پھر بھی جنہیں بہت مقبول سمجھتی ہوں ان میں "آسمانوں پہ لکھا" جس میں شہریار منور نے بھی میرے ساتھ کام کیا۔ "آس" سیریل بہت مقبول ہوا۔ "سہیلیاں" کافی کامیاب ہو گیا۔ "عشق ہماری گلیوں میں" کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ میرے سارے ہی ڈرامے مقبول ہوئے۔"

"اب فلم کی طرف بھی تو آپ نے قدم بڑھایا ہے؟"

"جی بالکل.... میری پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے ہی تو مجھے فلم سے آفرز آئی ہیں۔ آج کل فلم "عشق 20.20 " پر کام ہو رہا ہے۔ اس میں سجل علی بھی ہیں۔ ان کی یہ پہلی فلم ہوگی اور میری دوسری' کیونکہ اس سے پہلے فلم "سایۂ خدائے ذوالجلال" میں کام کر رہی ہوں' جو کہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔"

"خوشی کہاں ہوتی ہے' فلم میں کام کرکے یا ڈراموں میں؟"

"ڈراموں کا اپنا مزہ ہے اور سلور اسکرین کا اپنا مزہ ہے۔ مجھے دونوں میں مزہ آرہا ہے۔ بڑی اسکرین کا خواب تو ہر کوئی دیکھتا ہے اور میں نے بھی دیکھا' جس کو اللہ نے قبول کیا اور ڈراموں کی تو جی کیا بات ہے۔ اب ہمارے ڈرامے بھی بہت ترقی کر رہے ہیں ماشاء اللہ سے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟"

"جی میں 27 اگست 1990ء کو سعودی عرب میں پیدا ہوئی اور جب تین سال کی تھی تو سعودی عرب سے پاکستان آ گئی مستقل طور پر.... گھر میں سب سے چھوٹی ہوں' اس لیے بچپن میں شرارتی بھی بہت تھی' جس کی وجہ سے مار بھی پڑتی تھی اور ڈانٹ بھی مگر میں کب باز آنے والوں میں تھی.... بس اسی طرح اچھلتے کودتے اور ڈانٹ مار کھاتے بچپن گزر گیا۔"

"اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے جتن کرتی ہیں؟"

"بہت زیادہ نہیں' کراچی میں تو پھر بھی ڈائٹ کا خیال رکھتی ہوں مگر لاہور جا کر سب کچھ بھول جاتی ہوں' کیونکہ لاہور کے کھانے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ ہاتھ نہیں روک سکتی۔ ویسے بھی سب لاہور میں ہی ہوتے ہیں تو سب کے سامنے ڈائٹ کے نخرے نہیں دکھاتی۔ کراچی میں تو "نوڈلز" کھا کر بھی گزارا کر لیتی ہوں۔ بس کوشش کرتی ہوں کہ کہیں میں موٹی نہ ہو جاؤں۔"

"اپنے آپ میں کوئی کمی محسوس کرتی ہیں؟"

"نہیں.... میں اللہ کی بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے ایک مکمل انسان بنایا ہے اور کمی تو نہیں' بلکہ مجھے تو اپنی آنکھیں بہت پسند ہیں۔"

"بہن کا شکریہ ادا کرتی ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ مقام حاصل ہوا آپ کو...."

"بالکل سو فیصد.... وہ اگر میرا ساتھ نہ دیتی تو شاید میں آج اس مقام پر نہ ہوتی۔"

"میوزک میں کون پسند ہے؟"

"مجھے "راحت فتح علی" بہت پسند ہیں اور میں زیادہ تر ان ہی کو سنتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

ثروت گیلانی

"کیسی ہو ثروت؟ اور روحان کیسا ہے؟"

"اچھی ہوں اور ماشاء اللہ سے روحان بھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"اور فہد؟"

"جی الحمد للہ.... وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ بس اپنی ڈاکٹری میں لگے ہوئے ہیں۔ پڑھائی بھی چل ہی رہی ہے اور سرجری بھی چل رہی ہے۔"

"ڈراموں سے غائب کیوں ہو؟"

"آپا.... ! ایک وقت میں کئی کئی کام نہیں کر سکتی۔

روحان ابھی کافی چھوٹا ہے۔ اس لیے ڈراموں کو ٹائم نہیں دے پا رہی۔ البتہ ماڈلنگ کرلیتی ہوں کہ اس میں ٹائم کم لگتا ہے' دو تین دن کی خواری کے بعد اچھا کام ہو جاتا ہے اور پھر فلمیں بھی تو کررہی ہوں۔"

"ہاں... فلموں پہ یاد آیا کہ تمہاری فلم "جوانی پھر نہیں آنی" میں تمہارے کام کو بہت پسند کیا گیا' پرسنلی کیا ریسپانس آیا؟"

"بہت اچھا ریسپانس آیا۔ بہت تعریف ہوئی۔ سب نے بہت حوصلہ افزائی بھی کی اور مزید فلموں میں کام کرنے کی آفرز بھی آئیں۔"

"ایک زمانہ تھا جب فلم کا اصل مرکز "لاہور" ہوتا تھا' اب کراچی ہے۔ ایسا ہونا بہتر ہے یا نہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کراچی بھی اپنا شہر ہے اور لاہور بھی' بس اچھی فلمیں بننی چاہئیں' تاکہ لوگ سینما ہاؤس کا رخ کریں اور اب تو ہماری فلموں کو پاکستان سے باہر بھی پسند کیا جارہا ہے۔ یہ ہمارے لیے کتنی خوش آئند بات ہے۔"

"اب تک کتنی فلموں میں کام کرچکی ہیں اور کیسا رہا یہ تجربہ کام کے حوالے سے؟"

"دو فلموں میں کام کیا ہے۔ "دل میرا دھڑکن تیری" اور "جوانی پھر نہیں آنی" اور دونوں میں کام کرنے کا تجربہ بہت اچھا رہا۔ خاص طور پر "جوانی پھر نہیں آنی" میں کام کرکے بہت مزہ آیا۔ اس میں' میں نے واسع چوہدری کی بیوی کا کردار ادا کیا ہے اور اب میرا اپنا بھی ارادہ ہے "فلم ڈائریکشن" میں آنے کا۔"

"اور تھیٹر میں کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا' کیونکہ میرے خیال میں تم نے پہلے کبھی تھیٹر نہیں کیا تھا؟"

"جی میں نے پہلے کبھی تھیٹر نہیں کیا تھا' میں نے تو بلکہ ٹی وی اور ماڈلنگ کرنے کا بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ میرے لیے تو راستے خود بخود ہموار ہوتے گئے۔ اسی طرح تھیٹر میں کام کرنے کی آفر آگئی تو کرلیا۔ بہت اچھا تجربہ رہا۔ میرا پہلا تھیٹر ڈرامہ "دھانی" تھا' جسے "عمرانہ مقصود صاحبہ" نے لکھا تھا اور بہت اچھا لکھا تھا۔ اس میں کام کرکے بہت اچھا لگا' بلکہ اسٹیج کا تو فائدہ یہ ہے کہ فوراً "ریسپانس" مل جاتا ہے۔ اچھا کرو یا برا کرو۔"

"زیادہ تر تم نے ڈراموں میں سنجیدہ اور رونے دھونے والے کردار کیے... کیوں؟"

"کیوں کی تو بات ہی نہ کریں... بس جو کردار ملتے ہیں کرلیتی ہوں۔ ویسے سچ بتاؤں مجھے بھی ایسے کردار کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ اس طرح کے کرداروں میں اپنے جذبات بھی شامل ہوجاتے ہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ تم رونے دھونے والے کردار بہت اچھے طریقے سے کرتی ہو۔"

قہقہہ... "جی جی... مجھے بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ آپ روتی بہت اچھا ہیں' تو میں سوچتی ہوں کہ پھر کیوں نہ لوگوں کی پسند کے کردار کیا کروں۔"

"فارغ وقت تو روحان کے ساتھ ہی گزرتا ہوگا۔"

"جی بالکل... اب روحان کافی شرارتی ہوگیا ہے' حالانکہ ابھی صرف چند ماہ کا ہے اور اب تو دل چاہتا ہے کہ فارغ وقت میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاروں... اپنے گھر کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں..."

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

بیف تکہ پزا

ضروری اشیاء

ڈو بنانے کے لیے:

میدہ	پانچ کپ
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ایسٹ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
خشک دودھ	تین چائے کے چمچے
شکر	دو چائے کے چمچے
پانی	آدھا کپ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک پیالے میں ایسٹ پاؤڈر' خشک دودھ اور شکر ڈالیں اور پانی شامل کر کے پندرہ سے بیس منٹ کے لیے ڈھکن ڈھک کر رکھ دیں۔ میدے میں بیکنگ پاؤڈر کو ملا کر چھان لیں اور اس میں نمک شامل کریں۔ پیالے میں بنائے ہوئے ایسٹ کے آمیزے میں جب بلبلے بننے شروع ہو جائیں تو اسے چمچے سے اچھی طرح ملا کر میدے میں ڈال کر حسب ضرورت پانی شامل کر کے ڈو گوندھ لیں۔ ایک چکنے کیے ہوئے بڑے ایئر ٹائیٹ پیالے میں یا پتیلی میں ڈو رکھیں اور ایک سے دو گھنٹے تک کسی نیم گرم جگہ پہ رکھ دیں تاکہ خمیر اچھی طرح اٹھ جائے۔

فلنگ کے لیے ضروری اشیاء :

گوشت	350 گرام
دہی	چار کھانے کے چمچے
کچری پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
تکہ مصالحہ	دو کھانے کے چمچے
پیاز (چھوٹی' سلائس کاٹ لیں)	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
لہسن' ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
تیل	حسب ضرورت

پزا ساس	حسب پسند
موزریلا چیز	حسب پسند
چیڈر چیز	حسب پسند
ٹماٹر	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
پیاز	ایک عدد

ترکیب :

1 ۔ پیاز کے سلائس کو گرم تیل میں سنہری ہونے تک تل لیں اور نکال کر پیس لیں۔ پسی ہوئی پیاز میں دہی' کچری پاؤڈر' سرکہ' تکہ مصالحہ' نمک اور لہسن' ادرک پیسٹ ملا کر اسے گوشت پہ لگا کر دو سے تین گھنٹے تک میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

2 ۔ ساس پین میں تیل گرم کر کے اس میں میرینیٹ کیا ہوا گوشت معہ میرینیشن ڈال کر پانچ منٹ تک فرائی کریں اس کے بعد ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پانی خشک ہونے اور گوشت گلنے تک پکائیں۔

3 ۔ تیار کیے ہوئے ڈو کو پزا پین پہ ہاتھ کی مدد سے پھیلا پھیلا کر بچھائیں۔ پھر اس پہ پزا ساس لگائیں۔ پھر چوپ کیے ہوئے ٹماٹر' شملہ مرچ اور پیاز کے سلائس رکھ کر کدوکش کیا ہوا چیڈر چیز اور موزریلا چیز چھڑک دیں۔ پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں ہائی ہیٹ پر پندرہ سے بیس منٹ تک بیک کریں۔ منٹ تک بیک کریں۔ مزیدار بیف تکہ پزا تیار ہے۔ (اگر اوون نہیں ہو تو۔ پتیلی میں بنا لیں)

بریڈ سلائس پزا

ضروری اشیاء :

بریڈ سلائسز	آٹھ عدد
کیچپ	ایک کپ
مایونیز	ایک کپ
مرغی کا گوشت	ایک کپ
پزا چیز	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد

ترکیب :

بریڈ سلائسز پر مایونیز لگائیں۔ شملہ مرچ (سلائس کٹی ہوئی) مرغی (ابلی ہوئی) اور کیچپ ڈالیں۔
کش کی ہوئی چیز ڈال کر پیاز کے گول رنگ کاٹ کر رکھ دیں۔ دو سے تین منٹ تک پہلے سے گرم اوون میں بیک کریں کہ چیز پگھل جائے۔

سویوں کے کپ

ضروری اشیاء :

سویاں	ایک پیکٹ
بادام 'پستہ 'ناریل	حسب پسند
کشمش	حسب ضرورت
کھویا	ایک کپ
چھوٹی الائچی	چار عدد
چینی	دو کپ
پانی	دو کپ
گھی	دو چائے کے چمچے

ترکیب :

چینی میں پانی ڈال کر گاڑھا شیرہ بنالیں۔ گھی گرم کر کے الائچی چھل کر ڈالیں سویاں ڈال کر ہلکی آنچ پر بھون لیں۔ تھوڑے پستے ' بادام ' کشمش ' ناریل ڈالیں حسب ضرورت چینی کا شیرہ ڈالیں اور ہلکی آنچ پر دو سے تین منٹ پکائیں۔ اور پیالوں میں بادام ' پستے ' ناریل ڈالیں اس پر سویاں ڈال کر دبادیں ٹھنڈا ہو جائے تو کسی پلیٹ میں پیالوں کو پلٹ دیں اور سرو کریں۔

چکن کارن سوپ

ضروری اجزا :

چکن	آدھا کپ
مکئی کے دانے	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
چائینز نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سویا ساس	حسب ذائقہ
یخنی	چار کپ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
انڈے کی سفیدی	دو عدد
چلی ساس	حسب ذائقہ

ترکیب :

مکئی کے دانوں کو یخنی میں ڈال کر ابالنے رکھ دیں۔ اس میں نمک ' چائینز نمک (اگر چائینز نمک دستیاب ہو) ملا دیں۔ جب یخنی تیار ہو جائے اور مکئی کے دانے گل جائیں تو آدھا کپ پانی میں کارن فلور گھولیں اور یخنی میں ڈال کر دو منٹ تک پکائیں۔ اب اس میں ابلی ہوئی چکن کے باریک ریشے کرکے ڈال دیں اور کچھ دیر پکائیں اور پھر انڈوں کی سفیدی پھینٹ ڈالیں' تھوڑی پتلی دھار کے ساتھ چمچہ چلا چلا کر ملاتے جائیں۔ تیار ہو جانے پر خوب گرما گرم سوپ کو سویا ساس اور چلی ساس کے ساتھ سرو کریں۔

ادارہ

حسن و صحت خوب صورت بنئے

جلد کو صحت منداور شفاف رکھنے کے طریقے

اپنے خون کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے درج ذیل طریقوں پر عمل کریں۔

1 لیموں' چقندر' گاجر اور سبز پتے والی سبزیاں خون کو صاف رکھتی ہیں۔

2 انگور کا رس چینی کے بغیر استعمال کیجیے' یہ خون میں ہیمو گلوبن بڑھاتا ہے۔

3 زیادہ سے زیادہ پانی پیجیے۔

4 چکن اور مسالے دار غذا سے پرہیز کریں۔

5 لہسن خون کو صاف رکھنے کے لیے بہترین ہے۔ روزانہ تین جوے لہسن' پانی کے ساتھ کھائیں۔ یہ عمل ایک ماہ کیجیے۔

6 انار کا باریک چھلکا خشک کر کے پیس لیں۔ اسے ایک گلاس پانی میں حل کیجیے اور روزانہ صبح پی لیجیے۔

7 شہد اور لیموں کو ایک گلاس پانی میں ملالیں اور ایک ماہ تک پئیں۔ اس سے خون صاف ہو جائے گا۔

کیل مہاسے چہرے کی خوب صورتی کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ آج ہم ان سے نجات کے لیے کچھ آسان گھریلو نسخے دے رہے ہیں جن کو آزما کر آپ ان سے نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ان نسخوں میں جن اشیا کی ضرورت ہو گی' وہ گھر میں موجود ہی ہوتی ہیں' کیل مہاسوں کے سلسلے میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ غذا کا خصوصی خیال رکھیں۔ بغیر چکنائی والی اور زود ہضم غذا استعمال کریں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ پھل اور سبزیاں زیادہ استعمال کریں۔

☆ ایک پیالے میں ایک پاؤ پودینے کا رس ڈال کر دو چمچے کولڈ کریم مکس کر کے پھینٹیں۔ اچھی طرح پھینٹ جائے تو حسب ضرورت لے کر چہرے پر لیپ کریں اور دس منٹ تک لگا رہنے دیں' پھر نیم گرم پانی سے دھو کر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹیں ماریں۔ یہ عمل ہفتے میں دو بار کریں' کیل مہاسوں میں نمایاں کمی آئے گی۔

☆ بیسن سے منہ دھو کر دودھ میں لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لگائیں اور ہلکا ہلکا مساج کریں۔ اس سے بند مسامات کھل جائیں گے جو دانوں کی وجہ بنتے ہیں۔

☆ صبح اٹھ کر گھاس پر سے اوس چہرے پر لگائیں۔

☆ دو عدد بادام اور آدھا چمچہ شہد' دو چمچے نیم گرم دودھ میں ملا کر چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ بعد چہرہ دھو لیں۔

☆ اجوائن کو دہی میں ملا کر رات کو سونے سے پہلے مہاسوں پر لگائیں' صبح گرم پانی سے چہرہ دھولیں' باقاعدہ استعمال سے کیل مہاسے غائب ہو جائیں گے۔

☆ مٹی کے برتن میں ایک چمچہ بالائی اور تین بادام پیس کر مکسچر بنالیں سوتے وقت تھوڑا مکسچر چہرے پر لگا کر اچھی طرح جذب کریں' پھر مزید مکسچر لے کر چہرے پر لیپ کر دیں صبح روئی سے صاف کر کے صابن سے منہ دھولیں۔